عشق سیڑھی کانچ کی

امجد جاوید

عشق سیڑھی کانچ کی

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

امجد جاوید

عرضِ ناشر

مقامِ شکر ہے کہ زیرِ نظر ناول ''عشق سیڑھی کانچ کی'' پیش کرتے ہوئے ہم خوشی اور اطمینان محسوس کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس ناول کا موضوع بہت ہی منفرد، سنجیدہ اور اعلیٰ نوعیت کا ہے۔ اس ناول میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کی بنیاد یہ ہے کہ انسانیت کو اس ازلی سچائی کی جانب متوجہ کیا جائے جو امن، محبت اور دوستی کی راہ دکھاتے ہوئے اُخروی نجات کا باعث بنتا ہے۔ اس ناول کا لینڈ اسکیپ بے حد معنی خیز ہے۔ اور کہانی کی بنت جس ماہرانہ انداز سے کی گئی ہے وہ لائق ستائش ہے۔

جناب امجد جاوید نے یہ ناول لکھ کر پھر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا شمار ان لکھاریوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف اپنے مقاصد کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں بلکہ صحیح معنوں میں دلِ دردمند رکھتے ہیں۔ ان کا اخلاص اور درد، ان کی تحریروں سے جھلکتا ہے۔ یہ سعادت انہی کا خاصہ ہے کہ وہ اعلیٰ موضوعات پر قلم کاری کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ آپ جینوائن لکھاری ہیں اور قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ تاہم حیرت اس پر ہے کہ ان کی پذیرائی پر حاسدین نے افواہوں کا بازار گرم کر دیا۔ مثلاً عشق کا شین جیسی داستان کو آگے بڑھانا انہی کا خاصہ ہے جس پر یہاں تک کہہ دیا گیا ''ہر قلم میں وہ سحر نہیں ہوتا جو الفاظ میں معنی اور تاثیر پھونک دے۔'' ''لایعنی اور بے روح الفاظ کا ہجوم ہے۔'' ''اس داستان کو مضحکہ خیز انجام تک دے دیا گیا۔'' ان جملوں کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو عشق کا شین حصہ دوئم جب انہوں نے لکھا تو نہ صرف اس نے قبولیت عام پائی بلکہ حصہ سوئم بھی منظر عام پر آیا اور قارئین کا اصرار ہے کہ حصہ چہارم بھی منظر عام پر لایا جائے۔ یعنی داستان ابھی جاری ہے انجام نہیں ہوا۔ اگر داستان میں کوئی تاثیر، معنی خیزی اور اخلاص نہ ہوتا تو مزید حصے کبھی منظر عام پر نہ آتے۔ قارئین کی سند قبولیت سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ عشق کا شین کو جناب امجد جاوید نے ہی زندگی دی اور اپنی قلم کاری سے اس

میں نئی روح پھونک دی۔ ورنہ اس داستان کو ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا (کیوں چھوڑا گیا، یہ ایک الگ کہانی ہے) ایسا کہنے والے حاسدین خود اِدھر اُدھر سے مواد جمع کر کے لفظوں کی جوڑ توڑ کرتے ہی جب ایسی تحریر لکھ لیتے ہیں تو انہیں کئی جگہ بیچنے اور ان لفظوں کے دام کھرے کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تحریروں میں غیر ضروری تفاصیل کے ساتھ سطحی دلچسپی ہوتی ہے جو وقتی طور پر قارئین کو ضرور متاثر کرتی ہے لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ کسی مخصوص نظریہ اور کسی چھوٹے سے دائرے میں رہ کر اس کی پابندی کرنا الگ بات ہے اور عظیم سطح پر بلند نگاہی دوسری بات!

جناب امجد جاوید کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ انسانیت کے لیے سوچتے اور لکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ایسی افواہیں ان کے کام میں قطعاً حارج نہیں ہوں گی۔

''عشق سیڑھی کانچ کی۔'' ایک ایسا ناول ہے جو میرے ان خیالات کی تائید کرے گا۔ یہ ناول پڑھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ بلاشبہ لکھنے والے بے شمار ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے حاسدین بھی موجود ہیں۔ تاہم امجد جاوید ایک ہی ہیں جو کام پر یقین رکھتے ہیں۔ ادارہ ان کی نگارشات کو فخریہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

گل فراز احمد

عرضِ مصنف

جدید دنیا جہاں گلوبل ولیج بن رہی ہے، وہاں انسانی تعلقات میں بھی وسعت آ رہی ہے۔ ان تعلقات کی نہ صرف نوعیت مختلف ہے بلکہ اقدار انسانیت کے انداز بھی تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ ازلی حقیقت اس میں اب بھی موجود ہے اور وہ ہے حق و باطل کی کشمکش، جس سے عالمی منظرنامے کی ہیئت ہی کچھ مختلف ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح جدید ذرائع ابلاغ نے جہاں معلومات کے حصول کو آسان تر کر دیا ہے، وہاں نظریات و افکار کے پرچار میں بھی بڑی سہولت میسر آ گئی ہے۔ بلاشبہ اس دور میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ''ابلاغیات'' کے فن میں بہت ترقی و پیش رفت ہوئی ہے۔ جس کے اثرات دنیا کے ہر شخص تک پہنچ رہے ہیں۔ ابلاغیات کے اسی فن کی بدولت ماضی کی دو قوتوں کے درمیان ''سرد جنگ'' لڑی گئی۔ جس کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کیے گئے۔ آج یہ جنگ ایک مختلف روپ دھار چکی ہے۔ مثلاً اس سرد جنگ میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ جھوٹ اس قدر بولو کہ وہ سچ معلوم ہو۔ یا پھر واقعات و حالات کو اس طرح پیش کیا جائے جو آپ کے نظریات و افکار کے مطابق ہوں یا پھر سچائی کے اصل پہلو کو چھپا کر، اپنے نظریات کے مطابق ایسے پہلوؤں کو پیش کیا جائے جس سے نفرت انگیز جذبات پیدا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ یہاں وغیرہ وغیرہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے بے شمار اصول بنائے گئے جو ضرورت کے مطابق تخلیق ہوئے اور ان کی بنیاد میں اخلاقیات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ انہی بنیادوں پر ہر قوم اپنے نظریات و افکار کے پرچار میں مصروف ہے اور ذرائع ابلاغ پر جنگ کا منظرنامہ ہے۔ بے شک اس منظرنامے میں مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا پورے زور و شور سے جاری ہے۔ جو اس دور کی تلخ حقیقت ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ طے ہے کہ، کمپیوٹر جیسے آلے کی ایجاد میں کوئی مثبت نیت نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد میں تخریب تھی۔ جب یہ دنیا کے لوگوں کے ہاتھ میں آیا تو اس میں مثبت

رجحان بھی آ گیا۔ سواب تک اس پر زیادہ مواد تخریب کا پہلو ہی لیے ہوئے ہے۔ یہاں میں اس سوچ کو بالکل بھی نظر انداز نہیں کر رہا ہوں کہ کوئی بھی آلہ بذاتِ خود نہ منفی ہوتا ہے اور نہ مثبت، بلکہ اسے استعمال کرنے والے ذہن میں مثبت یا منفی خیال ہوتا ہے، ایٹم بم یا میزائل داغنے کے لیے ٹارگٹ کا دوست زاویہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے اور امراض کے علاج کے لیے تحقیق میں مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ کون سی قوم کیا کر رہی ہے، اب یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ جسم فتح کرنے سے کوئی قوم مفتوح نہیں ہوتی بلکہ دل جیتنے سے ایک قوم، دوسری قوم کو اپنے قریب کر سکتی ہے۔ تاہم ایک تیسرا پہلو بھی موجود ہے، اور وہ ہے ذہن فتح کرنا، جس سے کسی بھی قوم کے افراد کی سوچ کو دھیرے دھیرے اس سطح پر لے آیا جائے کہ وہ اپنے بنیادی نظریات وافکار چاہے نہ بدلیں، لیکن انہیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ ذہنی طور پر نظریات وافکار کی یہی شکست وریخت قوم میں انتشار پیدا کر دیتی ہے اور منزل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس تناظر میں اگر ہم عالم اسلام کو دیکھیں تو ہمارے سامنے سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ عالمی پراپیگنڈے کو جب پرت در پرت دیکھا جائے، اس پر تھوڑا سا غور وفکر کیا جائے اور سچائی کی تلاش میں تھوڑی سی محنت کر لی جائے تو یہ پروپیگنڈا پانی کے بلبلے کی مانند ثابت ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پوری طرح عیاں ہے کہ سچائی اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ چاہے اس پر جتنا مرضی اندھیرا کر دینے کی کوشش کی جائے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ سچائی کی طرف رجوع کیا جائے۔ عالم اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے اثرات کیا ہیں اور کہاں تک ہیں، اس بحث سے قطع نظر سوال یہ ہے کہ اس کا جواب دینا چاہیے؟ جواب ہاں میں ہو یا ناں میں، عالم اسلام کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس کی بدولت اس انسانیت سوز غبار کو ایک پھونک سے اڑایا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ وہ ازلی سچائی، نورِ مبین کلام الٰہی ہے جو سرکارِ دو عالم، نبی رحمت ﷺ کا زندہ معجزہ ہے۔ جس میں یہ فرما دیا گیا ہے کہ جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے، بے شک باطل مٹ جانے کے لئے ہی ہے۔ اگر عالمِ اسلام کا یقین پوری طرح قرآن مجید کی جانب ہو جائے تو میرا نہیں خیال امت مسلمہ کہیں بھی اور کسی سے بھی شکست و ریخت کا شکار ہو۔ بلکہ عالم اسلام کی بقا و مضبوطی صرف اور صرف اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے میں ہے۔

میں نے زیر نظر ناول، انہی خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ میں نے

تفاصیل سے بچتے ہوئے، محض اشاروں میں، تشبیہات واستعاروں میں بہت سارے پہلو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے حضرت اقبالؒ کے اسی پیغام کو دہرایا ہے کہ ’’اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔‘‘ میری اس حقیری کاوش سے اگر ایک بھی ذہن پورے دل سے اس بات پر متفق ہو گیا کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ محض اور صرف اللہ رب العزت کے احکام کی پابندی اور نبی رحمت، وجہِ تخلیقِ کائنات، خاتم الرسل ﷺ کی سنت کی پیروی میں ہے اور اس دل نے عمل کرنے کی سعی بھی کر ڈالی تو میں سمجھوں گا میری محنت ٹھکانے لگی اور میرے رتجگوں کا ثمر مجھے مل گیا۔

میں شکریہ ادا کروں گا جناب حکیم محمد اقبال صاحب کا جنہوں نے بہتیرے راز مجھ پر آشکار کیے۔ محترم محمد سعید پنسوتہ کا، جنہوں نے علمی مدد دی۔ محترم خالد بن سعید ایڈووکیٹ کا جو اس کہانی کی بنیاد بنا۔ محمد علی رضا کا جس نے بہت تعاون کیا۔ ان دوستوں کا جو وقتاً فوقتاً میرے علمی کام میں معاون رہے۔

کوئی بھی انسانی کاوش غلطیوں اور لغزشوں سے پاک نہیں ہوتی۔ مجھ سے بھی غلطیاں اور کوتاہیاں ہوگئی ہوں گی۔ میری استدعا ہے کہ کمالِ شفقت سے نشاندہی کرتے ہوئے میری رہنمائی فرمائیں اور اپنی دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیں۔

طالب دعا

امجد جاوید

18-رانا ٹاؤن، حاصل پور، 63000

Email: amjadhsp@yahoo.com

www.lekhari.blogspot.com

"تھائی لینڈ! یہی کہا ہے نا تم نے؟" ذیشان نے انتہائی حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت ہی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ایسا ہی حال میرے سامنے بیٹھے فہد کا بھی تھا۔ جس نے چونکتے ہوئے کوئی تبصرہ تو نہیں کیا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری، طنزیہ احساس اور حیرت کے ملے جلے اثرات میں مجھے اپنی بات کی ناپسندیدگی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحے پہلے جو میرے دفتر کا ماحول انتہائی خوشگوار تھا، ایک دم سے بوجھل ہوگیا۔ جیسے کسی واٹر کلر سے بنی ہوئی تصویر پر اُوس پڑ جانے سے اس کے رنگ بھدے اور بے ترتیب سے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کے رویئے سے مجھے دفتر کا ماحول کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

ذیشان اور فہد میرے کلاس فیلو تھے۔ ہم نے اکٹھے پڑھا تو تھا لیکن میں ایک اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز ہوگیا۔ ذیشان اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا جبکہ فہد کا معاملہ ابھی طے نہیں ہو پایا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ اس کا کہنا یہی تھا کہ وہ مزید تعلیم کے لیے باہر جائے گا لیکن اصل میں وہ کرنا کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں فہد کے بارے میں اچھی طرح اس لیے جانتا تھا کہ وہ میرا پھوپی زاد تھا۔ اس کے پاپا الطاف انور نے ایک اعلیٰ حکومتی عہدے پر بہت ترقی کے ساتھ ڈھیروں دولت جمع کر لی تھی۔ اس لیے اب اگر وہ ساری عمر بھی بیٹھ کر کھاتا رہتا تو وہ ختم نہ ہوتی۔ وہ میرا دوست تو تھا لیکن اس میں ہلکی سی خود پسندی بھی تھی۔ اسے یہ زعم تھا کہ اب جو میں ایک اعلیٰ حکومتی عہدے پر ہوں، اس کے پاپا کی وجہ سے ہوں۔ حالانکہ انہوں نے اپنے تئیں خود دلچسپی لی تھی، میں نے ایک بار بھی انہیں نہیں کہا تھا۔ ذیشان میں خامیاں کم اور خوبیاں

تھا۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم اچھے اور بااعتماد دوست تھے۔ اس لیے میرے تھائی لینڈ جانے کی بات پر وہ اس قدر حیرت زدہ ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا تو ذیشان بولا۔

''میرے خیال میں ان دنوں جبکہ تمہاری شادی کو فقط ایک ماہ رہ گیا ہے، تمہیں کہیں نہیں جانا چاہیے اور وہ بھی تھائی لینڈ جیسے بدنامِ زمانہ ملک میں۔'' اس نے کہا تو مجھے یوں لگا جیسے اسے میرے جانے پر شدید غصہ آیا تھا۔

''میری بات سنو گے تبھی تجھے معلوم ہوگا، اپنی ہی کہے جا رہے ہو۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''میں تو اتنا جانتا ہوں پیارے۔ اس ملک کی شہرت اس قدر خراب ہے کہ وہاں ک نام لیتے ہی عیش وعشرت کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ ایسا ہونا فطری سی بات ہے۔ کس کس ک اپنی بے گناہی کے بارے میں بتا سکو گے اور وہ بھی ان دنوں میں جبکہ تمہاری۔۔۔'' وہ پھ وہیں سے شروع ہو گیا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''میری شادی کو ابھی پورا ایک ماہ پڑا ہے اور ابھی حتمی تاریخ طے ہونا باقی ہے۔ می اسی لیے ان دنوں میں جانا چاہتا ہوں کہ پھر مجھے شاید ہی وہاں جانے کا موقعہ ملے اور ممکن ہ وہ مقصد ہی نہ رہے جو ان دنوں میرے پیشِ نظر ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مقصد! کیسا مقصد میری جان؟'' اس نے مزید حیرت سے پوچھا، لہجے میں انتہا درجے کا طنز تھا۔

''وہ میں تم لوگوں کو آ کر بتاؤں گا۔'' میں نے بھی وہ بات چھپا لینا مناسب سمج کیونکہ تھائی لینڈ کے نام پر ہی ان کا ردعمل یہ تھا، مقصد کے بارے میں جان کر تو ان کا بھڑک جانا لازمی تھا۔

''یار! تم کچھ عجیب وغریب قسم کی باتیں نہیں کر رہے ہو؟'' ذیشان نے کہا پھر ا دائیں طرف بیٹھے فہد کو ٹھوکا دیتے ہوئے بولا ''تم بھی تو کچھ منہ سے پھوٹو، یونہی بت بنے بیٹ رہو گے۔''

اس کے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر طنزیہ سے لہجے میں بولا:

''اگر تو یہ فقط عیاشی وغیرہ کے لیے جا رہا ہے تو میرا نہیں خیال کہ ان دنوں میں ا کا جانا ضروری ہے اور پھر اتنا سرمایہ خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ممکن ہے اسے خود اعتماد نہ ہو اور وہاں جا کر یہ اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہو۔'' فہد نے دھیمی مسکراہٹ کے سا

سیدھے میرے کردار کو نشانہ بنایا۔ وہ میری مردانگی پر شک کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ کسی بھی مرد کو جذباتی کر دینے والی بات تھی چونکہ ایسا کچھ تھا نہیں، مجھے اپنے آپ پر اور اپنے کردار پر پورا اعتماد تھا، اس لیے فہد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیسی بات ہے یار؟'' ذیشان نے کہا، ''فہد ٹھیک کہتا ہے، وہ تمام سہولیات اور مواقع ہم تمہارے لیے یہاں مہیا کر سکتے ہیں تو پھر تمہیں اتنی دور جانے کی ضرورت کیوں ہے؟'' اب کہ اس کا انداز مجھے زچ کرنے والا بھی تھا۔

''اچھا تم لوگ بکواس ہی کرتے چلے جاؤ گے یا پھر میری بات بھی سنو گے۔'' میں نے واقعتاً زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا، تم اپنی سنا لو، اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ تمہیں جانا بھی چاہیے یا نہیں۔'' ذیشان نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بالکل خاموش تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''دیکھو میرے بھائی! میں وہاں کسی عیاشی وغیرہ کے لیے نہیں جا رہا ہوں اور نہ ہی میرا ایسا کوئی مقصد ہے۔ اگر تم یہاں پر عیش وعشرت کی سہولیات حاصل کر سکتے ہو تو مجھے تمہاری اس آفر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجھے تم لوگوں کی مدد درکار نہ ہوتی نا تو میں تم دونوں کو تھائی لینڈ جانے کے بارے میں بتاتا بھی نہ، اور یونہی خاموشی سے چلا جاتا۔'' میں نے ان دونوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے ذرا سے سخت لہجے میں کہا۔

''مدد۔ ! کیسی مدد؟'' ذیشان نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب شاید میں تم دونوں سے مدد بھی نہ مانگوں یہی میرے لیے اچھا ہے۔'' میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں! بتاؤ، تم کیسی مدد چاہتے ہو۔'' فہد نے میری جانب گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے جانے کے حق میں ہی نہیں ہوں اور تم مدد کی آفر کر رہے ہو۔'' ذیشان نے تڑپ کر کہا تو وہ بولا

''دیکھو ذیشان! جہاں تک بلال کے کردار کی بات ہے تو میرا نہیں خیال کہ ہم اس پر کوئی شک کر سکیں۔ اس کا لڑکپن، اس کی جوانی ہمارے سامنے ہے، سو یہ کہنا کہ یہ تھائی لینڈ اس مقصد کے لیے جا رہا ہے، اسے ذہن قبول نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچنے والے انداز

میں میری جانب دیکھتا رہا، پھر بولا: ''دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کا مقصد کوئی اور ہے تو وہ ہمیں بتائے۔''

''نہیں! فی الحال میں تم دونوں کو نہیں بتاؤں گا، ہاں مگر، واپس آنے پر پوری تفصیل سے بتا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں میرے اس مقصد کو اچھا خیال کرو گے۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

''پھر بھی، وہ کیا مقصد ہے، کچھ تھوڑا بہت ہمارے پلے بھی پڑے، واپس آ کر جو بتاؤ گے، جانے سے پہلے بتانے میں کیا حرج ہے۔'' ذیشان نے الجھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اب نہیں، واپس آ کر تفصیل سے بتاؤں گا، میرا وعدہ رہا۔'' میں نے صاف طور پر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو بتاؤ، تمہیں ہماری کیا مدد چاہیے۔'' فہد نے پھر پوچھا

''کمال کرتے ہو یار اسے بجائے روکنے کے، اس کی مدد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔'' ذیشان نے پھر سے ٹانگ اڑا دی۔

''اور تم اسے کیوں روکنا چاہتے ہو؟'' فہد نے پلٹ کر اس سے پوچھا، لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

''اس کی کئی ساری وجوہات ہیں۔ یہ ابھی چھٹیاں لے گا، پھر چند دنوں بعد اپنی شادی کے لیے۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو وہ بولا

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے، یہ کون سا مہینے رہنے کے لیے جا رہا ہے، زیادہ سے زیادہ دو چار دن رہے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھ سے پوچھا'' کتنے دن کے لیے جا رہے ہو؟''

''دس دن کے لیے۔'' میں نے کہا تو ایک لمحے کے لیے وہ بھی چونک گیا۔ اس پر ذیشان تو جیسے شروع ہی ہو گیا۔

''اب دیکھو، دس دن اور وہ بھی دوسرے ملک میں، اتنا خرچ، اپنی شادی پر کیوں نہ خرچ کرے۔ ایسا ہی ٹور اپنے ہنی مون کے لیے بچا رکھے، اس کے لیے جو اس کی ہونے والی بیوی اور محبوبہ ہے۔ فہد! تم بھی جانتے ہو اور میں بھی، یہ ماہا سے عشق کی حد تک محبت کرتا ہے۔ وہ جو کچھ دنوں بعد اس کی ہو جانے والی ہے، اس کے بارے میں سوچنے کی بجائے یہ عجیب عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔ یہ اچانک تھائی لینڈ میں اس کا کون سا مقصد آن پڑا ہے۔''

''ذیشان! میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ماہا سے عشق ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس کے لیے بھی پورا پلان کیا ہوا ہے۔ اسی

لیے تو کہتا ہوں نا کہ پھر مجھے وقت نہیں ملے گا میں ہوں گا اور ماہا۔ ہماری اپنی ایک دنیا ہو گی۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے ذیشان کہ میں نے اس کے لیے، اس کی پسند کے مطابق یہاں گھر بنایا ہے، ماہا کو میں نے بتا دیا ہے کہ جب اس گھر میں آئے گی تو اپنی پسند سے سجائے گی۔ پھر بھی وہ آج کل حویلی کا وہ حصہ سجانے کی فکر میں ہے، جو ہمارے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سو۔! اس کی کوئی فکر نہیں۔'' میں نے بھرپور انداز میں ذیشان کی بات کو رد کر دیا تو اس نے اک نیا پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! اگر وہاں کسی لڑکی کا کوئی چکر ہے نا تو پھر بھی تمہیں مایوسی ہو گی، تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کیسی ہیں۔ تم دس دن کا کہہ رہے ہو، میرے گمان میں تو یہی آتا ہے کہ تم دوسرے یا حد تیسرے دن وہاں سے واپس آ جانے کی بابت سوچو گے، تو پھر خواہ مخواہ میں اتنا پیسہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''تو اس سے یہ ثابت ہوا، میری جان کہ تم لوگ میری مدد نہیں کرو گے۔ اس لیے یہ موضوع یہیں چھوڑ دیں، کوئی اور بات کریں۔'' میں نے واقعتاً اکتاتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا، بولو، تمہیں کیا مدد چاہیے، تم خود ہی اس کی باتوں سے الجھ رہے ہو۔'' فہد نے کہا۔

''یار! تم اس کے ہی نہیں، ماہا کے کزن بھی ہو۔ تمہیں ان دونوں کا خیال رکھنا چاہیے، تم ہو کہ اس کی مدد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔'' ذیشان نے اب بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس پر فہد نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب ایک بندہ جانا چاہتا ہے، تم کیوں اسے روک رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے، بتاؤ بھئی، ہم کیا مدد کریں تمہاری؟'' آخر کار اس نے ہتھیار پھینک ہی دیئے۔

''ہاں بولو!'' فہد نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو وہ دونوں میری جانب انتظار طلب نگاہوں سے دیکھتے رہے، تب میں نے کہا۔

''میں نے ریٹرن ٹکٹ کے ساتھ کراچی سے ویزہ بھی لے لیا ہوا ہے یہ سارا کام میرے دوست علی نے کیا ہے۔ تم بھی اس کے بارے میں جانتے ہو۔ ٹھیک دو دن بعد میں نے یہاں سے نکلنا ہے، یہ طے ہو چکا ہے۔ میں تم دونوں سے الگ الگ مدد چاہتا ہوں۔''

''دونوں سے الگ الگ۔۔۔ مطلب؟'' ذیشان نے پوچھا

''ہاں! تم سے میں یہ مدد چاہتا ہوں کہ تمہارا وہ کزن جو بنکاک میں ہے۔ کیا نام ہے اس کا، جو وہاں گارمنٹس کا بزنس کر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شعیب ہے اس کا نام! وہی نہیں، اسکے والد صاحب بھی کئی برسوں سے وہاں پر ہی کاروبار کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں! وہی شعیب، چونکہ ملک نیا ہے اور میں اس کے بارے میں اتنا نہیں جانتا۔ دوسری بات کہ مجھے وہاں جاتے ہی۔۔۔'' میں نے کہنا چاہا تو وہ درمیان ہی میں بول اٹھا۔

''او کے! تم اس سے جس طرح کی مدد بھی چاہو گے، وہ دے گا۔ میں ابھی اس سے بات کروا دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ؟'' اس نے پوچھا اور ساتھ ہی اپنا فون نکال کر اس کے نمبر پش کر ڈالے۔ تب میں نے اس کی آمادگی دیکھی تو خاصا حوصلہ ہوا۔

''چلو، میں خود ہی اس سے بات کرلوں گا''۔ میں نے کہا اور رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ تو چند لمحے حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے کہا۔

''شعیب! میرا جگری دوست بلال۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں وہی۔۔۔ وہ تھائی لینڈ آرہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دوسری طرف سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''ہاں! اسے کوئی کام ہے وہاں پر، یہ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔۔۔ لو اس سے بات کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے فون پکڑا اور پھر حال احوال کے بعد اسے اپنے تھائی لینڈ آنے کے بارے میں بتایا۔

''میرے سر آنکھوں پر بھائی جان، آپ آؤ، جو بھی اور جیسی بھی خدمت ہو سکی میں ضرور کروں گا۔ آپ سیدھے مجھے فون کر کے حکم دے دیتے، اس میں سفارش کی کیا ضرورت تھی۔''

''نہیں میرے بھائی، سفارش کی بات نہیں ہے، میں چاہتا تھا کہ بندے کا ایک اعتبار۔۔۔''

''اوہ۔۔۔ کیا کرتے ہیں آپ، کیا میں نہیں آپ کو جانتا، یہ اعتبار وغیرہ کو چھوڑیں، مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے اور ذیشان بھائی نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں آپ کے کسی کام آسکوں۔ کب آرہے ہیں آپ؟''

''پرسوں رات میری فلائیٹ ہے، میں کل آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا کہ مجھے کیا چاہیے۔ پھر وہیں آکر لمبی باتیں ہوں گی۔'' میں نے کہا اور فون ذیشان کو دے دیا۔

''بات سن! کوئی ایسی بات نہ ہو، ساری زندگی۔۔۔ اچھا چل ٹھیک ہے، اللہ حافظ'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔ ''لو جی! یہ تمہاری مدد تو ہو گئی، اب اس سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے فہد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو!'' فہد نے پوچھا

''تم سے میں یہ چاہتا ہوں میری جان کہ کسی کو بھی میرے تھائی لینڈ جانے کی خبر نہ ہو، میں یہاں لاہور میں دس دن نہیں ہوں گا، اتنے دن غائب رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سب پوچھ سکتے ہیں۔ انہیں کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے۔'' میں نے الجھتے ہوئے کہا

''سیدھی سی بات ہے کہ تم کسی اور ملک جانے کا کہہ دو، وہ ہم طے کر لیتے ہیں۔'' فہد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ملائیشیا کہہ دو۔'' ذیشان نے لقمہ دیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' فہد نے کہا۔ پھر مجھ سے پوچھا ''اور دوسری بات؟''

''چونکہ شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ میں نے پاپا اور ماما سے کہا تھا کہ چند دن بعد وہ خریداری کے لیے یہاں لاہور آئیں۔ اول تو انہیں آنے ہی نہ دینا اور اگر وہ آجاتے ہیں تو ان کے ساتھ خریداری کروا دینا۔ ممکن ہے وہ سب یا ماما میرے یوں اچانک جانے پر پریشان ہوں۔ یہ تم نے ہی سب کو سنبھالنا ہے، میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔''

''او کے باس!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فائنل ہو گیا۔ میں کل شام ہی گاؤں چلا جاؤں گا اور تمہارے آنے تک ادھر ہی رہوں گا یا جو بھی میں نے بہتر سمجھا، تم پریشان نہیں ہونا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو نجانے کیوں مجھے اس کا لہجہ اس قدر اجنبی لگا کہ وہ خود بھی مجھے اجنبی دکھائی دینے لگا۔ لیکن یہ ایک لمحاتی کیفیت تھی کیونکہ میں ذیشان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''چلو یار اب تو بتا دو کہ وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟''

''پھر وہی بات؟'' میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو جاؤ۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا، پھر آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''لیکن! اس وعدے کے ساتھ، جب تم واپس آؤ گے نا تو پوری تفصیل سنوں گا، بلکہ ایک ایک دن کی روداد، بولو منظور ہے؟''

تب میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یار میں تم لوگوں کو بتانے کے لیے خود بے تاب ہوں گا۔'' اس پر وہ بھی ہنس دیئے تو میں نے پورے خلوص سے کہا ''آؤ! اس خوشی میں کسی بہت اچھے ریسٹوران میں اعلیٰ قسم کا کھانا کھلاؤں۔''

''ہاں! اب یہ تو بنتا ہے۔ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تب ماحول ایک دم سے

خوشگوار ہوگیا جیسے کسی ماہر مصور کی واٹر کلر سے بنائی ہوئی تصویر میں سبھی رنگ اس خوبصورتی اور مہارت سے بھرے ہوں، جس سے تصویر نکھر جاتی ہے۔ سو ہم تینوں دفتر سے نکل پڑے۔

❁......❁......❁

نور پور شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر آباد گلاب نگر، کہنے کو تو ایک گاؤں تھا لیکن جدید دور کی تقریباً تمام تر سہولیات وہاں میسر تھیں۔ وہاں کھلی ہوا، پُر فضا مقام اور پر سکون ماحول تھا۔ بیشتر سے زیادہ لوگ غیر ممالک میں کمانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یوں وہاں کے لوگ خاصے خوشحال تھے۔ اس لیے گلاب نگر میں سفید حویلی اتنی زیادہ اجنبی نہیں لگتی تھی جس کا طرز تعمیر پرانا تھا۔ اس حویلی کو چوہدری نور الٰہی نے تعمیر کروایا تھا۔ یہی وہ شخص تھا کہ جس نے یہاں آ کر جنگل بیابان کو سبزہ زار میں تبدل کر دیا تھا۔ وہ اس علاقے کا بااثر زمیندار تھا۔ اس گاؤں کا نام بھی اسی لیے گلاب نگر پڑا تھا کہ چوہدری نور الٰہی کو گلاب کے پھول سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس نے زمین کے ایک قطعے کو گلاب کے پھولوں کی کاشت کے لیے مختص کر دیا تھا۔ یوں یہاں کے پھولوں نے شہر کو بھی مسحور کر دیا۔ چوہدری نور الٰہی دین دار، صوم وصلوٰۃ کا پابند اور بہت ہی مخلص انسان تھا۔ اس نے جہاں زمینوں کو آباد کیا تھا، وہاں اس نے اپنے علاقے کی تعمیر و ترقی میں بے حد دلچسپی لی تھی۔ جس کے ثمرات سے لوگ اِن دنوں مستفید ہو رہے تھے۔ پورا علاقہ نہ صرف ان کے اثر و رسوخ کو مانتا تھا بلکہ ان کے خاندان کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب چند سال قبل اس کی بیوی اللہ کو پیاری ہوئی تو سب کچھ اپنی اولاد کو سونپ کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا۔

چوہدری نور الٰہی کو اللہ نے ایک بیٹی نجمہ نور اور دو بیٹے احسان نور اور افضال نور سے نوازا تھا۔ بڑی بیٹی نجمہ نور کو اس نے الطاف انور کے ساتھ بیاہا جو ان دنوں اعلیٰ حکومتی عہدیدار تھا۔ وہ خاندان، دولت، عزت اور مرتبے میں ان کے ہم پلہ تھا۔ وقت کے ساتھ الطاف انور ترقی کرتا رہا اور مختلف شہروں میں رہتا ہوا، لاہور میں آن ٹکا اور اب وہیں سے سبکدوشی چاہتا تھا۔ نجمہ نور اور الطاف انور کی اولاد میں بیٹا فہد اور بیٹی فائزہ ہی تھے۔ لاہور اور نور پور کے درمیان کافی فاصلہ ہونے کے باعث ان کا آنا گلاب نگر میں بہت کم ہوتا تھا۔

چوہدری نور الٰہی کا بڑا بیٹا احسان نور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ، ایک اچھا انسان بھی تھا۔ وہ مقامی کالج میں پروفیسر تھا اور پھر نور پور ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔ اس نے حکومتی نوکری اس لیے کی کہ خود کو مصروف رکھ سکے اور لکھنے پڑھنے والی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق مضبوط رہے۔ شہر کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں وہ بھرپور شرکت کرتا اور ہفتے بعد چھٹی کا ایک دن گلاب نگر

میں گزارتا۔ اس کی بیوی ذکیہ بہت اچھی خاتون تھی۔ ان کی اولاد میں فقط ایک اکلوتی بیٹی ماہا تھی۔ قدرت کی جانب سے مزید اولاد نہ ملنے پر وہ دونوں میاں بیوی صبر کر رہے تھے اور ماہا کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

چوہدری نور الٰہی کا دوسرا بیٹا افضال نور کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا، اس کی ساری دلچسپی اپنے باپ کی طرح زمینداری کی طرف ہی تھی۔ اگرچہ وہ بھی اپنے والد کی مانند ہمدرد، مخلص اور اچھا انسان تھا، لیکن سیاسی سرگرمیوں کے باعث کسی حد تک گروپ بندیوں میں مشغول رہتا۔ دنیاداری کے تقاضوں کو نبھانا خوب جانتا تھا۔ اس لیے پورے علاقے میں اس کی اچھی خاصی پہچان بن چکی تھی۔ اس کی بیوی زبیدہ خاتون کو باہر کے جھمیلوں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا، اسے بس حویلی کے اندر چار دیواری سے مطلب تھا۔ نوکر چاکر ہونے کے باوجود وہ خود کام کرنا پسند کرتی اور اِسی دنیا میں خوش تھی۔ ان کا ایک بیٹا بلال تھا اور بیٹی رقیہ۔ دونوں کو بہت نازنخروں سے پالا گیا۔ رقیہ تو بس اپنی ماں کی ہو کر رہ گئی۔ اس نے اچھی تعلیم حاصل کی مگر کالج کی حد تک جو نور پور میں واقع تھا۔ مزید تعلیم کے لیے وہ کسی بڑے شہر میں نہ جا سکی۔ لیکن بلال کی تعلیم پر بہت توجہ دی گئی۔ اس کا دادا چوہدری نور الٰہی تو جیسے اس کا عاشق تھا۔ جب وہ سکول جانے کی عمر تک پہنچا تو اس کے لیے الگ سے کار خریدی گئی اور ڈرائیور رکھا گیا۔ جو اسے نور پور میں موجود سب سے اچھے سکول لے کر جاتا اور پھر واپس لے آتا۔ اکثر اوقات دادا بھی ساتھ جاتا۔ پھر ماہا بھی اسی سکول میں پڑھنے لگی۔ یوں بلال اور ماہا، اپنے دادا کی محبت میں پروان چڑھتے گئے۔ ان دونوں کو یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کب ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔ بلال جب تعلیم مکمل کر کے حکومتی عہدے پر فائز ہوا تو دونوں کی منگنی دھوم دھام سے کر دی گئی۔ اس وقت طے یہ پایا کہ جونہی ماہا کی تعلیم مکمل ہوگی، ان کی شادی کر دی جائے گی۔ سو ان دونوں کی شادی کے بارے میں تاریخ طے کرنا باقی تھی۔ باقی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دادا کی یہ سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ان دونوں کی شادی کرے۔ اس لیے اُن دنوں حویلی میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

فہد علی اور بلال نور دونوں کزن تھے۔ یونیورسٹی میں دونوں نے ایک ہی کلاس میں داخلہ لیا، ان کی رشتے داری اپنی جگہ لیکن وہ دونوں دوست بہت اچھے بن گئے چونکہ فہد کے والدین کا آنا جانا بہت کم تھا۔ لیکن بلال کی دوستی کے باعث وہ اکثر گلاب نگر آتا، پھر نور پور جاتا، ماہا بھی بلال ہی کے باعث فہد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی تھی۔ اس حوالے سے ان میں ڈھیروں باتیں ہوتیں۔ سو فہد کی وجہ سے ان خاندانوں کے درمیان تعلق برقرار تھا۔

اس دن بھی ماہا اپنے والدین کے ساتھ گلاب نگر آئی ہوئی تھی۔ زبیدہ خاتون نے اُسے خاص طور پر بلایا ہوا تھا۔ اس وقت سارے ہی بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور شادی کے بارے ہی میں باتیں چل رہی تھیں۔ ان میں فقط بلال نہیں تھا، جس کی کمی دادا نور الٰہی کے ساتھ ماہا نے بھی بہت محسوس کی تھی۔

''آج اگر بلال بھی ہوتا تو کتنا اچھا تھا، یہ نوکری بھی نا بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔'' دادا نور الٰہی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو احسان نور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اب وہ آجائے گا تو پھر جلدی واپس جائے گا، تب آپ کہیں گے کہ وہ جلدی کیوں چلا گیا؟''

''ہاں! یہ بھی ہے، یار میں نے تو بہت کہا کہ چھوڑ نوکری، کیا رکھا ہے اس میں، یہاں رہ مزے کر لیکن وہ ہے کہ بس نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔'' دادا نے پھر سے خود کلامی میں کہا۔

''جب تک اللہ عمر دراز کرے بھائی افضال ہے، تب تک اسے نوکری کرنے دیں۔ اس سے زندگی کا تجربہ بہت ہوتا ہے، یہاں وہ کیا کرے گا، زیادہ سے زیادہ سیاست، اس کے لیے بھائی افضال ہی بہت ہے۔'' احسان نور نے کہا۔

''ہاں ابا جی! لوگوں سے تعلق بنتا ہے، پڑھا لکھا ہے، کچھ عرصہ اس دنیا کی موج بہار دیکھ لے، پھر اس نے گلاب نگر ہی میں رہنا ہے۔ ویسے آپ کو اس کی نوکری اس لیئے اچھی نہیں لگتی نا کہ وہ آپ پاس نہیں رہتا۔''

''سچی بات تو یہی ہے۔'' دادا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سبھی ان کے ساتھ مسکرا دیئے۔

''چلو آپ سے اس کی بات کروا دیتے ہیں۔'' احسان رانا نے کہا اور اپنی جیب سے فون نکالا تو افضال جلدی سے بولا

''یہ فون رہنے دیں، وہ دوسرا لاتے ہیں بڑے اسپیکر والا، سارے اس کی بات سنیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک ملازمہ کو فون لانے کے لیے کہا۔ اپنے سامنے میز پر فون سیٹ رکھ کر بلال کا نمبر پش کر دیا۔ ذرا سی دیر میں رابطہ ہو گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد وہ بولا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر بعد فون کرنے والا تھا، مجھے معلوم تھا کہ آپ سب یہیں حویلی میں ہوں گے۔''

''کیا بات ہے پتر، خیریت تو ہے۔'' دادا نے پوچھا۔

''وہ دادا جی۔۔۔ مجھے چند دنوں کے لیے۔۔۔ اُدھر ملائیشیا جانا ہے بہت اہم

میٹنگ ہے، آتے ہی۔۔۔''

''ملائیشیا۔! وہاں کیا کرنے جا رہے ہو اتنی دور۔۔؟'' دادا نے تذبذب سے پوچھا۔

''بتایا ہے نا دادا جی، ایک بہت ہی اہم میٹنگ ہے، جس کی تفصیلات میں ابھی نہیں بتا سکتا، بس چند روز کے لیے جانا ہے اور پھر آتے ہی پورے ایک مہینے کی چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''اُو یار کسی دوسرے کو بھیج دو۔ اتنی دور کیا کرنے جانا ہے تم نے، شادی کے بعد بھی تو تم نے جانا ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے آپ فکر مند نہ ہوں۔ باقی وہاں میرا جانا ضروری ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں نا؟ اور پھر کون سا میں زیادہ دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ یوں سمجھیں جیسے میں نے چند دن اسلام آباد میں گزارے ہیں۔'' بلال نے بھرپور قسم کی تسلی دے ڈالی ''اور ہاں! میں نے فہد کو سمجھا دیا ہوا ہے۔ اگر کوئی کام ہو تو اسے بتا دیں۔''

''اچھا، چل ٹھیک ہے، ذرا دھیان سے جانا، وہاں جا کر اپنا خیال رکھنا، وہ بھی تو اسلامی ملک ہے نا؟'' دادا نے پوچھا۔

''جی! وہ بھی اسلامی ملک ہے۔'' بلال نے تائید کی۔

''اچھا اب اپنی ماں سے بات کر لے۔'' دادا نے کہا تو پھر بلال نے فرداً فرداً سب سے بات کی، ان سے پسند کی کسی شے کے بارے میں پوچھا۔ یوں کافی دیر تک باتوں کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

ماہا، جو کچھ دیر پہلے تک بلال کے ذکر پر بہت خوش تھی، رقیہ کے ساتھ ایک جانب سمٹی ہوئی باتیں سن رہی تھی۔ بلال کے یوں ملائیشیا جانے پر اچانک اس کے اندر ایسی لہر اٹھی جسے وہ فوری طور پر نہ سمجھ سکی تاہم وہ بجھ کر رہ گئی۔ بلاشبہ اسے بلال کا یوں جانا اچھا نہیں لگا تھا، اس لیئے یہ کیفیت ہوئی تھی۔ پھر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ سب کیا باتیں کر رہے ہیں اس کا سارا دھیان اپنی جانب ہو گیا۔ وہ اٹھی اور اندر کی جانب چلی گئی اور تنہائی میں سوچنے لگی۔

''تمہیں یوں بلال کا جانا اچھا کیوں نہیں لگ رہا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''پتہ نہیں۔'' من سے آواز آئی۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، وہ ایک اعلیٰ حکومتی ادارے میں کام کر رہا ہے، اسے اپنے کام کے سلسلے میں جانا ہوگا، تمہیں کیوں پریشانی ہے۔ اتنی معمولی سی بات پر۔۔۔''

''اس نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ جب جانے کا پروگرام تھا تو ایک فون کال کر کے نہیں بتا سکتا تھا۔''

''بس اتنی سی بات پر دل گرفتہ ہوگئی ہو کہ اس نے تمہیں بتایا نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔''

''نہیں! اسے مجھے بتانا چاہیے تھا۔''

''یہ بھلا کیا ضد ہوئی۔ وہ ایک ذمہ دار آفیسر ہے۔ اب سارے معاملات تو وہ تم سے شیئر نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کر سکتا؟ میں جب اس کی ہوں اور وہ میرا ہے تو اس کے سارے معاملات میرے ہیں۔ میں تو اسے اپنا مان چکی ہوں۔ میرا سب کچھ وہ ہے تو۔۔۔''

''اس طرح نہیں سوچتے۔ تم خود پوچھ لینا، اس میں کیا حرج ہے؟''

''پوچھوں گی میں، ابھی پوچھوں گی۔''

یہ سوچتے ہی اس نے اپنا فون نکالا اور بلال کے نمبر پش کر دیئے۔ دوسری بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا اور بولا

''مجھے معلوم تھا کہ تم فون کرو گی۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ تمہیں کیوں معلوم تھا؟'' ماہا نے تنک کر کہا۔

''یہی کہ تم پوچھو گی میں اچانک۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن ماہا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کیوں جانا ہے، پھر مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''بابا، اچانک جانا پڑ رہا ہے، اور اس میں بتانے والی کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں۔ میں نوکری کرتا ہوں، اس میں احکام ماننا پڑتے ہیں۔ میں منع تو نہیں کر سکتا۔ ہر بات میں تم سے کس طرح شیئر کر سکتا ہوں۔'' بلال نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے کتنے دن کے لیے جانا ہے؟'' اس نے ایک دم سے نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہفتہ تو لگ جائے گا۔ خیر چھوڑو اس بات کو، تم بتاؤ، کیا لاؤں میں تیرے لیے۔'' بلال نے جواب دیتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

''کچھ نہیں [illegible] بہت [illegible] پسند کا خریدیں گے۔'' وہ بولی۔

''اچھا خیال ہے۔'' اس نے تعریف [illegible]

''پتہ ہے، آج میں یہاں کس لیے آئی ہوں؟'' ماہا نے بہت خوشگوار موڈ میں کہا۔

''تم بتاؤ گی تو مجھے معلوم ہوگا نا؟'' بلال نے بھی پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے کمرے والا جو حویلی کا حصہ ہے نا، وہ چاچی جی نے مجھے دے دیا ہے اور کہا ہے کہ میں اسے اپنی پسند کے مطابق سجا سنوار لوں، اب مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں کیا کروں۔ تم ہوتے نا تو مجھے بہت آسانی رہتی۔ آج میں نے ایک انٹریئر ڈیکوریٹر کو بلوایا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ آ جائے گی۔ پھر اس کے مشورے سے اس پورے حصے کو سجاؤں گی۔'' ماہا نے دبے دبے جوش میں کہا۔

''اچھی بات ہے۔ لیکن خدا کے لیے میرے کمرے میں افراتفری مت مچانا، وہاں بہت سارے اہم کاغذات، کتابیں اور بہت ساری ایسی چیزیں ہیں۔ میں آ جاؤں گا تو اس کمرے کو دیکھ لیں گے۔ باقی سارا حصہ تم ٹھیک کروا لینا۔'' بلال نے ذرا سا گھبراتے ہوئے لیکن پیار بھرے انداز میں کہا۔

''مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ تم اتنا گھبراؤ نہیں۔'' ماہا طنزیہ انداز میں بولی۔

''شاباش! یہ ہوئی نا بات۔'' وہ ایک دم سے خوش ہوگیا۔

''اچھا، کب جا رہے ہو ملائیشیا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''تمہاری سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی ہے؟'' بلال نے پوچھا۔

''اچھا، چلو نہیں پوچھتی، لیکن یہ تو پوچھ سکتی ہوں نا کہ کب واپس آ رہے ہو؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''او میرے اللہ! یار بتایا تو ہے تمہیں ایک ہفتے کے بعد۔'' بلال نے تنگ آتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتی کمرے میں زبیدہ خاتون آ گئیں، تب ماہا نے کہا۔

''چاچی جی آ گئیں۔ بعد میں۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''ماہا! پتر، وہ تمہاری کوئی ملنے والی آئی ہے۔ یہ وہی ہے گھر سجانے والی۔'' زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

''جی چاچی جی۔'' اس نے اختصار سے کہا اور اٹھ گئی۔

''اچھا چل تو اسے اپنے ساتھ ادھر لے آ، میں چائے وغیرہ بھجواتی ہوں۔ پھر بعد میں اسے حویلی دکھا لینا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو زبیدہ خاتون کچن کی جانب چلی گئی۔ انٹریئر

ڈیکوریٹر اس کی ماما ذکیہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ پھر وہ تینوں ہی اندر کی جانب آ گئیں۔

میں روانگی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میرے ملازم نے میرا بیگ اٹھا کر پورچ میں رکھ دیا تو میں نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ شام ہو رہی تھی اور ائیر پورٹ سے کراچی کے لیے جہاز نکلنے میں تقریباً دو گھنٹے رہتے تھے مجھے فہد اور ذیشان کا انتظار تھا۔ جو بس چند لمحوں میں پہنچنے والے تھے۔ میں گیٹ تک آیا تو مجھے فہد کی کار دکھائی دی اس نے گیٹ پر کار روکی، ذیشان آگے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پچھلی نشست پر بیٹھنے تک ملازم نے بیگ رکھ دیا اور ہم ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

''کاش میں بھی تیرے ساتھ جاتا، لیکن تم نے اتنی راز داری سے یہ ٹور بنایا ہے کہ ہوا نہیں لگنے دی۔'' ذیشان نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب میں تمہیں اس کا جواب کیا دوں میرے چندا۔ تم ہو کہ سر کھائے جا رہے ہو؟'' میں نے چڑتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر اس کی بات کو بڑھاوا دیا گیا تو اس کی تان اس سوال پر آ کر ٹوٹے گی کہ آخر میں تھائی لینڈ کیا کرنے جا رہا ہوں۔

''اچھا چل نہیں کھاتا سر!'' اس نے مسکرائے ہوئے کہا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے شعیب کا فون آیا تھا، پوچھ رہا تھا کہ تم کب بنکاک پہنچ رہے ہو؟ میں نے اسے اندازہ ہی بتایا ہے۔''

''کیا بتا دیا اندازہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ تم رات کسی وقت کراچی سے اُڑو گے۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''وہ ابھی کچھ دیر میں تمہیں فون کرے گا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن میں اسے کراچی جا کر ہی ساری تفصیلات بتاؤں گا، میں آگے پیچھے بھی ہوا تو اسے بتا دینا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ویسے بلال! اتنی راز داری تم برت رہے ہو، لگتا ہے کہ کوئی اونچا کھڑاک ہی ہے۔'' فہد نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''کچھ بھی نہیں ہے یار، اور ہاں میں نے سب کو وہی ملائیشیا ہی بتایا ہے۔ کہیں کوئی پوچھے تو خدا کے لیئے یہی بتانا'' میں نے تسلی کے لیے کہا۔

''میں سمجھ گیا ہوں اور ماما مجھ سے پوچھ چکی ہے۔'' فہد نے بتایا۔

''پھر! کیا کہا ہے تم نے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''وہی جو تم کہہ رہے ہو۔ تم پریشان مت ہونا، میں سنبھال لوں گا۔'' فہد نے حوصلے بھرے لہجے میں کہا۔ پھر ایسی ہی باتوں میں ہم ائیر پورٹ جا پہنچے۔

اس وقت ہم ائیر پورٹ کی عمارت کے اندر پہنچے ہی تھے کہ شعیب کا فون آ گیا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ تمام تر تفصیل میں کراچی ائیر پورٹ پہنچ کر بتاؤں گا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان دونوں سے مل کر اندر چلا گیا۔ تقریباً تین گھنٹے بعد میں کراچی ائیر پورٹ پر تھا۔ وہاں جاتے ہی سب سے پہلے میں نے شعیب کو فون کیا۔ حال احوال کے بعد میں نے کہا۔

''بہت انتظار کروایا ہے میں نے، اس پر میں معذرت چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں بلال بھائی، میں کل سارا دن آپ کے لیے فری ہوں۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

''نہیں میرے بھائی، آپ اپنا کام نہیں چھوڑیں، کیونکہ میں نے بنکاک میں کوئی وقت نہیں گزارنا، وہاں ٹھہرے بغیر میں نے ''پٹایا'' کے لیے روانہ ہو جانا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''مطلب! آپ نے پٹایا جانا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔! اور یہ چند دن میں نے وہیں گزارنے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''اُو۔! اچھا۔۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر پوچھا۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کو یہاں میری مدد چاہیے۔ کیا آپ ابھی بتا دیں گے یا پھر یہیں آ کر؟'' اس نے اپنے طور پر سمجھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ ابھی آپ کو بتا دوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بتائیں۔''

''آپ نے مجھے ایک سیل فون دینا ہے اور ایک لیپ ٹاپ، تا کہ میں اس پر انٹرنیٹ استعمال کر سکوں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''یہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ؟'' اس نے پوچھا

''یہ کہ تھائی لینڈ میرے لیے بالکل اجنبی ملک ہے، اگرچہ تھوڑی بہت شدھ بدھ ہے لیکن کچھ معلومات چاہوں گا، رقم میرے پاس کافی ہے، اس کے لیے علاوہ کریڈٹ کارڈز بھی ہیں۔ ایسی کوئی فکر والی بات نہیں ہے۔ آپ نے ایک کام کرنا ہے کہ میں آپ کو اس ہوٹل کا نام ایس ایم ایس کر دیتا ہوں، وہاں میرے نام سے نہیں، اپنے نام سے بکنگ کروا دیں ہے اور یہ

بنکاک آج ہی کروانی ہے، تفصیل میں آکر بتاؤں گا کہ یہ راز داری کیوں؟''

''اوکے! یہ بھی ہو جائے گا، اور کچھ؟'' اس نے پوچھا۔

''اور کچھ نہیں، یہاں سے تقریباً بارہ بجے کی فلائیٹ ہے، جو میرے خیال میں صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب بنکاک پہنچے گی، تکلیف کی معذرت کہ آپ کو اتنی سویرے اٹھنا پڑے گا۔'' میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ مجھے بار بار شرمندہ مت کریں پلیز! آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے آنے کی مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ ممکن ہے مجھے خوشی سے نیند ہی نہ آئے۔ لیکن آپ یہ زیادتی کریں گے کہ میرے پاس نہیں ٹھہریں گے۔'' اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں ممکن ہے ہم کچھ وقت ساتھ میں گزاریں۔ اس کے لیے فکر مت کرنا۔'' میں نے کہا تو اس نے ایک دم خوش ہوتے ہوئے کہا

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ مزید میرے کرنے والا کوئی کام؟''

''نہیں!'' میں نے کہا اور پھر ساتھ ہی کہہ دیا۔ ''اوکے! پھر صبح ملاقات ہوتی ہے۔''

''اوکے جی، میں انتظار کر رہا ہوں، اس نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے بہت سارا بوجھ اُتر گیا ہے۔ اس لیے میں پوری یکسوئی کے ساتھ بین الاقوامی روانگی والے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا تاکہ کاغذات وغیرہ کی جانچ ہو سکے۔

تقریباً آدھا گھنٹہ دیر سے جہاز نے تھائی لینڈ کی جانب پرواز کی۔ سیٹ بیلٹ کھول لینے کے بعد میں پرسکون ہو گیا۔ اس جہاز میں زیادہ تر چہرے ایشیائی تھے۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹیک لگا لی۔ میرے ساتھ ایک بوڑھا اور نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شاید پاکستانی تھے چونکہ انہوں نے ایک مسکراہٹ بھی میری جانب نہیں اچھالی تھی، اس لیے میں نے بھی کوئی راہ و رسم بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں اپنے خیالات میں کھو جانا چاہتا تھا لیکن فضائی میزبان خواتین نے اپنی جانب متوجہ کیے رکھا۔ ان کی مصروفیات ختم ہوئیں تو سکون ہو گیا۔ تب میں نے سیٹ سے ٹیک لگائی اور سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی جگہ میں ان خیالوں میں کھو گیا، جن کے باعث میں یہ سفر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ان دنوں میں مقابلے کا امتحان دے کر فراغت کے دن گزار رہا تھا۔ فہد اور ذیشان کے ساتھ گھومنے پھرنے یا پھر گپ شپ کے علاوہ یہی ایک کام تھا کہ انٹرویو کی تیاری کے لیے [illegible]خبارات، رسالے اور کتابیں [illegible] کے [illegible]ت کو وسعت دیتا رہوں۔ میرے

زیرِ مطالعہ رہتیں ہی تھیں، اس کے علاوہ نیٹ پر بھی میں خاصا وقت گزارتا تاکہ تازہ ترین معلومات رہیں یا پھر تھوڑی بہت تفریح ہو جائے۔ میں دنیا کے مختلف لوگوں کے ساتھ چیٹ کرنے کی کوشش کرتا، کسی سے لمبی گپ شپ ہو جاتی اور کوئی محض تھوڑی دیر بعد ہی رابطہ ختم کر لیتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ کسی کے ساتھ ایک دو دن بات چلتی یا چند دن پھر وہ بھی اندھیرے کی اس دنیا میں گم ہو جاتا۔ یہ واقعتاً اندھیری دنیا ہی ہے، چیٹ کرنے والوں کو بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری جانب کون ہے، وہ آپ سے ساری باتیں سچ کہتا ہے یا پھر جھوٹ ہی بولتا جاتا ہے۔ آپ اس پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں دے سکتے۔ بہر حال، دو افراد ایسے تھے جن سے میری دوستی خاصی طویل ہو گئی تھی۔

ارون ورما، میرا پہلا نیٹ دوست بھارتی ہندو تھا جو ان دنوں لندن میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مقیم تھا۔ بھارت میں اس کا آبائی شہر امرتسر تھا۔ وہ اپنے خیالات میں انتہا درجے کا تعصب رکھتا تھا۔ میری اس کے ساتھ بہت لمبی بحث چلتی تھی۔ اگرچہ مختلف وقت میں، موضوعات مختلف ہوا کرتے لیکن اس کی ہر بات کی تان اس نکتے پر آکر ٹوٹتی کہ ہندوستان کی تقسیم یہاں کے باشندوں کا بہت بڑا المیہ ہے جبکہ میں اسے نظریہ پاکستان سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتا۔ اگرچہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دلائل سے قائل نہیں ہوئے تھے لیکن اس کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ہندو تعصب، جس کے بارے میں فقط کتابوں یا رسالوں میں پڑھتا تھا، براہِ راست ایک بھارتی سے باتیں کر کے، اس کی ذہنیت کا اندازہ کر چکا تھا۔ دوسرا مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ بھارتی تقسیم ہند اور پاکستان کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں۔ ظاہر ہے اسے دلائل دینے کے لیے مجھے خوب پڑھنا پڑتا تھا، اور میں نے خوب پڑھا۔ ارون ورما کی بہر حال ایک خوبی یہ تھی کہ وہ مذہب پر بات نہیں کرتا تھا، لیکن اپنے تئیں یہی خوبی، اس کی خامی بن جاتی جب وہ ''دھرتی ماتا'' کی بات کرتا، اس کا پسندیدہ ترین موضوع تقسیم ہند کے مابعد اثرات تھا۔ بسا اوقات وہ تضاد بیانی میں آکر اس پر ضد کی حد تک اُڑ جاتا۔ مثلاً وہ جلیانوالہ باغ کے واقعے کو ہندوستانی تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کے لیے سنہرا دور مانتا تھا۔ بہر حال اس سے یہ بحث جاری تھی، اس یقین کے ساتھ کہ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کی بات کبھی نہیں مانیں گے۔ یہاں تک کہ ہم بھی اندھیرے کی اس دنیا میں گم ہو جائیں گے۔

میری دوسری نیٹ دوست ایک تھائی لڑکی ''پی اون'' تھی۔ اگرچہ اس کا نام بہت لمبا چوڑا تھا جو مجھے کبھی یاد نہیں رہا تاہم پی اون اس کا نک نیم تھا۔ میری اور اس کی دوستی کی بنیاد

انگریزی زبان تھی۔ اس کی مادری زبان تھائی تھی لیکن وہ انگریزی زبان میں عبور حاصل کرنا چاہتی تھی، کسی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھ کر باتیں کرے گی تو اس کی زبان بہت بہتر ہو جائے گی۔ ابتداء میں جو اس نے اپنا تعارف کرایا تھا وہ یہی تھا کہ وہ طالبہ ہے، پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہوٹل میں جز وقتی ملازمت کرتی ہے۔ اس کی نسل میں تھوڑا بہت امریکی خون بھی شامل ہے۔ جنگ عظیم دوئم میں ویت نام سے بھاگے ہوئے امریکی زیادہ تر تھائی لینڈ کا ہی رُخ کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک امریکی، تھائی لینڈ میں آیا اور اس نے تھائی لڑکی سے شادی کرلی۔ جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ وہ امریکی سن پچاس کے لگ بھگ بغیر بتائے امریکہ چلا گیا تو اس تھائی لڑکی نے اپنے بیٹے کو پالا، تھائی لڑکے نے پھر وہیں ایک تھائی لڑکی سے شادی کی، جس سے پی اون پیدا ہوئی اس نے بتایا کہ اسے اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ مستقبل کے لیے وہ چاہتی ہے کہ اس کی انگریزی بہت اچھی ہوتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بھات (تھائی کرنسی) کما سکے۔ بہت عرصہ تک میری اس سے انگریزی زبان کے بارے میں بات چلتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنے بارے میں بھی بتایا اور کئ باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ چھٹی والے دن اپنے سارے کام ختم کر کے عبادت کے لیے ''واٹ'' (عبادت گاہ) ضرور جاتی ہے۔ مذہب کے لحاظ سے وہ بُدھ تھی۔ ایک ایسے خاص فرقے سے تعلق رکھتی تھی جو خدا کے وجود سے انکاری تھا۔ عبادت کے نام پر محض مراقبہ کرنا اور بس۔ دھیرے دھیرے اس کی باتوں میں حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی آنے لگا۔ عالم واقعات کے تناظر میں ایسے تبصرے کرتی کہ جس میں اس کی مسلمانوں سے نفرت خاص طور جھلکتی تھی۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اس طرح کیوں کرتی ہے؟ اگرچہ اسے معلوم تھا ک میں مسلمان ہوں، پھر بھی وہ اپنی نفرت کا اظہار بہت واضح انداز میں کر دیتی۔ بعض اوقات مجھ شک ہونے لگتا کہ پی اون کے نام کے پیچھے کوئی ایسا فرد ہے جو باقاعدہ ایک مشن کے طور کام کر رہا ہے۔ جن دنوں پی اون سے میری بات شروع ہوئی تھی، میرے پاس بھی دین اسلا کے بارے میں وہی معلومات تھیں جو عموماً ہم نصابی کتابوں میں پڑھتے چلے آتے ہیں۔ مجھ اعتراف ہے کہ میرے پاس بھرپور معلومات نہیں تھیں کہ میں اسے موثر جواب دے سکتا، م بہر حال کوشش کرتا کہ مطالعہ کے بعد اسے مطمئن کرسکوں لیکن نہ کر سکا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ مذہب پر بات کرنا چھوڑ گئی۔ اس کی باتوں میں امریکی نفرت آ گئی یا پھر اپنی معا جدوجہد۔ میرے دل میں انہی دنوں ایک خواہش پیدا ہوئی، دھیرے دھیرے وہ خواہش ا قدر مضبوط ہوتی چلی گئی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے سا

تھوڑا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے تھائی لینڈ کے شہر پتایا کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ پی اون پتایا ہی میں رہتی تھی اور اس شہر ہی کے ایک ہوٹل میں جز وقتی ملازمت کر رہی تھی۔ میرے پاس اس کے بارے میں یہی معلومات تھیں۔ میں نے اپنی تصویریں اسے بھجوائی تھیں اور اس کی تصویریں بھی میرے پاس تھیں۔ خاص طور پر وہ تصویر جو وہ واٹ کے باہر کھڑی تھی اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ مجھے اس کے ساتھ ہونے والی ایک ایک بحث کا حوالہ یاد آتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ ایک جھپکی آئی تھی، لیکن ایسا نہیں تھا، میری آنکھ اس آواز پر کھل گئی، جس میں بنکاک پہنچ جانے کی نوید سنائی جا رہی تھی۔ ایک دم سے میرے بدن میں سنسناہٹ شروع ہوگئی، اجنبی دیس میں ایک اجنبی لڑکی کی تلاش کے لیے یہاں تک پہنچا تھا۔ بظاہر ایک احمقانہ فیصلہ تھا لیکن میں بہرحال پراُمید تھا کہ میں جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں، وہ بہرحال ضرور پورا ہوگا۔

وہ اوائل نومبر کے دن تھے۔ جب میں تھائی لینڈ کے شہر بنکاک کی فضاؤں میں تھا۔ جہاز اترنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے اپنی گھڑی تھائی وقت کے مطابق دو گھنٹے آگے کرلی۔ میں نے کھڑکی سے ''سوورنا بھاؤمائی'' ائیر پورٹ کا نظارہ کرنا چاہا جہاں تیز روشنیوں میں مجھے ایسی عمارت نظر آئی جس میں آدھے آدھے گنبد تھے۔ شاید ابھی سورج نہیں نکلا تھا اس لیے مجھے یہی لگا جیسے ابھی وہاں رات ہی ہے۔ جہاز اترنے اور ائیر پورٹ کے مراحل طے کرنے کے بعد بس کے ذریعے میں اس جگہ آ گیا جہاں مجھ شعیب مل سکتا تھا۔ اس وقت سورج نکل آیا تھا اور چہار سو روشنی پھیل چکی تھی۔ موسم میں قدرے خنکی تھی مگر ویسی نہیں جیسے میں کراچی میں یا پھر لاہور میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے شعیب کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ بہت پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کا چہرہ میرے لیے دھندلا سا تھا لیکن ذیشان نے جو تصویر میرے سیل فون میں بھیجی تھی، میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کی تازہ تصویر تھی۔ ایسی ہی ایک تصویر اس نے میری بھی شعیب کو بھیج دی ہوئی تھی۔ میں بیگ زمین پر رکھے اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے پتایا جانے والی ایک بس کھڑی تھی۔ گہرے پیلے رنگ کی لگژری بس پر بڑے بڑے حروف میں پتایا لکھا ہوا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے چند منٹ ہوئے تھے کہ میرے قریب آ کر شعیب نے زور سے السلام علیکم کہا اور پھر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ حال احوال کے بعد بولا۔

''آئیے بھائی جان! چلیں۔''

''وہ سامنے پتایا جانے والی بس کھڑی ہے۔'' میں نے اس گہرے پیلے رنگ کی

لگژری بس کی جانب اشارہ کیا۔

''آپ آج ہی پتایا پہنچیں گے۔اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ میں جب کہہ رہا ہوں آئیں تو بس پھر آئیں۔'' اس نے میرا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل پڑا۔وہ میرا میزبان تھا۔ابھی میں نے اس کے ساتھ بہت ساری باتیں بھی کرنا تھیں۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد ہم پارکنگ میں آ گئے۔اس نے ایک قیمتی گاڑی کا دروازہ کھولا پچھلی سیٹ پر بیگ رکھا اور مجھے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس وقت تک خاموش رہا، جب تک وہ بڑی سڑک پر نہیں آ گیا۔

''اور سنائیں بھائی جان، کیسے ہیں آپ؟''اس نے خالص لاہوری انداز میں پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سناؤ'' میں نے بھی رسمی سے انداز میں کہا۔

''او مجھے چھوڑیں جی، سنائیں لاہور کیسا ہے؟، یقین کریں، مجھے لاہور بہت یاد آتا ہے، یہ بنکاک ٹھیک ہے، یہاں بہت بزنس ہے۔ جدید شہر بن گیا ہوا ہے، لیکن یقین جانیں بھائی جان جو مزہ وہاں کی صبح اور شام میں ہے، کہیں نہیں ملتی، یہاں رہ کر تو یوں لگتا ہے جیسے ویرانے میں جی رہے ہیں۔''اس نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

''فطری سی بات ہے شعیب، اپنا وطن بہت یاد آتا ہے۔اس کا احساس فقط وہی کر سکتا ہے جو دیارِ غیر میں رہتا ہے،اسے احساس نہیں ہو سکتا جو باہر نہ رہا ہو۔''میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کا چہرہ یوں تھا جیسے اس کی نگاہیں بنکاک کی سڑک پر ہوں لیکن اس کا ذہن لاہور کی گلیوں میں گھوم رہا ہو۔ وہ کتنی دیر تک خاموش رہا پھر چونکتے ہوئے بولا۔

''او! میں بھی کیا سوچنے لگا۔'' یہ کہہ کر اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔''بلال بھائی! آپ کا لیپ ٹاپ، پچھلی سیٹ پر پڑا ہے اور یہ فون۔''اس نے جیب سے ہاتھ ڈال کر ایک قیمتی سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ پھر آن کر کے مجھے تھما دیا۔''یہ میرا ہی کنکشن ہے۔ آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔''

''میں نے اسے فقط نیٹ کے لیے اور آپ سے رابطہ کے لیے ہی استعمال کرنا ہے۔''میں نے اسے بتایا۔

''اچھا تو وہ آپ معلومات کیا چاہ رہے تھے؟''اس نے پوچھا

''یہی کہ یہاں کے لوگوں کا رویہ کیسا ہے؟ میں کس طرح ان سے بات چیت کر سکوں گا؟ یا پھر۔۔۔''میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات اُچکتے ہوئے کہا۔

''آپ بہترین انگریزی جانتے ہیں، بولتے ہیں، تو یہاں آپ کو نہیں، انہیں مسئلہ

ہوگا۔ زیادہ تر لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ بات چیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آپ نے جس ہوٹل میں کمرہ بک کرنے کو کہا ہے، وہ تو بہت مہنگا ہے۔ یہاں بہت سارے سستے گیسٹ ہاؤس ہیں اور بہت ساری رہائش گاہیں ہیں جو انہی کے طرح سہولیا۔۔۔''

''نہیں میرے ویر، میں نے اسی ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔ مجھے سستے یا مہنگے سے کوئی غرض نہیں ہے۔''میں نے اس کی اُلجھن دور کی۔

''وہ تو میں نے ریزرویشن کروا دی ہے اور پانچ دن کی ادائیگی بھی کر دی ہے۔'' شعیب نے مجھے بتایا۔

''کیا ہیں اس کی تفصیلات۔۔۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا تو اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''فی الحال آپ ادھر رہیں جب جانا ہو تو یہ سب ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے کہا۔''اور ہاں، آپ کو یہاں کی کرنسی چاہیے ہوگی وہ بھی میں آپ کو دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل موڑ لیا اور پھر ایک چھوٹے سے ریستوران کے آگے گاڑی روک دی۔

''بلال بھائی! یہ ہے بنکاک میں حلال کھانوں کا مرکز، یہاں آپ کو ہندوستانی طرز کا بہترین ناشتہ ملے گا۔''اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے یار، ویسے پتایا میں کوئی ایسا مرکز ہے، مطلب کوئی ریستوران وغیرہ۔''

''میرے علم میں نہیں ہے، خیر آئیں، میں نے یہ مسئلہ بھی کسی حد تک حل کیا ہوا ہے، آئیں میں آپ کو اطمینان سے بیٹھ کر بتاتا ہوں۔'' شعیب نے گاڑی میں سے نکلتے ہوئے کہا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے نکلتے ہوئے ریستوران میں چلے گئے، جہاں اندر سناٹا تھا۔

''شعیب یہاں تو لگتا ہے کوئی بھی نہیں ہے۔''میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم جلدی آ گئے ہیں نا، ویسے ان کا زیادہ رش کا وقت دوپہر اور شام کو ہوتا ہے۔'' اس نے ایک ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا تو میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ایک تھائی لڑکا نمودار ہوا۔ وہ بالکل تروتازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی شعیب کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے سلام لیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ میرا تعارف کرانے پر وہ اور زیادہ گرم جوشی سے ملا، پھر جلدی ناشتہ بھجوانے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

''یہی اس ریستوران کا مالک ہے، اس کے ساتھ اس کی بیوی ہوتی ہے۔''اس نے معلومات دیں اور پھر پرس نکال کر بولا،''بلال بھائی! یہ تھوڑے سے بھات ہیں، اسے رکھیں۔''

"یار میرے پاس ٹریول چیک ہیں، ڈالر ہیں، کوئی بات نہیں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ رکھیں، وہ جاتے ہوئے میں لے لوں گا۔" اس نے واضح کرتے ہوئے کہا تو میں نے وہ بھات لے لیے۔ تب اس نے کہا۔

"بلال بھائی! جب آپ پتایا پہنچیں گے، تب وہاں آپ کو ہمت سنگھ ملے گا۔ میرا مطلب ہے پتایا بس ٹرمینل پر وہ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"یہ ہمت سنگھ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کچھ عرصہ قبل ہمارے پاس ادھر بنکاک میں کاریگر کے طور پر کام کرتا تھا، ہندوستانی ہے اور بہت اچھا درزی ہے۔ اباجی نے اسی پتایا میں دوکان بنادی ہے۔ اب یہ وہیں کام کرتا ہے۔ کچھ مال ہم سے بھی لیتا ہے۔ اس کے ہونے سے آپ کو ذرا سی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔ آپ اس سے ملیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ بہت مخلص آدمی ہے۔ اس کا نمبر سیل فون میں ہے۔ اگر آگے پیچھے ہو جائے تو فون کر لیجیے گا۔" شعیب نے تفصیل سے بتایا تو میں خوش ہو گیا۔

"یار! یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔"

"باقی اگر آپ مجھے بلائیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ان دنوں بہت مصروفیت ہے۔ آپ چند دن پہلے بتاتے تو میں آپ کے ساتھ ضرور جاتا، ویسے ہمارا رابطہ تو رہے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اختصار سے کہا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا اور ویسے بھی شعیب مجھے سمجھدار لگا تھا کہ میرے رویے سے اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ اس وقت یہ ساری آسانیاں مجھے عطیہ خداوندی معلوم ہو رہی تھیں اور میں جانتا تھا کہ یہ سب میری حوصلہ افزائی ہی کے لیے ہے ورنہ چند دن پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی آسانیاں میسر آ جائیں گی۔ میں یہ خیال کر ہی رہا تھا کہ ایک دھان پان سی لڑکی ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی، اس کے پیچھے وہی تھائی لڑکا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا اور پھر میز پر ناشتہ لگانے لگی، لڑکے نے بھی اپنا ٹرے میز پر خالی کر دیا۔

"یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔" شعیب نے ان سے تعارف کرایا۔ تو وہ دونوں مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ ناشتہ کانٹی نینٹل قسم کا تھا۔ جو ہم دونوں نے ڈٹ کر کھایا۔ اس دوران شعیب مجھے اپنے طور پر بہت ساری باتیں بتاتا رہا۔ میں سنتا رہا اور جہاں ضرورت پڑتی

وہاں اس سے سوال کر لیتا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ناشتے سے فراغت کے بعد ریستوران سے باہر تھے۔

❁......❁......❁

لاہور پر سورج اپنی سنہری کرنیں نچھاور کرنے کے لیے رات کے بطن سے نکل آیا تھا۔ اس پوش علاقے میں زندگی کی ہلچلا بھی اتنی نہیں ہوئی تھی، وہاں دن کا آغاز اس وقت ہوتا تھا جب سورج آسمان کے ایک تہائی حصے کا سفر طے کر جاتا۔ وہ سرکاری آفیسران کے لیے مخصوص علاقہ تھا۔ جہاں سارے گھر حکومت کی طرف سے مہیا کیے گئے تھے۔ ایک ہی جیسے گھروں میں مختلف مزاج، گریڈ اور رویہ رکھنے والے لوگ بستے تھے۔ کون کس قدر دولت جمع کر چکا ہے اور کس کی رسائیاں کہاں تک ہیں، یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ ایسے ہی بڑے سے گھر میں الطاف انور اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے اپنے گھر کے فرد اتنے نہیں تھے، جتنے اس کے ملازمین تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھ جانے کا عادی تھا اور جوگنگ کے لیے نزدیکی پارک جانا اس کی عادت تھی۔ اس کے ساتھ نجمہ بھی اٹھ جاتی، وہ اپنے ہاتھوں سے شوہر کے لیے ناشتہ بناتی۔ اسے تیار کرتی، جب تک وہ دفتر نہیں چلا جاتا، وہ اس کے سارے کاموں کا دھیان خود رکھتی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد وہ سو جاتی، ان کے بچوں کے لیے ملازمین ناشتہ بناتے تھے۔ بہت عرصے سے یہی معمول تھا۔ اس دن نجمہ الطاف جب ناشتہ بنا کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی وہاں فہد بھی آ گیا۔ نجمہ الطاف نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فہد! بیٹے خیریت تو ہے، تم اتنی صبح صبح جاگ گئے ہو؟"

"بس امی، آپ سے میں ایک بات شیئر کرنا چاہتا تھا۔" اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو بیٹا یہ کون سا وقت ہے، ہم سکون سے دوپہر کے وقت بات کر لیں گے۔" نجمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

"دوپہر۔! اسے چھوڑیں، میں رات بھر اس بات پر سوچتا رہا ہوں۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ہائیں! ایسی کون سی بات ہے، بولو۔" نجمہ کی حیرت زدہ آواز میں تجسس کا بھی عنصر تھا۔ اس پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بڑے عجیب سے لہجے میں بولا۔

"امی! کیا اب بھی آپ کے دل میں یہ خواہش موجود ہے کہ میری شادی ماہا سے

ہوجائے؟"

نجمہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے، حیرت زدہ انداز میں فہد کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی انہونی بات کر رہا ہو اور اس بات نے جیسے اس پر سحر طاری کر دیا ہو۔ اس لیے انتہائی حیرت سے بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو فہد! تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"امی! مجھے پتہ ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، میں نے جو پوچھا ہے، آپ اس کا جواب دیں۔" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ تب نجمہ نے گہری سانس لی اور بے جان سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

"خواہش کا پوچھتے ہو، اب تو یہ خواہش حسرت میں بدل گئی ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ ماہا میری بہو بن جائے۔ اتنی پیاری ہے وہ، میرے بھائی کی بیٹی، پھر اس کے ساتھ آنے والی اتنی بڑی جائیداد کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔ گلاب نگر کی وہ زمین جس پر بلال قابض ہو جانے والا ہے، وہ تمہاری ہوتیں، میرا حصہ ملانے کے بعد تم اس سے کہیں زیادہ بڑے زمیندار کہلاتے۔ نور پور میں بنائی ہوئی بھائی کی جائیداد، وہ خوبصورت بنگلہ تمہارا ہوتا، لیکن کیا کروں، میں کچھ بھی نہ کر سکی، یہ بلال اور ماہا کا جو عشق چل رہا ہے نا، اس نے میری ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔" نجمہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو فہد نے حد درجہ جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"امی! میں بھی جانتا ہوں کہ وہ دونوں عشق کی حد تک ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں میں یہ عشق ہی نہ رہے تو پھر۔۔۔؟"

"یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم؟" نجمہ نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں بہکی باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھے عقل ہی اب آئی ہے۔ اس وقت تو میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکا کہ دولت جائیداد کی کشش سے ہٹ کر بھی ماہا مجھے اچھی لگتی ہے، اور۔۔۔"

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے پاگل کرنا چاہتے ہو۔" نجمہ نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں کہا جس میں غصہ بھی جھلک رہا تھا۔

"نہیں امی، میں آپ کو پاگل نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں اگر نفرت، بداعتمادی اور شک آ جائے تو پھر آپ کیا کریں گی؟" فہد یہ کہتے ہوئے

بالکل نارمل ہو چکا تھا، وہ جو کچھ دیر پہلے اس پر جذباتیت چھا گئی تھی، اب اس کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔

"اگر ایسا ہو جائے نا فہد تو میں اپنا وہ خواب جواب ایک حسرت بن کر مجھے اکثر دُکھ دیتا رہتا ہے، میں اس خواب کو پورا کرنے کے لیے پوری کوشش ہی نہیں، اسے چھین لوں گی۔"

نجمہ نے اپنے ہی اندر کسی احساس کے تحت عجیب سے لہجے میں کہا تو فہد چونک گیا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، تب وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"تو امی! وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے اور آپ یہ سوچ لیں کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔"

"ایسا ہونا ممکن نہیں ہے میرے بچے، ان دونوں کی شادی میں فقط ایک ماہ رہ گیا ہے۔ تقریباً ساری تیاریاں ہو چکی ہیں جس دھوم دھام سے وہ شادی کرنا چاہتے ہیں میرا نہیں خیال کہ وہ کسی بھی وجہ سے اس شادی کو مزید چند دنوں کے لیے التواء میں ڈالیں گے اور تم ان کے درمیان جدائی کی بات کر رہے ہو؟"

"امی! اگر بندے کے پاس دماغ ہو اور وہ اسے استعمال کرنا بھی جانتا ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ کامیاب بندہ وہی ہوتا ہے جو دوسروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے فائدہ اٹھائے، بلال ایک بہت بڑی غلطی کر چکا ہے۔ اس کی اسی غلطی کو میں اپنے حق میں کر لینا چاہتا ہوں۔" فہد نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر کیسے؟ کیا غلطی کی ہے اس نے؟" نجمہ نے حیرت سے پوچھا، اس کی یہ حیرت ختم ہونے ہی کو نہیں آ رہی تھی۔

"یہ میں آپ کو چند دن بعد بتاؤں گا، بلکہ آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا، اگر میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر ماہا کو اس گھر کی بہو بنانے کے لیے آپ ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔" فہد نے اپنی ماں کو بھرپور حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہو جاتا ہے نا فہد، تو سمجھو، ماہا اس گھر کی بہو بنے گی، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے، مجھے آپ سے یہی سننا تھا۔" اس نے ہونٹوں میں مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"لیکن۔۔۔ لیکن تم یہ سب کیسے کرو گے، کہیں کوئی ایسی غلطی نہ کر جانا کہ میرے میکے والے ہی مجھ سے چھوٹ جائیں اور ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔" وہ ایک انجانے خوف سے

کانپ گئی۔

”نہیں، ایسا نہیں ہوگا، میں سب سنبھال لوں گا، آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ اس نے خود اعتمادی سے کہا۔ پھر چند لمحے اپنے ہی خیالوں میں کھوئے رہنے کے بعد بولا۔ ”امی! زمین، جائیداد اور دولت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن آپ کو اس بات کا خیال رہے کہ ماہا میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں، اسے دل سے چاہتا ہوں۔ میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ ماہا میری بن جائے۔ لیکن دو دن پہلے تک ایسا نہیں ہو سکا تھا، شاید قدرت میری جانب دیکھ کر مجھ پر مہربان ہوگئی ہے۔ اس نے مجھے ایک موقع دے دیا ہے اور میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔“ فہد پھر سے جذباتی ہوگیا اور اپنی رُو میں کہتا چلا گیا۔ نجمہ اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ وہ اس وقت چونکی جب باہر اس کے شوہر کے بولنے کی آواز آئی، وہ کسی ملازم سے بات کر رہا تھا۔ تب وہ جلدی جلدی پلیٹیں سیدھی کرنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد الطاف انور اندر آ گیا، وہ سیدھا ڈائننگ ٹیبل کی طرف آیا۔ اس نے فہد کی طرف دیکھا اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ارے واہ برخوردار! آج تم اتنی جلدی جاگ گئے ہو؟، خیریت تو ہے نا؟“

”ابو جی! میں سویا ہی کب تھا جو اتنی جلدی جاگتا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کوئی مسئلہ ہے!“ الطاف نے سنجیدگی سے پوچھتے ہوئے کہا اور پھر جواب کے انتظار میں اس کی جانب دیکھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”نہیں! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس وہ رات دیر تک بلال کے ساتھ رہا تھا، وہ چند دنوں کے لیے ملائیشیا گیا ہے اور مجھے کہہ گیا ہے کہ میں ایک آدھ چکر گلاب نگر کا لگا لوں۔ اگر انہیں کوئی کسی قسم کی مدد چاہیے ہوگی۔۔۔“ اس نے کہا تو الطاف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ ایویں ہی تمہارا دل رکھنے کو کہہ گیا ہوگا، ورنہ شادی کی تیاریوں کے لیے حویلی میں تھوڑے لوگ ہیں اور تم ہو کہ اس کی دوستی میں اب گلاب نگر جانا چاہتے ہو۔“

”جی ابو! اور اس میں حرج بھی کیا ہے۔“ فہد نے دبے دبے لفظوں میں کہا نجمہ نے مزید گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے اپنے شوہر سے پوچھا۔

”مجھے یہ سمجھ آج تک نہیں آئی کہ اتنے بڑے عہدے کے لیے آپ نے بلال کی اتنی مدد کیوں کی؟، حالانکہ اتنا کچھ آپ نے فہد کے لیے نہیں کیا۔“

”اچھا ہوا بیگم تم نے یہ بات پوچھ ہی لی اور یہ فہد بھی سامنے ہے۔ پہلی بات ہے بلال کی مدد کیوں کی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے پلیٹ سیدھی کی تو نجمہ ناشتہ رکھنے لگی، تب

وہ بولا۔ ”میں اگر اس کی مدد نہ کرتا، تب بھی وہ ایسے ہی کسی عہدے تک لازماً پہنچ جاتا۔ وہ باصلاحیت ہے، اس حقیقت کو مانتے ہوئے میں نے اس پر احسان کیا۔ اب ساری زندگی وہ کم از کم میرے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میری ملازمت دو چار سال مزید ہوگی، پھر بعد میں اپنے کام میں نے اسی سے لینے ہیں۔ دوسرے کسی اور کو میں اتنا استعمال نہیں کر سکوں گا، جتنا اس بلال کو میں نے استعمال کرنا ہے۔“ الطاف اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا تو نجمہ جھٹ سے بولی۔

”اور دوسری بات!“ اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز تھا۔

”ہاں! دوسری بات یہ ہے کہ فہد کی طبیعت ایسے کسی عہدے یا سرکاری ملازمت کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس ملک پر بیوروکریسی حکمران ہے اور یہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس بہت اختیارات ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے اختیارات کو استعمال کرنا کوئی کوئی جانتا ہے۔ میں فہد کو ایک سیاستدان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے موزوں ترین حلقہ گلاب نگر ہے۔ جہاں افضال نے اپنی بنیاد بنالی ہوئی ہے۔“

اس طرح تو آپ ان کے مقابلے۔۔۔“ نجمہ نے جلدی سے کہنا چاہا۔

”نہیں، ان کے مقابلے میں نہیں، بلکہ وہی اسے رکن اسمبلی منتخب کروائیں گے، میں اسے بتاؤں گا کہ اختیارات کیسے استعمال کرتے ہیں۔ سرکاری ملازم الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ اس لیے میں نے بلال کا بندوبست پہلے ہی کر دیا ہے۔“ اس نے کہا تو نجمہ چونک گئی، اس کا شوہر کس حد تک سوچ چکا تھا۔

”تو اس لیے آپ نے۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی، فہد بڑے غور سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جو اس کے مستقبل کے بارے میں وہ کچھ بتا رہا تھا جس کی منصوبہ بندی اس نے پتہ نہیں کب سے کرنا شروع کر دی تھی۔

”ہاں! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ سب کیا ہے۔ ہم نے آج تک سیکھا ہی یہی ہے۔ سنو سب کی، کرو اپنی، سو بیگم صاحبہ میں نے یہ بات اب ہی تم لوگوں کو کیوں بتائی ہے، اس کی بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ میرے اس منصوبے کے آغاز کا وقت بہت قریب آ گیا ہے۔ جیسے ہی بلال کی شادی ہو جاتی ہے۔ ان دنوں میں فہد کا ہاتھ بڑے چوہدری صاحب کے ہاتھ میں تم دو گی تا کہ وہ اپنی بیٹی کی لاج رکھتے ہوئے خود فہد کا ہاتھ افضال کے ہاتھ میں دے دے۔ بلال تو یہاں لاہور میں رہے گا اور یہاں پر اسے انتہائی مصروف رکھنا میری ذمے داری ہے۔ باقی تم دونوں سمجھدار ہو۔“ الطاف انور نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اب ان دونوں کے

پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ گہری سوچ میں ڈوب چکے تھے۔ فہد کے سامنے ایک نیا وژن آ چکا تھا، جسے سوچتے ہوئے اس کے اندر ہلچل آ چکی تھی۔ وہ یہی خیال کر رہا تھا کہ قدرت اس پر مہربان ہو چکی ہے۔ کہاں وہ ماما سمیت اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور کہاں زندگی اس کے دامن میں ساری خوشیاں ڈال دینے پر آمادہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ زیرِ لب مسکرانے لگا، وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا، اس نے کہا۔

''ابو جی! میں تیار ہوں۔''

''شاباش بیٹے! مجھے معلوم تھا کہ بس تمہیں بتانے کی دیر ہے، باقی تم خود ساری بات سمجھ جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بیگم کی جانب دیکھا جو سوچوں میں گم تھی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا، اپنی ماں کو سمجھاؤ، اتنا مت سوچے کہ تمہیں ناشتہ دینا ہی بھول جائے۔ ابھی تو بہت سارے مرحلے طے کرنا ہیں۔''

اس کے یوں کہنے پر نجمہ چونک گئی۔ پھر کچھ کہے بغیر اس نے پلیٹ فہد کے سامنے رکھ دی۔

''میں آج ہی گلاب نگر جاؤں گا۔'' فہد نے کہا تو الطاف نے عام سے لہجے میں کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی، تم جو چاہو سو کرو۔''

اس پر ان تینوں میں خاموشی چھا گئی۔ جیسے طوفان سے پہلے کی خاموشی ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

شعیب بڑے سکون سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ تھائی لوگوں اور ان کے رویے کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا تھا۔ میں نے رات بھر میں اک ذرا سی جھپکی لی تھی اور ناشتے کے بعد طبیعت خاصی بوجھل ہو رہی تھی۔ اس لیے مجھے اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آئیں اور کچھ نہ آئیں۔ انہی باتوں کے دوران وہ سڑک پر موڑ مڑا اور بولا۔

''لیں جی! ہم اب جس روڈ پر آ گئے ہیں اسے ''سوکھوم ویٹ روڈ'' کہتے ہیں۔ یہی سڑک آپ کو پتایا لے جائے گی۔ یہاں تھوڑے سے فاصلے پر پتایا جانے والی بسیں آپ کو مل جائیں گی۔ میرے خیال میں آپ کو بس کے ذریعے ہی جانا چاہیے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یوں تو ہر طرح کی ٹیکسی مل جاتی ہے۔ وہ ہزاروں میں بھاٹ مانگیں گے، ٹرین بھی جاتی ہے لیکن وہ اس طرح کی نہیں ہے کہ آپ کو اتنے وقت میں پہنچا سکے، تقریباً ڈھائی گھنٹے میں یہ آپ کو پتایا پہنچا دے گی۔ میرا مطلب ہے لگژری بس جو یہاں سے جاتی ہے۔ یہ باتیں

اپنی جگہ مگر میں جو آپ کو بس کے ذریعے بھجوا رہا ہوں، ہمت سنگھ وہیں آپ کو ملے گا۔ دوسرا بس سے سفر محفوظ ہے۔'' اس نے مجھے تفصیل سے بتایا اور میں قائل ہو گیا۔

''ظاہر ہے ٹیکسی اور بس کے کرائے میں بہت فرق بھی تو ہو گا نا۔'' میں نے کہا۔

''وہی کہہ رہا ہوں نا، یہ مختلف ہوٹلوں سے جانے والی کوچز اور ٹیکسی بہت مہنگی ہے۔ وقت بھی تقریباً اتنا ہی لگتا ہے، وہ کون سا اُڑ کر جاتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو، اس لیے بولا ''جس ہوٹل میں آپ جانا چاہتے ہیں، وہ بس ٹرمینل سے تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر ساحل کی جانب ہے اور اس جانب ہی ہمت سنگھ کا گھر ہے۔ ممکن ہے ہوٹل جانے سے پہلے وہ آپ کو اپنے گھر لے جائے۔ اس لیے پریشان نہیں ہونا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کر گاڑی سے یوٹرن لیا اور پھر پارکنگ میں روکتا ہوا بولا

''لیں جی، یہاں سے آپ پتایا جائیں گے، یہ ایکامائی بس ٹرمینل ہے۔ آیئے!'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے باہر نکلا، پھر میرا بیگ اور لیپ ٹاپ اٹھایا۔ میں نے اس سے پکڑنا چاہا لیکن اس نے مجھے نہیں دیا۔ وہ بس ٹرمینل کے طویل برآمدے میں آ گیا جہاں ایک جانب باہر کی طرف بسیں کھڑی تھیں۔ اس نے مجھے ایک بینچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ سامنے بورڈ دیکھیں، جس پر ایک نمبر لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔''

میں نے اس جانب دیکھا، وہاں بڑے سارے ہندسے کے ساتھ پتایا لکھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد چند مسافر کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ سفید اور ہلکے نیلے رنگ کی بس جائے گی۔ اس نے سامان میرے قریب رکھا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ بلاشبہ وہ اندر سے ٹکٹ لینے گیا تھا، میں نے بھی اپنا بیگ اٹھایا، اسے کاندھے پر لٹکا کر لیپ ٹاپ کو ہاتھوں میں لیا اور اس کے پیچھے لپکا۔ وہ چند مسافروں کے پیچھے کھڑا تھا۔ کھڑکی کے پار ایک تھائی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو بھات پکڑ کر ٹکٹ دیتی چلی جا رہی تھی۔ شعیب کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ ذرا سی حیرت کے ساتھ بولا۔

''بلال بھائی، آپ وہاں بیٹھیں، میں ٹکٹ لے آتا ہوں۔''

اس پر میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ جیب سے بھات نکال کر اس کی جانب بڑھا دیئے۔ سامنے شیشے پر کرایہ لکھا ہوا تھا۔

''یہ لو'' میں نے کہا۔

''بلال بھائی، کوئی بات نہیں میں۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوک دیا۔

''یہ جو آپ نے مجھے بھات دیئے ہیں، میں ان کا کیا کروں، پلیز!'' یہ کہہ کر میں نے

اس کی طرف دیکھا تو اس نے چپ چاپ پکڑ لیے میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور باہر آ گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد بس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرا بیگ ایک جانب رکھوا دیا گیا اور میں لیپ ٹاپ کے ساتھ بس کے اندر چلا گیا۔ شعیب میرے پیچھے ہی آ گیا، ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے براؤن رنگ کا ٹکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے سیٹ کی طرف رہنمائی کی۔ میں نے بیٹھتے ہی کہا۔

”شعیب، تمہارا بہت شکریہ۔“

”بلال بھائی! کیسی بات کر رہے ہیں آپ، شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔“ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”یقیناً!“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اختصار سے کہا تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

جلد ہی میرے ساتھ ایک تھائی نوجوان آ کر بیٹھ گیا۔ پھر بس چل پڑی۔ نیلی سیٹوں اور سفید پردوں کے ساتھ ماحول خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ اے سی کے باعث ہلکی سی خنکی تھی۔ بس میں تھائی اور غیر ملکی کئی لوگ سوار تھے۔ میں نے نہیں جانا کہ اس وقت کس کے کیا جذبات ہوں گے یا پھر کوئی کسی کی جانب متوجہ بھی تھا یا نہیں، لیکن جونہی بس سوکھوم ویٹ روڈ پر چڑھنے کے بعد تیز ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کر کے کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ تب میری نگاہوں میں پی اون کی وہی تصویر گھوم گئی جو اس نے مجھے چند ماہ پہلے ای میل کی تھی۔ وہ ایک واٹ کے باہر بنچ پر بہت سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ سفید قمیص کے ساتھ منی سکرٹ گرے رنگ کی تھی، جس میں اس کی گلابی پنڈلیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ سفید رنگ کی ہلکی سی چپل، ہلکا سا میک اپ اور شانوں تک تراشے ہوئے گہرے براؤن بال پہلی نگاہ میں یہی کچھ دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ تھائی لڑکیاں سبھی ایک جیسی ہی دکھائی دیتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چپکا ہوا ناک، قدرے موٹے ہونٹ اور سفید رنگ جس میں چینیوں کی مانند پیلاہٹ سی ہوتی ہے لیکن پی اون کے نین نقش خالص تھائی لڑکیوں جیسے نہیں تھے۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد اس کے نین نقش کو یوں سمجھا تھا کہ جیسے اس کی بنیادی خدو خال تو تھائی لڑکیوں جیسے ہی تھے مگر ان کی بناوٹ میں مغربی نقوش کی ہلکی سی جھلک تھی جیسے ناک تیکھا ہونے کا احساس، کھلی سی بادامی صورت آنکھیں جن پر بھنویں فطری تھیں اور پتلے سے لبوں کے ساتھ گالوں کا اُبھار، گوری رنگت میں گلابی پن تھا۔ اس نے اور بھی تصویریں مجھے ای میل کی تھیں۔ ان سب کے مجموعے میں وہ مجھے ایک لاابالی لڑکی لگی تھی اور پھر اس کے سوال اکثر اوقات ان موضوعات کے گرد ہی

گھوما کرتے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے لیے نفرت زیادہ ہوتی تھی۔

پی اون سے دوستی اور گفتگو کے بعد مجھے تھائی لینڈ کے ساتھ اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ وہی تاثر جڑا ہوا تھا جس کا اظہار، میرے ذکر کرنے پر فہد اور ذیشان نے کیا تھا۔ جہاں سستی عیاشی کے لیے لوگ جمع ہوتے ہوں، وہاں کی اخلاقی قدروں کا حال کیا ہو گا۔ میں قطعاً یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جس طرح پی اون نے میرے سامنے اپنا تاثر بنایا تھا وہ ویسی ہی ہو گی۔ ممکن ہے وہ ویسی ہی ہو یا پھر تیسرے درجے کی طوائف۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سرے سے لڑکی ہی نہ نکلے، کوئی مرد ہو یا پھر ہیجڑا۔ جیسے وہاں کی زبان میں ”لیڈی بوائے“ کہتے تھے۔ میری ذہنی رو پھر سے اس جانب بہک گئی تھی۔ میں جس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس خیال کو جھٹک کر ذہن سے نکال دیا اور اس کی جگہ اپنی ماہا کو سوچنے لگا۔

آخری بار جب میں نے اس سے بات کی تھی۔ وہ حویلی کے اس حصے کو سجانے کا فیصلہ کر چکی تھی جو ہمارے لیے مخصوص ہو جانے والا تھا۔ انٹیریئر ڈیکوریٹر سے اس کی بات ہو گئی تھی اور اس نے مجھ سے بنیادی رنگ کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اسے ہلکا کاسنی رنگ بتایا تھا جو اسے بھی بہت پسند تھا۔

ماہا! میری بچپن کی دوست ہی نہیں، میرا عشق تھی۔ میں نے کبھی اسے خود سے الگ نہیں سمجھا تھا ہمیشہ اس کی سوچ اور مزاج کے مطابق ہی میرا رویہ ہوتا۔ وہ رُو دیتی تو میں اسے بہلاتا، وہ خوش ہوتی تو میں بھی خوش ہو جاتا، اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کے ناز ہی بہت اٹھائے گئے تھے۔ میں جو خود ناز و نعم میں پلا تھا، ماہا کے ناز اٹھاتا۔ جی میں آتا تو لمحے بھر میں پوری کلاس کو ٹریٹ دینے کا فیصلہ کر لیتی اور مجھے حکم دیتی کہ اس کا بندوبست کروں اور کبھی روٹھ جاتی تو کسی سے بات تک نہ کرتی۔ چھٹیاں ہوتے ہی وہ حویلی چلی آتی، نور پور میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ ہم جی بھر کے کھیلتے۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی اس کی ضد رَدّ کی ہو، ہمیشہ اس نے جو چاہا وہی کیا۔ پھر گزرتے دنوں کے ساتھ اسے شعور آتا گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کی ضدیں ختم ہوتی چلی گئیں۔ بے تکلفی میں احترام اُتر آیا تھا۔ اگرچہ وہ مجھے اب بھی ”تم“ ہی کہتی تھی لیکن اس قدر اپنائیت کے ساتھ کہ اس پر ہزار ”آپ“ قربان کر دیئے جائیں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی اپنی پسند سے کوئی لباس بنایا ہو۔ ہمیشہ ماہا ہی میرے لیے لباس کا انتخاب کرتی، وہی خریدتی یا پھر بنواتی، فقط ایک بار دیکھتی اور اس لباس کی اہمیت ختم ہو جاتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ مجھ سے مشورہ کرتی۔ اصل میں اس

کی دنیا بہت محدود تھی۔ نور پور اور حویلی یا پھر سکول، اس کے بعد جب وہ کالج میں آئی تو میرے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہو چکی تھی کہ اس کی کوئی بھی گہری سہیلی نہ بن سکی۔ ماہا، بنیادی طور پر معصوم، لاابالی اور جذباتی لڑکی تھی۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی، اس کے بارے میں اتنا کرید کرتی کہ دوسرا تنگ پڑ جاتا، وہ میرے ہر معاملے میں شریک ہو جانے کی کوشش کرتی۔ اس میں ماہا کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ میں اس کے قریب ہی اتنا تھا وہ خود کو مجھ سے جدا خیال ہی نہیں کرتی تھی۔ بہت جلد سہم جانے والی ماہا، میرے ساتھ پر بہادر ہو جاتی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں اسے ایک بہادر لڑکی دیکھنا چاہتا تھا جو اپنی بات منوا سکے۔ سو جب وہ یونیورسٹی میں پہنچی تو میں نے جان بوجھ کر اسے کم وقت دینا شروع کر دیا اور زیادہ سے زیادہ سہیلیاں بنانے پر حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تعلیم مکمل کی تو نور پور کے سماجی حلقوں میں اس کی پہچان تھی۔ اگرچہ وہ بولڈ تھی لیکن رشتوں کا احترام کرنا وہ جانتی تھی۔ بہت ساری باتیں مجھے یاد آتی رہیں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بس میں پایا۔ خود کو سنبھالنے پر میں نے دیکھا، میرا لیپ ٹاپ ساتھ بیٹھے تھائی نوجوان کی گود میں پڑا ہے۔ مجھے اپنی غفلت پر بہت افسوس ہونے لگا۔ میں نے شرمندگی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور لیپ ٹاپ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے وہ واپس کر دیا۔

''شکریہ'' میں نے انگریزی میں کہا۔

''کھرب کون کھریپ'' اس نے منمناتے ہوئے کہا۔ اس کی مجھے سمجھ تو نہ آئی بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی میرا شکریہ ادا کر رہا تھا، میں اس کی بات نہیں سمجھا تو خاموشی سے اپنی جگہ سمٹ گیا۔ تب اس نے پوچھا، ''پتایا؟'' اس پر میں نے فقط سر ہلا دیا۔ تو وہ آہستہ ہنستے ہوئے بولا، ''مائی پن رائے'' (کوئی بات نہیں) میں اس کی بات پھر نہ سمجھا تو وہ بھی شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ میں نے خجالت سے بچنے کے لیے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو باہر خوب دھوپ چمک رہی تھی نیلے آسمان پر سفید بادل چھائے ہوئے تھے۔ تبھی بس ایک بڑے سارے چوراہے تک پہنچ گئی۔ جس سے میں سمجھ گیا کہ اب پتایا زیادہ دور نہیں ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی، ہمیں سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ پھر بس اڈے پر پہنچ گئی۔

میں بس میں سے نکلا تو سامنے نیلی پلاسٹک کی کرسیوں پر بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک جانب سفید پتلون، میرون چیک دار شرٹ اور سر پر گہرے نیلے رنگ کی مخصوص پگڑی باندھے ایک سکھ جوان کھڑا بس میں سے اترتے ہوئے مسافروں کو

بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، چونکہ وہاں پر وہی ایک سکھ تھا، اس لیے میں سمجھ گیا کہ وہی ہمت سنگھ ہوگا۔ میں نے اپنا بیگ لیا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ تبھی میرا سیل فون بج اٹھا، میں نے دیکھا، ہمت سنگھ پریشانی چہرے پر سجائے فون سیٹ کان سے لگائے کھڑا ہے۔ میں نے فون ریسیو کر لیا۔

''ہیلو آپ بلال بھاء جی او۔''

''ہاں جی، میں بلال ہی ہوں، آپ ہمت سنگھ؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے قدم اس کی جانب بڑھا دیئے۔

''جی جی، آپ کدھر ہو، آپ کی بس تو آ چکی ہے۔'' اس نے کہا تو میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''میں آپ کے پاس کھڑا ہوں لیکن آپ مجھے پہچان ہی نہیں رہے ہو۔'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے یوں کہنے پر چونک کر ارد گرد دیکھا، پھر نگاہیں مجھ پر ٹکا دیں۔ پھر جلدی سے بولا۔

''گرے رنگ کے سوٹ والے آپ ہی۔۔۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا دیا۔ اس نے جلدی سے فون کان پر سے ہٹایا اور تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر خوشی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی ترسا ہوا بندہ کسی جانب لپکتا ہے۔ ہم میں چند قدم کا فاصلہ اس نے اڑنے کی مانند طے کیا۔

''اور جی آیاں نوں بلال بھاء جی۔'' جوش جذبات میں اس نے کہا اور پھر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ پھر معانقہ کے انداز میں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب کئی بار ملا۔

''ہمت سنگھ جی، بس کریں، کوئی ہڈی وڈی۔۔۔''

''او چھوڑو جی، میرے پنجاب سے آنے والا شیر اس قدر نازک نہیں ہو سکتا۔ سفر کیسا رہا؟'' اس نے یہ پوچھتے ہی میرا بیگ پکڑا۔

''بہت اچھا، ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بابے دی مہر ہے جی، آئیں چلیں۔'' پھر اچانک رک کر بولا۔ ''کوئی اور سامان تو نہیں ہے نا۔''

''نہیں، بس یہی بیگ ہے۔'' میں نے بتایا تو وہ ایک جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''آئیں!'' یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ سیدھا ایک

کاؤنٹر پر گیا۔ وہاں سے اس نے کوک کے دو ٹین پیک لیے اور ایک مجھے دیتے ہوئے بولا

’’تھوڑی بہت پیاس تو بجھائیں نا، جاہ لسی گھر چل کر پیتے ہیں۔‘‘

’’تو اس کا مطلب ہے ہمت سنگھ، آپ پہلے گھر چلیں گے۔‘‘ میں نے تصدیق چاہی۔

’’اُو کیا باتیں کرتے ہو بلال بھاء جی، میری جند کورتے ساری رات نہیں سوئی۔ پنجاب سے اور پھر لاہور سے کوئی آئے تو اسے ویسے ہی چاہ چڑھ جاتا ہے اور میرا جیت سنگھ اوئے کیا بات ہے اس کی، ایک منٹ میں دوستی، آپ کے آنے کا سن کر سکول نہیں جارہا تھا، اسے سمجھایا کہ تیرے آنے تک ادھر ہی رہیں گے۔‘‘ وہ جوش جذبات اور پورے خلوص سے بولتا چلا جارہا تھا۔ اس وقت مجھے لگا اپنا وطن اور اپنا دیس کتنا پیارا ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ ایک روحانی تعلق بھی ہو۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ہمت سنگھ نے خود ہی بات کی اور پھر اگلی سیٹ پر بیگ رکھ کر جیب سے فون نکال لیا۔ پھر نمبر پش کرتے ہوئے بولا۔

’’شعیب بھاء جی کو بتادیں کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر دوسری طرف سے رابطہ ہوجانے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جیسے ہی رابطہ ہوا۔ اس نے میری آمد کے بارے میں بتایا۔ ’’ہاں ہاں جی۔ یہاں سے سیدھے گھر جائیں گے۔ پھر دوپہر کے بعد میں انہیں وہاں چھوڑ دوں گا۔۔۔ نہیں جی! دوکان کھلی ہے، کاریگر ہیں ادھر، اگر بند بھی کرنی پڑتی تو کوئی بات نہیں تھی جی۔۔۔ آپ فکر نہ کریں جی، میں پورا خیال رکھوں گا، اور کوئی شکوہ نہیں آئے گا۔۔۔ جی میں سمجھتا ہوں۔۔۔ میں بتادوں گا۔۔۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے مختصر سی بات کی اور فون بند کر کے اسے دے دیا۔ تب میں نے باہر دیکھا تو مجھے لگا یہ منظر میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔ ابھی یہیں سے گزر کر بس اسٹیشن کی جانب گئے تھے۔ میں نے اس کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

’’جی بھاء جی! ہم ابھی اس روڈ سے واپس جارہے ہیں، جدھر سے آپ آئے تھے اب ہم آگے جاکر دائیں جانب مڑ جائیں گے۔ میرے گھر سے آپ کا ہوٹل نزدیک ہی ہے۔‘‘

’’اچھا ایک بات یاد رکھنی ہے، راستے میں کسی ایسی جگہ جانا ہے، جہاں سے پھل لے سکیں۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تھائی زبان میں ڈرائیور سے کہا وہ بھی سر ہلاتا رہا۔ پھر اس نے ٹیکسی ایک ذیلی سڑک پر موڑ لی۔

میں ہمت سنگھ کے ساتھ ایک بڑی سی دوکان میں داخل ہوا۔ آتے وقت میں لیپ ٹاپ اور بیگ ساتھ میں اُٹھا لیا تھا۔ میں ٹیکسی والے پر ایک فیصد بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہتا

تھا، میرے سامنے عجیب قسم کے پھل تھے، ان میں چند پھل تو ایسے تھے جن کی مجھے سمجھ آرہی تھی۔ جیسے کہ کیلے، انناس اور امرود۔ اس کے علاوہ نہ مجھے ان کے نام آتے تھے اور نہ ہی میں ان کی پہچان کہ کون سے پھل کی کیا خاصیت اور ذائقہ ہے۔

’’ہمت سنگھ جی! میری کچھ مدد کریں۔ یہاں سے پھل پسند کریں۔‘‘ میرے یوں کہنے پر چند لمحے سوچتا رہا جیسے وہ میری بے بسی سمجھ رہا ہے، پھر تھائی میں دوکاندار سے کچھ کہا۔ اس نے جلدی جلدی سے شاپر بیگ میں پھل ڈال دیئے۔

’’بلال بھاء جی، یہ رمبوتان ہے۔ پہچان لیں اسے، بہت مزے دار پھل ہے اور یہ پومیلو ہے۔‘‘ اس نے علیحدہ علیحدہ پھلوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ تب میں نے کنو، کیلے اور سیب مناسب مقدار میں لیے۔ ’’بھاء جی، اتنے پھل کیوں لے رہے ہیں، کون سا یہ ختم ہوجائیں گے، بعد میں لے لیں۔‘‘

’’ہمت سنگھ جی، آپ خاموش رہیں۔‘‘ پھر میں نے دوکاندار سے انگریزی میں پوچھا۔ ’’کتنے بھات؟‘‘ اس نے مجھے بھات بتائے تو میں نے ادائیگی کردی۔ بلاشبہ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں، اس لیے پھر اس نے سوال نہیں کیا۔ میں سڑک کے ایک کنارے دیکھتا رہا، جہاں کہیں مجھے تجسس ہوتا ہمت سنگھ سے پوچھ لیتا۔ مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک گلی نما راستے پر آگئے۔ ٹیکسی دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور پھر ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے آگے رک گئی۔

’’لو جی! گھر آگیا۔‘‘ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ وہ باہر نکلا اور پرس نکال کر اس میں سے کرایہ نکالا اور ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیا۔ پھر میرا بیگ اور لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔ میں نے پھل والے بیگ اٹھائے۔ اس نے گیٹ پر ایڑیاں اٹھا کر اندر آواز دی۔ ’’او جند کورے۔۔۔!‘‘ اس آواز کی بازگشت میں ایک لمبے قد والی جوان عورت باہر نکلی، اس نے ٹھیٹ پنجابی لباس شلوار قمیض کے ساتھ بڑا سا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا، میرون رنگ کے لباس پر سنہری کام تھا، دوپٹے پر باقاعدہ گوٹا لگا ہوا تھا، وہ آئی، اس نے گیٹ کھولا، پھر میری طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی طویل سانس لی، اس کی آنکھوں میں نمی اُتری تو اس نے اپنا سر میرے آگے کر دیا۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

’’جند کور! میری بہن چپ ہوجاؤ۔‘‘ میں نے بھی جذباتی سے انداز میں کہا تو وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔

’’میرے میکے سے آنے والا میرا ویر ہی ہوسکتا ہے۔ کتنی عزت اور شان والی ہوتی

ہیں وہ بہنیں جن کے بھائی ان کے پاس آتے ہیں۔ میرا تو آپ سے دوہرا رشتہ ہوگیا۔ ایک میرے میکے سے اور دوسرا بابے نانک جی کے پاک استھان سے۔'' اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ اس کی پلکوں پر موتی اب بھی لرز رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ اندر سے ٹہلتا ہوا آیا۔ وہ چھوٹا سنگھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قریب آیا، میری طرف دیکھا، بڑے اعتماد سے میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور بولا۔

''جی آیاں نوں۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا، پھر اپنے باپ کی طرف دیکھ کر انگریزی میں بولا، ''بابو جی! میں انہیں کیا کہوں، چاچا جی یا ماما جی۔۔۔''

''جو تمہارے دل میں آئے بیٹا۔'' میں نے جواباً کہا۔

''تو پھر یار ہی بن جاتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''جند کورے! یہیں کھڑی رہے گی، اندر بھی چلیں گے۔''

''او! مجھے خیال ہی نہیں رہا، آئیں ویر جی۔'' اس نے سامان میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ پھر ہم ایک صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں وہ لسی بنا کر لے آئی۔

''ویر جی! یہ پئیں لسی اور میں لگاتی ہوں کھانا، آپ کو بھوک تو لگی ہوگی۔''

''اتنی زیادہ نہیں، میں نے صبح ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا۔'' میں نے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جب بھی من چاہے، مجھے بتا دیں، کھانا تیار ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چونکتے ہوئے بولی، ''یہ پھل آپ لائیں ہیں؟''

''ہاں! بہنوں کے گھر بھلا خالی ہاتھ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے بھیگ گئیں۔

''آپ کو شاید نہیں پتہ ویر جی، میری ماں لاہور میں پیدا ہوئی تھی، تقسیم کے وقت چھوٹی سی بچی تھی، سارا خاندان امرتسر آ گیا لیکن میری ماں لاہور کو نہ بھول سکی، اس کی گڑیا حویلی میں رہ گئی تھی۔ اسے وہ گڑیا ساری زندگی یاد رہی تھی۔ جب میں نے آپ کی آمد کے بارے میں سنا تو میرے دل سے یہی آواز نکلی کے میرا ویر آ رہا ہے۔ میرا چھوٹا ویر۔'' اس نے کچھ اتنے خلوص سے کہا کہ میں بھی متاثر ہوگیا۔ لیکن ذہن کے ایک خانے میں گڑیا والی بات رہ گئی، اسے شاید یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ فقط گڑیا کے لیے روتی رہی تھی لیکن یہاں پاکستان آنے والے مہاجرین اپنے خونی رشتے داروں، اپنے پیاروں، اپنے راج دلاروں کو اپنے ہاتھوں

بے گور و کفن چھوڑ آئے تھے۔ ان کا دکھ انہیں کتنا ہوگا۔ میں یہ بات اس سے کہنا چاہتا تھا مگر موقعہ نہیں تھا۔ اس لیے کسی اور وقت یہ بات کہنے کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر لاہور، پنجاب اور امرتسر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تب ہمت سنگھ نے ہی کہا۔

''بلال بھاء جی، آپ نہا کر فریش ہو جائیں۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور فوراً ہی نہانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ہمت سنگھ مجھے اپنے کمرے کے باتھ روم میں چھوڑ آیا۔

نہا کر میں نے ہلکا پھلکا سا لباس پہن لیا تھا، جین پر ٹی شرٹ، اس کے ساتھ ہلکے سلیپر، اور پھر میں کھانے کی میز پر آ گیا۔ جہاں ہمت سنگھ کے ساتھ جیت سنگھ بیٹھا ہوا تھا اور جند کور کھانا میز پر لگا رہی تھی، پھر جیسے ہی وہ آ کر بیٹھی تو اس نے کہا۔

''ویر جی! یہاں پتایا میں آپ کے لیے حلال کھانا بہت مشکل سے ملے گا، میں سمجھتی ہوں اس بات کو، چونکہ یہ بنکاک میں مسلمانوں کے ساتھ بہت عرصہ کام کرتے رہے ہیں، اس لیے مجھے سارا پتہ ہے۔ میں نے گوشت کے علاوہ ہر شے بنائی ہے۔ مچھلی ضرور بنائی ہے تاکہ کوئی تھوڑی بہت کمی پوری ہو جائے۔ گوشت والا مسئلہ میں بعد میں آپ کو سمجھاؤں گی۔ آپ بلا جھجک کھانا کھائیں۔'' اس نے کہا تو میں نے جند کور کی ذہانت کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ کھا بہت مزے دار تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، پھر چائے پینے کے بعد میں نے ہمت سنگھ سے کہا۔

''اب چلیں۔''

''کچھ دیر اور رک جاتے، آرام کر کے چلے جاتے۔'' جند کور نے کہا۔ اس کے لہ میں خلوص تھا۔

''نہیں! وہاں بھی جا کے آرام ہی کرنا ہے۔'' میں نے گھڑی کی جانب دیکھ ہوئے کہا۔ میرے حساب سے تقریباً ایک گھنٹے بعد پی اون اس ہوٹل کے کاؤنٹر پر آنے وا تھی، جہاں میں جا رہا تھا اور وہاں میرا کمرہ پانچ دن کے لیے بک تھا۔

''ویر جی! آپ یہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ یہاں آپ کو۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا

''میں یہاں سیر کرنے نہیں آیا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر انتہائی سنجیدگی کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ پھر جیت سنگھ سے ہاتھ ملا کر میں نے بیگ اور لیپ ٹاپ لیا اور وہا سے نکل آیا۔ جیسے ہی ٹیکسی اس ہوٹل کی جانب چلی، میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی، می ہاں اور ناں کے درمیان لٹک گیا۔ نجانے پی اون کے پس منظر میں کیا اور کون ہو؟

❀……❀……❀

دوپہر ہوجانے تک فہد نور پور پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ شہر میں داخل ہوا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس کے ہاتھ خواہ مخواہ ہی اسٹیرنگ پر مضبوط ہوگئے۔ اتنے سفر میں اس نے ذرا سی بھی تھکان محسوس نہیں کی تھی لیکن یوں شہر میں آکر دل کی دھڑکن بے قابو ہوجانے سے اسے خود پر بھی قابو نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کتنی بار لاہور سے نور پور اور پھر حویلی آیا گیا تھا، لیکن کبھی وہ اس قسم کی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوا تھا جو اس وقت اس پر طاری تھی۔ ماہا کا خیال ہی اسے بے خود کر دینے کے لیے کافی تھا، چہ جائیکہ اب وہ اسے جیتنے کے لیے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے سارا سکون چھین لیتی ہے۔ حاصل اور لاحاصل کے درمیان والی کیفیت میں تو یہ بے سکونی اس قدر بے چینی میں بدل جاتی ہے کہ بندے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی داؤ پر لگ گئی ہو اور یہ ایسا داؤ ہے، جہاں جیت جانے کی لگن نہیں ہوتی بلکہ اپنا آپ وار دینے کی جستجو لگی رہتی ہے۔ فہد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ماہا نے ذہنی طور پر بھی بلال کو قبول کرلیا ہے۔ لیکن بے قراری دل یہ حقیقت قبول کرنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ شب تاریک میں اک ذرا سی امید اسے ہوئی تھی۔ جیسے وسیع وعریض صحرا میں گہری رات اور دور کہیں کوئی ستارہ آسمان پر سے ٹوٹے تو اس کی روشنی میں لحہ بھر کو منزل دکھائی دے جائے تو مسافر دیوانہ وار اس سمت بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ فہد کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، وہ ایسی ہی امید کے سہارے ماہا کی جانب بڑھا تھا، اب یہ اس کا نصیب تھا کہ منزل اسے مل جاتی یا پھر وہ صحرا میں کہیں بھٹک جاتا، اکثر رات کی تنہائی میں اسے ماہا یاد آتی تو پھر آتی ہی چلی جاتی۔ اس کے من میں معصومیت کے الوہی رنگ تھے، اس کی باتیں، جن میں لاپرواہی کا خمار تھا، اس کے انداز جس میں زندگی کی رعنائیاں تھیں۔ وہ قہقہے جن میں جلترنگ تھی، جب اسے یاد آئے تو وہ بے بسی کی انتہا تک پہنچ جاتا، منفی قسم کے خیالات سر ابھارنے لگتے جنہیں وہ بڑی مشکل سے اپنے قابو میں کرتا، رشتوں کے حصار اس قدر اس کے سامنے تھے جنہیں وہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو بہت ساری قربانی دینا پڑتی، جس کا حاصل کچھ بھی نہیں تھا، وہ اپنی منزل ہی گم کر بیٹھا، اب جو زندگی نے اسے امید دلائی تھی۔ یہ امید اس شمع کی مانند تھی جو روشن ہوئی ہے اور فہد پروانہ وار اس کی جانب بڑھ گیا تھا، اسے قسمت پر کم اور خود پر زیادہ بھروسہ تھا، کیونکہ وہ اس امید کو قدرت کی جانب سے ایک عطیہ سمجھ چکا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں کھویا، احسان نور کے بنگلے کے سامنے جارکا۔ ہارن کے جواب میں چوکیدار باہر آیا، وہ فہد کو جانتا تھا، اس لیے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی پورچ میں لے گیا۔ پھر بڑی بے تکلفی سے اندر چلا گیا۔ جہاں خوبصورت اور کھلے ڈرائینگ روم میں اس کی مامی ذکیہ اسی کے انتظار میں تھی۔ سلام ودعا کے بعد اس نے پوچھا۔

''فہد بیٹا! تم نے بہت دیر کر دی، تمہیں کم از کم ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''مامی جی! میں بہت آرام سے آیا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لو! ہم تمہارے لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ تم آؤ گے تو کھانا کھائیں گے۔'' ذکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوری! چلیں بس جلدی سے کھانا لگوادیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

کھانے کی میز پر وہ چاروں ہی ہے، احسان نور، ذکیہ، ماہا اور فہد۔ اس دوران سب کا حال احوال پوچھا جاتا رہا، ماہا اور بلال کی شادی بارے تیاریوں کا ذکر رہا جو فہد کو بہت برا لگا لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہ سنتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر میں ماہا نے کہا۔

''اچھا ہوگیا آپ آگئے ہو۔ مجھے کچھ اپنی پسند کی شاپنگ کرنی ہے۔ وہ ایک دو دن میں کرلیں گے۔''

''تمہاری کون سی شاپنگ رہتی ہے ماہا؟'' ذکیہ نے پوچھا۔

''وہ حویلی کے لیے چاہیے۔ میں نے ڈیکوریٹر سے۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو احسان نور ہنستے ہوئے بولا۔

''ارے ماہا، یہ سردردی ان کے ذمے ڈالو، جنہیں تم نے معاوضہ دینا ہے۔ تم کیوں سر کھپاتی رہو گی۔''

''نہیں پاپا، آپ سمجھتے نہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بہر حال میں نے پسند کرنی ہیں۔'' اس نے اصرار بھرے لہجے میں کہا

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔ اب تم جانو اور فہد، جتنی مرضی شاپنگ کرلو، مگر کام کی ایک چیز نہیں ہوگی۔'' ذکیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیجیے گا، ساری کام کی ہوں گی۔ آپ سب سے زیادہ پسند کریں گی۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اچھا! فہد اتنی دور سے آیا ہے۔ اسے کچھ دیر آرام کرنے دو۔ پھر شام کو چلی جانا۔'' ذکیہ نے کہا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے فوراً ہی سعادت مندی سے کہا اور اٹھ گئی تو پھر سبھی اٹھ گئے۔

فہد اپنے کمرے میں تھا۔ وہ ابھی جا کر لیٹا ہی تھا، وہ اس خیال ہی سے مسحور ہو رہا تھا کہ شام ہوتے ہی ماہا اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے جائے گی، اگرچہ پہلے بھی وہ کئی بار اس

کے ساتھ یوں جا چکی تھی، لیکن پہلے ہی دن یوں تنہائی میں باتیں کرنے کے لیے موقع مل جانا نیک شگون خیال کر رہا تھا۔ نینداس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی مگر وہ ماہا کو اور ماہا سے ہونے وا باتوں کے بارے میں سوچنا چاہ رہا تھا، پھر وہ بے بس ہو گیا، نینداس پر حاوی ہو گئی اور وہ سکوا سے سو گیا۔

ساحل سمندر پر موجود ''شاہانہ ہوٹل'' کا شمار فور سٹار ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ اس عمارت کئی منزلہ تھی۔ سرسبز علاقے میں درختوں، پودوں اور پھولوں میں گھرا سفید رنگ کا ہوٹل بہت اچھا دکھائی دے رہا تھا، یا شاید اس ہوٹل کی نسبت پی اون سے تھی، اس لیے وہ مجھ سب سے منفرد اور اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیکسی پورچ میں رک چکی تھی، میں نے جلدی سے والٹ نکالا تو ہمت سنگھ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھاء جی شرمندہ نہ کریں۔ بس آئیں۔'' یہ کہہ کر وہ دائیں جانب سے باہر نکلا ساتھ ہی اس نے بیگ اور لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔ پھر تھائی میں ڈرائیور سے کچھ کہا اور اندر جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا، وہ جس کے لیے میں ہزاروں میل کا سفر کیا تھا، ابھی چند لمحوں میں میرے سامنے آ جانے والی تھی اور پتہ نہیں وہ ہو گ بھی یا نہیں۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، وقت کے حساب سے تو پی اون کو وہاں ہونا چاہیے تھا جس طرح مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اسے پہچان لوں گا، اس طرح مجھے یہ پورا یقین تھا کہ و شاید مجھے نہ پہچان سکے۔ میں نے جو اسے اپنی تصویر ای میل کی تھی، وہ ذرا سی پرانی تھی، اس میں میری مونچھیں ذرا بھاری تھیں، لیکن اس وقت اتنی بھاری نہیں تھیں، میرا ہیر اسٹائل بھی و پہلے والا نہیں رہا تھا، اب میرا جسم تھوڑا سا بھر گیا تھا۔ میں جوں جوں قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا توں توں میں دباؤ کا شکار ہونے لگا تھا، پھر جیسے ہی مجھے اس کا احساس ہوا، میں ایک لمحے کو رک گیا۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے آپ کو نارمل حالت میں لے آیا۔ میرے ذہن میں سو ہی ایسی آئی کہ ساری بے اعتمادی ہوا ہو گئی اور اس جگہ ایک بااعتماد اور حوصلہ مند شخص کھڑا تھا میں نے سامنے کاؤنٹر پر دیکھا، ہمت سنگھ وہاں جا کر رک گیا تھا، تین لڑکیوں میں سے ایک اس کی جانب بڑھی تھی، میں نے غور سے ان تینوں کو دیکھا وہ تینوں ایک جیسے لباس میں تھیں. میرون رنگ کے کوٹ، اسی رنگ کی پتلون، آف وائٹ قمیض، ایک جیسا ہیر سٹائل اور چہر پر مسکراہٹ ان میں سے دائیں جانب والی لڑکی پر مجھے پی اون کا گمان ہوا۔ میں ہمت سنگھ کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تھائی میں ان سے کمرے کی ریزرویشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

باتیں کرنے والی لڑکی میری جانب بڑھی اور مجھ سے تھائی میں پوچھا جس کی مجھے سمجھ میں نہیں آئی، اس پر ہمت سنگھ نے اسے تھائی میں شاید یہی کہا تھا کہ یہ میرے ساتھ ہے تو وہ خالص انگریزی میں میری جانب دیکھ کر بولی۔

''او! مجھے افسوس ہے، آپ تھائی نہیں جانتے۔ بہر حال ہم آپ کو اپنے ہوٹل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

''میں یہی توقع کروں گا کہ یہاں مجھے بہترین سہولیات ملیں۔'' میں نے جواباً کہا۔

تبھی میں نے دائیں جانب والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور تصور میں اس تصویر کو ابھارا جو پی اون نے مجھے ای میل کی تھی، دونوں میں نین نقش کی مشابہت بتا رہی تھی کہ یہی میری مطلوبہ منزل ہے۔ پی اون، میری دوست، لیکن ان لمحات میں انتہائی اجنبی، ممکن ہے، اس کے گمان میں بھی نہ ہو کہ بلال، اس کا دوست یہاں دو فٹ کے فاصلے پر اس کے قریب موجود ہے۔ چونکہ دو لڑکیاں ہمیں ڈیل کر رہی تھیں، اس لیے متوقع پی اون نے مداخلت کرنا بہتر نہیں سمجھا، درمیان والی نے ہمت سنگھ کے سامنے چابی رکھ دی تو قریب ہی سے ایک ویٹر نمودار ہو گیا۔ اس نے بیگ پکڑ لیا۔ میں نے بہت غور سے پھر اس لڑکی کو دیکھا جس پر پی اون کا گمان ہوا تھا، کیا یہ وہی تھی، یا پھر۔! اس سے آگے میں نہیں سوچ سکا۔ اگر یہ وہ نہ ہوئی تو میرا سفر شاید رائیگاں جانے والا تھا۔ میں پلٹ کر ہمت سنگھ کے ساتھ ویٹر کے پیچھے لفٹ میں چلا گیا، میری نگاہیں اسی لڑکی پر جمی ہوئیں تھیں۔ شاید اسے میری توجہ کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے وہ بھی میری جانب دیکھ رہی تھی۔ تبھی لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ پھر تھوڑی سی دیر کے بعد ہم کمرے میں پہنچ گئے جو تیسری منزل پر تھا۔ کمرے میں سکون سے بیٹھنے کے بعد ہمت سنگھ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بلال بھاء جی! یوں تو میں گھر میں بھی آپ سے پوچھ سکتا تھا لیکن بس نہیں پوچھ سکا، اگر پینے پلانے کا شوق ہے تو یہاں سے مت لیجیے گا، یہاں بہت مہنگا۔۔۔''

''نہیں! میں نہیں پیتا۔'' میں نے واشگاف الفاظ میں اسے بتایا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''حیرت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں بعد بولا۔ ''اور کوئی شباب۔۔۔'' اتنا کہہ کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''نہیں! ایسا بھی نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''تو پھر آپ یہاں کرنے کیا آئے ہیں؟ اس پتایا میں جس نے لڑکی اور شراب کی ضرورت محسوس نہیں کرنی، تو یہاں ۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ تجسس تھا۔

''آپ کو سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چھوڑیں اس ذکر کو۔'' میں نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے اس کی حیرت کم کرنے کی کوشش کی۔

''خیر! پھر بھی میں بتا دیتا ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہو، تو مجھے بتایئے گا، اس طرح آپ بہت سی قباحتوں سے بچ جائیں گے۔ شعیب بھاء جی نے چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھے کہا تھا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہمت سنگھ جی چھوڑیں اس ذکر کو۔'' میں نے اسے شرمندگی سے بچاتے ہوئے کہا اور بالکونی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے پردے ہٹائے تو میرے سامنے قدرے سبزی مائل نیلگوں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ نیلے آسمان پر چمکتا ہوا سورج، ریت اور سمندر کو بھی چمکا رہا تھا۔ نیچے ہوٹل کے سوئمنگ پول کے شفاف پانی میں نیلے رنگ کی تہہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس پول کے اردگرد ایک قطار میں لوگ لیٹے ہوئے سن باتھ لے رہے تھے، ظاہر ہے لوگوں میں عورتوں اور مردوں کا شمار ہوتا ہے۔ میں نے ادھر سے نگاہیں ہٹالیں اور دور تک پھیلے ہوئے طویل ساحل کو دیکھا۔ میری نگاہیں ساحل پر موجود اس مندر نما پگوڈا پر رک گئیں، جس میں ایک خاص کشش تھی۔ ہمت سنگھ میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تب میں نے اس پوچھا۔

''وہ کیا چیز ہے، مطلب کیسی عمارت ہے وہ؟''

''وہ۔!'' اس نے اشارہ کر کے تصدیق چاہی پھر بولا ''وہ کہنے کو تو پگوڈا ہی ہے، جسے یہاں واٹ کہتے ہیں لیکن یہاں باقاعدہ عبادت نہیں ہوتی، یہ لکڑی سے بنایا گیا ہے، سمجھیں ایک ماسٹر پیس ہے جس میں یہاں کے فنکاروں نے سیاحوں کی توجہ کے لیے بنایا ہے۔ اسے سنیکچری آف ٹرتھ کہتے ہیں۔

''سنیکچری آف ٹرتھ......!'' میں نے زیرلب دہرایا تو وہ بولا

''ٹھیک ہے پھر بلال بھاء جی، مین چلتا ہوں، ٹیکسی والا انتظار کر رہا ہوگا۔ کل ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ بالکونی سے واپس پلٹ گیا۔ میں بھی وہاں سے پلٹا تو وہ بولا۔ ''کسی قسم کا مسئلہ، الجھن یا مشورہ ہو تو مجھے کال کر لینا، کسی بھی وقت۔'' اس نے خلوص سے کہا تو مجھے اس پہ بہت ہی پیار آیا۔

''بڑی مہربانی، یہاں میرا ہے کون؟ آپ ہی تو ہیں آپ ہی کو بتاؤں گا۔''

''اچھا پھر رب راکھا۔'' اس نے کہا اور دروازے سے نکلتا چلا گیا تو میں نے طویل سانس لی، تنہائی پاتے ہی میں نے کمرے کا جائزہ لیا جو خوبصورت اور معیاری تھا، لیکن ادائیگی کے لحاظ سے بہت مہنگا تھا۔ کمرے میں تھوڑی دیر تک ٹھہر کر میں نے نیچے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں لفٹ سے باہر آیا تو لاشعوری طور پر میری نگاہ کاؤنٹر پر کھڑی متوقع پی اون پر پڑی۔ وہ مصروف تھی۔ ایک غیر ملکی جوڑا ان کے پاس کھڑا تھا، میں ڈائننگ ہال کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں مجھے کچھ کھانے پینے کو مل سکتا تھا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک میز منتخب کی جس کے ساتھ پردے تھے اور اس میں سے سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ ہلکورے لیتا ہوا سمندر جو زندگی کا احساس دے رہا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ میز پر رکھا ہی تھا کہ ایک صحت مند لیکن مناسب بدن والی ویٹرس میرے قریب آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہی نہیں، آنکھوں سے بھی مسکراہٹ ٹپک رہی تھی۔ اس نے جھک کر پوچھا۔

''سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' اس نے اٹکتی ہوئی انگریزی میں کہا۔

''کافی اور اس کے ساتھ نمکین۔'' میں نے ویٹرس کے پیچھے دور کاؤنٹر پر کھڑی متوقع پی اون کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، بہتر۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکا، وہ رک گئی تو میں نے پوچھا۔

''ایک بات پوچھنا چاہ رہا ہوں۔''

''جی پوچھیے!'' اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا

''مسلم فوڈ کے بارے میں یہاں کچھ۔۔۔؟'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یس۔! یہاں اب مل سکتا ہے۔ پہلے نہیں تھا، اگر آپ مزید تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو ہم اپنے مسلم باورچی کو آپ کے پاس بھیج دیں گے۔ کیا آپ یہاں ٹھہریں گے؟'' اس نے معلومات دیتے ہوئے خود بھی معلوم کرنا چاہا۔

''ہاں! پانچ دن۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اُو!'' یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور واپس چلی گئی۔ میں لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں لاگ آن ہوا تو میری توقع کے عین مطابق پی اون موجود تھی۔ سامنے کاؤنٹر پر اب کوئی بھی نہیں تھا۔ چند لمحوں میں پی اون کی طرف سے پیغام سکرین پر تھا۔

''اتنی دیر کر دی، کہاں تھے تم؟''

''بس دیر ہوگئی، ایک میٹنگ میں پھنس گیا تھا۔''

''کیا میٹنگ ختم ہوگئی ہے، یا اب بھی مصروف ہو؟''

''نہیں! اب میں صرف تم سے بات کروں گا۔ سناؤ کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ میں بھی اتنی مصروف نہیں ہوں۔ کیا تم آفس ہی میں ہو یا گھر آ چکے ہو؟''

''دونوں جگہ نہیں ہوں، ایک ضروری کام کے لیے ہوٹل میں ہوں۔ تم بھی تو ایک ہوٹل ہی میں کام کرتی ہو نا؟'' میں نے جان بوجھ کر یہ پیغام بھیجا تھا۔

''ہاں، میں یہاں ایک ہوٹل میں کام کرتی ہوں، استقبالیہ پر کیا تم بھول گئے ہو؟''

''نہیں بھولا نہیں، تھوڑا بہت ذہن میں ہے، تمہارا کام کس طرح کا ہے؟''

''میرا کام کمپیوٹر کے ساتھ منسلک ہے، میں چھ گھنٹے ڈیوٹی کرتی ہوں۔ انتظامیہ کی طرف سے جو ریزرویشن ہوتی ہے اس کے مطابق میں مہمانوں کی رہنمائی کرتی ہوں۔ میرے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں۔ اس طرح کے اور کاؤنٹر بھی ہیں لیکن میں جس کاؤنٹر پر کام کرتی ہوں وہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔'' اس نے ایک طویل پیغام بھیجا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس نے بھیجا۔ ''کیا تم آنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں تمہارے شہر اور وہ بھی تمہارے ہوٹل میں آ جاؤں گا؟''

''ایسا ہونا، کوئی ناممکن تو نہیں ہے نا؟''

''پھر کب بلا رہی ہو مجھے؟''

''میری طرف سے تو چاہے ابھی آ جاؤ، لیکن شاید یہ ممکن نہ ہو۔ اتنا سفر تم لمحوں میں تو نہیں کر سکتے ہو نا؟''

''کوئی بھی دل سے یاد کرے نا تو ایسا ممکن ہوتا ہے۔''

''دل کا کیا ہے، تمہارے ساتھ تو اتنی ذہنی ہم آہنگی ہو چکی ہے کہ اب دل بھی تمہاری چاہت کر رہا ہے۔ بس ایک خواہش ہے تمہیں بہت قریب سے دیکھوں، اتنا قریب کے درمیان میں کوئی فاصلہ نہ ہو۔''

''چلو کبھی تو یہ خواہش پوری ہوگی۔ ویسے اگر میں اچانک تمہارے سامنے آ جاؤں تو پھر تمہارا رویہ کیا ہوگا؟''

''یہ وقت بتائے گا، جب کبھی ایسا ہوا۔ میں اس وقت کے جذبات اور احساسات کیا بتا سکتی ہوں۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ مجھے بعد میں خود حیرت ہوگی۔''

''ذرا تصور کرو! میں تمہارے کاؤنٹر پر پہنچ جاتا ہوں۔ تو کیا تم مجھے ایک لمحے میں پہچان لوگی، یا جو تصویر تم نے بھیجی ہے تم ویسی ہی ہو کہ میں تمہیں پہچان لوں گا۔''

''شاید میں تمہیں پہچان جاؤں۔ میں نے تمہاری تصویر نجانے کتنی بار دیکھی ہے۔ لیکن کیا تم مجھے اپنا تعارف نہیں کراؤ گے کہ میں بلال نور ہوں؟''

''لیکن کیسے! کسے جا کر کہوں گا کہ میں بلال نور ہوں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، مگر اتنا مشکل نہیں ہے، کاؤنٹر ہے ہی معلومات کے لئے، تم پوچھ سکتے ہو کہ پی اون کون ہے؟ پھر تصدیق کے بعد بتا دینا، لیکن! ایسی باتیں کیوں کرتے ہو، جو ممکن نہ ہوں، صرف خیالی باتیں کرنے کا فائدہ؟''

''پی اون! میرے پاس ابھی اتنے ڈالر نہیں ہوئے کہ تمہارے شہر آ سکوں، جیسے ہی میں نے جمع کر لیے تب آ جاؤں گا۔''

''تم آنے کا فیصلہ تو کرو، مل کر شیئر کر لیں گے، میں نے کئی بار تمہیں آفر کی ہے، چلو آج ڈن کرو، میں کب ٹکٹ بھیجوں۔''

''ابھی نہیں! چند دن بعد بتاؤں گا، ویسے اس وقت تم کیا کر رہی ہوں؟''

''موضوع بدل دیا نا، تم آنا ہی نہیں چاہتے۔ خیر! میں اس وقت استقبالیہ پر موجود کمپیوٹر سے تمہارے ساتھ چیٹ کر رہی ہوں۔''

''اصل میں مسئلہ یہ ہے پی اون، میں تمہارے ملک میں آ تو جاؤں۔ لیکن جیسے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ کھانے میں حلال شاید ہی ملے، یہ بہت بڑا مسئلہ ہوگا میرے لیے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا، اب نہیں ہے یہ مسئلہ، اب مسلمانوں کو حلال فوڈ مل جاتا ہے۔ پہلے یہودیوں کے لیے ذبیحہ ہوتا تھا، وہ بہت تھوڑے لوگ آتے تھے لیکن بزنس مین تھے۔ اور پوری دنیا کی ہوٹل انڈسٹری میں اپنی بات منوائی ہوئی تھی، مگر افسوس تم مسلمانوں پر ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود دنیا کی ہوٹل انڈسٹری میں اپنے حلال کھانے کے لیے اپنی بات نہیں منوا پائے۔ اب یہ تو ہوٹل والوں نے اپنی آمدن کے لیے سہولت خود دی ہے، مسلمانوں کی ہمدردی کے لیے نہیں۔ ؟ شدت پسند ہیں۔''

''پی اون! تمہاری مسلمانو کے بارے میں رائے ٹھیک نہیں ہے، جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں مسلمان ہوں اور تمہارا دوست ہوں۔''

''رائے اور دوستی میں بہت فرق ہے بلال، کبھی ملے تو بات ہوگی۔''

میں اس کے پیغام کے جواب میں اپنا پیغام بھیجنا چاہتا تھا کہ وہی ویٹرس مسکراہٹ

کے ساتھ آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں سجی ہوئی ٹرے تھی، اس نے بڑے نفاست سے برتن ر
پھر پوچھا۔

''کیا میں آپ کے لیے چائے بناؤں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ کافی حد تک جھک
چائے بنانے لگی، اس پر مجھے شک ہوا کہ وہ مجھے ایک خاص ادا سے اپنی جانب متوجہ کرنے
کوشش میں ہے۔ میں نے لیپ ٹاپ پر سے توجہ ہٹائی اور اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہ

''تم ویٹرس ہو اور وہ استقبالیہ پر کھڑی لڑکیاں، کیا تم دونوں کی آمدن میں فر
ہے۔'' میرے پوچھنے پر اس نے اپنی مسکراہٹ مزید گہری کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جی ہاں! فرق ہے۔''

''کیوں فرق ہے یہ، حالانکہ تم ان سے زیادہ خوبصورت، سڈول اور تازہ ہو۔''
نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ جہاں پسندیدگی چھلکنے لگی تھی۔ تب اس نے انت
بے باکی سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ انگریزی اچھی بول سکتی ہیں، میں ابھی سیکھ رہی ہوں اور بہت جلد ان کی جگہ
ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کپ میرے آگے رکھا پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولی، ''کیا
آپ کی کوئی بھی خدمت کر سکتی ہوں۔''

''یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم میری کیا خدمت کر سکتی ہو۔'' میں نے گہری مسکراہ
سے اس کے بدن پر ایک خاص ادا سے نگاہ ڈالی۔

''میں آپ کی گائیڈ بن سکتی ہوں۔ جتنے دن آپ یہاں پر ہیں اچھی دوست بھی
سکتی ہوں۔'' اس نے مجھے آفر کی تو میں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس کی بات پر
کیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے تو بولی۔ ''آپ سوچ لیں۔ میں دوبارہ آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ
گئی۔ تب میں نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دیکھا وہاں پی اون کا پیغام تھا۔

''کیا تم مصروف ہو، جواب نہیں دے رہے ہو؟''

''میں تصور ہی تصور میں پتایا پہنچ گیا تھا اور تمہارے سامنے کاؤنٹر پر کھڑا ہوں او
سے مخاطب ہوں۔'' میں نے یہ پیغام بھیجا اور کپ اٹھا کر سامنے کاؤنٹر پر دیکھا۔ متوقع پی اون۔
گھبرا کر سر اوپر اٹھایا، پھر طویل سانس لی اور کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے پیغام آیا۔

''ایسی غلط بات کیوں کرتے ہو کہ جس سے دوسرے کے جذبات مجرو
ہو جاتے ہیں؟''

''کیا تمہارے ساتھ کام کرنے والی لڑکیاں بھی تمہاری طرح چیٹ کر سکتی ہیں۔ ان
کے پاس بھی کمپیوٹر ہیں۔''

''نہیں! یہاں صرف میری ڈیوٹی ہے۔''

''تم تھائی لڑکیوں کا ایک بڑا مسئلہ ہے، سب کے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''بڑے مزے کی بات ہے، خیر، میں ان سے قدرے الگ ہوں، میرے نین نقش
تیکھے ہیں، آخر میری رگوں میں امریکی خون بھی ہے۔ اس کے اثرات ہیں، ہم تین تھائی
لڑکیوں میں سے تم مجھے الگ کر سکتے ہو۔ ویسے کتنی تھائی لڑکیوں کو جانتے ہو؟''

''ایک پی اون کو، جس سے ملنے کی بہت زیادہ خواہش ہے۔''

چائے پیتے ہوئے میں لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ تھا کہ ایک موٹا سا شخص میرے
قریب آ گیا۔ درمیانے سے قد کا گنجا اور ادھیڑ عمر تھا۔ جب وہ مسکرایا تو اس کا ایک سونے
کا دانت دکھائی دیا۔ اپنی طرف متوجہ پاتے ہی وہ بولا۔

''کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں۔'' اس نے یہ بات بڑی مشکل سے کہی تھی۔
جیسے وہ انگریزی اتنی اچھی نہ جانتا ہو۔ میرے اثبات میں سر ہلانے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''آپ
یہاں پر سیاح ہیں؟'' میں نے پھر سر ہلا دیا۔ تو وہ بولا، ''آپ کو جس طرح کی بھی تفریح چاہیے
اس کے لیے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''مثلاً! تم میری کس طرح کی مدد کر سکتے ہو؟''

''جیسی بھی آپ چاہیں۔ گائیڈ، یا دوستی کے لیے اچھی سے اچھی ''بیوٹی فل گرل''
دے سکتا ہوں۔'' اس نے ایک البم میرے سامنے رکھ دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کون تھا، میں نے
اس البم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور کہا۔

''بیوٹی فل گرل۔!'' میرے یوں کہنے پر وہ پورے وجود سے ہنس دیا۔ بلاشبہ میں
اس کے لیے ''آسامی'' ثابت ہوا تھا، اس نے البم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ دیکھ کر پسند کریں یا بتائیں کہ آپ کو کیسی لڑکی چاہیے۔''

میں نے چند لمحے اس کی جانب دیکھا، پھر چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے ایک
جانب رکھا اور سامنے استقبالیہ پر موجود متوقع پی اون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ لڑکی! وہ جو کمپیوٹر پر میری طرح کام کر رہی ہے، وہ میری مدد کر سکے گی۔''

میرے کہنے پر وہ یوں ہو گیا جیسے اس پر ایک دم سے اوس پڑ گئی ہو۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا
اور بولا۔

''نو سر! وہ نہیں، ان کے ساتھ دو میں سے جسے کہیں، وہ بھی کمپیوٹر جانتی ہیں۔''

''وہ کیوں نہیں؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوری توجہ سے پوچھا

''وہ بیوٹی فل گرل نہیں ہے۔'' اس نے قدرے تلخی اور مایوسی میں کہا۔

''کوشش کرو، تمہاری توقع سے زیادہ بھات دوں گا۔ مجھے وہ پسند آ گئی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نو سر! وہ نہیں، میں جانتا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور البم میرے آگے کر دی۔

''اوکے! پھر آپ جا سکتے ہیں۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ اور لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جہاں پی اون کا پیغام تھا۔

''لگتا ہے تم مصروف ہو، اس لیے ڈبکی لگا جاتے ہو۔''

''نہیں! صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''یہی کہ تم میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہو اور میرے بارے میں پوچھ رہے ہو؟''

''بالکل! میں مراقبہ کر سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ تم اس وقت کیا کر رہی ہو۔'' میں نے پیغام بھیجا تو میرے سامنے بیٹھا شخص بولا۔

''سر! میں آپ کی خدمت۔۔۔''

''نو! آپ جا سکتے ہیں۔ ہاں اگر اس لڑکی کے لیے کوشش کریں۔ بھات بتائیں اور معاملہ ڈن۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو میں نے اسکرین پر دیکھا۔

''بتاؤ۔! میں کیا کر رہی ہوں؟''

تب میں نے لاشعوری طور پر کاؤنٹر کی جانب دیکھا، جس طرف وہ موٹا آدمی جا رہا تھا، متوقع پی اون کھڑی تھی۔ ممکن ہے وہ میری جانب سے یہ توقع کر رہی ہو کہ جب وہ کمپیوٹر پر بیٹھی ہے تو میں یہی کہوں گا کہ تم کمپیوٹر پر بیٹھی کام کر رہی ہو۔

''تم اس وقت کھڑی ہو۔''

یہ پیغام بھیج کر میں نے اس جانب دیکھا۔ وہ اسکرین پر دیکھ کر مسکرا دی تھی، پھر چند لمحوں بعد وہ حیران ہوتے ہوئے جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگی، پھر انٹر دبا کر اسکرین پر نگاہیں جما دیں۔ مجھے پیغام ملا۔

''یہ تمہارا مراقبہ نہیں، ذہانت ہے، ویسے تم نے ٹھیک کہا۔''

تب میں نے استقبالیہ کی جانب دیکھا، وہ موٹا کاؤنٹر پر پی اون سے بات کر رہا تھا، اس نے نفی میں سر ہلایا تو نجانے کیوں میرے من میں خوشی سرایت کر گئی۔ وہ شخص چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر وہاں سے دوسری سمت نکل گیا۔ میری جانب آنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ تبھی اسکرین پر پیغام آیا۔

''بلال! میں مصروف ہوں۔ کل بات کریں گے۔ بائی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ لاگ آف ہو گئی۔ میں نے بھی لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنے ارد گرد کے ماحول کر دیکھا۔ میری خواہش تھی کہ میں پی اون کا چہرہ دیکھوں لیکن دوری اور کاؤنٹر کے باعث ممکن نہ ہو سکا۔ سو میں نے ہال پر نگاہ ڈالی، چند لوگ وہاں تھے۔ سہ پہر کے قریب یہ ایسا وقت تھا، جب لوگ باہر نکلنے کی تیاریوں میں ہوتے ہیں۔ تبھی وہ ویٹرس آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تو پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''ابھی ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے بھی ایسی ہی مدد کی خواہش کی تھی، تب میں نے اس لڑکی کے بارے میں کہا۔'' میں نے استقبالیہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ۔! نہیں، اس نے ناکام ہونا تھا، وہ قطعاً باصلاحیت نہیں ہے۔'' اس نے نخوت سے کہا تو میں نے جیب سے والٹ نکالا۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا اور ایک بڑا نوٹ نکالا۔

''پی اون! وہ بس تنخواہ پر گزارا کرتی ہے۔ اسے زندگی کی سہولیات سے کوئی دلچسپی نہیں، بہت بور لڑکی ہے۔'' وہ ویٹرس شاید اس سے جلتی تھی۔ لیکن بہر حال مجھے وہ خوشی کی نوید دے گئی تھی، میں نے خوشی سے کہا۔

''شاید اس لیے بھی کہ وہ اتنی خوبصورت نہیں ہے، تم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ کس وقت تک وہ استقبالیہ پر رہے گی اور تم؟'' میں نے پوچھا۔ اس دوران وہ برتن اٹھا چکی تھی۔

''دو گھنٹے مزید! میں بھی اور وہ بھی، پھر ہمارے بعد دوسرے لوگ آ جائیں گے۔ کیا آپ باہر جانا پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں، تم فریش ہو کر آ جاؤ۔ ہم کہیں گھوم پھر آئیں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہہ دیا۔

''نائس! میں ایک ہزار بھات میں شام گزار سکتی ہوں۔'' اس نے صاف انداز میں

کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میرے کمرے میں آجانا، وہیں فیصلہ کریں گے۔'' میں نے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جو خوشی اس نے مجھے دی ہے، اس کی قیمت کیا ہے۔ میں اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں سے میں نے دیکھا، شام اتر کر ہر جگہ اندھیرا کر چکی تھی۔

❁....❁....❁

جس وقت فہد اور ماہا شاپنگ کے لیے نکلے مغربی افق پر سورج اپنے غروب ہونے کے آثار چھوڑ چکا تھا۔ نور پور شہر کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ بنگلے سے نکلنے کے بعد جب فہد نے گاڑی بڑھائی اور اس سے پوچھا۔

''ماہا! بتاؤ، پہلے کس طرف جانا ہے؟''

''سیدھے سپر مارکیٹ، میں نے وہ انٹیریئر ڈیکوریٹر کو وہیں بلوالیا ہے۔ کچھ چیزیں پسند کرنی ہیں۔ پھر ایک چکر ٹیلر کے ہاں لگانا ہے اور بس۔'' ماہا نے کسی خوش کن خیال میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہاں سے تمہاری پسند کی چیزیں مل جائیں گی، میرا نہیں خیال کہ یہاں سے ورائٹی ملتی ہوگی؟'' فہد نے بات بڑھائی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، اگر کوئی شے پسند آئی تو ٹھیک ورنہ لاہور تو جانا ہی ہے۔'' ماہا نے کہا۔

''کب جانا ہے لاہور؟'' فہد نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا

''بس انہی دنوں میں چلے جانا تھا، لیکن یہ بلال۔۔۔ پتہ نہیں ان دنوں ہی اس کا فارن ٹور لگنا تھا۔ اب اس کے آنے پر ہی ہے۔'' ماہا نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''وہ تو میرا خیال ہے ہفتہ دس دن نہیں آئے گا۔ پھر اس کے بعد شادی کے دن ہی کتنے رہ جائیں گے۔'' فہد نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

''اس نے تو کہا تھا کہ ہفتے میں واپس آجائے گا اور اس میں سات دن ہوتے ہیں۔'' ماہا نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔

''اگرچہ اس نے تفصیل تو مجھے بھی نہیں بتائی لیکن میرا اندازہ ہے جو میں نے اس کی تیاری اور باتوں سے لگایا ہے پتہ نہیں آج کل اسے کیا ہوگیا ہوا ہے۔'' فہد نے آخری لفظ دبے ہوئے لہجے میں کہے تھے۔ جس کے ردعمل میں ماہا نے فوراً پوچھا۔

''کیا مطلب، کیا ہوگیا ہے اسے؟''

''وہ پہلے جیسا تر وتازہ، ہنس مکھ اور پرسکون نہیں رہا، مرجھایا ہوا، چڑچڑا اور بے چین تھا، مجھے بڑا پراسرار دکھائی دیا تھا۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ خود بھی اس کی ذہنی حالت پر پریشان ہو۔

''کیوں تھا وہ ایسا، مطلب کیا وہ جانا نہیں چاہتا تھا، کوئی پرابلم تھی؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''پتہ نہیں، وہ چند دن سے ایسا تھا، میں نے ایک دو بار اس سے پوچھا بھی لیکن اس نے کوئی بات نہیں کی، اس سلسلے میں ذیشان سے بھی بات ہوئی تھی، اس کو بھی نہیں بتایا، دراصل۔۔۔'' فہد کہتے کہتے رک گیا۔

''فہد! تم کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے ہو، جہاں تک میرا خیال ہے، وہ تمہارے ساتھ ہر طرح کی بات شیئر کرتا ہے اور پھر۔۔۔ تم چپ کیوں ہوگئے ہو؟'' وہ انتہائی پریشان لہجے میں بولی۔

''میں وہی بتا رہا ہوں نا، وہ پہلے ایسا نہیں تھا، جب اس نے ٹور کے بارے میں بتایا تو اس وقت جانے کی تیاری کر چکا تھا، ہمیں تو اس وقت پتہ چلا ہے جب وہ ٹکٹ بھی لے چکا تھا۔ میرا اندازہ ہے، اس کی پریشانی، اس ٹور کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اس میں کچھ نہ کچھ ہے۔''

''کیا ہوسکتا ہے؟'' اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا، بعض اوقات اندازوں سے غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس نے بھی تو کوئی بات بتانا پسند نہیں کی، آئے گا تو معلوم ہوگا۔''

''اب وہ پتہ نہیں کب آئے گا؟'' اس نے انتہائی بے چینی سے کہا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ ''ویسے! میرے ساتھ بھی اس کا رویہ اتنا اچھا نہیں رہا ہے۔''

''کب سے؟'' فہد نے جلدی سے پوچھا۔

''یہی کوئی دو تین ہفتوں سے! پہلے ہر بات میرے ساتھ شیئر کرتا تھا، لیکن اب مجھے ی نہیں بتایا کہ وہ ملائیشیا جا رہا ہے۔ روزانہ فون پر بات ہوتی رہی ہے لیکن۔!'' وہ بے یقینی ے بول رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو! تم کیوں پریشان ہوتی ہو، دنیاداری کے سو مسئلے مسائل ہوتے ہیں، روہ ہر بات تم سے تو شیئر نہیں کر سکتا نا۔'' اس نے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا۔

''نہیں۔! اسے میرے ساتھ ہی تو ہر بات شیئر کرنی چاہیے اور وہ ایسا کرتا رہا ہے۔ مگر یہ چند دن سے۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اچھا چلو بتاؤ، ایسی کون سی بات۔۔۔'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''مثلاً۔۔۔مثلاً۔۔۔ یہی کہ جب میں نے حویلی کے اس حصے کو نئے سرے سجانے کی بات کی تو اس نے فوراً اپنے کمرے کی کسی بھی چیز کو نہ ہلانے کی بابت سختی سے دیا۔ قیمتی کاغذات، کتابیں۔۔۔ جیسے میں سمجھتی ہی نہیں ہوں ان کی اہمیت۔'' وہ ذرا سے میں بولی جس میں تھوڑا سا شکوہ تھا۔

''یہ تو اس کی پرانی عادت ہے، اپنی کسی شے کو بھی وہ ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ خیر کس بحث میں پڑ گئے۔ جب آئے گا نا تو ساری باتیں ہو جائیں گی۔'' فہد نے آہستہ کہا۔ وہ اپنی بات کہہ چکا تھا اور اس کا ردعمل بھی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں، میرے ساتھ نہیں۔۔۔ وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔'' ماہا نے یو جیسے اسے بلال پر یقین کی حد تک اعتماد ہو، فہد کو یوں لگا جیسے وہ شک کا بیج بونے میں ناکا ہے۔ تبھی اس کے ذہن میں خیال آیا۔ فصل کاٹنے کے بعد جب بھی نیا بیج بویا جاتا ہے زمین کو تیار کیا جاتا ہے، وہ تو بغیر زمین تیار کیے بیج بو رہا ہے۔ پہلے ہی قدم پر غلطی، یہ سو اسے خود پر بے حد ملال ہوا۔ وہ فوراً ہی محتاط ہو گیا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''ماہا! یہ تم لڑکیاں بھی نا، ذرا ذرا سی بات پر یوں پریشان ہو جاتی ہو جیسے کو ٹوٹ پڑا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ شادی سے پہلے سارے بکھیڑے ختم کر لینا چا تاکہ شادی کے بعد وہ ساری چھٹیاں سکون سے انجوائے کر سکے۔ اب بتاؤ اس میں شیئر والی بات کونسی ہے؟''

''تم مجھے یونہی پریشان کر رہے ہو یا دلاسہ دے رہے ہو۔ ایک تو تمہاری آ رہی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے کون سا غلط بات کہی ہے، جو ہے، میں نے تو وہی کہا ہے نا پریشانی خیال کرو یا دلاسہ، میں کیا کر سکتا ہوں۔'' فہد نے انتہائی محتاط انداز میں اپنی با دی۔ پھر اس سے پہلے کہ ماہا کوئی جواب دیتی اس نے فوراً پوچھ لیا۔ ''حویلی کا جو حص سرے سے سجانے جا رہی ہو، اس کے بارے میں تم نے بلال سے کوئی رائے لی؟''

''نہیں، بس اسے بتایا ہے، یا پھر اس کی پسند کا بنیادی رنگ پوچھا تھا، اور بس ماہا نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

''اب دیکھو! یہ ایک چھوٹی سی بات ہے، غیر اہم اور بے ضرر سی اور میرا نہیں کہ وہ تمہاری پسند کو ترجیح دیتا۔ اب اس میں پریشان ہو جانا۔۔۔ چھوڑو!'' فہد نے با

میں اڑا دیا۔

''اس کی ہر پسند و ناپسند مجھے معلوم ہے۔'' ماہا نے فخر سے کہا تو فہد اندر سے جل گیا۔ اس لمحے اسے اپنی اہمیت انتہائی بے وقعت دکھائی دی، جسے وہ چاہتا ہے وہ اپنی قربت اور ذہنی ہم آہنگی کا اظہار اس قدر دل آویزی سے کرے۔ اس کے اندر ایک لہر اٹھی، جس میں بلال کے خلاف وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن یہ موقعہ نہیں تھا۔ بہت مشکل سے فہد نے اپنی اندرونی کیفیت کو دبایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

''ہونا بھی چاہیے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ اسے تمہاری شاپنگ پسند بھی آتی ہے یا نہیں، ویسے وہ مجھ سے یہ مدد مانگ چکا ہے کہ میں شاپنگ کے سلسلے میں تمہاری مدد کروں۔''

''بہت شکریہ۔! لیکن اس وقت میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم اس کی وجہ سے میرے ساتھ ہو، یا اپنی وجہ سے؟'' ماہا نے یوں کہا جیسے اس کے اندر کا چور اس نے پکڑ لیا ہو۔

''اس کا فیصلہ تم کر سکتی ہو۔'' فہد نے کہا۔

''چلو۔! شاپنگ کے بعد بتاؤں گی۔'' ماہا نے ہنستے ہوئے کہا اور سپر مارکیٹ کے باہر انٹیرئیر ڈیکوریٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ سامنے وہاں گاڑی روک دو۔''

''یہی وہ خاتون ہیں؟'' فہد نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، وہی ہے۔'' ماہا نے اختصار سے کہا اور پھر ساری توجہ اس کی جانب کرتے ہوئے خاموش رہی۔

تینوں سپر مارکیٹ میں بہت دیر تک گھومتے رہے۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے مشورے کرتی رہیں۔ درمیان میں کبھی کبھی ماہا، فہد سے کوئی مشورہ چاہتی جو وہ بڑے خلوص سے دیتا رہا۔ وہاں پھرتے رہنے کا مقصد فقط چیزیں پسند کرنا تھیں۔ اس سے ماہا کو یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ کون سی شے کہاں مناسب رہے گی، فہد کو ماہا کا رویہ بالکل گھریلو خاتون کی مانند لگ رہا تھا جسے فقط اپنے گھر کو سجانے اور سنوارنے کی دھن لگی ہوئی ہو۔ اس دوران جب بھی اسے یہ خیال آتا کہ فقط ایک مہینے کے بعد، بلال کی ہو جائے گی تو اسے یوں لگتا جیسے کوئی پسندیدہ ترین شے اس سے چھینی جا رہی ہو۔ ایک دم سے اس کی کیفیت بدل جاتی۔ پھر خود ہی یہ سوچ کر اپنے آپ کو نارمل کرتا کہ وہ محنت تو کر ہی رہا ہے۔ قدرت نے اسے مواقع بھی فراہم کر دیئے ہیں۔ اب پورے تحمل اور محتاط انداز میں فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ ذرا سی جلد بازی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، چاہے اس کے لیے بہت کم وقت ہے۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ تینوں سپر مارکیٹ سے نکلے، وہ ڈیزائنر اپنی راہ کو چل دی جبکہ ماہا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اب ہمیں ٹیلر کے ہاں جانا ہے وہاں اتنا زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''میں کون سا جلدی میں ہوں۔ جتنا چاہے وقت لگاؤ۔'' فہد نے خوشدلی سے کہا اور گاڑی بڑھا دی۔

جب وہ ٹیلر کی دوکان سے نکلے تو کافی وقت ہو چکا تھا۔ تبھی ماہا نے جلدی واپس گھر جانے کے لیے کہا کیونکہ اس دوران اس کی ماما کا فون آ چکا تھا۔

''ماہا، کیا تم مجھے فقط پانچ منٹ دو گی؟''

''کیوں نہیں، مگر کس لیے؟'' ماہا نے ذرا سی حیرت کے ساتھ پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک جیولر کی دوکان کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''آؤ ذرا۔'' فہد نے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی۔ وہ دونوں جیولرز کی دوکان میں چلے گئے۔ تب وہ بولا: ''میں نے تمہیں شادی پر تحفہ تو دینا ہی ہے۔ تم یہاں سے اپنے لیے کوئی بھی چیز پسند کر لو پلیز!''

''تحفہ یوں دیا جاتا ہے۔'' ماہا نے حیرت سے کہا۔

''اس میں اگر تمہاری پسند شامل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے دلیل دی۔

''نہیں۔!'' اس نے سختی سے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہوں گی کہ تمہاری پسند کیا ہے؟، خود پسند کیا تو کیا کیا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں پسند کر لیتا ہوں۔ لیکن پھر۔۔۔'' اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا، جس میں سارا مطلب تھا۔

''او کے! مجھے پسند ہوگا۔'' ماہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر تھوڑی دیر تک فہد جیولری دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک مہنگا سیٹ اس نے پسند کیا اور فوراً ہی اس کی قیمت ادا کر دی کچھ دیر بعد وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھا، تمہاری پسند بہت اچھی ہے۔'' ماہا نے اعتراف کیا تو فہد کو یوں لگا جیسے قبولیت کی ابتداء ہو گئی ہے، اس کے اندر خوشی کی ایک لہر اٹھی، جس نے اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیا۔ اسی خمار میں وہ ماہا کو لیتا ہوا واپس چل دیا۔ نجانے اسے کیوں یقین ہو گیا تھا کہ ماہا اب اس کی ہے۔

❁.......❁.......❁

میں نے ویٹرس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سے اپنے کمرے میں ملوں گا اور ایک

ہزار بھات میں بات طے ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا لیکن پھر تھوڑی سی دیر بعد لیپ ٹاپ رکھ کر، ویٹرس کا انتظار کیے بغیر کمرے سے واپس آ گیا۔ میں نے اس کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو میری نگاہ متوقع پی اون پر جا پڑی۔ اس وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا۔ وہ مجھے اپنے کاؤنٹر کے قریب دیکھ کر اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ پھر یوں کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہوئی جیسے کسی نہ کسی طرح مجھ سے بات نہ ہو سکے۔ میں بالکل اس کے پاس چلا گیا اور اسی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں سے مجھے کچھ معلومات مل سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں، پوچھیں۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ یہ میری اور پی اون کی پہلی گفتگو تھی۔

''میں یہاں پہلی بار آیا ہوں اور میری پتایا میں پہلی شام ہے۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ میں تفریح کے لیے کہاں جاؤں؟'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پہلی بار میں اس کے اتنے قریب ہوا تھا۔ اس کی گوری رنگت میں گلابی پن تھا۔ چکنی جلد، ہونٹوں کے اوپر سنہری روئیں، لمبی شفاف گردن، سیاہ گیسو جو خاص سٹائل میں باندھے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب بس ایک لمحے کو دیکھا تھا، پھر کاؤنٹر میں پڑا ایک میگزین نکال کر مجھے دے دیا۔

''آپ اسے پڑھیں اور اپنی پسند کے مقام پر چلے جائیں۔''

''اگر میں آپ کو گائیڈ کے طور پر آفر کروں تو کیا آپ کے پاس وقت ہوگا؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''سوری! میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' اس نے نخوت سے کہا اور کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔ تبھی باقی دو میں سے ایک بولی۔

''آپ کو اگر گائیڈ چاہیے تو ہم آپ کی مدد کر سکتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچتا ہوں۔ آپ کو یہاں سے ڈیوٹی کب آف ہوگی؟'' میں نے پھر ذرا سی جسارت کی۔

''ابھی کچھ دیر میں۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے، میں ادھر ہی ہوں۔'' میں نے کہا اور پی اون پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے چل پڑا۔ میں یونہی لابی میں گھومتا ہوا اس ویٹرس کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ ایک جانب سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔

''آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟''

''تمہیں! میں کمرے سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ باہر انتظار کر رہا ہوں۔''

''میں وہیں آ جاؤں گی۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ممکن ہے وہاں انہیں اس طرح کی بات چیت کرنا منع ہو سو میں وہاں سے باہر آ گیا۔ میں شاہانہ ہوٹل کی عمارت سے باہر نکلا تو شام ڈھل چکی تھی۔ ہوٹل کے لان میں آیا تو ساحل سے آنے والی ٹھنڈی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تو عجب طرح کا سکون محسوس ہوا۔ میرا رخ پام کے درختوں تلے بچھی کرسیوں کی طرف تھا، میں وہیں جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد وہ ویٹرس باہر آ گئی۔ ایک لمحے کو میں اسے پہچان ہی نہیں سکا، وہ یونیفارم میں نہیں تھی بلکہ ٹی شرٹ اور جینز میں تھی، کاندھوں تک بال کھلے ہوئے تھے، ہاتھ میں سفید رنگ کا چھوٹا سا پرس اور اس مناسبت سے پاؤں میں سینڈل وہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور آتے ہی بولی۔

''کس طرح کی تفریح کرنا چاہتے ہیں آپ؟'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''باتیں! میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم تھکی ہوئی بھی ہوگی، مجھے اس کا احساس ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ کمرے میں بھی ہو سکتی تھیں۔ یہ آپ اچانک باہر کیوں آ گئے۔ پہلے سے کچھ ڈسٹرب بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا ہوا؟'' اس نے ایک ادا سے کہا۔

''دیکھو! مجھے تمہارے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے۔ میں بس معلومات لینا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گئی۔ اس کے ذہن میں نجانے کیا خیال آئے ہوں گے۔ اس لیئے فوراً بولی۔

''میں نہیں جانتی آپ کیسی معلومات چاہتے ہیں۔ آپ اگر باہر جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہوں اور اگر چاہیں تو واپس کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کا وہ پہلے والا موڈ کیوں نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کاؤنٹر والی لڑکی پی اون کی وجہ سے۔ وہ مجھے اچھی لگی ہے لیکن اس نے باوجود کوشش کے منع کر دیا۔ مجھے اس کا انکار اچھا نہیں لگا۔'' میں نے اتنی تمہید کے بعد اپنی بات کہہ دی۔

''اوہ! یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں نے بتایا تھا نا کہ وہ ایسی نہیں ہے۔ دوسروں کے لیے اس میں کشش بھی بہت ہے۔ آپ ہی نہیں کئی دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے کوشش کر چکے ہیں۔ مگر وہ اہمیت نہیں دیتی۔'' اس نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

''کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟'' میں نے انتہائی احمقانہ سوال کر دیا تو وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اس دنیا میں مجھ سے زیادہ احمق کوئی اور بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ادھر ادھر دیکھ اپنی کوفت کا اظہار کیا تو میں بولا

''کچھ کھانا پینا ہے تو منگواؤ''

''فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا پھر بولی۔ ''پی اون کی طرح یہاں بہت لڑکیاں ہیں۔ غیر ملکی سیاح جب یہاں آتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی تھائی لڑکی سے وہ اپنی خواہش کا اظہار کر دیں گے تو انہیں مثبت جواب ملے گا۔ اس میں سیاحوں کا قصور بھی نہیں ہے۔ یہاں ٹورازم والوں نے پتایا کا تاثر ہی یہی دیا ہے کہ یہاں پر چار ''ایس'' ہیں، مطلب سمندر، ریت، سورج اور جنس۔ حالانکہ ایسا ہے نہیں۔''

''اوکے! میرا مطلب ہے وہ کوئی امیر لڑکی ہے تو وہ جاب کیوں کر رہی ہے؟ اور۔۔۔'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہاں کا ایک اپنا نظام ہے۔ یہاں زیادہ تر تھائی لڑکیاں گاؤں وغیرہ سے لائی جاتی ہیں۔ پی اون کا تعلق پتایا کے ان خاندانوں میں سے ہے جو یہاں بہت پرانے ہیں۔ شاید اس لیے بھی ہو کہ محنت کو ترجیح دیتی ہے۔ بہر حال میں نے اسے ایسا دیکھا۔ سنا ہے کہ وہ ہر ہفتے باقاعدہ واٹ جاتی ہے۔'' ویٹرس نے بہت کچھ اشاروں کنائیوں میں سمجھا دیا۔

''کیا تم اسے ذاتی طور پر جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا

''نہیں، بس یہاں ہی اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہم میں تھوڑی سی مختلف ہے، اس لیے اس کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔ میری اس سلسلے میں کبھی اس سے بات نہیں ہوئی۔'' اس نے کہا اور پھر چند لمحے خاموش رہی جیسے وہ پی اون کے ذکر سے اکتا گئی ہو۔ پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے میری جانب گہری نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ''وہ شخص جس سے آپ نے پی اون کے لیے کہا تھا، وہ دوبارہ آپ کے پاس کیوں نہیں آیا؟، اس کی یہی وجہ تھی۔ خیر، آپ بتائیں میں جاؤں یا۔۔۔''

''تمہاری مرضی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے والٹ نکالا اور اس میں سے گرے رنگ کا نوٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔''

''جب میں نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی تو۔۔۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

جبکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ جس قدر اس نے معلومات کی صورت میں مجھے خوشی دے دی ہے،

اس کے مقابلے میں یہ نوٹ کہیں کم تھا۔

''پھر بھی رکھ لو، میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ مزید بڑھا دیا۔

''میں نے مساج کی بہترین تربیت لی ہوئی ہے۔ اگر آپ کمرے تک چلیں اور مساج کروالیں تو میں یہ نوٹ لے لیتی ہوں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''چلو، وہ تم پر ادھار رہا، یہ لو، اور مساج پھر کسی اور وقت کر دینا۔''

اس نے نوٹ پکڑ لیا، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے آنگ سے بات کی تھی، وہی مسلم باورچی، وہ آپ سے ملے گا، آپ اسے کھانے کے بارے میں بتا دیجیے گا۔''

''بہت شکریہ۔'' میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھی، دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی ٹھوڑی کے ذرا سے قریب لے گئی اور پھر گھوم کر یوں چل دی کہ جیسے وہ مجھے جانتی بھی نہ ہو۔

میں وہیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں، پی اون کے بارے میں جو ابتدائی معلومات ملیں تھیں، اس سے میرے سارے خوف ختم ہوگئے تھے۔ اس کا وجود تھا اور میں نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ بھی درست نکلا۔ میرے اندازے کی بنیاد وہ باتیں تھیں جو وہ اکثر چبھتے ہوئے سوالات کی صورت میں کرتی رہتی تھی۔ اس نے بے شمار سوال کیے تھے، جن کے جواب کے لیے میں نے تھوڑی بہت محنت کی تھی۔ میں ذہنی طور پر تیار تھا۔ ہاں اگر وہ ایک عام سی تھائی لڑکی کی مانند ہوتی تو پھر وہ میرے لیے اتنی مشکل ثابت ہونے والی نہیں تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' اس سوال پر میں چونک گیا۔ پی اون میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، وہ یونیفارم میں نہیں تھی، ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور گہرے نیلے رنگ کی پتلون میں وہ بڑی سوبر سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ جو شانوں سے بھی نیچے تک جا رہے تھے۔ وہ میری جانب مسلسل دیکھ رہی تھی، جبکہ میرے اندر بہت حد تک حیرت کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ جس سے چند لمحوں تک مجھے کچھ بھی واضح دکھائی نہیں دیا تھا۔

''جی بیٹھیے!'' میں نے انتہائی اختصار سے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔

''ابھی مجھے سون کا فون ملا ہے، وہ بتا رہی تھی کہ تم بہت ڈسٹرب ہو، صرف اس لیے کہ میں نے تمہاری خواہش کو رد کر دیا ہے، کیا یہ سچ ہے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ مسلسل میری جانب

دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے اسے چہرے پڑھنے کا تجربہ رہا ہو، اور پھر اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ لوگوں سے اور بالکل مختلف لوگوں سے ملتی رہتی تھی۔

''ہاں۔! میں تھوڑا بہت ڈسٹرب ہوا ہوں، لیکن اتنا نہیں، جتنا تمہارا لہجہ بتا رہا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو، اور کہاں سے آئے ہو، لیکن اتنا معلوم ہے کہ تمہاری ریزرویشن بنکاک کے ایک بزنس مین نے کروائی ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ ہر تھائی لڑکی آپ کی خواہش پوری نہیں کرسکتی؟'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ جبکہ اس کی آنکھیں آواز کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

''میرے پاس تمہاری بات کا موثر جواب ہے، مگر، وہ بات کہو جو تم کہنا چاہتی ہو۔'' میں نے مسکراہٹ بھرے انداز میں اس سے کہا۔

''تم یہی کہو گے نا کہ ہماری ثقافت، تہذیب، معاشی نظام اور۔۔۔'' وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اپنی کہو!'' میں نے کہا۔

''میں تھائی روایت کے مطابق یہ کہنے آئی ہوں کہ تم ڈسٹرب نہ ہو۔ جس کی وجہ اگر میرا رویہ ہے تو؟ ویسے تمہیں یہاں بہت کچھ مل جائے گا، تم ہمارے شہر اور یہاں کی تفریحات سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔'' اس نے انتہائی شائستگی سے کہا۔

''کیا یہ ضروری ہے اور تم نے اپنے پر یہ فرض کر لیا ہے کہ میں نے فقط تمہارے بدن کی وجہ سے دعوت دی ہے، ممکن ہے تم میری اچھی دوست ثابت ہو جاؤ۔'' میں نے کہا تو اس نے بھرپور انداز میں قہقہہ لگایا۔ پھر انتہائی طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ تم چھوٹے سے بچے ہو یا پھر میں تمہیں احمق دکھائی دیتی ہوں۔ خیر۔! جو بات ناممکن ہو، وہ نہیں کہتے، تم یہاں آئے ہو، تفریح کرو اور اپنے وطن واپس جاؤ، ایک اچھا مشورہ تمہارے لیے یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس دولت ہے تو پھر تمہیں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ ابھی سون تمہارا مذاق اڑا رہی تھی کہ تم نے اسے خواہ مخواہ میں ہزار بھات دے دیا۔''

''یہ تم لوگوں کا رویہ ہے، جبکہ میں ایسا نہیں سوچتا، ایسا وہ لوگ کرتے ہیں، جن کے نزدیک انسان سے زیادہ دولت کی اہمیت ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہاری قوم کا مزاج ہی یہی بن چکا ہے۔ دولت کے لیے تم لوگ اپنے بچے تک خود قتل گاہوں میں بھیج رہے

ہو۔ جس قوم کا وطیرہ ہی دولت بن جائے، اس سے رویے، احساس، ہمدردی اور انسانیت جیسی باتیں بہت اجنبی لگتی ہیں۔ تمہارا اپنی روایات کے مطابق مجھے مشورہ دینا انتہائی بدبودار لگ رہا ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم یہاں کی ایک اچھی لڑکی ہو تو میں نے تمہاری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تمہارے ہی روایتی طریقے کے مطابق! تم اس لیے مجھ پر طنز کر رہی ہو مجھے احمق بتا رہی ہو کہ سون جیسی لڑکی مجھ پر ہنس رہی تھی، جو ایسے ہی ایک نوٹ کے عوض میرے سامنے وہی کچھ کر سکتی ہے جو میں اسے کہوں۔‘‘ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر بولی۔

’’تم ہمارے کلچر میں آئے ہو، ممکن ہے تمہیں بہت ساری باتیں عجیب لگیں، لیکن تمہارا رویہ یہاں پر احمقانہ ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کی وجہ ہے کہ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگتے خدمات دیتے ہیں اور کماتے ہیں۔ اس میں شرم کی کیا بات؟‘‘ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں مس۔۔۔‘‘ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’پی اون!‘‘ اس نے اپنا نام بتایا تو مجھے تصدیق ہوگئی اور ایک سکون کی لہر میرے اندر اتر گئی۔ جس سے رہی سہی بے اعتمادی ختم ہوگئی۔ ’’ایسی باتیں، جو انسانیت کا معیار ہوتی ہیں۔ تم جو بھی کہہ لو، تمہاری روایات میں، ثقافت میں ایسا نہیں ہے۔ کچھ باتیں ہیں، جنہیں تم نے خدمات کے خانے میں رکھ کر اپنی ہی بات کی نفی کر دی ہے۔ خیر۔! اس مختصر سی ملاقات میں ہم نے ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے جو کئی دنوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ یعنی انسانیت اور تہذیب، یا پھر تہذیبی روایات میں انسان کا معیار، اسے چھوڑو، بتاؤ، کیا کھاؤ پیو گی، ویٹر کو بلا کر اپنی پسند کا آرڈر دے دو، بل میں دے دوں گا۔‘‘ میں نے اس کا پل پل بدلتے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو ایک دم سے وہ چونک گئی پھر بولی۔

’’تم سے بات ہو سکتی ہے۔ کل میں یہاں جلدی آجاؤں گی۔ ہم اس موضوع پر مزید بات کریں گے۔‘‘ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا، جیسے میرا عندیہ چاہتی ہو۔

’’بات چونکہ انسانیت کی ہے، اس لیے میں تمہارا انتظار کروں گا۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’اس کے لیے پیشگی شکریہ۔‘‘ وہ ہاتھ ٹھوڑی تک لے جاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ پھر کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گئی۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ مجھے پوری امید تھی کہ کل وہ مجھے

ضرور ملے گی۔ اس لیے میری ہلکی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

گلاب نگر میں صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں سے اڑانیں بھر چکے تھے، فضا میں صبح کی مہک پوری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں حویلی سورج کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ نور الٰہی اشراق پڑھنے کے بعد کچھ دیر کے لیے پائیں باغ میں گلاب کے پھولوں کے پاس بید کی کرسی پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ ناشتہ بھی یہیں کرتا تھا، پھر کچھ دیر یہاں بیٹھ کر وہ مردانے میں چلا جاتا، جہاں اس کے پرانے دوست آ بیٹھتے اور گپ شپ لگی رہتی تھی۔ وہ زیادہ تر دوپہر کے بعد حویلی میں دوسرے مکینوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا، یہاں تک کہ عصر ہو جاتی، یہ معمول گرمیوں میں بدل جاتا تھا، لیکن ان دنوں چونکہ نومبر کے اوائل دن تھے، اس لیے دھوپ اچھی لگتی تھی۔ نور الٰہی بڑے اہتمام سے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے سے ماہا اس کے لیے ناشتہ کے ٹرے تھامے آ رہی تھی۔ اس لیے نور الٰہی نے جلدی سے اخبار ایک جانب رکھ دیا اور انتہائی خوشی کے عالم میں بولا۔

’’ارے میری ماہا بیٹی! تم کب آئی ہو؟، اور آتے ہی اپنے دادا ابو کی خدمت شروع کر دی ہے۔‘‘

تب ماہا نے ٹرے میز پر رکھی اور نور الٰہی کے سامنے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

’’السلام علیکم دادا ابو!‘‘ اس نے کہا تو نور الٰہی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دیا تو وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ’’میں ابھی آئی ہوں۔ آپ کا ناشتہ لے کر وسائی ادھر آ رہی تھی تو میں نے سوچا میں ہی لے جاؤں۔ مجھے بھی تو ناشتہ کرنا ہے نا۔‘‘ اس نے معصومیت سے کہا تو نور الٰہی ہنس دیا، پھر سنجیدگی سے بولا۔

’’مگر تم اتنی صبح سویرے آئی کس کے ساتھ ہو؟‘‘

’’دادا ابو! گھڑی دیکھیں نو بج رہے ہیں اور میں فہد کے ساتھ آئی ہوں۔‘‘ اس نے لاڈ سے کہا۔

’’وہ کہاں ہے بھئی، اس نے بھی تو ناشتہ کرنا ہوگا۔‘‘

’’وہ بھی آ رہا ہے۔ آپ۔ کیں کیسے ہیں آپ؟‘‘ وہ بولی، اور ناشتہ لگانے لگی۔

’’میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، وہ تمہاری نئے سرے سے ہونے والی سجاوٹ ختم ہوئی یا کہ نہیں؟‘‘ وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

’’ہو جائے گی، اور وہ بھی انہی دو دنوں میں ختم ہو جائے گی، ابھی کچھ دیر بعد سامان

آ جائے گا، تو وہ سب سجا دے گی۔'' ماہا توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ اچھا ہوا کہ فہد ان دنوں میں آ گیا، سو کام ہیں یہاں پر۔'' نور الٰہی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''واقعی! ورنہ مجھے بازار جانے میں بڑی دقت ہو رہی تھی، ابو کو وقت نہیں ملتا تھا، اور ماما کی الگ مصروفیت۔ اب جیسے ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے، چلی جاتی ہوں۔''

''السلام علیکم نانا ابو!'' فہد نے آتے ہی کہا، پھر بغل گیر ہو کر وہ بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نور الٰہی نے ہاتھ ملاتے ہوئے سلام کا جواب دے دیا تھا۔ اس لیے کچھ دیر حال احوال پوچھنے کے بعد وہ بھی ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس دوران وسائی ان کے لیے بھی مزید لے آئی تھی۔

''فہد! یہ بلال کتنے دنوں کے لیے گیا ہے۔ میں نے جب بھی پوچھا ہے کوئی واضح جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔'' نور الٰہی نے پوچھا تو وہ بولا۔

''نانا ابو! کوئی بتائے بھی کیسے؟، بلال نے کون سا حتمی بتایا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے بھی یونہی گول مول سا بتایا کہ بس جا رہا ہوں اور بہت جلدی واپس آ جاؤں گا۔''

''تمہیں نہیں لگتا فہد یہ لڑکا پچھلے چند ماہ سے کچھ زیادہ ہی لاپرواہ ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ افسری کیا کرتا ہو گا؟'' وہ بولا۔

''ہاں! ہے تو کچھ ایسا ہی۔ پتہ نہیں نوکری، اس کے مزاج کے خلاف ہے یا پھر وہ شعبہ، یا پھر کوئی بات، ان دنوں تو وہ خاصا پراسرار سا بھی ہو گیا ہے۔ عجیب عجیب لوگوں سے لمبی لمبی بحثیں، کتابیں، میگزین اور نجانے کیا کیا۔ آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ وہ چند ماہ سے خاصا لاپرواہ ہو گیا ہے۔'' فہد نے بہت محتاط انداز میں بلال پر اپنا تبصرہ سنا دیا تو ماہا جلدی سے بولی۔

''لیکن فہد، تم نے جاننے کی کوشش کی، اس کا رویہ ایسے کیوں ہے؟، تم اس کے اچھے دوست بھی تو ہو نا؟''

''اچھا دوست ہونا الگ بات ہے اور راز دار ہونا ایک دوسری بات۔ بہت سارے معاملات ایسے ہیں، جن پر ہم بات نہیں کرتے، میں بھی پسند نہیں کروں گا کہ میرے چند ایسے اہم معاملات پر وہ بھی۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو نور الٰہی نے ٹوک دیا۔

''سیدھی سی بات میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا؟''

''میرے خیال میں نہیں، پھر نوکری تو نوکری ہی ہوتی ہے۔ اس میں دنیاداری کے

بہترے مسائل چلتے رہتے ہیں۔'' فہد نے بڑے ہی محتاط انداز میں پھر اپنی رائے دے دی۔

''ہاں! یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے یہ کہہ کر چپ سادھ لی۔

''دادا ابو! ممکن ہے وہ ان دنوں کچھ زیادہ دباؤ محسوس کر رہا ہو، اس لیے بھی وہ کچھ لاپرواہ ہو گیا ہو۔'' بے چین سی ماہا نے جلدی سے کہا تو فہد کو اس کا یہ انداز بالکل بھی اچھا نہ لگا۔ بلال کے لیے ماہا کی تڑپ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا، اس لیے بولا۔

''ماہا! تم مانو یا نہ مانو! کچھ مختلف ہے ضرور۔ ورنہ، میں نے تو اس کے ساتھ سارا بچپن گزارا ہے، تم بھی جانتی ہو، وہ ایسا نہیں ہے جتنا مرضی دباؤ ہو، وہ گھبرانے والا نہیں، زندگی کا ہر چیلنج قبول کرتا ہے، لیکن جو اندازہ نانا ابو نے لگایا ہے، وہی میرا ہے، اور مجھے لگتا ہے یہ ہے بھی درست، مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تمہیں محسوس کیوں نہیں ہوا؟''

''اس لیے شاید کہ اب وہ گلاب نگر میں نہیں رہتا، ادھر لاہور میں رہتا ہے۔ اب فون پر ہونے والی بات سے تو ایسا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔'' ماہا نے بے چارگی سے کہا۔ اس پر نور الٰہی نے دونوں کی جانب دیکھا اور بہت کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کی، لیکن اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ فہد کیا باور کرانا چاہتا ہے۔ وہ جہاں دیدہ شخص ان کی باتوں سے بہت کچھ اخذ کرنے کا احساس کر چکا تھا، وہ کیا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے خاموش رہا تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بات کریں۔

''یہ تم نانا جی کی بات کو قبول کر رہی ہو یا پھر اپنی کم مائیگی کا احساس ہے تمہیں؟'' فہد کے لہجے میں ذرا سی تلخی تھی، اسے یہ بھی احساس نہیں رہا کہ وہ اپنے خاندان کے بزرگ کے پاس بیٹھے ہیں۔

''پتہ نہیں۔'' ماہا نے جلدی سے کہا۔

''دیکھو! اس نے مجھے یہ کہا کہ میں یہاں حویلی چلا جاؤں، وہاں سو کام ہوں گے، مطلب اسے احساس ہے کہ مصروفیت ہو گی، شاپنگ کے لیے لاہور بھی جانا ہے، اب ساری صورتحال تمہارے سامنے ہے، ایسے میں غیر ملکی ٹور، کیا معنی رکھتا ہے، کوئی دوسرا چلا جاتا، اب پھر اسے تمہارے ساتھ کہیں نہ کہیں جانا ہے، چلو، اس بات کو لے لو، کہاں جانا ہے، کوئی پتہ ہے، تمہیں کچھ بھی معلوم ہے؟'' فہد نے کہا۔

''ویسے مجھے نہیں پتہ! بلال نے کہا تھا کہ آ کر پوری تفصیل سے بتاؤں گا۔'' ماہا نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے دادا کے سامنے ایسی بات کرتے ہوئے جھجک بھی رہی تھی۔ شاید وہ ایسی بات نہ کرتی لیکن خود نور الٰہی نے انہیں تھوڑا بہت بے تکلفی والا ماحول دیا ہوا تھا،

تا کہ بچے اپنے معاملات و مسائل اس سے بیان کرتے ہوئے کبھی نہ جھجکیں۔ اور پھر معاملہ اس کے سب سے لاڈلے پوتے کا تھا، جس کے بارے میں وہ چند دن سے کسی کے ساتھ بات کرنے کے لیے ترس گیا تھا۔ اس لیے بولا۔

"ہاں ماہا بیٹی! یہ تو ہے، اس نے تمہاری رائے نہیں لی کیا؟"

"دادا ابو! اس نے کہا تھا کہ میں سرپرائز دوں گا۔" ماہا منمنائی کیونکہ اس سے شرم کے ساتھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"چلو دیکھ لو! اللہ خیر رکھے وہ آ جائے گا تو پھر اس کا سرپرائز بھی دیکھ لیں گے۔" نور الٰہی نے قدرے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اس معاملے میں وہ شروع ہی سے سنسنی سا ہے۔ کبھی پہلے اس نے بات نہیں کی، جب کام ہو جاتا ہے تو منہ سے نکالتا ہے۔" فہد نے ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے بات کی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ماہا نے جلدی سے کہا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے چائے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ماہا! تم میں ایک کمی ہے بیٹا!" نور الٰہی نے اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا دادا ابو؟" اس نے چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھا۔

"تم فوراً دوسرے کی بات مان لیتی ہو، بھئی بندے کو اپنی بات منوانے کے لیے دلائل دینے چاہئیں۔ وہ چاہے کمزور ہی کیوں نہ ہوں۔" نور الٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دادا ابو! میرے خیال میں ایسا رویہ غیروں کے ساتھ اپنایا جاتا ہے، جو اپنے ہوں ان سے کیا۔" ماہا نے کہا تو فہد چونک گیا۔ یہی وہ لمحات تھے جب فہد کو اپنی پہنچ سے دور دکھائی دینے والی ماہا، بہت قریب دکھائی دی تھی۔ ان دونوں کو کیا خبر تھی کہ فہد کے دماغ میں کیا چل رہا ہے اور جس قدر سادگی کے ساتھ ماہا نے اسے اپنا کہہ دیا تھا، اس قدر فہد کے من میں اسے پانے کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ وہ خاموش رہا تو سبھی اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے، اسی خاموشی میں ناشتہ کر لیا گیا اور وسائی برتن اٹھا کر لے گئی۔ تب فہد نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"نانا ابو! آپ بھی تو چلیں نا میرے ساتھ لاہور، آپ ہمارے پاس تو آتے نہیں ہیں۔"

"ہاں! بہت کم لاہور جاتا ہوں۔ ادھر ہی رہتا ہوں، وہاں جانے کے کوئی بہانہ مل جائے تو بندہ چلا بھی جائے۔" نور الٰہی نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ان سادہ سے لفظوں میں اس نے بڑی گہری بات کہہ دی، اسے فہد نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ کونسا ملنے کے لیے حویلی آتے تھے۔ اس لیے وہ خجل سے ہو گیا تھا۔ بولا

"اس میں بہانے والی کون سی بات ہے نانا ابو، وہ بھی تو آپ کا گھر ہے۔ اگر ماموں جی کو وقت نہیں ملتا تو بات مانی جا سکتی ہے۔"

"خیر! اس بار تو نجمہ بیٹی چند دن کے لیے ہی آ رہی ہے، پھر اس کے بعد دیکھیں گے۔" نور الٰہی نے گویا اس موضوع پر بات ہی ختم کر دی۔ اور ماہا کی طرف دیکھا جو اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی ان سے لاتعلق سی بیٹھی ہوئی تھی۔ نور الٰہی کو بڑا عجیب سا لگا۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ بلال کا ذکر اس کے سامنے چھیڑ دیا۔ اب نجانے یہ کیسے اوٹ پٹانگ سوچتی رہے گی۔ اس لیے مسکراتے ہوئے بولا۔ "ماہا! پتر کن خیالوں میں کھو گئی ہو؟"

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ چونک گئی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "نہیں، کچھ نہیں، یونہی سوچ رہی تھی کہ وہ ڈیکوریٹر ابھی تک پہنچی نہیں ہے۔"

"فون کر کے پتہ کر لو۔" فہد نے کہا۔

"کچھ دیر اور دیکھتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا! یہ جو بلال ہے نا، بڑی گہری چیز ہے، تمہیں تو پتہ ہے ماہا، وہ ہم سب سے کتنا پیار کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ لاپرواہ اس لیے ہو یا دباؤ میں نظر آتا ہو، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ دن اسے یہاں گزارنے چاہئیں تھے، لیکن اسے فارن ٹور کے لیے جانا پڑا تھا۔ خیر، وہ جب آئے گا تو بات ہو گی، فی الحال تم پوری یکسوئی سے اپنے معاملات کو دیکھو۔" نور الٰہی نے کہا تو ماہا کے چہرے پر جیسے روشنی پھیل گئی ہو، وہ ایک دم سے مسکرا دی۔ جیسے دادا کے ان چند لفظوں سے اسے بہت زیادہ حوصلہ مل گیا ہو۔

"جی، ٹھیک ہے دادا ابو۔" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسے اندر سے بلاوا آ گیا، تو نور الٰہی اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ چلیں! میں بھی تو دیکھوں تم لوگ کیا کر رہے ہو؟"

"ہاں۔! یہ بہت اچھا ہے۔" ماہا نے بچوں کی طرح خوش ہو کے کہا اور اٹھ گئی جس پر مجبوراً فہد کو بھی اٹھنا پڑا۔ وہ تینوں اندر کی جانب چل دیئے۔

میری آنکھ کھلی تو چند لمحوں تک مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کہاں پر ہوں۔ میں رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ نیند آنے کے باوجود میرا سونے کے لیے جی نہیں چاہا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا تھا کہ یہ کیسا انوکھا اور سنسنی خیز تجربہ ہے کہ میں جس کے بارے میں ہونے یا پھر نہ ہونے کے درمیان وہم و گمان میں مبتلا تھا، وہ پورے وجود کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہو جائے

وہ جو فقط کمپیوٹر سکرین پر اپنے احساس کے ساتھ عکس کی مانند ابھرتی تھی، اس کا جسم حقیقت میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ میں نے سوچا جس طرح میں اپنے اندر اس کے لیے کشش، انس اور اپنائیت محسوس کرتا ہوں، اگر یہی کچھ اس کے اندر بھی ہوا تو میرے چھپ جانے سے، اپنا اظہار نہ کرنے اور اسے اپنے بارے میں نہ بتانے سے جو لاعلمی ہے اس نے ہمارے درمیان کس قدر اجنبیت کی دیوار بنادی ہوئی ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ بالکل میرے گمان کے مطابق ثابت ہوئی تھی اور ایک حیران کن سوال میرے سامنے تن کر آ کھڑا تھا جو میرے شک وشبہات کو اک نئی راہ دکھا رہا تھا، لیکن بہت پہلے مجھے ایک درویش نے بتایا تھا کہ ایسا ممکن ہو جاتا ہے۔ میں نے اس درویش کی بات پر جتنا سوچا، وہ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، جب مجھے بتایا گیا تھا، لیکن اب نکھر کر مجھے وضاحت کے ساتھ اس کی سمجھ آرہی تھی۔ وہ سرزمین، جس کی پہچان ہی جنس اور عیش وعشرت کے حوالے سے تھی، وہاں پی اون جیسی لڑکی کا پایا جانا اچنبھے کی بات تھی، اگر واقعی اسے جنس سے نفرت تھی تو اس درویش کی بات سچ ہو جاتی۔ پی اون مجھے ویسے ہی دکھائی دی تھی جیسا میں چاہتا تھا اور اگر وہ ویسے ہی تھی تو اس کے اندر میری اصل پہچان کے ساتھ نفرت کی شدت بھی ہونا لازمی تھی۔ سو ابھی میں نے اسے مزید کھوجنا تھا۔ اس کے اندر جھانکنا تھا۔ اس بارے میں بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔

مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ ہوٹل کے اس کمرے سے باہر دنیا عیش وعشرت میں مگن ہے، میں چاہوں تو ان میں شامل ہو سکتا ہوں۔ بس ذرا سے ارادے کی دیر ہے۔ یہاں کون ہے مجھے دیکھنے والا، باہر نہ بھی جاؤں، ایک فون کال پر ہر وہ شے اس کمرے میں میسر آسکتی تھی جس کی میں طلب کرتا۔ یہی کمرہ عشرت کدے میں بدل سکتا تھا، لیکن میں تنہا تھا نہیں۔ پی اون کی رعنائی میرے ساتھ تھی، میں پوری یکسوئی کے ساتھ اسے سوچنا چاہتا تھا۔ اس دوران مجھے ماہا کی یاد بھی آئی۔ یوں جیسے کوئی چپکے سے دروازے کی اوٹ میں سے جھانکتا ہے اور اذنِ رسائی نہ پاتے ہوئے واپس پلٹ جائے۔ پاکستان سے اُڑان بھرتے وقت میں نے خود سے وعدہ کیا تھا، کہ اس کی تمام تر یاد وہیں رکھ آؤں گا، اسے اس سرزمین پر یاد نہیں کروں گا، یہ چند دن جو میں نے پی اون کے لیے وقف کیے تھے ان میں ماہا کے ساتھ منافقت نہیں کرسکتا تھا لیکن میں اس کی یاد سے بھلا کیسے بچ سکتا تھا کیونکہ اک وہی تو میرا عشق تھی۔ چند لفظ جو پی اون نے مجھ سے کہے تھے، میں انہی کے تجزیے میں بہت دیر تک سر کھپاتا رہا تھا۔ پھر رات بیت جانے کے احساس نے مجھے سونے پر مجبور کر دیا۔ انہی لمحوں ایک خیال میرے ذہن میں آیا شاید میں اس لیے بھی دیر تک جاگتا رہا ہوں کہ چند دنوں سے جو

آجانے کا دباؤ میرے اعصاب پر سوار تھا، وہ اپنے نکتۂ عروج پر تھا، یا پھر شاید شک وشبہ میں لپٹی دھندلی سی تصویر، میرے سامنے حقیقت کا روپ دھار گئی تھی، اس کی خوشی تھی، کچھ بھی تھا لیکن نیند بہت دیر بعد آئی تھی۔ پھر خوب دیر تک سویا تھا، میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، دوپہر ہونے والی تھی۔ میں اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا۔

میں تیار ہونے کے بعد ناشتہ کر چکا تھا۔ اب سوائے پی اون کے انتظار کے میرے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی، اس نے کوئی وقت نہیں دیا تھا اور نہ وقت کا تعین ہوتا۔ ویٹرلیس برتن لے گئی تو میں بالکونی میں آ گیا، جہاں سے دور سمندر کے کنارے مجھے پگوڈا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کا نام مجھے ہمت سنگھ نے بتایا تھا۔ میرے دائیں جانب اس ہوٹل کا سوئمنگ پول تھا۔ جو اس وقت خاصا آباد ہو چکا تھا، سمندر سے آنے والی ہوا میں ایک خاص قسم کی تاثیر تھی، میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ ایسے میں انٹر کام بج اٹھا۔

''کہیں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا گیا؟'' میرے ہیلو کے جواب میں انتہائی شائستگی سے پوچھا گیا۔ وہ نسوانی آواز خاص لوچ دار تھی۔

''نہیں تو، لیکن آپ ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''میں پی اون بات کر رہی ہوں۔ کل ہمارے درمیان ملاقات طے ہوئی تھی۔'' دوسری جانب سے کہا گیا تو میرے اندر خوشی کی لہر سرائیت کر گئی۔

''او! میں سمجھ گیا، کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں کاؤنٹر کے پاس، جہاں کل آپ نے معلومات لیں تھیں۔'' اس نے کہا۔

''اگر تم چاہو تو میرے کمرے میں آ جاؤ، یہاں۔۔۔''

''نہیں! آپ کو نیچے آنا ہوگا۔ یہاں نیچے کھلی فضا ہے۔ یہاں بیٹھ کر بات کرنا بہت اچھا لگے گا۔'' اس نے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔ تب میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھا اور نیچے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے لفٹ سے نکل کر پی اون کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کاؤنٹر کے پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور پھر چند قدم میری جانب بڑھ آئی۔ قریب آتے ہی اس نے ہاتھ تھوڑی تک لے جاتے ہوئے کہا۔

''ہائے! صبح بخیر!''

''کیسی ہو تم؟'' میں نے پوچھا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ عام سے لباس میں تھی۔ سیاہ

پتلون، گلابی رنگ کی سوتی شرٹ، پاؤں میں سفید چپل اور بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرہ میک ا
سے بے نیاز تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، میرے پاس تھوڑا سا وقت ہے، اس دوران ہم کہیں بیٹھ کر گ
شپ کر سکتے ہیں۔اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ۔۔۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہو
فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ظاہر ہے، ہم کہیں باہر تو نہیں جاسکتے، کیونکہ تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہے
بہتر سمجھتی ہو کہ اس ہوٹل میں باہر بیٹھنے کی جگہ کونسی ہے؟'' میں نے کہا تو وہ کوئی جواب دیے بلا
باہر کی جانب چل دی۔

ہوٹل کی عمارت کے بائیں جانب، سوئمنگ پول سے ذرا فاصلے پر سرسبز درختوں
ساتھ لکڑی سے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے ہٹ تلے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ وہ ہٹ چارو
جانب سے کھلے تھے، بس ستونوں کے اوپر تکونی سی چھت تھی۔ روشیں پختہ اور چمکدار تھیں
سبزہ، مختلف رنگوں کے پھول، پودے اور سمندر سے آنے والی خمار آلود ہوا نے ماحول خا
خوشگوار بنا دیا ہوا تھا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کا تعارف پوچھ سکتی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے صاف انداز میں کہا تو وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے حیرت
میری جانب دیکھنے لگی، چند لمحے اس کیفیت میں رہی، شاید اسے اس طرح کے جواب کی تو
نہیں تھی۔سو میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''کیونکہ تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔''

''دو انسانوں کے درمیان شناسائی کا مرحلہ تعارف ہی سے طے ہوتا ہے پھر اس
بعد تعلق کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ بڑھنا ہے یا پھر ختم ہو جانا ہے۔اس لیے۔۔۔''

''تم ایسے ہی کسی تعلق کو رد کر چکی ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔''سو اس تکلف
ضرورت نہیں۔'' میں اپنی بات پر اڑا رہا، ایسے ہی لمحے میں ایک ویٹرس نمودار ہوئی، اس
چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ تھی، پی اون نے فریش پائن ایپل جوس کا کہہ دیا۔ اس کے
جانے کے بعد وہ بولی۔

''آپ کا رویہ خاصا پُراسرار ہے، ہوٹل ریکارڈ میں آپ کا نام نہیں، کمرہ کسی ا
کے نام پر بک ہوا ہے جو یہیں بنکاک کا تاجر ہے۔ اب آپ اپنا تعارف نہیں کروا
ہیں۔اس سے کیا تاثر لیا جائے۔'' اس نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ میں ہنس دیا اور بولا

''جھوٹ بولنے کی بجائے، انکار کر دینے کو ترجیح دیتا ہوں۔ تعارف چھوڑو، ا

بات کہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر بولی۔

''آپ مجھ سے دوستی کیوں چاہ رہے تھے؟''

''اس لیے کہ میں یہاں پر آیا ہی تمہارے لیے ہوں۔'' میرے یوں کہنے پر وہ پھر حیرت زدہ سی میری جانب دیکھنے لگی۔

''میرے لیے، مطلب۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔'' وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی تھی۔

''دیکھو! میں جب یہاں پر آیا تو میرے ذہن میں تھا، ایسی لڑکی جو عام تھائی لڑکی مانند نہ ہو، جو فقط بھات کمانے کے چکر میں ہوتی ہے، کسی ایسی لڑکی کے ساتھ چند دن۔۔۔''

''تمہارا مطلب ہے کوئی صاف ستھری لڑکی، تم خوفزدہ ہو کہ تمہیں کوئی بیماری نہ لگ جائے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ وہ اچانک بے تکلف ہوگئی تھی۔

''نہیں! میں جسمانی تعلق چاہتا ہی نہیں ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ تو اس نے اگلے ہی لمحے میری جانب غور سے دیکھا اور بولی

''پھر تم مرد نہیں ہو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، مرد وہی ہوتا ہے جس کے ذہن میں لڑکی دیکھ کر ایک ہی خیال آئے، یہ خصلت تو جانوروں میں بھی نہیں ہے۔ جبکہ انسان تو اس سے بلند تر مخلوق ہے۔ اگر مرد ہونے کا معیار یہی ہے تو پھر گدھا اور گھوڑا زیادہ مرد ہیں، انسان کی نسبت۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر دیکھنے لگا، وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن میں انسان اور انسانیت کی بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

''کل ہم میں یہی طے ہوا تھا کہ اس پر بات کریں گے، لیکن تم نے سوال ہی کوئی اور کر دیا۔'' میں نے کہا۔

''اصل میں تم جب اپنا تعارف نہیں کراؤ گے، مجھے کیا پتہ چلے گا کہ تم کس ذہنیت سے تعلق رکھتے ہو، تب میں سمجھ سکوں گی کہ تم سے کس پہلو سے سوال کیا جائے۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا تب وہ بولی ''تم ہنس رہے ہو؟''

''بات ہی ہنسنے والی ہے۔ جب بات انسانیت کی ہے تو اس کا کسی ایک خاص خطے، ملک یا علاقے سے کیا تعلق؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''ہر قوم کا اپنا مذہب اور اپنی روایات ہوتی ہیں۔ اسی تناظر میں اس کی ذہنیت، ثقافت اور معاشرت مختلف ہوتی ہے، کسی ایک شے پر ہر قوم کا اپنا الگ نقطہ نگاہ ہوتا ہے، ممکن

ہے تمہارے اور میرے ذہن میں ''انسانیت'' کا معیار اور رائے مختلف ہو۔'' اس نے کہا۔

''لیکن چند چیزیں ایسی ہیں جو بہر حال پوری دنیا انہیں تسلیم کرتی ہے، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر علاقے کے لوگ انہیں مانتے ہیں۔ مثلاً مساوات آزادی، احترام انسانی، انسانی حقوق کی پاسداری۔۔۔'' میں نے کہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں پھر کہوں گی یہ جو باتیں تم نے کہی ہیں۔ اس کے پیچھے اپنا ایک پس منظر ہے، خواہ وہ مذہب کا ہو یا اپنی خاص معاشرت کا۔'' اس کے لہجے میں دبی دبی خوشی تھی۔ اس دوران ویٹرس جوس رکھ کر چلی گئی، ہم دونوں نے سپ لیا تو خوشگوار احساس من میں اتر گیا۔

''دوسرے لفظوں میں تم اسے نظریات کہہ سکتی ہو۔ بنیادی نظریات؟'' میں نے کہا تو وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

''کہہ سکتے ہیں اور انہی نظریات کی بدولت، اس کا اپنا نکتۂ نگاہ تو ہے نا، تم اسے تسلیم کیوں نہیں کرتے ہو؟'' وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔

''یہ ایک بات ہے کہ کوئی قوم کیا نکتۂ نگاہ رکھتی ہے، لیکن بین الاقوامی طور پر کسی ایک شے کے بارے میں ایک ہی رائے ہوگی، تاہم کوئی کس طرح اس پر عمل کرتا ہے، یہ الگ بحث ہے، مثلاً آزادی! ہر قوم اپنے طور پر آزاد رہنا چاہتی ہے، اس کے پس منظر میں کوئی نظریہ بھی ہو، دنیا اس کو تسلیم کرتی چلی آئی ہے، لیکن جہاں آزادی نہیں، وہاں تحریک ہے۔''

''یہ اس لیے نا کہ دوسری قوم جس سے آزادی چاہ رہے ہیں، یا جن کے خلاف تحریک چل رہی ہے، ان کے ہاں آزادی کا مطلب کچھ اور ہے، اس لیے۔۔۔''

''نہیں۔! بات اگر اصول اور تسلیم کر لینے کی ہے تو پھر وہ بین الاقوامی طور پر ایک ہی رائے ہے، ہاں، البتہ بین الاقوامی سیاست میں وہ تحریک یا آزادی کو سبوتاژ کروایا جا رہا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ میں آزادی کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی اسے مادر پدر آزاد رہنے کو آزادی تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری قوم ایسی آزادی نہیں چاہتی، یہ ہر قوم کا اپنا انفرادی معاملہ ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔۔۔'' اس نے جوش سے کہا۔ ''تم میری بات خود تسلیم کر رہے ہو، ہر قوم اپنی انفرادی حیثیت میں آزاد ہے۔ کسی دوسرے کو اس پر نکتہ چینی یا مخالفت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مان لیا! کسی کو دوسرے کی انفرادی زندگی، معاشرت، ثقافت یا مذہب میں مداخلت کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، اس رویے کو ہم کیا کہیں گے؟'' میں نے پوچھا

''انسانیت!'' وہ فوراً بولی

''اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ انسانیت پر ظلم کر رہا ہوتا ہے، اب ظلم کیا ہے؟ پی اون! میں نے مان لیا کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن دنیا کے تجربات میں کون سی بات یا نظریہ درست ثابت ہوا، وہ بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں۔ جیسے پانی کے بارے میں سائنسی تحقیق کہ یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے۔''

''بالکل یہ تسلیم شدہ ہے؟'' وہ بولی۔

''اس طرح کچھ باتیں ایسی ہیں جو عالمگیر حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص نظریات کے جھروکے سے جب وہ انہیں دیکھتا ہے تو اسے وہ دکھائی نہیں دیتیں۔ اب اگر انسان خود ہی انسانیت کی اعلیٰ ترین شے تک نہ پہنچے تو اس میں انسان کا اپنا قصور ہے، اس شے کا نہیں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے اس پر سوچتی رہی، پھر بولی۔

''تمہارے خیال میں انسانیت کی اعلیٰ ترین شے کا معیار کیا ہوگا؟''

''سچائی! وہ جو ثابت ہو جائے، اور سچائی ہی ثابت ہوتی چلی جائے، جس میں دنیا کے ہر انسان کی فلاح ہو، اور پھر۔۔۔ تم ہو یا میں ہوں، ہم اس دنیا میں آ گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے مر بھی جانا ہے۔ پیدا ہونے اور مر جانے کے دوران ہم نے کیا کرنا ہے؟''

''ظاہر ہے وہ سب کچھ جو ہمارا ذہن یا ہمارا دل چاہے گا، جو ہمارے اور گرد ہوگا۔ بہترین اور معیاری زندگی کے لیے جدوجہد کرنا، اپنے لیے اپنی قوم کے لیے۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم اسے زندگی سمجھتی ہو یا پھر انسان کا مقدر! یہ تو جنگل میں جانور بھی کرتے ہیں۔ ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق؟'' میں نے پوچھا تو وہ ایک لمحے میں بولی۔

''انسان ایک معاشرتی جانور ہی تو ہے۔''

''اس میں معاشرت کو تم کیوں ساتھ میں جوڑ رہی ہو؟، معاشرت تو جانوروں کی بھی ہوتی ہے۔ شیر کا اپنا رہن سہن ہے، گیدڑ کا اپنا رہن سہن، خیر! تم کہہ سکتی ہو کیونکہ تمہارے پاس یہی نظریہ ہے۔ اب جبکہ تم انسان کو جانور کہہ رہی ہو تو پھر انسانیت کی بات کرنا ہی فضول ہے۔''

''کیوں؟ انسانیت کا مطلب بھی تو زندگی گزارنے کے اصول ہی ہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''نہیں! ایسا نہیں ہے پی اون۔'' میں نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا ہے؟'' وہ بولی

''اس کے لیے کچھ بنیادی باتوں کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری یونہی ملاقاتیں رہیں تو شاید ہمارے درمیان گفتگو رہے۔'' میں نے ویٹرس کو اپنی جانب آتے دیکھ کر کہا اور اپنا والٹ

نکال لیا۔

''آپ میرے مہمان ہیں۔ اس لیے ادائیگی میں کروں گی۔'' اس نے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''پھر کسی وقت سہی۔'' میں نے اپنا ڈیبٹ کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ایک دم سے خاموش ہوگئی۔ ویٹرس کارڈ لے کر چلی گئی تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

''یقیناً یہ کارڈ بھی یہیں تھائی لینڈ سے ہے، اس پر تمہارا نام نہیں ہوگا۔''

''تم میرے بارے میں کیوں جاننا چاہ رہی ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

''اس لیے کہ تم میں مجھے کسی کا گمان ہو رہا ہے، میں اسے تلاش کر لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے اس سنجیدگی سے کہا۔

''تو کیا اس کے لیے میری مدد کی ضرورت ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

''اگر تم بتا دو تو میرے لیے آسانی ہو جائے گی۔ میں ہاں اور ناں کا فیصلہ لمحوں میں کر لوں گی۔ ورنہ پتہ نہیں کتنے دن لگ جائیں۔'' وہ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

''چلو! اگلی ملاقات میں بتا دوں گا، وعدہ رہا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ خاموشی سے میری جانب دیکھتی رہی۔ اسی سکوت میں کچھ لمحے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ تبھی ویٹرس کارڈ واپس لے آئی تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے، تمہاری ڈیوٹی کا وقت بھی ہو رہا ہوگا۔''

''ہاں! ابھی تھوڑی دیر ہے۔ لیکن۔۔۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس کی آواز بہت دور سے آ رہی ہو۔ پھر وہ اٹھ گئی۔ ہم دونوں وہاں سے چل دیئے۔ ہمارے درمیان وہی خاموشی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ لابی میں آ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی جہاں کہیں جا کر اس نے یونیفارم پہننا تھی اور میں کمرے میں جانے کے لیے لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

❀.......❀.......❀

حویلی کے دالان میں فہد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ماہا کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو ڈیکوریٹر سے بات کر رہی تھی۔ یہ حویلی کا وہی حصہ تھا جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ڈیکوریٹر اپنے ساتھ مزدور اور جونیئرز کو لائی تھی۔ جنہوں نے دوپہر تک ہر شے کو سجا دیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلہ تھا جو ختم ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی بحث فائنل پر ہو رہی تھی۔ ماہا پوری طرح مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔ سو تھوڑی دیر بعد اس نے فہد سے پوچھا۔

''فہد! بھئی تم بھی تو کچھ بتاؤ، ہماری مدد کرو، تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرے خیال میں جو یہ کر رہی ہیں، بالکل ٹھیک ہے۔ فائنل ابھی ہونا ہے۔ انہیں اپنا کام کرنے دو۔'' وہ بولا

''اوکے!'' اس نے حتمی انداز میں کہا تو ڈیکوریٹر نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اٹھی اور اپنے لوگوں کے درمیان چلی گئی۔

''کوئی بھی فنکار ہوتا ہے نا، اس کے فائنل ٹچ تک آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ جب آپ اپنی مرضی ٹھونسیں گے تو گڑبڑ ہو جاتی ہے۔'' فہد نے ماہا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتی ہوں جیسے ہی بلال آئے، پہلی نگاہ میں اسے خوشگوار حیرت ہو۔ اسے بہت اچھا لگے۔'' ماہا نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''تمہاری کوشش میں کوئی شک نہیں ہے لیکن۔! بنانے والے کے ذہن میں کیا ہے اور دیکھنے والے کے ذہن میں کیا، یہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی سوچ ایک ہو جائے، تم لاکھ کوشش کرو مگر بلال کے خیال تک نہیں پہنچ پاؤ گی اور اس طرح وہ تمہاری سوچ تک نہیں پہنچ سکتا، یہاں تک کہ دونوں میں گفتگو کے ذریعے کوئی بات طے نہ ہو جائے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہم خیالی اسے ہی تو کہتے ہیں۔'' ماہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم کیوں پریشان ہو؟ اگر تمہیں ہم خیالی کا دعویٰ ہے تو پھر تمہیں یقین ہونا چاہیے، جو تم کرو گی، وہ اسے پسند آئے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی، پھر ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولی۔ ''ویسے فہد! ایک بات ہے، انسان جتنا مرضی ہم خیالی کا دعویٰ کرے لیکن کہیں نہ کہیں اختلاف بھی موجود ضرور ہوتے ہیں۔''

''اس کا نام ہی تو زندگی ہے، میرے خیال میں اگر اختلاف نہ ہو تو پھر زندگی میں یہ رنگینی بھی نہ رہے۔ دھیرے دھیرے انسان اپنی زندگی میں بے رنگی لے آئے۔ انسان ساری زندگی اپنے آپ سے، ماحول اور معاشرے سے اختلاف ہی تو کرتا ہے۔ یہیں سے اس کی اپنی صلاحیتیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو منواتا ہے۔ اپنی ذات کو منوانے کا ذریعہ یہی اختلاف ہی تو ہے۔'' وہ دھیرے دھیرے کہتا رہا تھا، اور ماہا اسی تناظر میں نجانے کیا سوچتی رہی تھی حویلی کو وہ بولی۔

''ہاں! جیسے مرد اور عورت، انسان ہونے کے ناطے برابر ہیں، لیکن مرد نے اپنے

آپ کو منوایا اور عورت نے اس کی برتری مان لی، پھر مرد اس پر حاکم ہو گیا۔ عورت سمجھو
کرتی چلی آ رہی ہے۔ مرد کے ظلم کا شکار ہے۔"

"بالکل! اور جہاں عورت نے مرد سے اختلاف کیا، وہیں اس نے اپنی ذا
منوائی، تاریخ شاہد ہے۔" فہد نے دلچسپی لیتے ہوئے قدرے زوردار انداز میں کہا۔

"بالکل ٹھیک بات ہے، وہاں ہم خیالی یا برابری کہاں ہوگی، جب عورت کو محکوم تھ
کیا جاتا ہوگا اور جہاں حاکمیت کے نام پر عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اب دیکھو! کچھ عر
پہلے میری بلال سے بات ہوئی۔ میں عورتوں کے حقوق کے لیے ایک فلاحی تنظیم بنانا چاہ رہی
اور اس کے لیے میں نے بنیادی کام بھی کر لیا تھا۔"

"لیکن بلال نے منع کر دیا۔۔۔" فہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل! اس نے منع کر دیا تھا، اس کی بات کسی حد تک ٹھیک تھی کہ پہلے مجھے ا
تعلیم مکمل کر لینی چاہیے۔" ماہا نے صاف طور پر کہہ دیا۔

"میرے خیال میں اس نے ایسا اس لیے کہا ہوگا کہ اسے تمہاری صلاحیتوں پر یقین
نہ تھا۔ ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جب تمہیں فلاحی تنظیم بنانے کا خیال آیا تھا، اس وقت ک
حالات نے تمہیں سوچنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اسے یہ خیال کرنا چاہیے تھا کہ تم ان عورتوں میں
تو نہیں ہو جنہوں نے برتن مانجھنے ہیں یا جھاڑو پوچا کرنا ہے۔ تمہارا مقام تو ایسا ہے کہ تم اپنی تعلیم
کے ساتھ ساتھ بے سہارا اور مظلوم عورتوں کے لیے کام کر سکو۔ لیکن بات پھر وہی آ جاتی ہے کہ
کہیں لاشعور میں حاکمیت تھی نا۔" فہد نے موقع ملتے ہی ماہا کے خیالوں میں شک کا زہر گھو
شروع کر دیا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، یہ میرا خواب ہے، اسے تو میں نے پورا کرنا ہی ہے۔ اب
میں بلال سے اس حوالے سے بھی بات کروں گی۔ اب بھی اگر اسکی سوچ وہی ہوئی تو پھر وا
حاکمیت والی بات ہوگی۔" ماہا نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، وہ اب بھی تمہیں اجازت دے دے گا، وہ پہلے اپنے گھر کی اجا
کرے گا، پھر معاشرے اور مذہب کو درمیان میں لے آئے گا، یہاں تک کہ تمہارا اپنا من نہیں
چاہے گا کہ تم ایسا کوئی کام کرو، اور ممکن ہے وہ تمہیں اجازت دے بھی دے لیکن اس میں قدغن
ہوگی۔" فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم! اگر تمہارے سامنے یہ صورتِ حال ہو، تمہاری بیوی یہ چاہے تو تم کیا کر
گے؟" ماہا نے براہِ راست اس سے سوال کر دیا، جس کے لیے فہد پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔

سبز باغ کہتے ہی اسے ہیں جو نہ ہو۔ یوں بیان داغ دینے سے بھلا کیا ہوتا ہے، پہلے وہ کون سا
درست بات کر رہا تھا۔

"میں نہ صرف اپنی بیوی کو اجازت دوں گا بلکہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر
چلوں گا۔" اس نے پرجوش انداز میں کہا۔

"ایسا کیوں؟" ماہا نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

"دراصل یہ سارا سوچ کا فرق ہے۔ عورت اور مرد کے فرق سے ہٹ کر اگر ہم
انسان کی بات کریں تو ان دونوں مخالف جنس میں خواہشات، امیدیں، خواب اور جذبات
ابھرتے ہیں۔ ایک کی پسند کو صرف اس لیے رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسرے کو پسند نہیں۔ یہی تو
استحصال ہے۔ اور پھر ظلم اس وقت بنتا ہے جب کسی بھی دباؤ کے تحت دوسرے کے جذبات کو
کچل دیا جائے۔ بیوی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے اپنی مرضی اور خواہشات کی زنجیروں میں
باندھ دیا جائے۔ وہ انسان ہے، اس کی خواہشات اور جذبات کا احترام بھی لازماً کرنا
چاہیے۔۔۔ اگر اس سے ہم اپنے لیے بھی ایسا چاہتے ہیں۔" فہد نے جوش و جذبات میں پوری
سنجیدگی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ ماہا جواباً کوئی بات کہتی، حویلی کی ملازمہ ان کے پاس آ گئی اور
آتے ہی بولی۔

"آپ کو کھانے کی میز پر بلایا جا رہا ہے۔"

"آ رہے ہیں اور یہ جو۔۔۔" اس نے کام کرنے والے لوگوں کی جانب اشارہ
کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ان کے لیے یہیں بھجوایا جا رہا ہے۔" ملازمہ نے کہا اور پھر چند لمحے ان کی طرف
سے کسی بات سننے کی توقع میں کھڑی رہی۔ پھر واپس پلٹ گئی۔ وہ دونوں بھی اٹھے اور ڈرائنگ
روم کی جانب چل دیئے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت کچھ سوچ رہے تھے۔

کھانے کے بعد سبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اس حویلی کی روایت تھی
کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کی جاتیں تاکہ اگر کسی نے بھی کوئی بات کسی سے کہنی ہو تو وہیں کہہ
لے۔ کوئی مسئلہ یا معاملہ وہیں طے ہو جاتا تھا اور یہیں پر مشورہ بھی لے لیا جاتا تھا۔ اس دن ماہا
اور حویلی کی سجاوٹ پر ہی بات چل رہی تھی۔ دادا نے پوچھا

"ماہا! میرا خیال ہے آج یہ کام ختم ہو جائے گا؟"

"جی دادا ابو۔! آج کسی وقت بھی وہ کام ختم کر کے ہی جائیں گے۔" وہ بولی۔

''اب اللہ کرے یہ بلال کو پسند آ جائے۔ وہ بھی تو بڑے نخرے والا ہے نا۔'' زبیدہ خاتون نے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

''کیوں نہیں پسند آئے گا بھئی! ماہا نے اتنی محنت کی ہے اور پھر میرے خیال میں ان دونوں کی پسند تقریباً ملتی جلتی ہے۔'' افضال نور نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماہا ایک دم سے شرما گئی۔ تب دادا نور الٰہی نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ارے مجھے یہ سمجھ نہیں آتی، آج تمہاری ماں ذکیہ کیوں نہیں آئی، وہ بھی آ جاتی، احسان کے پاس تو پہلے ہی وقت نہیں ہوتا۔''

''اباجی! آخر انہوں نے بھی تو کچھ تیاری کرنا ہے، بے چاری ماہا یہاں پر ہے، یہ کام بلال کو کرنا چاہیے تھا، یہاں آپ اور آپ کا پوتا ہوتے اور میں اپنی بھابی اور بھائی کے پاس ہوتا۔ ایک اس کے نہ ہونے سے کتنی گڑبڑ ہے۔'' افضال نور نے سنجیدگی سے کہا۔ تو فہد جلدی سے بولا۔

''ماموں! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں، میں ہوں نا ادھر! کیا آپ مجھے بلال جیسا نہیں سمجھتے؟''

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم بھی ہماری اولاد ہو۔'' افضال نے جلدی سے کہا۔ یہ لفظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ حویلی میں فون کی گھنٹی بجی۔ ملازمہ نے فون سیٹ ان کے پاس لا کر دیا۔ دادا نے فون کا ریسور اٹھایا تو دوسری جانب نور تھی۔ حال احوال کے بعد نور الٰہی نے سپیکر آن کر کے کہا۔

''لو بھئی! سب لوگ تمہاری بات سن رہے ہیں۔''

''مجھے یقین تھا ابو، اس وقت آپ سب اکٹھے بیٹھے ہوں گے۔ میں سب سے بات کرتی ہوں لیکن میں پہلے یہ پوچھوں گی کہ میں کب آؤں، میرے ذمے اگر کوئی کام ہے تو بتائیں؟''

''تم جب جی چاہے آ جاؤ۔'' نور الٰہی نے جواباً کہا۔

''لیکن مجھے فہد نے بتایا تھا کہ ذکیہ شاید لاہور آئے شاپنگ کے لیے، میں اس کے لیے رُکی ہوئی تھی ورنہ میرا بڑا جی چاہ رہا ہے کہ میں گلاب نگر آ جاؤں۔''

اس کے یوں کہنے پر دادا نور الٰہی نے افضال اور زبیدہ کی جانب دیکھا، کوئی جواب نہ پا کر بولا۔

''یہ تم ذکیہ سے پوچھ لو! زبیدہ اور افضال تو آئیں گے ہی۔ وہ بلال ادھر نہیں ہے

پاکستان میں، وہ جیسے ہی آیا تو آ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں ان سے بھی بات کر لیتی ہوں۔ میں ابھی دوبارہ فون کرتی ہوں۔ پہلے ذکیہ سے پوچھ لوں۔'' پھوپھو نجمہ نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ ٹھٹک گئے۔ فہد کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے اپنی ماں پر بڑا پیار آ رہا تھا۔

❀......❀......❀

میں ہوٹل کے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ لیپ ٹاپ میری گود میں تھا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ کب پی اون آن لائن ہوتی ہے۔ بالکونی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس میں سمندر انتہائے نگاہ تک پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ساحل سے آنے والی ہوا میں ایک خاص قسم کی مہک تھی۔ جس میں روشنی کے ساتھ تھوڑا بہت شور بھی آ رہا تھا۔ میری نگاہیں بار بار لیپ ٹاپ کی سکرین پر جاتیں اور مایوس ہو جانے کی حد تک کوفت ہونے لگی۔ سو میرے دل میں خواہش ابھرنے لگی کہ میں لابی تک جاؤں اور وہاں جا کر دیکھوں پی اون وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ لاگ آن ہو گئی۔ میں نے اضطراری انداز میں اسے مخاطب کرنا چاہا لیکن پھر رک گیا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود مجھے مخاطب کرے۔ پھر میری توقع کے عین مطابق اس نے پیغام بھیجا جس میں معذرت کے ساتھ دیر ہو جانے کی وجہ مصروفیت لکھی۔ پھر تھوڑی دیر تک یونہی باتیں چلتی رہیں۔ تب اچانک اس نے پیغام بھیجا۔

''آج مجھے تمہاری بہت یاد آ رہی ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میری آج ایک ایسے نوجوان سے باتیں ہوئیں جس کی شبہات تمہارے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے تمہارے ملک کے لوگ بھی ہمارے جیسے ہوں، مطلب۔۔۔ جس طرح ہم سب کے نین نقش ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں نے تمہاری تصویر سے اس کا بہت موازنہ کیا ہے، ہو بہو تم ہو۔ لیکن تم اپنے ملک میں ہو۔ وہ مجھ میں بہت دلچسپی بھی لے رہا ہے اور اپنا تعارف بھی نہیں کروا رہا ہے۔ میں الجھن میں ہوں۔''

''الجھن میں کیوں ہو؟ تم اس کے بارے میں معلومات لے لو، آخر وہ اپنے بارے میں پوچھنے پر تو بتائے گا۔''

''نہیں، میں نے کوشش کی، اس نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ خیر، میری خواہش

ہے کہ تم بہت جلد ملو، یا پھر میں تمہارے ملک آ جاؤں؟''

''کیا تم آ سکتی ہو؟ اور مجھ سے ملنے کی ضرورت اس قدر محسوس کر رہی ہو؟''

''ہاں! آج تو بہت ہی زیادہ۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا یا میں کیا کروں، طے کرلیں گے۔ اب خوش؟''

''ہاں! یہ میرے لیے بہت بڑی خوشخبری ہوگی۔'' اس پیغام کے ساتھ اس پھول بھی بھیج دیئے۔ جس سے میں نے اس کی شدت کا اندازہ لگایا جو وہ ظاہر کرنا چاہ رہی تب میں نے باتوں کا رخ پھیر دیا۔ یہاں تک کہ سورج نے الوداعی سرخی افق پر پھیلا دی دوران باتیں بھی چلتی رہیں اور مصروفیت کے باعث انتظار بھی رہا۔ میں نے اس دوران اسے ایک ای میل بھیج دی۔

''میری ڈیوٹی ختم ہونے میں بس چند منٹ رہ گئے ہیں۔ سو کل کے لیے بائی بائی۔''

''کیا تم یہ نہیں چاہوگی کہ میں تمہیں بتاؤں کہ ہم نے کب ملنا ہے؟''

''اگر طے نہیں کر پائے ہو تو مجھے ای میل کر دینا بعد میں جب تم طے کرلو۔''

''کاؤنٹر چھوڑنے سے پہلے میری ای میل دیکھ لینا۔ بائی۔''

میں نے یہ پیغام بھیجا اور لاگ آف ہوگیا۔ میں نے لیپ ٹاپ بند کرکے جانب رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں آنے والے لمحات کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ توقع کے عین مطابق تقریباً دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بیڈ سے اترا مگر اسی لمحے دروازہ کھلا اور پی اون طوفان کی طرح میری طرف بڑھی، میں اسے فقط ایک ہی دیکھ سکا تھا، اس کا چہرہ حیرت، خوشی اور تجسس سے بھرپور تھا جس کا مجموعہ دیوانگی کا تاثر وہ میرے ساتھ یوں آ لگی جیسے مجھ ہی میں جذب ہو جانا چاہتی ہو۔ وہ دیوانہ وار مجھے ٹٹول تھی۔ جیسے میرے وجود میں ہونے کی تصدیق کر رہی ہو۔ اس کا سر میرے سینے سے لگا اور وہ اپنا چہرہ بار بار یوں ادھر ادھر رگڑ رہی تھی، جیسے پی اون کو اپنی اندرونی کیفیات پر قا مشکل ہو رہا ہو۔ تب میں نے اسے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا۔ ا آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ تب اس نے ہوئے لہجے میں کہا

''ہونا ظالم مسلمان، اذیت دینا ہی جن کا مقصد ہے۔''

اگرچہ یہ اس کے پیار کا انداز تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے گالی د

ہے۔ میں نے اسے دھتکارا نہیں بلکہ اس گالی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ پھر خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ملاقات کا یہ انداز کیسا لگا؟''

''بہت برا، نہایت اذیت ناک، تم مجھے کل سے ڈسٹرب کر رہے ہو۔ تم جب میرے سامنے آئے تھے نا تو اس وقت میرا دل زور سے دھڑکا تھا، لیکن آج جب تم نے اپنا تعارف نہیں کروایا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تم ہی ہو۔'' وہ کہتی چلی گئی۔

''اوہ! مطلب کل تم مجھے پہچان گئی تھی۔'' میں نے پوچھا

''نہیں۔! لیکن یونہی گمان ہوا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چونکی اور پھر بولی، ''مگر تم نے وہ آفر کیوں کی، سیدھے مجھے آ کر اپنے بارے میں کیوں نہیں بتایا، تم نے اس قدر تجسس کیوں رکھا؟'' اس نے شدت بھرے انداز میں کہا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، اس کی آنکھیں خوشگوار حیرت اور خلوص بھرے جذبات سے مخمور ہو رہی تھیں، دمکتے ہوئے گال مزید سرخ ہو رہے تھے اور گلابی ہونٹ دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور یہی خیال کرتا رہا کہ میرے سامنے ایک بدلی ہوئی پی اون ہے۔'' بولتے کیوں نہیں ہو بلال، کیوں میرے بارے میں تجسس کیا؟ میں سننا چاہتی ہوں۔''

''کیا یوں تمہارے بارے میں معلومات لینا، تمہیں اچھا نہیں لگا؟'' میں نے دھیرے کہا۔

''یہ تمہاری نیت پر منحصر ہے بلال، میں وہی سننا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کیسی ہو؟ ویسی، جس طرح تم اپنی باتوں میں دکھائی دیتی تھی یا پھر ایک عام تھائی لڑکی کی مانند، جس طرح کہ سون ہے۔ اب مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ میں نے تمہیں کیسا پایا، کیونکہ اگر تم سون جیسی ہوتی تو میں اب تک واپس جا چکا ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں چلے جاتے واپس، مجھ سے ملے بغیر جو تمہاری راہ دیکھ رہی تھی، تمہیں دیکھنے کو ترس رہی تھی۔'' اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

''اگرچہ مجھے تمہارے ان جذبات پر بہت خوش ہو جانا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے پی اون کہ اگر تم سون جیسی ہوتی تو پھر تم جھوٹی ہوتی اور جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں، کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں انہیں میں منافق کہتا ہوں۔ میری منافق لوگوں سے کبھی نہیں بنی۔'' میں نے غیر جذباتی لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔ پھر چند لمحے حیرت زدہ انداز میں میری

جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''فرض کیا اگر میں چیٹ کرتے ہوئے تمہیں بتا دیتی کہ میں سون جیسی لڑکی ہوں تو ویسی نہ ہوتی، ایسی ہوتی جس طرح کہ اب ہوں تو بھی۔۔۔؟'' اس نے دکھ سے انداز میں کہا۔

''ہاں! میں تم سے تب بھی ملے بغیر واپس چلا جاتا۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ تمہارا والہانہ انداز میرے بارے میں کیا کہتا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''وہ سب کچھ جو میں سوچتی رہی ہوں۔ میں نے بہت سوچا ہے تمہارے بارے میں، اتنا کہ میں بتا نہیں سکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا اور پھر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بالکل ویسے ہی ہو، جیسے میں سوچتی رہی تھی۔ لیکن۔۔۔تم بہت ظالم ہو بلال، تم نے اپنے آنے کے بارے میں بہت جھوٹ بولا، تم جھوٹے ہو، تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں تمہیں تمہارے جھوٹ پر وہی رویہ اختیار کر سکتی ہوں جو تمہارا ہو سکتا تھا۔'' اس نے کہا تو میں نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری مرضی ہے پی اون، تم مجھے دھتکار سکتی ہو، ایک لمحہ تاخیر کئے بغیر، مجھے قطعاً دکھ نہیں ہوگا۔''

''چلو چھوڑو ان ساری باتوں کو، تم تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ہم کہیں چلتے ہیں اور جی بھر کے باتیں کریں گے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جیسا تم چاہو، ویسے میں ان کپڑوں میں بھی برا نہیں لگ رہا ہوں۔'' میں نے اپنی جینز اور ٹی شرٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، تو آؤ، تمہیں لابی میں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔'' وہ بولی تو میں سمجھ گیا، وہ یونیفارم سے اپنا لباس بدلنا چاہ رہی تھی۔ پھر دونوں ہی کمرے سے نکلے، کمرہ لاک کیا اور لفٹ تک چلے گئے۔

ہم ''شاہانہ ہوٹل'' سے پیدل باہر نکلے اور سڑک پر آ گئے۔ یہ ساحل سے مخالف سمت میں تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا اور پتایا روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا جو اندھیروں کو دور کرنے کی ناکام کوشش تھی۔ ہم دونوں میں خاموشی تھی۔ مجھے تو معلوم تھا کہ میں نے پی اون سے کیا باتیں کرنی ہیں لیکن وہ کیا سوچ رہی تھی مجھے اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اچانک وہ رکی اور مجھ سے پوچھا

''تمہیں پیدل چلتے ہوئے کوئی زحمت تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''نہیں تو۔۔۔کیوں؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔

''اگر تم پیدل نہ چلنا چاہو تو کسی سواری سے چلتے ہیں۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کتنی دور جانا ہے، اور کیسے جانا ہے، اس کا فیصلہ تمہی نے کرنا ہے، میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی، پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''اتنا زیادہ دور تو نہیں ہے، خیر! یہ آگے کراس آ رہا ہے، وہاں سے ٹیکسی لے لیتے ہیں۔'' اس نے کہا اور قدم بڑھا دیئے تو پیدل چلتے ہوئے ہم میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔

تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم ساحل پر ہی جا ٹھہرے۔ وہ لکڑی سے بنایا ہوا جیٹی نما راستہ تھا جو دور سمندر تک چلا گیا تھا۔ وہیں مختلف رنگوں کی پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہوئیں تھیں اور اسی مناسبت سے چھوٹے چھوٹے میز تھے۔ ہم ان پر آمنے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ تبھی وہ بولی۔

''اس جگہ کو شمالی پتایا یا چاؤن بوری کہتے ہیں۔ یہ اوپن ایئر ریستوران بہت مناسب ہے، یہاں کی لوکیشن بھی اچھی ہے۔''

''ہوں! اچھا منظر ہے۔'' میں نے مصنوعی روشنیوں سے ماحول کو پرکشش بنانے کی کوشش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کھاؤ گے۔'' اس نے مینو میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا جو ویٹر وہاں رکھ گیا تھا۔

''پی اون! میں نہیں جانتا کہ یہاں سے حلال کیا ملے گا، میرا خیال ہے تم حلال کا مطلب سمجھ سکتی ہو گی؟'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتی ہوں اور اسی لیے یہاں لے کر آئی ہوں۔ یہاں سی فوڈ بنتا ہے اور چکنائی کے لیے پام آئل استعمال کرتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں مینو دیکھنے لگا۔ پھر کھانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ بولی۔ ''ہر مذہب اپنے طور پر پابندیاں لگا دیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ اپنی پہچان بنانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ورنہ ساری دنیا میں ہر شے کھائی پی جاتی ہے اور اس کا کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔''

''یہ تم کہہ سکتی ہو کہ تمہیں معلوم نہیں ہے، حلال اور حرام کا تصور جو اسلام نے دیا ہے وہ صرف کھانے پینے تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی

کیوں دیا گیا اور اس کے اثرات کیا ہیں، اسے ہی معلوم ہوگا جو اس کے بارے میں جاننے کی
کوشش کرے گا۔ حلال اور حرام کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں وہی جان سکتا ہے، جسے
پتہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اپنی الگ سے پہچان والی بات غلط نہیں ہے۔'' اس نے اپنی بات منوانی چاہی۔

''میں تمہارے خیالات کو رد نہیں کرتا، تم وہی کہو گی جو تمہیں معلوم ہے اور جو بات
تمہارے دماغ میں ہے ہی نہیں اور نہ ہی اس کا علم ہے، وہ تم کہاں سے کہہ سکتی ہو۔'' میں نے
اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں ذرا سی حیرت پھیل چکی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے بولی

''دیکھو دو باتیں ہیں، لیکن اصول کے مطابق درست تو ایک ہی ہے۔ اس کا فیصلہ
کیسے ہوگا؟''

''سچائی! جو پرکھی جاسکے، پھر اس سے انکار کرنے والا بندہ جاہل گردانا جاتا ہے اور
میں یہ بتا دوں کہ اصل رکاوٹ یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر سچائی سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں یا پھر
اتنے لاپرواہ ہوتے ہیں کہ سچائی جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا جو میز پر کہنیاں رکھے، ہاتھوں پر اپنا چہرہ ٹکائے میری طرف دیکھے چلے جا رہی تھی۔

''سچائی۔'' یہ کہہ کر اس نے ذرا سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''سب سے بڑی بات
تو یہ ہے بلال کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہی سچائی ہے۔ آج کے دور میں تو سفید جھوٹ کو بھی سچ
قرار دیا جاسکتا ہے۔''

''سچائی تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، وہ اپنا آپ ظاہر کر دیتی ہے۔
اصل چیز توجہ دینے کی ہے۔ اب جیسے تم نے کہا کہ سفید جھوٹ بھی سچ قرار دیا جاسکتا ہے تو یہ
کیسے ہوجاتا ہے؟ وہ کون سی چیزیں، عناصر یا قوت ہے جو جھوٹ کو سچ میں بدل دیتی ہیں۔ جس
مقصد کے لیے یہ سب کیا جاتا ہے وہ پورا ہو جائے تو پھر وہ سچائی بھی کوڑے دان میں پھینک دی
جاتی ہے۔ جس طرح تم نے الگ الگ مذہب کی پہچان کے بارے میں کہا، تم یہ بھی کہہ سکتی ہو
کہ ہر مذہب والوں نے اپنا اپنا خدا رکھا ہوا ہے۔ یہ بھی اپنی الگ شناخت کے لیے۔ کوئی ایک
خدا کو مانتا ہے، کوئی بے شمار خداؤں کو، کوئی مانتا ہی نہیں، جیسے تم۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''یوں تو کہنے کے لیے بہت کچھ ہے پی اون، کیا تم نے کبھی سوچا کہ اس کائنات کی
سب سے بڑی سچائی کیا ہے؟'' میں نے اس کی الجھی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔ ''دیکھو

وقت کوئی فلسفہ نہیں، اس وقت تو میں فقط تمہیں محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ یہ یقین کر لینا چاہتی
ہوں کہ تم میرے پاس ہو۔ اپنے وجود کے ساتھ، کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔'' اس
نے جذباتی ہوتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا جس کی ہلکی سی تپش میں نے محسوس کی۔ بعض اوقات
انسانی لمس وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو ہزاروں لفظ بھی نہیں کہہ پاتے۔ اس وقت میرا یہی احساس تھا
اور شاید یہی کچھ پی اون کی آنکھوں میں سے چھلک رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا بلکہ
خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کی جذبات کیفیت کیا ہو رہی
ہے، سو کتنے ہی لمحے دبے قدموں گزرتے چلے گئے۔ تب میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

''کچھ یقین آیا؟''

''ہاں! ویسا یقین جس کے بارے میں تم احساس رکھ ہی نہیں سکتے ہو۔'' اس نے
گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔

''یہی نا کہ ایک عورت، اس مرد کے وجود کو پا کر کیا احساس رکھتی ہے، جس کے
بارے میں اس نے اندر تک، دل کی گہرائیوں تک سوچا ہو۔ بلال، میں انٹرنیٹ کے اندھیرے
کو سمجھتی ہوں۔ لیکن نجانے مجھے کیوں یقین تھا کہ ایک دن تم مجسم وجود کے ساتھ میرے سامنے
ہوگے۔ جب ہم نے بات کا آغاز کیا تھا، انہی دنوں میں یہ خواہش ابھری تھی جو وقت کے
ساتھ ساتھ اتنی مضبوط ہوتی گئی کہ میری خواہش یقین میں بدل گئی۔ کبھی کبھی جب میں اپنے
آپ سے بھی غافل ہو کر سوچتی تھی نا تو تم مجھے اپنے پورے وجود کے ساتھ دکھائی دیتے تھے۔''
وہ نجانے کس دنیا میں کھو کر کہتی چلی جا رہی تھی۔

''تمہارے اس قدر مضبوط یقین کی وجہ کیا تھی؟'' میں نے پوچھا، جس میں حد درجہ
تجسس تھا۔

''پتہ نہیں کیوں؟'' وہ غیر شعوری انداز میں بولی، پھر اپنے آپ میں آتے ہوئے
بولی۔ ''بلال۔! میں نے ماورائی قوتوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ انڈین مائیتھالوجی اور ایسا
ہی بدھ روایت میں پڑھا۔ مجھے ایسا یقین بھی ہے کہ انسان اپنے آپ میں بے شمار صلاحیتیں
رکھتا ہے جو حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ میں جب بھی تمہارے بارے میں سوچتی تھی، یوں لگتا تھا کہ
میری سوچ پرواز کرتے ہوئے جاتی ہے اور پھر وہ کسی وجود کے ساتھ ٹکرا جاتی ہے۔ یونہی ہوا
میں تحلیل ہو کر بے جان نہیں ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی پرندہ کسی شاخ پر جا بیٹھے۔ بجائے اس کے
کہ وہ ہوا میں دم توڑ جائے۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"مطلب اگر تم چاہو بھی تو اس کا ثبوت نہیں دے سکتی ہو۔" میں نے ایک
تناظر میں کہا، جسے وہ نہ سمجھتے ہوئے بولی
"کیا تمہیں ثبوت چاہیے، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اس نے حیرت
آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔
"اوہ نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ میں اس بات پر خوش
کہ میں کوئی ایسی ہی بات کہوں تو تم کوئی ثبوت نہ مانگ لو۔" میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم
یوں کھل گئی جیسے چند لمحے پہلے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ پھر اگلے ہی لمحے چونکتے ہوئے بولی۔
"تم ان دنوں میں اچانک کیوں آ گئے ہو؟ کیا تمہاری شادی نہیں ہو رہی ہے۔"
"ہو رہی ہے۔ ساری تیاریاں بھی تقریباً مکمل ہیں۔" میں نے کہا۔
"تو کیا تمہیں ان دنوں وہاں اپنے گھر نہیں ہونا چاہیے تھا؟ کیا تمہاری تہذیب
روایات میں کوئی پابندی نہیں ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جب دوسرے لوگ انتظامات کر دیں تو پھر دولہا کا فقط انتظار ہی کیا جاتا
میرے پاس وقت تھا، پھر شاید کبھی وقت نہ ملتا، جبکہ میں۔۔۔ تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔" میں ایک
لمحے کو وہ بات کہنے لگا تھا جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا تھا، پھر میں نے وہ سچائی افشاء نہ
اور ایک دوسری بات کہہ دی۔
"تمہاری منگیتر خوبصورت ہے، میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں جو تم نے ا
میل کی تھیں۔ اب حقیقت میں وہ کیسی ہے یہ تم ہی بتا سکتے ہو۔" اس نے ہلکے سے قہقہے کے
ساتھ کہا۔
"وہ تصویروں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ خوبصورتی من کا
ہوتی ہے، وہ مجھے کیسی لگتی ہے، یہ میں ہی جان سکتا ہوں، حتٰی کہ میری منگیتر بھی نہیں جان سکتی
میں اس سے عشق کرتا ہوں۔" میں نے اس ماحول میں ماہا کو یاد کرتے ہوئے کہا۔
"تم اپنے دادا کا بھی بہت ذکر کرتے ہو۔" اس نے موضوع بدل دیا تو یونہی
میری فیملی کے لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگی، میں بتاتا گیا۔ اس نے اپنے بارے میں شا
بتاتا تھا کہ درمیان میں کھانا آ گیا۔ سفید چاولوں کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی، جس کے ایک جانب
اناس کے قتلے اور دوسری جانب تلے ہوئے آلو تھے۔ وہ کھانا کافی اچھا تھا، میں نے ڈٹ کر
کھایا، درمیان میں وہ وہاں کے بارے میں مجھے بتاتی رہی، یہ وہی باتیں تھیں جو میں وقتاً فوقتاً
اس سے پوچھتا رہتا تھا، اسے جو یاد آ جاتا وہ کہہ دیتی۔ جو دل کیا پوچھتی رہی۔ یہاں تک کہ

رات گہری ہونے لگی۔
"آج تم وقت پر گھر نہیں پہنچ پاؤ گی، کیا تمہارے گھر والے۔۔۔" میں نے پوچھنا
چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا
"تم شاید اپنے ماحول کے مطابق یہ بات کہہ رہے ہو، یہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے،
میرا باپ شراب پی کر کہیں اوندھا پڑا ہوگا۔ ماما تھکی ہاری نیند کی گولیوں کے زیر اثر سو رہی ہوں گی
اور میرے دوسرے بھائی کو مجھ سے کوئی غرض نہیں ہے، وہ مجھ سے بھی دیر سے آئے گا، میں اگر
ساری رات بھی گھر سے باہر رہوں تو کوئی مسئلہ نہیں۔" اس نے کچھ اس قدر یاسیت سے کہا جیسے
ابھی اس کا گلا رندھ جائے گا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ "کیا تم بور ہو گئے ہو؟"
"نہیں تو۔۔۔" میں نے کہا پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے سمجھایا۔ "میں
یہ چاہ رہا ہوں کہ تم وہ سارا وقت میرے ساتھ گزارو جتنا وقت میں یہاں پر ہوں۔ ایک لمحہ بھی کسی
دوسرے کو مت دو، پھر پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ ملاقات بھی ہو پائے گی یا نہیں، یوں سمجھو کہ
میں کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کر پا رہا ہوں، میں نے اسی احساس کے تحت کہا تھا۔"
"اوہ۔!" اس نے بے یقینی کی سی کیفیت میں میرے چہرے پر دیکھا پھر مسکراتے
ہوئے بولی، "ٹھیک ہے، میں زیادہ سے زیادہ وقت تمہیں دوں گی، میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا
چاہیے۔" اس نے کہا پھر اشارے کے ساتھ ویٹر کو بلایا، اس کے آنے تک میں نے اپنا
والٹ نکالا تو وہ بولی۔ "نو۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب تم میرے مہمان ہو۔"
"اگر میں تمہارے گھر پر آتا تو۔۔۔ اب چلنے دو۔" میں نے کہا اور گرے نوٹ اس
کی جانب بڑھا دیا۔ پھر ہم وہاں سے اٹھ آئے۔

❀......❀......❀

ماہا کی آنکھ کھلی تو چند لمحے کے لیے اسے اپنا وجود بھی اجنبی سا لگا تھا جیسے وہ ماہا نہ ہو
بلکہ کوئی اور ہی ہو۔ اوائل نومبر کے دنوں میں جبکہ ٹھنڈ پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی پیشانی
پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اک عجیب سی گھبراہٹ اس پر طاری تھی جیسے کسی قیمتی چیز کے کھو جانے
کے بعد کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسے اپنی اس کیفیت کی وجہ معلوم نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس وقت وہ
بلال کے کمرے ہی میں تھی، وہ رات گئے تک وہیں تھی۔ انٹیریئر ڈیکوریٹر اپنا کام ختم کر کے
اپنے لوگوں کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اسے کام پسند آیا تھا۔ بلکہ جس نے بھی دیکھا اس نے
تعریف کی تھی۔ سیاہ، کاسنی اور سبز کے مختلف شیڈز کے امتزاج سے حویلی کا وہ حصہ بہت دلکش
دکھائی دے رہا تھا۔ بس یہی ایک بلال کا کمرہ اس سارے ماحول میں الگ سا دکھائی دے رہا

تھا۔ یوں جیسے نئی نویلی دلہن کو پرانی قمیض پہنا دی جائے۔ ڈنر کے بعد وہ اور رقیہ اس کمرے میں آکر باتیں کرنے لگیں۔ انہی باتوں کے دوران ماہا پر یہ ''انکشاف'' ہوا کہ پچھلے چند ماہ سے بلال خاصا بدل گیا ہے۔ اس سے پہلے جو اس کا معمول ہوا کرتا تھا وہ نہیں رہا۔ پہلے تو وہ بس سونے کے لیے اس کمرے میں آتا تھا لیکن پھر وہ اس کمرے سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی تھی، رقیہ بھی اسے نہ سمجھ پائی تھی۔

''آخر وہ یہاں اس کمرے میں کرتا کیا رہتا تھا؟'' ماہا نے الجھتے ہوئے رقیہ سے پوچھا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم ماہا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، اس کا زیادہ تر وقت کمپیوٹر اور کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا وہ ایسا کیوں کرتا تھا، اس کی وجہ کیا تھی، میں نہیں جانتی۔'' اس نے صاف انداز میں کہہ دیا تو اسی ایک معمولی سے اشارے کے ساتھ ہی وہ نجانے کیا کچھ سوچتی چلی گئی۔ اسے بلال کا وہ لہجہ یاد آ گیا۔ جب اس نے کمرے کو نہ چھیڑنے کے بارے میں کہا تھا۔ اس نے ایک کونے میں پڑے ہوئے کمپیوٹر اور شیلف میں پڑی کتابوں کو دیکھا۔ اسے یہ یقین ہو گیا کہ بلال میں تبدیلی کیسی بھی ہو، وہ انہی کی وجہ سے آئی ہے۔ رقیہ جب سو گئی تو اس نے اٹھ کر شیلف میں رکھی کتابوں کو دیکھا، وہ سب تحقیقی موضوعات پر دین اسلام کی تشریح کرتی ہوئی کتابیں تھیں۔ وہ جس طرح ان کتابوں کو دیکھتی چلی جارہی تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بلال کوئی بنیاد پرست ہو، بعض موضوعات میں بڑی شدت تھی، ان میں بعض ایسی انگریزی اور اردو کتابیں بھی تھیں جن میں دین اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات کئے گئے تھے۔ ماہا کے ذہن میں یہ دھندلا سا سوال واضح ہوتا چلا گیا کہ فکشن پڑھنے والا بلال، اس قدر مذہبی کب ہو گیا کہ اس قدر نازک موضوعات پر کتابیں اس کی شیلف میں پڑی ہوتی ہیں۔ اس نے چند ایک کتابیں نکال کر دیکھا تو کئی صفحات نشان زد تھے۔ وہ انہیں پڑھنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مزید کی جانب بڑھی۔ تھک ہار کر جب اس نے کلاک پر نگاہ ڈالی تو رات گہری ہو جانے کے احساس سے چونک گئی۔ رقیہ پرسکون نیند میں تھی۔ جبکہ ماہا کی آنکھوں میں سے نیند غائب تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ بظاہر کہیں سے بھی مذہبی دکھائی نہ دینے والا بلال، اس قدر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیسے کرسکتا ہے؟

اسے تو سوچنے کا جیسے بہانہ مل گیا۔ بلال میں اتنی بڑی تبدیلی آ گئی اور اسے احساس تک نہیں ہوا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے احساس نہیں ہونے دیا یا پھر اس نے خود محسوس نہیں کیا؟ کہیں نہ کہیں کچھ ایسا ہے جس سے ان میں ربط باہم نہیں رہا تھا۔ ورنہ بچپن سے لے کر اب تک ذرا سے تبدیلی بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کپڑے بھی اسی کی پسند کے مطابق پہنتا تھا۔ تو پھر یہ کیا ہے؟ اس کے اندر یہ تبدیلی کیسے اور کب آ گئی؟ اس کے لاشعور کی پہنائیوں میں بھی یہ نہیں تھا کہ یہ تبدیلی کیسی ہے، اچھی ہے، یا اچھی نہیں۔ اس بارے تو اس کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ اسے تو یہ فکر لاحق تھی کہ انگریزی ادب سے دلچسپی کے ساتھ اس کا ذہن بہت سارے انگریزی لکھنے والوں سے مرعوب تھا۔ بہت سارا لٹریچر تو اس کے پاس پڑا تھا۔ ان کی زندگی میں بہت سارا وقت ایسی بحث و مباحثے میں گزر جاتا کہ کس نے کیا اور کیسا لکھا ہے۔ ان کے درمیان بے تکلفی اس حد تک تھی کہ مشرقی ماحول میں شرمناک سمجھی جانے والی باتوں پر وہ سنجیدگی سے گفتگو کرلیا کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جہاں مغرب میں مختلف افکار کی شہرت نے اس معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہاں ایسی انسانیت سوز روایات کا بھی اجراء ہوا جن سے مغربی معاشرہ خود تنگ آچکا ہے۔ اور اس کے اثرات آئندہ نسلوں تک پہنچ کر انہیں انسانیت کے مقام سے بھی نیچے گرا چکی ہیں۔ مغرب سے درآمد ان افکار کو ایک خاص طبقے نے قبول کرنے کے بعد اسے اپنانے کی کوشش بھی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتشار کا شکار ہو کر رہ گئے۔ وہ نہ ان افکار سے مطمئن ہوئے اور نہ ہی اپنی بنیادوں پر مضبوط رہے۔ اسی لیے ماہا نے یہ خود میں ایک جھٹکا محسوس کیا تھا کہ بلال کے اندر تبدیلی کیوں اور کیسے ہوئی؟ کیونکہ وہ خود بھی ایسے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں جدید دنیا کے ساتھ چلنے کی کوشش میں اپنے بنیادی افکار بھول جاتے ہیں۔

ماہا نے بہت غور کیا۔ گزشتہ چند مہینوں میں وہ ان ساری ملاقاتوں کو یاد کرنے لگی جو بلال سے ہوئیں تھیں۔ یہ تھوڑی سی ملاقاتیں تھیں۔ ہر پندرہ دن بعد دو تین دن وہ یہاں گلاب نگر میں رہتا تھا۔ اس دوران ایک دو بار وہ ان کے پاس شہر بھی آتا جس میں زیادہ تر وقت وہ ان کے والدین کے ساتھ گزارتا، کھانا کھاتا اور واپس جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اگرچہ اس دوران ماہا اس کے قریب رہتی تھی لیکن وہ جو ''اپنی باتیں'' ہوا کرتی تھیں وہ سرے سے مفقود ہو چکی تھیں۔ ماہا نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اب اس نے جوان تھوڑی سی ملاقاتوں پر غور کیا تو بلال میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ چونک گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایک ایک ملاقات کو یاد کرکے تبدیلی کے بارے میں تجزیہ کرتی رہی۔ جس میں کچھ حقیقت تھی اور کچھ اس کی اپنی اندازہ ملی اختراع تھی۔ ہوتا ہے نا جب بندہ کسی شے کو نظر انداز کر دے تو بڑی بڑی خامیاں بھی نگاہ میں نہیں آتیں لیکن اگر کسی شے میں خامیاں تلاش کرنے کے لیے مشاہدہ کیا جائے تو بہت کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں بھی بہت بڑی بڑی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ایسی ہی

کچھ حالت ماہا کی بھی تھی۔ وہ ان ڈھیر ساری یادوں سے الجھتی ہوئی تھک گئی تھی۔ رقیہ بے خبر سو رہی تھی پھر دھیرے دھیرے وہ بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

رات کا نجانے وہ کونسا وقت تھا جب ماہا کی آنکھ کھلی تھی، وہ پسینے میں شرابور تھی اور اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حلق میں کانٹے اگ آئے ہیں۔ ان لمحات میں اس نے اپنے وجود کی طرف بالکل نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے اپنے سراپے پر ڈالنے کا ہوش تھا۔ وہ تو بس اس خواب کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اس نے دیکھا تھا۔ پورا خواب اسے یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اس خواب کے چند منظر ساکت تصویروں کی طرح اس کے سامنے روشن تھے۔ دھیرے دھیرے وہ ان مناظر میں دھندلی اور خالی جگہوں کو بھرنے کے لیے اپنے خواب کو دوبارہ یاد کرنے لگی جن کا ابتدائی سرا پھر بھی دھندلا رہا مگر دھیرے دھیرے منظر واضح ہونے لگے تھے۔

نجانے وہ زمین کا ٹکڑا کس ملک و مقام کا تھا لیکن تاحد نگاہ سیاہ تارکول کی چوڑی سڑک تھی جو نگاہ کی آخری حد پر جا کر ایک نقطے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ سڑک کے ایک جانب سمندر تھا، جس کا نیلگوں پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اس میں کوئی بھی لہر موجزن نہیں تھی جیسے نیلا چمکدار شیشہ زمین پر پھیلا دیا گیا ہو۔ اس میں اگر کشتیاں نہ چل رہی ہوتیں اور وہاں پرندے نہ اڑ رہے ہوتے تو وہ اسے شیشہ ہی سمجھتی۔ سڑک اور سمندر کے درمیان سفید ریت تھی۔ جس پر ہوا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب پھول ہی پھول تھے مختلف رنگوں کے پھول جو سبز تہہ میں اپنی منفرد بہار دکھا رہے تھے۔ وہاں تازگی کا احساس زندگی بخش بھی تھا۔ وہ دونوں سرخ اوپن کار میں سوار تھے۔ جس کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن سڑک نیچے سے سرکتی چلی جا رہی ہے جو سامنے موجود سنہری پہاڑوں میں سے کسی آبشار کی مانند بہہ رہی ہے۔ کہیں بھی کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا، بس وہ دونوں ہی تھے اور خاموش تھے۔ یہی خاموشی ان کی زبان تھی، اس زبان میں وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے۔ یہ گفتگو خالصتاً ان کی اپنی تھی جس میں صرف اور فقط دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان باتوں میں لفظ کوئی وجود نہیں رکھتے صرف ان کا احساس ہے جو اپنے سارے معنی و مطالب کے ساتھ تاثر کی رسائیاں بھی رکھتا ہے۔ وقت اور موسم جیسے ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک سنہری پہاڑوں میں سے سڑک کا چلنا بند ہو گیا۔ سنہری پہاڑ قریب قریب تر آنے لگے اور انہی پہاڑوں کے درمیان پہنچتے ہی نہ پھول رہے اور نہ سبزہ، شیشے سا سمندر بھی تحلیل ہو گیا اور وہ پہاڑوں کے اس کے پار اتر گئے جہاں سنہری ریت نے ان کا

استقبال کیا۔

ماہا کے لیے اس ریگستان کی ویرانی میں سوائے وحشت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اسی حیرت میں بلال کی جانب دیکھا، وہ بدل چکا تھا۔ سیاہ سوٹ اس کا سیاہ لبادے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے کار چھوڑی اور پیدل ہی چل پڑا۔ اس نے ماہا کی جانب مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس وقت ماہا حیرت سے چیخ پڑی جب اس نے بلال کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار دیکھی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر نہیں روک پائی۔ اس کی آواز تو جا رہی تھی لیکن اس میں سے اثر غائب ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی لیکن دونوں میں فاصلہ اتنا ہی رہا۔ وہ ہلکان ہو چکی تھی۔ آوازیں دے دے کر تھک چکی تھی لیکن بلال پر اک ذرا اثر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ اس تک پہنچ پا رہی تھی۔ تبھی اس نے دیکھا بلال ایک بڑے قافلے کے قریب جا کر رک گیا ہے جو اسی کی طرح سیاہ لبادے میں ملبوس تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار پکڑی ہوئی تھی جو چمک رہی تھی۔ ان تلواروں کی اس قدر چمک تھی کہ صحرا میں جیسے بجلیاں کوندر ہی ہوں۔ ماہا ششدر کھڑی اس منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے کہ بلال اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ ماہا نے اسے روکنا چاہا مگر وہ پھر بھی نہ رکا۔ اس نے قریب جا کر بلال کو بازو سے پکڑنا چاہا لیکن ایک جانب کھڑے شخص نے اسے بری طرح دھتکار دیا۔ وہ روتی چلاتی پھر بلال کی جانب بڑھی۔ تبھی آسمان پر سرخ آندھی نمودار ہو گئی۔ جس میں سے خوفناک سیاہ پرندے نمودار ہونے لگے ان کی چونچوں میں سے آگ نکل رہی تھی۔ آگ کا یہ طوفان بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا جس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ قافلہ تیار ہو گیا۔ قافلے کا ہر فرد ہوا میں اڑا اور ان پرندوں کا خاتمہ کرنے لگا۔ وہاں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ماہا کی نگاہ تھوڑی دیر کے لیے اس منظر میں الجھی تھی، پھر جیسے ہی اسے بلال کا خیال آیا اس نے دیکھا وہ وہاں پر نہیں تھا۔ وہ چیخنے لگی، اسے آوازیں دینے لگی کسی طرف بھی اسے بلال دکھائی نہیں دیا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

''آہ بلال! کہاں ہو تم؟'' اس نے لرزتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ اس کے سامنے آ جائے۔ وہ اس کے وجود کو دیکھ کر اس کی سلامتی کا احساس اپنی روح تک میں اتار لینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا، اس سے دور بہت دور کسی دوسرے دیس میں وہ تھا۔ اس نے ساتھ پڑی رقیہ کی جانب دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بیڈ پر سے اٹھی اور کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ پرانے طرز کی وہ لکڑی سے بنی ہوئی کھڑکی اس سے کھل نہ سکی۔ وہ گہری سانس کے ساتھ واپس ہوئی اور پھر کمرے سے نکل کر باہر کاریڈور میں آ گئی، جہاں سرد ہوا لگنے سے اس پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ ٹھنڈک کا یہ احساس

اسے اچھا لگا وہ ہولے ہولے لرزنے لگی تو ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کے
میں وہ خواب یوں طاری ہو چکا تھا جیسے کسی پرندے نے اپنے پنجے گاڑھ لئے ہوں۔ اس
باہر اندھیرے میں جھانکا اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ پر قابو پانے لگی۔

وہ مسلسل سوچتی چلی جارہی تھی۔ بلال کے قریب کی خواہش اور خواب کے دہلا
والے مناظر کے درمیان وہ ششدر کھڑی تھی۔ دونوں ہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے
کوئی ایسا راستہ یا ذریعہ ہے کہ جس سے وہ بلال کا قرب حاصل کر لے؟ یہ خواب کیا تھا اور
میں دکھائی دینے والے مناظر میں آخر کیا پیغام تھا؟ ایک دوسرے میں الجھی ہوئی سوچیں ا
بے چین کر رہی تھیں۔ بلال کا قرب تو وہ اس وقت حاصل نہیں کر سکتی تھی نہ ہی وہ ماورائی قوت
کی مالک تھی کہ چشم زدن میں اس تک پہنچ جائے اور نہ ہی وہ اس قدر قوت رکھتی تھی کہ ا
اپنے سامنے حاضر کر لے۔ اس کے پاس تو بلال کا وہ نمبر بھی نہیں تھا جس پر وہ دیارِ غیر میں با
کر سکتی۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔ اس کے بلال کے درمیان ایک طویل خلا تھا جسے وہ کسی بھی صور
پاٹ نہیں سکتی تھی۔ اور وہ خواب۔! اس قدر خوفناک خواب اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا وہ
بلال کے حوالے سے۔ اس نے سوچنا شروع کیا تو ایک دم خود پر ہنس دی وہ جو رات کے پ
پہر اس کے بارے میں اوٹ پٹانگ سوچتی رہی تھی، وہی کچھ اس کے خواب میں آ گیا۔ شاید
لاشعوری طور پر خوف زدہ ہو گئی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ ٹھٹک گئی۔ اس میں بھلا خوف زدہ ہو
کی کیا بات ہے؟ بلال اگر مذہبی ہو رہا ہے تو یہ اچھی بات ہے، ہر مسلمان کو پکا اور سچا مسلما
ہونا چاہیے تو پھر مجھے خوف کیوں آیا؟، میں کیوں ڈر گئی؟ فی الحال اس سوال کا جواب اس کی
سمجھ میں نہیں آیا لیکن اس کے ذہن میں تن کر اپنے ہونے کا احساس ضرور دینے لگا۔ دھیرے
دھیرے اس کی سوچیں تھک کر بوجھل ہو گئیں۔ اس کا جسم بھی کانپنے لگا تو وہ اٹھی اور رقیہ کے
ساتھ جا کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ کہاں پڑی ہے۔

دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سارا بدن تپ رہا تھا۔ ٹھنڈ کے باعث ا
بخار آ گیا تھا یا سوچوں نے اسے نڈھال کر دیا وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ ا
سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ وہ کمبل میں پڑی تھی کہ زبیدہ خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔

''ماہا بیٹی! بھئی کافی وقت ہو گیا ہے اب اٹھ جاؤ۔''

اسے یوں لگا جیسے اس کی چاچی کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے وہ جواب دینا چا
رہی تھی لیکن نہ دے پائی۔ اس پر زبیدہ نے اس کے بیڈ پر بیٹھ کر کمبل ہٹایا اور پیشانی پر ہاتھ ر
کر کہنے لگی۔

''ماہا۔!'' پھر چونکتے ہوئے بولی۔ ''ارے، تمہیں تو شدید بخار ہو رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھی اور باہر کی جانب لپکی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں پورا گھر آن موجود ہوا تھا۔ وہ سب تشویش زدہ تھے کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر وہاں آ گئی جو وہیں گلاب نگر میں حکومت کی طرف سے تعینات تھی۔ اس کے آتے ہی سب وہاں سے ہٹ گئے۔ صرف زبیدہ خاتون اس کے پاس بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا۔

''انہیں صرف موسمی بخار ہے، کوئی پریشانی کی بات نہیں۔''

''ماہا بیٹی کب تک ٹھیک ہو جائے گی۔'' زبیدہ خاتون نے انتہائی پریشانی سے پوچھا

''شام تک، میں دوائیں دے دیتی ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔'' ڈاکٹر نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ دوائیں دیں۔'' زبیدہ خاتون نے کہا تو ڈاکٹر نے اپنے بیگ میں سے کچھ دوائیں نکالیں پھر ایک دوا پرچی پر لکھتے ہوئے کہا۔

''یہ دوا آپ شہر سے منگوالیں۔ باقی یہ آپ انہیں دیں۔ انشاء اللہ یہ شام تک ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے یہ ابھی شہر سے آ جائے گی۔'' زبیدہ خاتون نے پرچی پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا مجھے اجازت۔'' ڈاکٹر بولی اور اٹھنے لگی۔

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔ ڈاکٹر صاحبہ نہ، چائے پی کر جائیے گا بلکہ اپنے سامنے ماہا بیٹی کو ناشتہ کروائیں، پھر خود دوائیں دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔'' زبیدہ خاتون نے فطری سادگی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''چاچی اماں! یہ فہد ہے نا باہر، آپ اسے دوا لانے کے لیے بھیج دیں۔'' ماہا نے کہا تو وہ فوراً ہی باہر کی طرف چلی گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر اسے دوائیں دے کر گئی تو ماہا اس کمرے میں گھٹن محسوس کرنے لگی جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔ اسے لگا کہ اگر وہ یہاں رہی تو بہت زیادہ بیمار ہو جائے گی۔ شاید یہ یہاں آنے اور رہنے ہی کا اثر تھا کہ وہ ایک دم سے بیمار ہو گئی ہے۔ اس نے ایک نظر وہاں موجود اپنوں کی جانب دیکھا۔ زبیدہ خاتون، رقیہ اور ایک نوکرانی تو بیڈ پر بیٹھی ہوئیں تھی۔ اس کا چاچا افضال نور تھوڑے سے فاصلے پر پڑے صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ہی دادا نور الٰہی۔

''انہیں کس قدر پیار ہے مجھ سے اگر بلال یہاں ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی میرے

قریب ہوتا؟'' یہ سوچتے ہی اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اس کے اندر سے ہاں یا ناں میں کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ ایک دم سے بے قرار ہوگئی۔

''چاچی اماں! میں کسی اور دوسرے کمرے میں جانا چاہتی ہوں جہاں گھٹن نہ ہو۔'' اس نے زبیدہ خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔ تمہاری طبیعت ذرا۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''میں ٹھیک ہوں چاچی اماں، خود اپنے پیروں پر چل کر جاؤں گی۔'' ماہا نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب کی جان میں جان آئی۔ اس وقت رقیہ نوکرانی کے ساتھ باہر چلی گئی تاکہ کمرہ ٹھیک کیا جاسکے۔ ذرا سی دیر میں وہ اس کمرے سے نکل آئی۔ دوسرے کمرے تک جب آئی تو سب کو اطمینان ہوگیا کہ ماہا اب ٹھیک ہے اس لیے سوائے زبیدہ خاتون کے کوئی دوسرا اس کے پاس نہیں رہا۔ اچانک اسے خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''ماما کو آپ نے بتایا؟''

''نہیں! وہ یونہی پریشان ہوں گی۔ تم ذرا ٹھیک ہو جاؤ تو بتا دیتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''مت بتائیے گا، میں شام تک ویسے بھی گھر چلی جاؤں گی۔'' ماہا نے کہا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ تب زبیدہ خاتون وہاں سے اٹھ آئی۔ تو اسے پھر سے نیند آنے لگی۔

وہ کچھ دیر ہی سوئی ہوگی کہ فہد شہر سے دوا لے کر آ گیا۔ اس نے آتے ہی اسے دوا دی اور پھر اس کے قریب بیٹھ گیا، تب ماہا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت رش ڈرائیونگ کی ہوگی آپ نے جو اتنی جلدی دوا لے آئے ہو۔''

''نہیں! ایسا بھی نہیں ہے بس سیدھے شہر پہنچا اور دوا لے کر واپس آ گیا۔ ویسے بائے دی وے اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔ وہ کل سارا دن مصروف رہی ہوں اور بلال والے کمرے میں نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی نا تو شاید بے آرامی کے باعث یہ بخار آ گیا ہے۔ شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماہا نے کہا۔

''ہاں، میرے خیال میں اب تم آرام کرو، خوب نیند لو۔ تو۔۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن ماہا نے ٹوک دیا۔

''لیکن یہ یاد رہے کہ شام کو واپس جانا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ بھئی ماما یہاں آ رہی ہیں وہ میرا خیال ہے دوپہر کے بعد تک یہاں پہنچ جائیں گی۔'' فہد نے کہا۔

''نجمہ پھوپھو؟''

''ہاں بھئی، تمہاری نجمہ پھوپھو، پھر اگر وہاں سے واپس۔۔۔''

''اچھا، فی الحال تو میں سو رہی ہوں، دوپہر کے بعد فیصلہ کریں گے۔'' ماہا نے اچانک اکتاتے ہوئے کہا اور خود پر کمبل لے لیا۔ فہد اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ماہا اچانک چڑچڑی سی کیوں ہوگئی ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے سے چلا گیا اور ماہا سونے کی کوشش کرنے لگی۔

❁……❁……❁

دروازے پر دستک کے باعث میری آنکھ کھل گئی۔ اجنبی دیار میں نیند ویسے بھی گہری نہیں آتی، ایک لاشعوری خوف ساتھ میں لپٹا رہتا ہے۔ اگلی بار جیسے ہی دستک ہوئی تو میں بیڈ چھوڑ چکا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر موجود دروازہ تھا، میں نے کھولا تو میرے سامنے تروتازہ پی اون کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بلند تھا، شاید دستک دینے لگی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ کھل گئی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح مسکرا دی تھیں جیسے انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ہو۔ اس کا تازہ دم چہرہ دیکھ کر مجھے بھی فرحت کا احساس ہوا۔

''صبح بخیر!'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے جواب دیتے ہوئے دروازہ پورا کھول کر وہاں سے بیڈ کی طرف پلٹ آیا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کل کی مانند عام سا لباس پہنا ہوا تھا۔ نیلی جین پر آف وائٹ شرٹ، پاؤں میں سیاہ رنگ کے جوگر۔ بال حسبِ معمول کھلے ہوئے تھے جن پر بینڈ لگایا ہوا تھا۔ کلائی میں ننھی سی گھڑی۔ وہ کمرے میں آتے ہی میرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر بڑے بے تکلفی سے بولی۔

''آثار بتا رہے ہیں کہ تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔''

''ہاں، ابھی تمہارے آنے سے جاگا ہوں۔'' میں نے خمار آلود لہجے میں کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے ہاتھ انٹرکام کی جانب بڑھایا اور تھائی میں بات کرنے لگی، کچھ دیر بعد اس نے ریسیور رکھا اور پھر میری جانب دیکھ کر کہا۔

''ناشتہ آ رہا ہے، تم فریش ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے کہا اور باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ میں نہا دھو کر فریش ہو۔ پھر کمرے میں آیا تو وہ ناشتہ میز پر سجائے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے تم نے بھی نہیں کیا؟'' میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کل اچانک چلی گئی تو پھر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں

لگا۔ بہت دیر سے سوئی اور صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ تب میں بس یہاں آ گئی۔'' اس نے اور میری جانب دیکھنے لگی۔

''ہاں، رات میں خود حیران تھا، تم اچانک ہی جانے کی باتیں کرنے لگی، حالانکہ نے تو میرے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔'' میں نے ناشتے کی جانب متوجہ ہوتے ہو کہا۔ ''کیا وجہ تھی؟''

''اس کی وجہ کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آ رہی ہے، جب اچھی طرح سمجھ جاؤں گی تو دوں گی۔'' اس نے واضح طور پر میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ پھر ہمارے درمیا خاموشی آن ٹھہری۔ یہاں تک کہ میں نے ناشتہ ختم کر لیا اور اپنے لیے چائے بنالی تو اس نے کہا

''اس وقت تم نے نہیں پوچھا کہ یہ کھانا حلال ہے یا نہیں؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''اس لیے کہ میں نے تم پر اعتماد کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم نے حلال ہی منگو ہوگا، ویسے مجھے نہیں لگتا کہ اس میں۔۔۔''

''پریشان نہیں ہونا، سب حلال ہے، اس وقت آنگ باورچی کچن میں ہے۔ چاہ تو اس سے تصدیق کر لو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کھانا میں نے تم پر اعتماد کیا۔'' میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور چائے کا سپ لے لیا تو وہ مجھے ناشتہ کے بارے میں تفصیل بتانے لگی۔ مقصد فقط یونہی گپ شپ تھا۔

ویٹرس برتن اٹھا کر لے گئی تو پی اون نے اٹھ کر پردے ہٹا دیئے۔ کمرہ ایک دم سے روشن ہو گیا۔ وہ کھڑکی میں کھڑے کھڑے بولی۔

''تمہیں آئے تین دن ہو گئے ہیں اور تم نے پتایا ابھی تک نہیں دیکھا، کیا تم دیکھنا نہیں چاہو گے؟''

''نہیں، اور وہ اس لیے کہ میں یہاں صرف تمہارے لیے آیا ہوں، تم سے ملنے، تم سے باتیں کرنے۔ مجھے شہر سے کوئی غرض نہیں۔'' میں نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

''اور اگر دونوں کام ساتھ ساتھ ہو جائیں، ہم ساتھ میں بھی رہیں اور تم شہر بھی دیکھ لو۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جیسا تم چاہو۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''اس شہر کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا

''وہی جو تم نے بتایا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر موڈ ہو تو باہر نکلتے ہیں، ورنہ یہیں۔۔'' اس نے کہتے ہوئے اپ

بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم نے اپنی جاب پر جانا ہے، اس کے۔۔۔'' میں نے کہا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔

''میں نے چھٹی کر لی ہے۔ تمہارے جانے تک میں کام پر نہیں جاؤں گی، تمہارے ساتھ رہوں گی۔'' اس نے اک ادا سے کہا تو میں ایک دم سے خوش ہو گیا۔

''واؤ، یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب جیسے تم چاہو۔'' میرے لہجے میں خوشی کا تاثر پا کر وہ کھل اٹھی، پھر وہیں سے باہر ساحل پر دیکھتے ہوئے بولی۔

''ساحل پر جانا پسند کرو گے۔ وہاں بہت ساری تفریحات ہیں۔'' اس نے یونہی پوچھا تو میں نے فوراً جواب دیا۔

''جیسا تم چاہو، میں نے کہا ہے نا۔''

''اوکے! تو پھر تیار ہو جاؤ۔'' اس نے ایک دم سے کہا تو میں اٹھ گیا۔ نجانے وہ کیا چاہتی تھی۔

ہم ''شاہانہ ہوٹل'' سے باہر آ گئے تو ٹیکسی کے ذریعے ساحل تک جانے کا سوچا لیکن میں ابھی وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سوائے ہلا گلا ہونے کے اور کچھ بھی نہیں تھا، جبکہ میں پی اون کے ساتھ سکون سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جہاں ہمارا ہوٹل تھا، اس کے ساتھ ساحل پر تفریح کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا۔ پتایا بیچ کے لیے ایک مخصوص علاقہ تھا جس پر ساحل کے ساتھ ساتھ بیچ روڈ بھی تھا۔

''پی اون! کیا ہم کسی پرسکون سی جگہ پر نہیں جا سکتے۔ جہاں ہم فقط باتیں کریں۔'' میں نے سڑک کنارے اس سے کہا

''کیوں نہیں! لیکن فقط باتوں کے لیے ہوٹل کا کمرہ اتنا برا تو نہیں تھا، خیر! آؤ، ہم بہت ہی پرسکون جگہ پر چلتے ہیں، یہیں پیدل کا سفر ہے۔''

''چلو!'' میں ایک دم سے تیار ہو گیا تو اس نے قدم بڑھا دیئے۔

''تمہیں پتہ ہے بلال پتایا کبھی ایک چھوٹی سی اک ساحلی بستی ہوا کرتا تھا۔ جس کے بارے میں دنیا کو معلوم تک نہیں تھا کہ ایسی بستی کہیں اس دنیا میں موجود بھی ہے یا نہیں۔'' پی اون نے میرے ساتھ چلتے ہوئے بنا شروع کیا۔ میں نے کوئی سوال نہیں کیا تو وہ کہتی چلی گئی۔

''اصل میں اس شہر کا نام ''پاؤ تھایا'' ہے۔ اس کا مطلب جنوب مغرب سے شمال مشرق کی جانب چلنے والی وہ ہوا جو بارشوں کے موسم سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ بعد میں یہ فقط پتایا رہ

گیا۔ اس شہر کی قسمت اس وقت جاگی، جب 1961ء کے اوائل میں تقریباً سو امریکی یہاں آئے۔ یہ وہ امریکی فوجی تھے جو ویت نام کی جنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ یہاں وہ تفریح کی غرض سے آئے تھے۔ پھر بعد میں امریکی بھگوڑے فوجی بھی یہاں آنے لگے۔ جلد ہی یہ علاقہ ترقی کرتا چلا گیا۔ ایک ساحلی بستی اب جدید شہر میں تبدیل ہو چکی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے پی اون! امریکیوں کی یہاں آمد سے اس شہر کی قسمت جاگی ہے یا ان کے باعث تمہاری نسلیں تک تاریک اندھیرے میں دھنستی چلی جا رہی ہیں؟" میں نے کہا تو اس نے میری جانب دیکھا اور پھر بڑے تحمل سے بولی

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ امریکیوں نے اس شہر کا رخ صرف عیاشی کے لیے کیا تھا۔ وہ سب ذہنی طور پر بیمار اور شکست خوردہ تھے۔ یوٹاپو ایئر پورٹ ہونے کی وجہ سے امریکیوں نے اس بستی، بلکہ پورے علاقے کو "آرام اور سکون" کا علاقہ قرار دے دیا تھا۔ ان کے لیے عورت اور شراب کے لیے علاوہ آرام و سکون کیا تھا۔ پوری قوم کو جنسی بے راہ روی پر لگانے والے یہ امریکی ہیں۔" پی اون نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی جیسے یہ سب کہتے ہوئے اچھا نہ لگ رہا ہو۔ میں چپ رہا تو وہ کہنے لگی۔ "یہ جو شہر میں اونچی عمارتیں ہیں، ترقی ہے یا چھوٹی چھوٹی ماہی گیروں کی کشتیاں اب عیاشی کے بجرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب فقط دولت کمانے کے لیے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہاں بدھا کی عبادت ہوتی ہے بلکہ میں یہ جانتی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں کہ یہاں دولت کی عبادت کی جاتی ہے۔ بدھا کے مجسمے پر جو ہار ڈالا جاتا ہے، اس میں بھی نوٹ پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟ میں جانتا ہوں۔ تمہاری قوم کو بھوک سے مر جانے کا خوف ہے۔ اس کے پاس کوئی مقصد بھی نہیں ہے جس کے لیے وہ جئیں۔" میں نے کہا۔

"یقیناً! مر جانے کا خوف اس قدر گہرا ہے کہ ان کے اندر ہر طرح کی بھوک چمک اٹھی ہے۔ یوں تو تھائی لینڈ کا مطلب آزاد لوگوں کی سرزمین ہے۔ یہ ملک کبھی بھی نو آبادیت کا شکار نہیں ہوا ہمیشہ آزاد رہا ہے۔" وہ قدرے فخر سے بولی۔ میں نے اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے وطن سے ہر انسان کی محبت فطری بات ہے۔ میں اس معاملے کو اچھی طرح سمجھتا کیونکہ میں بھی اپنے وطن سے لگاؤ رکھتا ہوں۔ لیکن پی اون! میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آزادی کس شے سے؟ کیا تم میری بات سمجھ رہی ہو؟" میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"یہی کہ ہم کسی کے غلام نہیں رہے، جیسے تمہارا ملک برطانیہ کا غلام رہا ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں تم لوگوں نے مزاحمت نہیں کی اور امریکیوں نے اپنی مرضی کا سب کچھ یہاں کر لیا۔ ہمارے ہاں سخت قسم کی مزاحمت پائی گئی تھی اور پھر انہیں یہاں سے نکال دیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے امریکن نے یہاں اپنی مرضی کا کیا کیا؟" اس نے میری بات نظر انداز کر دی اور ایک خاص نکتے پر پوچھا

"دیکھو! جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بدھ ازم میں مادیت پرستی نہیں ہے۔ ان کے طرزِ زندگی میں روحانیت پر زور دیا جاتا ہے لیکن تمہاری یہاں کی وہ معاشرت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہر شخص روحانیت سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے اور وہ مادیت کا پوری طرح شکار ہو چکا ہے۔ تم اپنے آپ پر غور کرو، تم خدا کو نہیں مانتی لیکن باقاعدگی سے واٹ جاتی ہو، یہ کیا ہے؟" میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں سچ کہوں گی، میں نے بہت سوچا ہے لیکن اس کی وجہ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی ہے۔" اس کے صاف انداز میں کہہ دیا تو میں مسکرا دیا۔ پھر کہا

"لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

"مطلب! تم جانتے ہو کیسے جانتے ہو، کیا ہے یہ؟" اس نے پوچھا۔

"ہر انسان کے اندر روح موجود ہے، اس کا موجود نہ ہونا مطلب موت ہے، زندگی نہیں۔ جب تک روح جسم کے اندر موجود ہے، اس کے بھی تقاضے ہیں۔ ہم وہ لاشعوری طور پر پورے کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تمہارے ہاں کے لوگ ہی ایسا کرتے ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے، وہ اپنی اصل کی جانب لوٹنا چاہتا ہے اور ہوتا یہ ہے کہ اسے نہ راستے بارے معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی طریقہ آتا ہے۔ اس معاملے میں ایک دوسری بات یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں، ضروری نہیں کہ اس کا وجود بھی نہ ہو۔ لاعلمی ہماری کوتاہی ہے، اس حقیقت کی نہیں جس تک ہم رسائی نہیں کر سکتے۔" میں نے دھیرے دھیرے اسے سمجھایا۔ وہ خاموش رہی جیسے میرے لفظوں کی تہہ میں اترنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ویسے بھی ہم ایک موڑ پر تھے جس کے بعد طویل راستہ دکھائی دے رہا تھا اور پھر وہ لکڑی سے بنا ہوا پگوڈا بھی نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہاری یہ بات تو مانتی ہوں کہ انسان سکون کی تلاش میں کہیں نہ کہیں اپنی توجہ لگاتا ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہ رہی ہوں کیا مسلمان بھی ایسی لاعلمی کا شکار ہوتے ہیں جو اپنے طور پر بہت مذہبی اور بنیاد پرست ہوتے ہیں۔" اس نے بات کا رخ میری جانب موڑ دیا۔ اس پر

میں نے بلا جھجک کہا۔

''بالکل! ایسا ہے، بہت سارے مسلمان لاعلمی میں اپنے بنیادی عقائد میں پوری طرح خالص نہیں ہوتے۔ لیکن دراصل تم جو پوچھنا چاہ رہی ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ چاہے مسلمان کس قدر ناواقف ہو لیکن اس کا تعلق پوری طرح اپنی روح سے جڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ بھی کوشش کرے تو، کیونکہ اسلام یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کا مرکز ایک ہی ہے، سب کی فطرت ایک سی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ ازلی سچائی تک پہنچ پاتا ہے یا نہیں؟''

''بلال! نیٹ پر بات کرتے ہوئے اور اب بھی تم ''ازلی سچائی'' کے بارے میں بات کرتے ہو، جہاں سے ہماری بات کبھی بھی آگے نہیں بڑھی۔ میں اس ازلی سچائی کے بارے میں جاننا چاہوں گی۔'' اس نے بڑے تجسس سے وہ بات کہہ دی جو میں اس کی زبان سے سننا چاہ رہا تھا۔

''ازلی سچائی! کوئی بھید نہیں بلکہ روشن حقیقت ہے، جسے کوئی بھی انسان معلوم کر سکتا ہے۔ اسے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، اس سے ازلی سچائی کو ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا تو اس وقت تک ہم لکڑی سے بنے ہوئے پگوڈے کے باہر والے دروازے تک آ پہنچے۔

''ایک منٹ، میں ٹکٹ لے لوں۔'' پی اون نے لپکتے ہوئے کہا اور ایک جانب بڑھ گئی۔ میں اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا، میرے ذہن میں لاتعداد دلیلیں اپنے اظہار کے لیے بے چین ہو گئی تھیں اور میں انہیں محسوس کرنے میں لاشعوری طور پر مصروف ہو گیا۔ وہ ٹکٹ لے آئی تھی۔ ''ہم اندر کی جانب بعد میں جائیں گے پہلے ہم بات پوری کریں گے۔'' وہ کہتے ہوئے ایک جانب بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتا ہوا گھرے درختوں کی چھاؤں میں لکڑی سے بنے ہو بینچ پر جا بیٹھا۔ وہ میری جانب متوجہ تھی۔ تب میں نے کہا۔

''اس دنیا ہی کی نہیں، اس پوری کائنات کی ازلی سچائی وہ ہے جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا اور پھر اس کا نہ صرف نگہبان ہے بلکہ اس سارے نظام کو چلا بھی رہا ہے۔ حتیٰ کہ مادی وجود کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے سے لے کر غیر مادی احساس تک، اس کی رسائی ہے اور یہی اس کا ثبوت ہے۔''

''بلال، میں نے کہا ہے نا کہ میں کہانیوں، روایتوں اور گھڑی ہوئی باتوں پر یقین نہیں رکھتی، بدھا کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا، لیکن اسے عقل تسلیم نہیں کرتی، یہ کیسے ممکن ہے بلال کہ ہر مادی ذریعے اور غیر مادی احساس تک کو وہ قوت دیکھ رہی ہے لیکن ہمیں اس کا

احساس تک نہیں۔ اصل میں یہ مذہب کی تشکیل میں جو کہانیاں یا دوسرے لفظوں میں مائیتھالوجی ہوتی ہے وہ ایک خاص قسم کا فلسفہ ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد میں انسانی ذہن کو اپنے حصار میں لے لیا جاتا ہے اور اپنے من پسند خیال اس میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اب جیسے انڈین مائیتھالوجی میں ہے۔ کیسی عجیب وغریب کہانیاں ہیں۔ جو کسی بھی کسوٹی یا معیار پر پورا نہیں اترتی ہیں۔'' وہ اپنی رو میں کہتی چلی گئی تھی مگر میں نے اسے ذرا سا بھی نہ ٹوکا بلکہ انتہائی تحمل سے اس کی بات سنتا رہا۔

''اصل میں تم ایک ہی سانس میں بہت ساری باتیں کہہ جاتی ہو۔ میں تمہارے خیالات کو رد نہیں کرتا، میں تمہارے خیالات کا پورا پورا احترام کرتا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ تم نے ایک کسوٹی کے بارے میں کہا۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کسوٹی یا معیار کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، پھر اس کی طرف سے کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''اور دوسری بات، یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے نظریات، افکار اور فلسفے موجود ہیں۔ سبھی سچائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ وہ کونسا معیار ہے جس پر کسی بھی نظریے، فکر یا فلسفے کی سچائی کو پرکھ سکیں۔''

''یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے طور پر کوئی معیار بنائیں اور وہ ٹھیک ہو۔'' وہ بولی۔

''اس کی وجہ؟، ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ہر طرح کے علم پر عبور نہیں رکھتے، بلکہ اپنے وجود تک کا ادراک نہیں ہے ہمیں۔ لیکن جب بھی ہم کسی بھی نظریے کو دیکھتے ہیں، اسے پرکھتے ہیں تو آخر میں کچھ نہیں ہوتا، سوائے چند نفسیاتی اصولوں اور خوفزدہ کر دینے والے خیالات کے۔'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''پی اون! دراصل تم تک حقیقت پہنچی ہی نہیں اور نہ ہی تم نے کوشش کی ہے تمہارے تمام تر خیالات ونظریات کی بنیاد وہ سب کچھ ہے جو تم تک زبردستی پہنچتا رہا ہے یا تم اپنے طور پر سوچتی رہی ہو۔ کچھ ایسا مسئلہ ہم مسلمانوں کے ساتھ بھی ہے جو خود حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ایسا ہر مذہب کے ماننے والے کے ساتھ ہوتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ میں کسی کا رد نہیں کرتا، لیکن حقیقت کے سامنے آ جانے کے بعد، روشنی میں ہر بندہ خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔'' میں نے صاف لہجے میں کہا۔

''کیا تمہارے پاس ازلی سچائی تک رسائی کا کوئی طریقہ ہے؟'' پی اون نے پوچھا۔

''ہاں! تم جس راستے پر بھی چلو، میں تمہیں اسی راستے پر چلتے ہوئے ازلی سچائی تک لے چلوں گا۔ وہ راستہ سائنس کا ہو، فلسفے کا ہو یا کوئی بھی مذہبی حوالہ ہو۔'' میں نے دل ہی دل میں اللہ سے توبہ استغفار کرتے ہوئے کہا۔ وہ لمحہ ہی ایسا تھا جہاں میں کمزور انداز میں بات نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے سامنے مجھے پورے اعتماد سے کہنا تھا لیکن اپنی کم مائیگی کا احساس بھی تھا۔

''سائنس کا راستہ ٹھیک ہے، مذہبی حوالے یا فلسفہ بہر حال اپنی پسند ناپسند پر ہوتا ہے کیا تم اس کے ذریعے مجھے ازلی سچائی تک پہنچا سکتے ہو؟'' پی اون نے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''تو ٹھیک ہے، ہم اس پر بات کرلیں گے۔ فی الحال تو آؤ اندر چلیں، تمہیں شاہکار دکھاؤں۔'' پی اون نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں بھی ساتھ میں اٹھ گیا۔

105 میٹر اونچے ''سینکیٹری آف ٹرتھ'' کو تھائی زبان میں جو بھی کہا جاتا ہوگا اردو میں اس کا ترجمہ یہی ممکن ہے ''سچائی کی مقدس جگہ۔'' لکڑی سے بنے اس پگوڈا نما کے بارے میں پی اون بتاتی چلی گئی۔ اس کے بارے میں پی اون نے بہت کچھ بتایا۔ مجھے اتنی ہی سمجھ آسکی کہ سرد جنگ کے بعد سے دنیا بہت تیزی کے ساتھ مادیت پرستی کی جانب مائل ہونا شروع ہوگئی اور ہنوز اس میں ترقی آتی چلی جارہی ہے۔ ہر انسان مادیت پرستی کے اس رجحان کو اولیت دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال جو بھی ہے اور جیسی بھی ہے اس میں یہ محسوس کیا گیا کہ وہ اقدار اور روایات جن میں روحانیت کا عنصر پوری طرح شامل ہوتا ہے دھیرے دھیرے مفقود ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انہی روایات کو زندہ رکھنے اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے یہ مقدس جگہ تعمیر کی جارہی ہے تاکہ اپنی روایات کو جو بہر حال اس قوم کی ہے انہیں محفوظ کرنے کے علاوہ اس کے احساس کو دوسروں تک منتقل کیا جائے۔ اسے مقدس جگہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں پر قوم کا ضمیر اور اس کی اصل سچائی ظاہر کی گئی ہے اس میں مذہبی اور سماجی روایات کو مدنظر رکھا گیا ہے جو مشرقی فلسفے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی تعمیر، تھائی ارب پتی لیک ولریا پھائی نے شروع کروائی تھی جو اپنی تہذیب، روایات اور انداز سے عشق کرتا تھا۔ 1981ء سے بنائی جانے والی یہ عمارت ابھی تعمیر ہورہی ہے جس میں فقط لکڑی ہی استعمال ہورہی ہے، جس کے بارے میں یہ امید کی جارہی ہے کہ 2025ء تک مکمل ہوجائے گی۔ میں نے وہاں مجسموں کے انداز اور ان کے سٹائل سے جب یہ اندازہ لگایا کہ اس میں ہندو دیوتاؤں کا پرتو بھی دکھائی دیا ہے تو پی اون نے بتایا کہ یہ انڈیا، چین، کمبوڈیا اور

لینڈ کی مائتھالوجی کو سامنے رکھ کر ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس پگوڈا کی ساخت بھی ایسی ہی تھی اس کے چار کونے تھے۔ میں خاموشی سے اس پگوڈا کے اندر پھرتا رہا، جس میں اپنے طور پر مشرقی تہذیب اور مائتھالوجی کی روایات کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں اس پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا تھا کہ آیا وہ مکمل طور پر کامیاب رہے ہیں یا نہیں کیونکہ میں اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مجھے جاننے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا! میں پی اون کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پگوڈا اندر اور باہر سے دیکھ لیا گیا۔ اس کے اطراف میں ایک جانب سمندر تھا، جس کی لہریں پگوڈے سے کافی دور پڑے پتھروں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی، اس کے ساتھ ساتھ اور آس پاس میں گھنے درخت اور سبزہ تھا جو ایک پارک کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جب پی اون تھک گئی تو واپس اس پارک میں ایک بنچ پر آبیٹھی، میں بھی وہیں آبیٹھا۔ تبھی اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ اس میں تخلیق کے ان سات عوامل کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کے بغیر انسان پیدا نہیں ہوسکتا۔''

''کون سے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے چند لمحے سوچا اور پھر بولی۔

''جنت، زمین، باپ، ماں، چاند، ستارے اور سورج۔۔۔ ان سات تخلیقی عوامل کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا دیا۔ میں جان بوجھ کر نہیں مسکرایا بلکہ یہ بے اختیار طور پر ہوا۔ اس نے میری جانب دیکھا اور بولی۔ ''مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہوگی کہ تم میری اس بات کا مذاق اڑاؤ، میں تو وہ معلومات دے رہی ہوں جو یہ دنیا کو دینا چاہ رہے ہیں۔ کیونکہ میں بھی ان افسانوی، دیومالائی قصے کہانیوں پر یقین نہیں رکھتی، جن کی کوئی عقلی توجیہہ نہ ہو۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارا قطعاً مذاق نہیں اڑا رہا ہوں بلکہ یہ سوچ کر مسکرایا ہوں کہ اس کو آٹھ کر دینا چاہیے یا پھر نو کیونکہ تخلیق روح کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی اور۔۔۔''

''میں نے کہا نا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتی، بلکہ کسی پر بھی کوئی یقین نہیں رکھتی ہوں۔'' وہ صاف انداز میں بولی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیا تم اس بات پر یقین نہیں رکھتی ہو کہ خدا موجود نہیں ہے؟'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچ میں ڈوبی رہی پھر بولی۔

''بلال۔! میں نہیں جانتی میرا ماحول، میری تعلیم اور میری اپنی سوچ، ان میں الجھاؤ ہے کہ انکار کے سوا میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے نہیں پتہ کہ خدا بھی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اگر ہے تو کیسے ہے؟، میں اگر واٹ میں جاتی ہوں تو اس لیے نہیں کہ میں وہاں پر عبادت کی غرض سے جاتی ہوں، بلکہ روایت کے طور پر محض اپنے اطمینان کے لیے کہ جب انتشار بڑھتا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ چند طریقے اپنانے سے یہ بوجھ کم ہو جاتا ہے۔'' وہ دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

''کچھ دیر پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ تجسس ہی کسی کی تلاش کے لیے ابھارتا ہے تجسس نہ ہو تو قریب پڑی شے بھی دکھائی نہیں دیتی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ یہ پگوڈا سچائی کا یہ مندر خود بخود بن گیا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے انتہائی حیرت سے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''تم ایسے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تم نے اس مقدس جگہ کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کیا، اس کا پس منظر، فلسفہ، بنانے والے کا نام، اس کا نقشہ اور اس کی بنیادیں، یہ سب کچھ، اور اس کا مقصد بھی بتا دیا۔ تمہارا کیا خیال ہے، میں، تم یا یہ پوری کائنات یونہی بن گئی ہے؟'' میں نے اس کے سامنے ایک سوچ رکھ دی۔

''اس کا مطلب ہے تم مجھے کوئی خاص فلسفہ سمجھانا چاہتے ہو؟''

''فلسفہ نہیں، حقیقت، یہ تم جو اپنے اندر انتہائی درجے کا انتشار لیے پھرتی ہو نا، اس کا حل ہے میرے پاس۔ میرے عقیدے کے لوگوں کے ساتھ بھی تمہارے جیسے حالات ہیں اور دنیا کے لوگوں میں بھی کیونکہ نہ تو وہ حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں اور نہ ہی خود پر رحم کھا رہے ہیں۔ یہ سادہ سی بات ہے، جب تک کوئی مشین اپنی صحیح سمت میں نہیں چلے گی وہ درست کام نہیں کر سکتی، اس کا ایک بھی پرزہ درست کام نہ کرے تو سوائے بگاڑ کے کچھ بھی حاصل نہیں ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''مطلب، میرے اندر یا دنیا کے کسی بھی انسان کے اندر جو بوجھ بڑھتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ اندر سے درست نہیں ہوتا؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

''مشین درست بھی ہو لیکن اس میں توانائی نہ ہو جو بہر حال باہر سے اندر کی جانب آتی ہے تو بھی۔۔۔ خیر، اس طرح کی میں اگر تمہارے سامنے ہزاروں مثالیں بھی رکھ دوں تو شاید تمہیں سمجھ نہ آئے۔ میں تمہیں کچھ بنیادی باتیں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ ہمہ تن گوش

ہوگئی۔ تب میں بولا۔ ''ہر خاکہ ایک خاکہ بنانے والے، ہر نقشہ ایک نقشہ ساز اور ہر منصوبہ ایک منصوبہ ساز کے وجود پر گواہی دیتا ہے کہ وہ ہے۔ اس مقدس جگہ کے بنانے والے سے میں متعارف نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، لیکن یہ پورا یقین ہے کہ وہ ہے۔ کیا تم مجھ سے اتفاق کرتی ہو؟''

''ہاں! تم درست کہہ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اسی طرح اس کائنات کے بارے میں یا اس میں موجود کسی بھی شے کے بارے میں دو ہی نظریے ممکن ہیں۔ ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کائنات محض اتفاق سے یا پھر حادثے کا نتیجہ ہے جس سے یہ تخلیق پا گئی۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اس کا تخلیق کرنے والا کوئی ہے۔ ان دو نظریات میں سے ایک نظریہ سچا اور درست ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں نظریات بیک وقت درست اور سچ ہو سکتے ہوں۔'' میں نے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا، جہاں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

''ہاں! فطری سی بات ہے کہ ان دو متضاد باتوں میں ایک درست ہو سکتی ہے۔''

''ہم پہلے نظریے کو لیتے ہیں، تخلیق کائنات محض اتفاق ہے، ایک حادثہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا کہنا ہے جو مادے کو اولیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ فنا نہیں ہوتا، یہ فقط صورت بدلتا ہے، صورت بدلنے کے بعد بھی یہ مادی ہی رہتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''ہاں! میں اس بات کی قائل ہوں۔ لیکن تم سے بحث نہیں کروں گی، بلکہ میں چاہوں گی کہ تم دوسرے نظریے پر بات کرو۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے یوں بولی، جیسے اس کے اندر تجسس پیدا ہو چکا ہو۔

''وہ لوگ جو کائنات کو محض حادثہ قرار دیتے ہیں۔ ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر مادہ ہی سے ہر شے خود بخود بن گئی ہے تو یہ عقل بھی کیا مادہ نے خود بنائی ہے، جس کے تابع ہو کر خود اپنی ہی تسخیر شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مادے کی اپنی حیثیت ایک غلام کی سی ہوگئی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہاں، مادہ ترقی کی مختلف منازل طے کرتا ہوا مقامِ عقل تک آ گیا ہے۔ چلیں مان لیتے ہیں لیکن ایسا کب اور کس دور میں ہوا۔ مادے کو عقل ہی آئی، اس میں زندگی، توانائی، روح وغیرہ کی صورت نہ آئی۔ اور وہ جو مادہ پرستی کے قائل ہیں ان کے نظریے پر تو اس وقت لکیر پھر گئی جب جوہری توانائی سے یہ ثابت ہو گیا کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور توانائی مادے میں بدل سکتی ہے۔ اس طرح حرکیات حرارت (Theroma Dymamics) کے قانون نے ثابت کر دیا کہ یہ مادہ عالم نہ ازلی ہے اور نہ

ابدی۔ لازماً اس کے شروعات کا ایک وقت ہے اور اسی طرح ایک وقت پر آ کر یہ ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے اب چاند، سورج اور دیگر نظامِ شمسی کی عمر وغیرہ کے بارے میں یقین کیا جا رہا ہے جو ظاہر ہے کہیں نہ کہیں سے نکتہ شروعات ہے۔''

''یہ تو تم محض مادے کی مخالفت میں بات کرتے چلے جا رہے ہو۔ تم اس میں ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟'' پی اون نے یوں کہا جیسے وہ اپنی حالت پر حیرت زدہ ہو گئی ہو۔

''میں بتاؤں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں، لیکن تم نے سائنسی اندازِ فکر سے خدا کے وجود بارے بات کرنے کے لیے کہا تھا، میں وہی کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش رہی۔ تب میں بولا۔ ''سائنسی اندازِ فکر یہ ہے کہ معلوم اور معروف حقائق کو دلیل بناتا ہے۔ پھر اس کی نفی یا اثبات کا اظہار تحقیق کے بعد کرتا ہے۔ سائنسی تحقیق کی پوری عمارت اس بنیادی تصور پر ہے کہ اس کائنات میں نظم و ترتیب ہے۔ بظاہر دیکھنے میں حیرت انگیز حد تک اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ان سب میں معنوی ربط پوری طرح موجود ہے۔ اب تحقیق کا میدان انسانی جسم کا ایک خلیہ بھی ہو سکتا ہے، زمین پر موجود مٹی کا ذرہ یا کچھ بھی۔''

''میں مانتی ہوں کہ یہی سائنسی اندازِ فکر ہو سکتا ہے لیکن خدا کے وجود کے لیے تم دلیل کہاں سے لاؤ گے۔ جس کو بنیاد بنا کر تم تحقیق کرو گے، اس کے لیے تو آلات چاہیے ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ سو فیصد درست ہوتا ہے۔'' پی اون نے اپنی بات کہی جو بہر حال درست تھی۔

''بنیادی دلیل یہ ہے کہ مادہ خود کیسے پیدا ہوا؟ یہ محض اتفاق یا حادثہ نہیں ہے۔ سائنسی تحقیق کیا ثابت کرتی ہے یہی نا کہ انسانی فائدے کی مادی اشیاء میں کوئی نہ کوئی افادیت ہوتی ہے جسے دریافت کیا جاتا ہے اور اسی بنا پر کسی مقصدیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ افادیت و مقصدیت کیوں رہتی ہے؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ مان لیا کہ اس میں ایک خود کار نظام ہوتا ہے۔ یہ ایک قانون کے تحت چل رہا ہے۔ لیکن یہ بات عقل سے ماورا ہے کہ مادہ وقوت نے خود اپنے اندر نظم پیدا کر لیا اور خود ہی اس کے ماتحت ہو کر چل رہا ہے۔ کوئی نظام کسی ناظم کے بغیر چلتا، کوئی قانون کسی قانون ساز کے بغیر بنتا، کسی حاکم کے بغیر نافذ ہو جاتا ہے؟ اس بارے میں تحقیق کیا کہے گی؟'' میں نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''ظاہر ہے اس پر تحقیق کر کے اس کی نفی یا اثبات کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ خدا کے وجود کو تم یونہی نہ قبول کرو، پوری تحقیق کرو، وجود خدا سے انکار اور وہ بھی اس جدید دور میں ممکن نہیں ہے، کیونکہ اگر کائنات محض حادثہ یا اتفاق ہوتی تو کروڑوں سال گزر جانے کے دوران اس نظام میں کہیں نہ کہیں خلل تو آتا، دن رات

ہی میں فرق پڑتا، یوں ایک سلسلہ ہے دلیلوں کا جس کا نتیجہ خدا کے وجود پر گواہی دے دیتا ہے، اس پگوڈے کی مانند ایک حقیری مینگنی یہ ثابت کر سکتی ہے کہ اونٹ کا وجود ہے تو ہمارے سامنے یہ پوری کائنات موجود ہے۔ اس میں بے شمار دلائل ہیں۔ اتنے دلائل ہیں پی اون کہ زندگی ختم ہو جائے اور دلائل ختم نہ ہوں۔''

''کیسے! یہ کس طرح ممکن ہے کہ دلائل ختم نہ ہوں؟'' وہ چونکی۔

''کائنات تو بہت دور کی بات ہے اگر ہم اپنے وجود پر ہی غور کریں تو کیا ہم خود بخود وجود میں آ گئے ہیں؟ یا ہم نے اپنے آپ کو تخلیق کیا ہے۔ ابھی تم نے انسان کی تخلیق کے لیے سات عناصر کا ذکر کیا۔ اس سے قطع نظر کہ یہ درست ہے یا غلط، بیرونی عناصر کے بارے میں ذکر کیا، ایک عقل مند، باشعور اور باصلاحیت مخلوق اپنے آپ کو پیدا کرنے پر قادر نہیں تو کوئی اس کے پیدا کرنے والا ہے۔ اگر مادہ اپنی تخلیق پر قادر ہوتا تو میں بھی مادہ ہوں تم بھی مادہ ہو۔ کیا ہم کوئی شے پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ چلو مان لیا، ماں اور باپ دو عناصر ہوں تو اپنے جیسا انسان بنا سکتے ہیں لیکن کوئی چیونٹی جیسی حقیر شے بنا سکتے ہیں؟ یہاں تک کہ ہم اپنے سفید ہوتے ہوئے بال سیاہ نہیں رکھ سکتے۔ مکھی اگر ہم سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے واپس نہیں لا سکتے، اس کائنات کی ذہین ترین مخلوق انسان اس قدر بے بس؟''

''تو اس میں انسان کا کیا قصور، اس کی کیمسٹری یا سمجھو اس کی ماہیت ہی ایسی ہے۔''

''جب تک وہ مادہ ہے، لیکن جیسے ہی وہ روحانی اعتبار سے ایک خاص مرکز کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے تو وہ مجبورِ محض نہیں رہتا، کسی شے کی کیمسٹری اس کی ہیئت و ماہیت پر دلالت نہیں کرتی۔ اب نظریہ جینز نے جہاں ڈارون کی تھیوری کو یکلخت کوڑے دان میں پھینک دیا ہے، وہاں اس نے خدا کے وجود کو بھی ثابت کیا ہے۔ ایک باریک سے ذرے میں پورے انسان اور اس کی وراثتی تاریخ موجود ہے۔ اس تاریخ کو مرتب کون کرتا ہے اور پھر اسے محفوظ کون رکھتا ہے۔ خلیے میں موجود جین میں پرورش کی پوری ''تقدیر'' پڑی ہوئی ہے۔ وہ تقدیر کہاں سے آئی؟''

''ہوں۔! تمہارے دلائل ٹھیک ہیں۔ لیکن ان سے خدا کا وجود اب بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کیا محض اشیاء کی ماہیت سے خدا کا ہونا قرار پاتا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''آج تک اس روئے زمین یا کائنات میں کوئی ایسی شے نہیں ملی، جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ پوری کائنات میں ایک ہی کیمسٹری کام کر رہی ہے۔ وہ ایک ہی مادے سے بنی ہے اور ان میں سے ایک ہی طرح کے قوانین کارفرما ہیں۔ لیکن میں تمہاری بات ہی کو لیتا

ہوں۔ ہم محض اشیاء کی بات نہیں کرتے، مجھے بتاؤ، وہ شخص بھی جو خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے تم بھی منکر خدا ہو، کیا تم اپنے اندر ضمیر رکھتی ہو؟ کون بولتا ہے انسان کے اندر؟'' میں نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گئی اور پھر ایک ٹک میری طرف دیکھتی چلی گئی۔

''بلال! تمہارے سائنسی دلائل نے مجھے اپیل کیا ہے، اس ضمیر والی بات پر میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر میں مانتی نہیں ہوں تو کم از کم اس پر سوچ تو سکتی ہوں۔ اور شاید یہ مضبوط دلائل ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔'' پی اون نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پی اون! ممکن ہے یہ سائنسی علم کی بنیاد پر کہے گئے دلائل تمہارے لیے اہمیت رکھتے ہوں لیکن میرے لیے یہ مچھر کے ایک پر کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟، اگر اہمیت نہیں تھی تو دلائل دیئے کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''صرف تمہیں سمجھانے کے لیے۔ خیر، میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، ایک ماہ پہلے سے ایک بات تمہیں معلوم ہو، جو محض اشارے سے تمہیں سمجھا دی گئی ہو، لیکن ایک ماہ بعد اس کی تشریح تمہارے سامنے آجائے تو باخبر کون ہوا؟'' میں نے پوچھا

''صاف بات ہے وہ جس نے پہلے بتایا۔'' اس نے کہا۔

''تو پیاری، یہ ساری حقیقت جسے آج کی سائنس انکشاف کی صورت میں ثابت کر رہی ہے یہ خدا نے چودہ سو سال پہلے ہی بتا دی ہیں۔'' میں نے بڑے آرام سے کہا تو وہ چونک گئی۔ اس پر ایک دم سے جیسے سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ پھر اچانک بولی۔

''تمہارا اشارہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کی طرف تو نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! دراصل جدید دور کے زیادہ تر سائنسدان عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے تھے۔ فطری طور پر انہوں نے معروف حقائق کو دلیل بنانے کے لیے انجیل یا بائبل کی جانب توجہ کی۔ وہاں خدا کے وجود اور کائنات کی تخلیق بارے اطمینان بخش جواب نہیں ہیں۔ اس لیے وہ گومگو کی کیفیت میں آگئے۔ جبکہ قرآن مجید ان کے تمام تر سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ بلکہ مزید تحقیق کی جانب اشارہ بھی کرتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، خدا کا وجود قرآن ثابت کرتا ہے۔ یہی وہی قرآن ہے نا جس میں جہاد کے متعلق بھی تعلیمات ہیں؟'' اس نے یوں کہا جیسے میری بات اسے پسند نہ آئی ہو۔

''پی اون! میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو، میں تمہارے اس سوال کا جواب

بھی تمہیں دوں گا، میں اب بھی تفصیل بتا سکتا ہوں لیکن تم مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں تمہیں۔۔۔''

''میں خدا کے وجود کی قائل ہوتی ہوں یا نہیں لیکن اس بات کی ضرور قائل ہوں کہ تم مسلمان، جہاد کے نام پر دنیا بھر میں دہشت گردی کر رہے ہو۔'' وہ انتہائی تلخی سے بولی۔

''تم جانتی ہو کہ جہاد کہتے کسے ہیں؟'' میں نے انتہائی تحمل سے پوچھا

''یہی کہ اپنی بات منوانے کے لیے تلوار کے زور پر لوگوں کو قائل کرنا۔'' اس نے اگلے ہی لمحے مجھے جواب دیا تو میں مسکرا دیا۔

''پی اون، کسی حقیقت کی غلط تشریح کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت بدلی جا سکتی ہے۔ انسان نے اب تک سورج کو جتنے بھی نام سے پکارا ہے وہ اپنی جگہ لیکن اس کی حیثیت وہی رہی ہے۔ تم چاہے اس کا نیا نام جتنی بھی نفرت یا محبت سے لے لو وہ ویسا ہی رہے گا۔ تم جہاد سے واقف ہی نہیں ہو۔ وعدہ رہا کہ اس کی حقیقت تم پر واضح کروں گا۔'' میں نے کہا تو وہ پہلو بدلنے لگی، پھر بولی۔

''بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرے خیال اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے واپس ہوٹل چلیں یا کسی ریسٹوران کا رخ کریں۔''

''جیسے تمہاری مرضی!'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہوٹل ہی چلتے ہیں۔ وہاں فریش بھی ہو جائیں گے اور تمہیں حلال کھانا بھی آنگ بنا دے گا۔''

''چلو!'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ ہمارا رخ باہر کی جانب تھا۔ پی اون کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ گہری سوچ میں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہے۔

* * *

دوپہر سے ذرا دیر قبل پھوپھو نجمہ کی آمد ہو گئی۔ وہ آتے ہی ماہا کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اسے فہد نے بتا دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تبھی زبیدہ خاتون اس سے ملتے ہوئے بولی۔

''ویسے تو اس کی طبیعت ٹھیک ہے، لیکن تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی ہے۔ اگر تم کہو تو اسے جگا لیتے ہیں۔''

''نہیں! پھر اسے آرام کرنے دیں۔ ممکن ہے وہ رات ٹھیک طرح سے سو نہ سکی ہو۔ ویسے ہوا کیا تھا۔'' پھوپھو نجمہ نے پوچھا۔

''پتہ نہیں، رات تو بھلی چنگی تھی، صبح اٹھی تو بخار تھا، مجھے لگتا ہے کہ کل سارا دن وہ

مصروف رہی ہے، وہ جو آئی ہوئی تھی ڈیکوریٹر۔ اس کے ساتھ۔'' زبیدہ خاتون نے تفصیل بتائی۔ شاید ان میں مزید باتیں ہوتیں لیکن اس وقت نورالٰہی باہر سے آ گیا تو وہ باپ سے ملنے لگی، یوں تھوڑی دیر بعد سب گھر والے وہیں جمع ہو گئے سوائے ماہا کے جو ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر سبھی جمع تھے۔ ماہا بھی اٹھ کر آ چکی تھی۔ پھوپھو نجمہ تو اس پر واری صدقے جا رہی تھی۔ اسے زبردست پرہیزی کھانا کھلایا گیا جو اس کے لیے خصوصی طور پر بنایا گیا تھا۔ پھر جب سارے اکٹھے ہو کر بیٹھے تو پھوپھو نجمہ نے بات چھیڑی۔

''یہ بھلا بلال اچانک کیوں چلا گیا ملائیشیا، اب اس کے انتظار میں یونہی کوفت ہوتی رہے گی۔''

''نوکری کے سلسلے ہیں نا، چلتے رہتے ہیں۔ ویسے تمہیں تو یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ تمہارا میاں خود سرکاری ملازم ہے۔'' نورالٰہی نے اپنے پوتے ہی کی طرف داری کی۔

''پھر بھی اباجی، آپ خود سوچیں، اس کے ہونے سے یہاں کا ماحول ہی کچھ الگ سا ہوتا۔'' پھوپھو نجمہ نے کہا

''ہاں! یہ تو ہے، خیر اللہ خیر کرے گا، چند دن بعد آ ہی جائے گا۔ ویسے تم نے اتنے دن کیسے نکال لیے، آگے پیچھے تو تم لوگوں کی مصروفیت ہی بہت ہوتی ہے گلاب نگر کا تو جیسے راستہ ہی بھول گئے ہو تم لوگ؟'' نورالٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مصروفیت کا تو کچھ نہ پوچھیں اباجی، یہ تو کوئی بہانہ ہی ہو تو نکلنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ جان چھڑا کے آئی ہوں۔ حالانکہ کہہ رہے تھے اس وقت ہی جاؤں جب ماہا وغیرہ لاہور کا چکر لگا لیں تو۔۔۔ انہیں بھی تو شاپنگ کرانا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ماہا کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''ویسے ماہا، کیا پروگرام ہے آپ لوگوں کا، ماما سے کوئی بات ہوئی؟''

''نہیں! اب آپ آ ہی گئیں ہیں تو خود ان سے پوچھ لیجیے گا۔'' ماہا نے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولی

''اب میں نور پور جانا چاہوں گی۔''

''ارے چندا! ابھی تو میں آئی ہوں۔ باتیں کرتے ہیں۔'' پھوپھو نجمہ نے لاڈ سے کہا۔

''پھوپھو! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر کو دکھاتی ہوں، آپ ہیں نا ادھر! میں پھر آ جاؤں گی یا آپ نے ادھر ہمارے گھر آنا تو ہے۔'' ماہا نے کہا تو نورالٰہی نے غور سے اس کی جانب دیکھا لیکن خاموش رہا۔ تبھی افضال نور نے کہا۔

''چلو بیٹی! میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

''ارے فہد جو بیٹھا ہے، یہ چھوڑ آتا ہے۔'' پھوپھو نجمہ نے جلدی سے کہا تو فہد اٹھ گیا۔ تب ماہا وہاں سے اندر کی جانب چلی گئی تھی۔

''یہ اچانک کیا ہو گیا ہے اس کو، کل تک تو چہک رہی تھی۔'' زبیدہ خاتون نے انتہائی تشویش سے کہا، پھر رقیہ سے پوچھا، ''تم اس کے ساتھ رہی ہو کوئی بات سمجھ میں آئی ہے۔''

''نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' رقیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ارے فکر کرنے کی ضرورت نہیں، وہی تھکن سے بخار آ گیا ہے۔'' نورالٰہی نے کہا اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

گلاب نگر سے گاڑی نکلی ہی تھی کہ فہد نے ساتھ بیٹھی ہوئی ماہا سے کہا۔

''ماہا! ویسے یہ اچانک بخار ہو جانے کی وجہ تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ اکتاتے ہوئے بولی۔

''اگر تم برا محسوس نہ کرو تو میں بتاؤں، تمہاری طبیعت کیوں خراب ہوئی ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا

''ہاں کیوں؟'' اس نے انتہائی اختصار سے کہا تو فہد نے کہا۔

''دراصل تم بلال کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگی ہو۔ سارے جو پوچھ رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی خوشگواریت تھی۔ تبھی ماہا جیسے پھٹ پڑی۔

''بات یہ نہیں، مجھے خود اپنی کم مائیگی کا احساس ہو رہا ہے۔ اس نے وہاں جا کر ایک بار بھی مجھے فون نہیں کیا۔ اپنی خیریت تک نہیں بتائی، اب یہ کیسی بات ہے کہ میرے پاس اس کا فون نمبر تک نہیں کہ میں خود ہی اس کی خیریت پوچھ لوں۔''

''ہاں! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن ماہا ذرا غور کرو، کیا اس نے کسی اور کو بھی فون کیا ہے؟ میرے خیال میں اس نے کسی کو بھی فون نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ وہاں پر بہت زیادہ مصروف ہو۔'' فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن فہد یہ سمجھو کہ میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ اسے پرواہ نہیں ہے، اور میرا خیال ہے اب نہیں ہو گی۔'' اس نے انتہائی مایوس لہجے میں کہا تو وہ چونک گیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' نے پوچھا

''مجھے نہیں پتہ!'' ماہا نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور پھر اچانک بولی، ''تم! کیا تم بھی اس کا نمبر نہیں جانتے ہو، اگر تمہیں معلوم نہیں تو کوشش کرو، اس کا نمبر تلاش کرو۔''

"ٹھیک ہے، میں اپنے دوست ذیشان سے پوچھتا ہوں، یا پھر اس کے کسی قریبی کولیگ سے، ممکن ہے اس کا کوئی سراغ مل جائے۔" فہد نے بڑے محتاط انداز میں کہا لیکن اس کے ذہن میں وہ بات رہ گئی جو کچھ لمحے پہلے تعلق کے حوالے سے ماہا نے کہی تھی۔ ان میں خاموشی چھا گئی تھی اور گلاب نگر سے نور پور کا راستہ کٹتا چلا جا رہا تھا۔ تب فہد ہی نے پوچھا۔

"وہ تمہیں روزانہ فون کیا کرتا تھا نا؟"

"ہاں۔" اس نے ہنکارے کے سے انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر اسے لازماً تم سے بات کرنا چاہیے تھی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تم سے کس قدر قریبی رابطہ ہے۔ اور رہی لاپرواہی کی بات تو چند ماہ سے وہ واقعتاً لاپرواہ ہو گیا ہے۔ اکثر اوقات وہ ہمیں وقت نہیں دیتا ہے۔"

"فہد! تم میرا ایک کام کرو، اس کے بارے میں معلوم کرو کہ آخر ان چند مہینوں میں تبدیلی آنے کی وجہ کیا ہے۔ کیوں ہو گیا ہے وہ ایسا، کن لوگوں سے رابطے ہیں اس کے؟" اس نے یوں کہا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن بہت کچھ چھپا بھی لینا چاہتی ہے۔ فہد کو احساس ہو گیا کہ ضرور کوئی بات ہے اسے ماہا کے رویے اور لہجے سے بہت سارے اندازے ہو رہے تھے۔

"وہ تو میں معلوم کر لوں گا، لیکن ماہا، کوئی ایسی مضبوط وجہ بھی تو ہو، اب اس نے تمہیں فون نہیں کیا تو اس کے بارے میں تفتیش شروع کر دیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے۔" فہد نے الجھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ اس کی بچگانہ بات پر تبصرہ کر رہا ہو۔

"دیکھو فہد! بلال اس وقت بہت ہی اہم پوسٹ پر ہے۔ کوئی بھی قوت اسے اپنے ساتھ ملا سکتی ہے۔ تم سمجھتے نہیں ہو کہ اس وقت ہمارے وطن میں کتنی قوتیں اپنا آپ منوانا چاہ رہی ہیں۔ میں یہ تو مانتی ہوں کہ وہ روپے پیسے کے لالچ میں نہیں آنے والا، مگر جذباتی طور پر یا مذہبی طور پر تو وہ کسی کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے رویے میں تبدیلی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ بہر حال بدل چکا ہے۔" ماہا نے بڑی مشکل سے اپنی بات کہی تھی۔ "ٹھیک ہے، میں پتہ کر لوں گا، بلکہ اس سے ہی پتہ کر لوں گا۔ لیکن میرا تمہیں ایک مشورہ ہے کہ پلیز، ایسا مت سوچو کہ اپنا دماغ خراب کر لو، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ یہ یقین رکھو ماہا، میں تمہارا اچھا کزن ہی نہیں، بہت اچھا دوست بھی ثابت ہوں گا۔ تمہیں کبھی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ ہر طرح سے تمہارا ساتھ دوں گا۔" فہد نے اپنے خلوص کی یقین دہانی کروائی لیکن وہ ذرا سی بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں بہت سارے خیالات آندھی کی مانند چل رہے تھے۔ جس کا اظہار وہ بہر حال کسی پر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے فہد! میں تم پر اعتماد کروں گی۔" وہ بولی اور پھر نور پور آ جانے تک ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔

سہ پہر تک وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ ڈاکٹر کو دکھانے، میڈیسن لینے اور کافی دیر تک اپنی ماما کے ساتھ رہنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ فہد واپس گلاب نگر لوٹ گیا تھا۔ تنہائی پاتے ہی پھر سے وہی خیالات اس کے ذہن میں در آئے۔ اس نے سوچا کہ فہد کو اعتماد میں لے یا نہیں؟ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

دراصل ماہا نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا۔ بلال کے کمرے میں مذہبی لٹریچر دیکھنے کے بعد اس کا ذہن ان ساری خبروں، تجزیوں اور رپورٹس کی جانب چلا گیا جو آئے دن اخبارات، میگزین یا نیوز چینل میں دکھائی دیتے ہیں۔ بنیاد پرست، شدت پسند اور دہشت گرد جیسے لفظوں سے ایک خاص طرح کی ہیت ان کے ذہن میں بن گئی تھی۔ اس کے خیال میں جو بھی مذہبی شخص ہو گا، اس کا تعلق ایسے ہی کسی خفیہ معاملات سے ہو گا جس کے باعث دنیا کا امن و سکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ایسی سوچیں کہیں سے نہیں لائی تھی بلکہ دن رات اسے یہ سب کچھ سننے اور دیکھنے کے لیے مل رہا تھا۔ اسے سب سے بڑی فکر یہ لاحق ہو گئی تھی کہ اگر بلال ایسے ہی معاملات میں ملوث ہو گیا ہے تو پھر وہ اس کا نہیں رہے گا، وہ جو ان دونوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں اتنے ڈھیر سارے پلان کیے تھے وہ کیسے پورے ہوں گے؟ اور پھر وہ ایسا ہو کیوں گیا ہے؟ اس نے اپنی خبر ہی نہیں لگنے دی۔

اس نے سوچا، میں نے گلاب نگر سے آنے میں بہت جلدی کی۔ مجھے ابھی مزید اس کے کمرے کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اسے کوئی ایسا مواد مل جائے جس سے وہ کوئی سراغ لگا سکے۔ بلال نے یونہی سختی کے ساتھ اسے منع نہیں کیا تھا، کچھ تھا، ورنہ وہ کیوں روکتا۔ ابھی تو صرف اس نے کتابیں دیکھی ہیں کمپیوٹر کھول کر نہیں دیکھا، وہاں سے بہت کچھ مل سکتا تھا۔ میں اچانک یوں گھبرا گئی ہوں۔ یہ ایسے لمحات نہیں ہیں بلکہ مجھے تو بہت زیادہ بہادر ہو کر، خود میں مضبوط ہو کر بلال کے بارے میں چھان پھٹک کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسی راہوں پر آ نکلا ہے تو اسے واپس بھی میں نے ہی لانا ہے۔ مجھے بہت سکون کے ساتھ بلال کے بارے میں جاننا چاہیے اور اس معاملے میں ابھی فہد کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے جو بات باہر نہ نکلنی والی ہو فہد کے ذریعے نکل جائے۔ وہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ سوچیں میں پڑی رہی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دوبارہ گلاب نگر چلی جائے۔ وہ کمرہ جس سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی، وہی کمرہ اسے اپنے درد کا درماں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا

فون بج اٹھا، وہ فہد کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کی تو وہ بولا۔

''ماہا! میری ابھی بلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ خیریت سے ہے۔ پریشان ہو کی ضرورت نہیں۔''

''تمہیں اس کا نمبر مل گیا ہے؟''

''نہیں۔! کسی دوست کا رابطہ ہے اس سے، میں نے اسے فون کیا تو اتفاق سے کچ دیر بعد اس کا بھی فون آ گیا۔ بلال کے پاس اپنا کوئی نمبر نہیں ہے اس نے کہیں سے کیا تھا، مگ ہے وہ تمہیں بھی فون کرے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماہا نے یوں کہا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ فون بن کرتے ہوئے اس نے گہرے دکھ کے ساتھ یہ سوچا کہ اس نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ فہد اس کے اس قدر نزدیک ہے۔ وہ مجھے نظرانداز کیوں کرتا چلا جا رہا ہے۔ کیا وہ جان بوجھ کر ا کر رہا ہے یا اس کی کوئی مجبوری ہے؟ کچھ بھی تھا لیکن اس کے من میں دکھ کی لہر اس قدر سرای کی جس میں اسے اپنا من ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اسے دل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

❁.......❁.......❁

ہوٹل کے کمرے میں واپس آ کر پی اون یوں بیڈ پر گری جیسے بہت زیادہ تھک گ ہو۔ حالانکہ ہماری واپسی پیدل نہیں بلکہ وہاں جابجا دکھائی دینے والی تین پہیوں کی موٹر سائ سواری پر ہوئی جسے ''سام لو'' کہتے تھے۔ یہ میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ کوئی زمانہ تھا ہمارے ہاں بھی ایسی ہی مخصوص قسم کی سائیکل رکشہ ہوا کرتی تھیں، جو بہت کم خرچ بھی ہوتی ہر جگہ مل جاتی تھیں۔ جہازی سائز کے بیڈ پر وہ بڑی بے ترتیب پڑی ہوئی تھی اور میں صوفے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر لیٹی رہی، پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔

''آؤ! یہاں بیڈ پر آ کر لیٹ جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔ '' یوں کسی لڑکی کے ساتھ لیٹنا بھی ویسے ہی حرام ہے جس طرح تمہارا کوئی کھانا۔'' اس کے میں انتہائی درجے کا طنز تھا۔

''ہاں! اگر صحیح اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بھی حرام ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ چونکتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور پھر ایک جانب دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''بلال! تم کوئی دوسری دنیا کی مخلوق ہو یا محض میرے سامنے پوز کر رہے ہو۔ جنسی کشش کو مانتی ہوں، یہ ایک فطری عمل ہے۔ ٹھیک ہے میں اسے پسند نہیں کرتی، لیکن

صورت میں جب اسے بزنس کے طور پر لیا جائے۔ مگر اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محبت کا اظہار ہے۔ میں جب سے تمہارے ساتھ ملی ہوں، تم نے ایک بوسہ تک نہیں دیا۔ میرے جسم کو چھوا تک نہیں محض اپنا فلسفہ بیان کرنے پر زور دیتے چلے جا رہے ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ تم مسلمان اس حس سے بھی عاری ہو جسے محبت کہتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں کافی حد تک تلخی کا عنصر نمایاں تھا۔

''پی اون، محبت اور جنس دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں میں محبت کا تعلق ہے تو دین اسلام کی بنیاد ہی محبت پر ہے لیکن اس میں ایک خاص نظریہ کارفرما ہے۔ جس طرح تم محبت اور کاروبار میں فرق محسوس کر رہی ہو۔ باقی رہی بات کہ میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں اس دنیا کا باشندہ ہوں۔ شاید تم محسوس نہ کر رہی ہو لیکن میں تم سے بھی بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ایسی محبت جس میں بوسے کی گنجائش نہیں ہے مگر مجھے تمہارا تحفظ عزیز ہے۔''

''نہیں! تم ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا تو میں ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر چلا گیا۔

''کیا میں اب حرام نہیں رہی۔'' اس نے تلخی سے کہا، پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔

''کیا حرام اسے نہیں کہتے جسے تم ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے ہو۔ جس کی بنیاد میں نفرت بھرا جذبہ ہوتا ہے تم پھر میرے ساتھ محبت کا دعویٰ کیسے کر رہے ہو؟''

''تم ایسے کرو باتھ روم میں جاؤ اور فریش ہو جاؤ، لیکن اس سے پہلے آنگ کو کھانے کا کہہ دو، پھر باتیں کریں گے۔'' میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے موضوع بدلا۔ وہ میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر انٹرکام تک گئی، وہاں اس نے تھائی میں باتیں کیں، پھر باتھ روم میں چلی گئی۔

کھانے کے بعد مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی تو میں نے منگوانے کے لیے کہہ دیا۔ اس دوران ہم میں تھائی کھانوں کی باتیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ چائے آ گئی۔ چائے پینے کے دوران اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے جہاد کے نام پر تم خاموش ہو گئے تھے یقیناً یہ تم مسلمانوں کی کمزوری ہے۔''

''نہیں پی اون! ہمارے لیے جہاد ہی میں زندگی ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا تو طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''ظاہر ہے اسی لیے تو پوری دنیا کا امن تباہ کیا ہوا ہے۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے

ہوئے کہا۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری سوچ کم از کم اس معاملے میں بہت محدود ہے۔ لیکن یہ سوال بہر حال میں تم سے ضرور کروں گا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ دنیا کا امن مسلمانوں ہی نے تباہ کیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو بولی۔

”بلال! تم انتہائی کمزور دلیلوں کے ساتھ اپنی بات نہیں منوا سکتے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ دنیا کے سارے لوگ اس میں شامل ہیں؟“

”اگر بات دلیل ہی ہے نا پی اون، میں تمہیں بے شمار دلیلیں دے سکتا ہوں لیکن چونکہ تمہاری سوچ فیصلہ کن ہے۔ تم اپنے طور پر ایک نتیجہ اخذ کر چکی ہو، اس لیے تمہارا انداز تجزیاتی نہیں، جارحانہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”نہیں! میں سنوں گی، آخر تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بات کہہ سکو۔ ممکن ہے میں غلط ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا، کپ میں چائے کا آخری گھونٹ لے کر اسے ایک جانب رکھا اور پھر بڑے تحمل سے پوچھا۔

”پی اون! کیا تم نے کبھی یہ فقرہ سنا ہے کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے؟“

”ہاں! یہ بہت مشہور فقرہ ہے، میرے خیال میں کسی برطانوی کا ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اگر میں کہوں کہ یہ دنیا کا گھٹیا ترین فقرہ ہے تو اس پر تمہاری رائے کیا ہے؟“ میں نے اس کی جانب دیکھا۔

”یہ تمہاری سوچ ہو سکتی ہے، ورنہ مجھے اس میں بظاہر کوئی غلط بات معلوم نہیں ہوتی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”اس لیے تمہیں جہاد کی سمجھ نہیں ہے، کیونکہ اسلام میں جنگ کا تصور نہیں ہے کہ دوسروں کے ملک پر چڑھائی کر کے انہیں اپنا مطیع بنانا مقصد ہو۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے باقاعدہ اصول و ضابطے متعین کیے ہیں اور اس کے عملی ثبوت دیے ہیں۔ کوئی بھی مذہب ایسی اپنی تعلیمات نہیں رکھتا اور اسلام میں سب کچھ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جہاد کا مقصد ہی کچھ اور ہے، وہ نہیں جو تم کہہ رہی ہو۔“

”تو پھر کیا ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”جہاد کا مقصد ”فتح“ کرنا نہیں ہے بلکہ فتنے کو دور کرنا ہے۔ امن قائم کرنا اور انسانیت کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ وہ سب کچھ نہیں جو آج کا مغربی میڈیا اور غیر مسلم افراد

مسلمانوں پر الزام تراشی کر رہی ہیں۔ تمہیں جہاد کی اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گی جب تک تم اس کے بارے میں جان نہ لو۔ تم نے اعتراض کیا ہے کہ قرآن میں جہاد کی آیات کیوں ہیں۔ یہ اعتراض تمہیں نہیں ہر اس غیر مسلم کو ہے جو اسلام اور مسلمان کو اس روئے زمین پر دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ کیسا انصاف ہے پی اون؟، کہ مسلمانوں کو اپنے دفاع کا حق بھی نہیں ہے۔ جبکہ یہ حق اس سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا، وہ خوف زدہ اس لیے ہیں کہ مسلمان ہوتا ہی غیرت مند ہے، جو مسلمان غیرت مند نہیں اس کی مسلمانی میں شک کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان نہ صرف اپنا دفاع کرنا جانتا ہے بلکہ اس کے پاس وہ جذبہ شہادت ہے جو اُن کے پاس نہیں جو جہاد کی مخالفت کی بات کرتے ہیں۔ حرمت قرآن پر تو ہر مسلمان کٹ سکتا ہے اور یہ جرأت، غیرت اور حوصلہ کسی دوسرے میں بالکل نہیں۔“ میں قدرے جذباتی سا ہوا لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔

وہ آنکھیں پھاڑے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی۔

”تم حیران کن بات کر رہے ہو۔“

”میں درست کہہ رہا ہوں۔ وہی لوگ مغربی پروپیگنڈے کے زیر اثر آتے ہیں جنہیں جہاد کے بارے میں علم نہیں، خواہ وہ نام نہاد مسلمان کیوں نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جہاد کیا ہے اور تم خود ہی کہو گی کہ واقعتاً اس میں زندگی ہے۔“ میں نے انتہائی تحمل سے کہا۔

”تم قرآن کی تعلیمات ہی بتاؤ گے نا؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے وہ انتہائی اہم بات سننے کی طلبگار ہو۔ میں نے سر ہلایا اور کہا۔

”لفظ جہاد کا مطلب ہے ”کوشش کرنا“، ایسی کوشش جس سے فساد ختم ہو جائے اور امن قائم ہو۔ کیونکہ دین اسلام کا مطلب ہی سلامتی ہے۔ ایسی سلامتی جو پوری انسانیت کو تحفظ دے۔ لیکن اسلام کے امن اور سلامتی والے دین کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ مسلمان ظلم برداشت کرتے رہیں۔ ظالم کا ہاتھ روک دینے کا نام بھی جہاد ہے۔ حق کے لیے ڈٹ جانے کا نام جہاد ہے۔ جارحیت کا مقابلہ کرنے اور ظالمانہ کارروائیاں روکنے کا نام جہاد ہے۔“ یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تا کہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہے تو کرے مگر وہ چپ رہی تو میں نے کہا۔ ”تمہارے اس ملک کا مذہب بدھ ہے۔ اب کیوں ہتھیار اٹھائے جاتے ہیں۔ جبکہ بدھ تعلیمات میں تو چیونٹی کو مارنا بھی گناہ ہے۔ عدم تشدد کا پرچار کرنے والوں کو کس بے دردی سے ختم کرنے کی کوشش کی، تم نے کبھی اپنی تاریخ پڑھی ہے۔ اسی طرح رومی سلطنت کی کوکھ سے جنم لینے والی پوری عیسائی مملکتیں، اپنی تاریخ میں انسانیت سوز مظالم سے اٹی پڑی ہیں۔ مذہب کے نام پر انہوں نے اتنے ظلم کیے ہیں اور اب تک کرتے چلے جا رہے ہیں کہ تاریخ

بھی ان سے شرمندہ ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ بات صلیبی جنگوں تک آ پہنچی، یہی وہ مرحلہ جس کے بعد عیسائیوں نے اپنی بدترین جنگی و حربی شکست کے بعد انتہائی بے بسی میں مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ہیڈرو فرانکیز ا ایک عیسائی دانشور گزرا ہے جس نے شاہ فلپ سوئم کے سامنے یہ تجاویز دی تھیں کہ ہمیں ہر وہ عمل کرنا ہے جس سے مسلمانوں کو روکا سکیں کہ وہ اپنے مردے اپنے دینی رواج کے مطابق دفن نہ کر سکیں، ان کی زبان، ان کا مذہبی لباس یہاں تک کہ حلال گوشت کھانے پر اصرار کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ ان کی مساجد، مدرسے اور حمام تک ڈھا دینے چاہئیں۔ یہ کل کی بات نہیں 1600ء میں ان کی یہ سوچ تھی جس کا عکس آج تک نظر آ رہا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرو یا خود کوشش کر کے دیکھو، بنیاد پرست، دہشت گرد انتہا پسند کون ہے؟ کیا مسلمانوں کو یہ سب کچھ کہنے والے خود کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے تفصیل سے بات چھیڑی تو اس نے میری سانس لینے کے دوران فوراً کہا۔

''بلال! تم جہاد میں اسلامی تعلیمات کی بات کر رہے تھے، وہ کیا تم بتا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں، قرآن اور میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ جب بھی جہاد کی صورت پیدا ہو تو عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے، کسی لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے راہب، عابد، یا کسی معبد کے مجاوروں کو نہ قتل کیا جائے اور نہ ہی ان کے معبد مسمار کیے جائیں کوئی پھل دار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں۔ آبادیاں ویران نہ کی جائیں جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے، اور جو لوگ اطاعت کر لیں ان کی جان و مال کا نہ صرف احترام کیا جائے بلکہ اسے کسی مسلمان کے برابر سمجھا جائے۔ وہ سارے وحشیانہ افعال جو جنگ سے متعلق سمجھے جاتے ہیں ان سے منع فرما دیا گیا ہے۔'' میں نے تحمل سے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

''کچھ وجہ تو ہے کہ مسلمانو کو دہشت گرد۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اگر تم مجھے یہ منوانا چاہ رہی ہو کہ میں بنیاد پرست ہوں تو مجھے اپنے بنیاد پرست ہونے پر فخر ہے کیونکہ میں اپنی بنیادی دینی تعلیمات پر پوری طرح کاربند ہوں۔ اگر مسلمان کی مزاحمت کو دہشت گردی کہا جاتا ہے تو میں دہشت گرد ہوں۔ میں انتہا پسند بھی ہوں۔ اہل میں یہ جو اصلاحیں ہیں، ان کے بارے میں کچھ معلوم ہیں تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی حد تک۔۔۔ لیکن میں نے پوری طرح تحقیق نہیں کی ہے۔'' اس نے اعتراف کر لیا۔

''اصل مسئلہ ہی یہی ہے پی اون، آخر اصطلاحیں آئی کہاں سے؟ ان کے

مطالب کیا ہیں، ہم یہ تو جانتے نہیں لیکن اپنی تقریروں، بحث و مباحثوں میں بڑی گرم جوشی سے ان اصلاحات کا ذکر کرتے ہیں۔ معاف کرنا پی اون، تم نے انہی باتوں کو بنیاد بنا کر مسلمانوں سے اپنی نفرت کا اظہار مسلسل کیا ہے، لیکن میں نے کبھی تمہیں جواب اس لیے نہیں دیا کہ تم کبھی نہ کبھی خود سوچو گی، مگر تم نے ایسا نہیں کیا، میں چاہوں گا کہ تمہیں کم از کم ایسے اشارے دے دوں، جس پر تم پوری دیانت داری سے سوچ سکو۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ پوری دیانت داری سے تجزیہ کروں گی۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ گیا اور لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔ اس پر میں نے اس حوالے سے جو کام کیا تھا، اسے کھولا اور پی اون کے سامنے کر دیا۔

''اسے پڑھو، دیکھو، دہشت گردی کی تعریف کیا ہے۔ کیا مطلب ہے اس کا؟'' میں نے کہا تو وہ پڑھنے لگی۔

''خوف اور ہنگامی حالت پیدا کرنے کے لیے تشدد کی دھمکی دہشت گردی کہلاتی ہے۔ اکثر دہشت گرد سیاسی معاملات کو تقویت دینے کے لیے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ سخت اور وحشیانہ تشدد دہشت گردی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس عمل میں اغوا، ہائی جیکنگ اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے بم باری بھی شامل ہے۔ سیاستدانوں اور ذرائع ابلاغ کے زیر استعمال آنے کے بعد یہ لفظ اپنی اصل ہیئت میں ہر قسم کے سیاسی تشدد کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ خاص کر انقلابی اور گوریلا جنگی حکمت عملی کے ضمن میں مکمل جنگ کے علاوہ دیگر تمام پر تشدد اقدامات دہشت گردی کے مترادف ہے۔'' یہ پڑھ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ میں نے ایک دوسری فائل کھولی۔ اور کہا۔

''اس پر انتہا پسندی کے بارے میں پڑھو، دنیا کی مشہور ڈکشنریوں اور انسائیکلوپیڈیا سے مواد اکٹھا کیا ہے۔'' میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ میں کافی دیر تک انیکسی میں کھڑا رہا، پھر اس کے بلانے پر واپس آیا۔

''میں نے پڑھ لیا، تم اس پر کیا کہنا چاہو گے۔''

''یہی کہ ایک معیار میں نے تمہیں دے دیا، تم خود اس پر سوچو کہ اس معیار پر اس وقت کون دہشت گرد ہے یا کون انتہا پسند۔ امریکہ اور اہل یورپ دہشت گرد ہیں یا مسلمان، چودہ صدیاں پہلے مسلمانوں نے جو نظریۂ حیات کو قبول کیا اور اس پر قائم رہ کر اپنی تعمیر شخصیت اور استحکام اجتماعیت میں خاص کردار پیدا کرتا ہے۔ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اہل یورپ، جو کل تک انسانی گوشت کھاتے رہے

انسانوں کو زندہ جلانا جن کا معمول تھا، کا، کیو، کلس سے لے کر لاتعداد انتہا پسندی بلکہ وحشیانہ تنظیمیں معرضِ وجود میں آتی رہی ہیں۔ فری میسن کن کی تنظیم ہے جو دنیا میں شر پھیلانے کا کام کررہی ہے، ہم اسے فساد کہتے ہیں، ہر اس کام کو جو امن کے نقصان کا باعث بنے اور ایک مسلمان پر واجب ہے کہ جب بھی ان کی غیرت وحمیت کو للکارا جائے وہ جہاد کریں۔ یہ ان کا حق ہے جو ان سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ وہ بھی نہیں جو جنگی طاقت کے نشے میں کمزوروں پر حملہ آور ہورہے ہیں اور جگہ جگہ خاک چاٹنے پر مجبور ہورہے ہیں۔'' میں کسی حد تک جذباتی ہوگیا تھا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''پی اون، کسی بھی قوم کے بارے میں تاریخ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ کیا تھے اور ہیں۔ چودہ صدیاں پہلے جو نظام ہمیں ملا، اس کے تحت انسانیت کو کیا ملا، اور یہ انسانیت کو کیا دے رہے ہیں۔ فیصلہ تم خود کرلینا، اس میں شخصیات کیسی پیدا ہوئی ہیں۔ اس کی فقط ایک مثال دیتا ہوں۔ اہل یورپ نپولین کو ایک عظیم جرنیل گردانتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی فوج کو بھوکا پیاسا مرتا ہوا چھوڑ گیا۔ اس کا کردار ایک طرف رکھ لیا جائے تو دوسری جانب خالد بن ولیدؓ کے کردار کو رکھ لیا جائے۔ تو جب موازنہ کیا جائے گا، کسی تعصب کے بغیر تو نپولین انتہائی بونا دکھائی دے گا۔''

''اس کی وجہ کیا ہے؟'' پی اون نے تجسس سے پوچھا۔

''رویہ! کسی بھی شخصیت کا رویہ، نپولین کے پاس اس کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا کہ وہ سرزمین فتح کرے حکومت حاصل کرے، لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ کے نزدیک صرف حکم الٰہی کی پابندی تھی، انسانیت کی فلاح تھی، تم اگر واقف نہیں ہو تو یہ تمہارا قصور ہے، تاریخ تو اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے۔ میں اس پر شرمندہ ہوں کہ بعض مسلمان بھی اپنی تاریخ کا موازنہ نہیں کرتے، میں بھی انہی میں شامل تھا، لیکن جب تم نے طنزیہ انداز میں مجھ پر سوالات کی بھرمار کی تو میں نے اپنے نظریات اور افکار کو دیکھا۔ اس منبع حکمت و رہنمائی کو پڑھا جس میں دنیا کا ہر معاملہ موجود ہے اور اس سے رہنمائی ملتی ہے، میری مراد قرآن پاک سے ہے۔''

''قرآن؟'' اس نے حیرت سے پوچھا، ''قرآن میں دنیا کے ہر معاملے میں رہنمائی مل جاتی ہے، ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''یہی اس کے سچا ہونے کا ثبوت ہے۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے ایک حرف میں کمی بیشی نہیں ہوئی، اور اپنی اصل زبان میں موجود ہے۔ باقی جتنی بھی الہامی کتابیں ہیں، ان کے اصل زبان ہی دنیا سے ختم ہو چکی ہے۔ مجھے یاد آیا، مارٹن لوتھر کنگ کو زندہ کیوں جلایا گیا؟ پروٹسٹنٹ فرقہ کیسے وجود میں آیا؟، اس کا قصور فقط اتنا تھا کہ اس نے بائبل کو

عام آدمی تک پہنچانے کی بات کی تھی؟ یہ انتہا پسندی نہیں، بلکہ انسانیت کا قتل ہے۔ ایک عیسائی اپنی ہی کتاب کو نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح ہندومت میں برہمن نے اجارہ داری بنا رکھی ہے، لیکن قرآن عظیم وہ واحد کتاب ہے جو عام انسانوں سے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ان سے ہم کلام ہوتا ہے، پھر اس میں ایمان والوں سے الگ ہم کلامی ہے۔ قرآن ایک سچی اور خالص کتاب ہے جو اللہ کا کلام ہے، تم بھی تحقیق کرسکتی ہو۔''

''کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟'' پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟ وہ کسی محدود وقت یا فقط مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ کتاب پوری انسانیت کے لیے ہے۔ کیونکہ پھر اس کے بعد کوئی الہامی کتاب آنے والی نہیں ہے۔ اس میں دین مکمل کردیا گیا ہے۔ میں جہاد یا اس کے علاوہ دیگر معاملات پر تمہیں بتا سکتا ہوں۔ لیکن تم خود اگر اس میں دیکھو اور پھر کسی تعصب کے بغیر تجزیہ کرو تو میرا خیال ہے تم حقیقت کو پالو گی۔ ممکن ہے تم یہ سمجھو کہ شاید میں تمہیں پوری بات نہیں بتا رہا ہوں۔'' میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کافی دیر تک مجھ سے ہم کلام نہ ہوئی، پھر اچانک سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور بولی۔

''آج شام کا کیا پروگرام؟''

''جیسا تم چاہو؟'' میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔

''میرے خیال میں تم تھوڑی دیر آرام کرلو، شام کے وقت میں آؤں گی تو پھر باہر چلیں گے۔'' اس نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ میرے ساتھ ہی رہو گی جب تک میں یہاں ہوں۔ اب؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کچھ دیر کے لیے اپنے گھر جاؤں گی، رات میں ادھر ہی رہوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ تمہارے گھر والے تمہارے بارے میں اتنی تشویش نہیں کرتے؟'' میں نے اس کی دھڑکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چھوڑو! میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ وہ چلی گئی تو میں واپس بیڈ تک آیا۔ لیپ ٹاپ کا نیٹ کنکشن بند کرکے اسے ایک جانب رکھا، پھر بیڈ پر لمبی تان کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ عین انہی لمحوں

میں مجھے ماہا یاد آنے لگی، نجانے وہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ میں نے اپنے سیل فون سے فہد کا نمبر ملایا تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''ماہا کیسی ہے؟''

''بالکل ٹھیک، اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے۔ ماما آگئی ہیں، وہ اس کے ساتھ مصروف ہے۔''

''مجھے یاد کرتی ہے؟''

''تھوڑا بہت، اب اس کے دل کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم بتاؤ، تمہاری مصروفیت ختم ہوئی کہ نہیں۔''

''بس چند دن اور، پھر میں آرہا ہوں۔''

''اوکے، ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو پھر میں نے الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں مطمئن ہو گیا تھا، میں نے فون ایک جانب رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈھلتی ہوئی شام ایک عجیب سوگوار سا تاثر دے رہی تھی۔ ماہا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو مغربی افق پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ وہ نجانے کب سو گئی تھی اور اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی تو دماغ میں کوئی سوچ نہیں تھی بڑی ساری کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور شیشے کے پار کا منظر دھیرے دھیرے اسے سوگوار کرتا چلا جا رہا تھا حالانکہ اس سوگواریت کی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ شاید خوشی کا من سے چلے جانا بھی سوگواریت ہی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بے خیال سی اپنے بیڈ پر لیٹی مغربی افق کو دیکھتی رہی۔ جب وہ سرخی سیاہی میں تبدیل ہونے لگی اور اسے بھی احساس ہونے لگا کہ کمرے میں اندھیرا چھانے لگا ہے تو وہ اٹھ گئی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اور پھر باتھ روم میں جا گھسی۔ اس نے کافی دیر تک اپنے چہرے پر پانی ڈالا تھا، پھر جلتی ہوئی پلکوں کے ساتھ واپس آگئی۔ اسے یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ بلال بدل گیا ہے۔ وہ خود پر افسوس کر رہی تھی کہ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ وہ کس حد بدلا ہے۔ شاید اب بلال کی دنیا میں اس کی اتنی گنجائش نہیں رہی۔ ورنہ جو روزانہ بات کرتا تھا، اتنے دن ہو گئے اس نے ایک فون کال بھی نہیں کی۔ دیارِ غیر میں تو اپنے زیادہ یاد آتے ہیں۔ کیا وہ اس کے لیے اہم لوگوں کی فہرست میں کہیں بہت نیچے آگئی ہے کہ کسی دوست کو تو فون ہو سکتا ہے لیکن اسے نہیں۔ تب اچانک اس نے سوچا، وہ اگر یونہی کمرے میں تنہا رہی تو ایسی ہی

فضول سوچیں سوچتی رہے گی۔

''کیا میں واقعی فضول سوچیں سوچ رہی ہوں؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ چند لمحوں تک وہ خلا میں رہی جیسے اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو، پھر اس کے اندر ہی سے آواز گونجی۔

''نہیں تو، میں کیوں فضول سوچنے لگی؟''

''تو پھر تم اتنی افسردہ کیوں ہو، تمہاری تمام تر جولانیوں، جوش اور اور جذبے پر تو جیسے اوس پڑ گئی ہے۔ ایک دم سے کیوں مرجھا گئی ہو؟'' اس نے پھر اپنے آپ سے کہا۔

''ظاہر ہے، میں بلال کی وجہ سے ایسی ہوئی ہوں، وہ بدل گیا ہے؟''

''اس کے بدل جانے سے آخر کیا قیامت آجائے گی جو تم اس طرح ہو گئی ہو کہ جیسے سب کچھ ہی فنا ہو گیا ہے۔''

''بہت کچھ، بہت کچھ تبدیل ہو جانے والا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرا ہی نہیں رہے گا، وہ میری دنیا ہی سے نکل جائے گا، کل تک میں اس کے لیے سب سے اہم تھی، آج نہیں ہوں۔ بلاشبہ جو وہ فارن ٹور پر گیا ہے، وہ اسی مقصد کے لیے ہوگا۔ کوئی سرکاری کام نہیں ہے۔''

''کیا تم نے اس کی تصدیق کی؟''

''میرا اندازہ ہے، میں اس کی تصدیق ضرور کروں گی، یہیں سے اس کا جھوٹ سچ پتہ چل جائے گا۔'' اس نے جوش بھرے انداز میں سوچا، اور پھر اس کی سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

بلال اگر بنیاد پرست مسلمان بن گیا تو پھر وہ تبدیل تو ہوگا ہی، اس کا لائف سٹائل بھی بدل جائے گا، ظاہر ہے میں اس کی بیوی ہوں گی تو وہ مجھے بھی اپنے انداز میں چلنے پر مجبور کرے گا۔ کیا میں ایسی زندگی گزار سکوں گی جس میں پابندیاں ہی پابندیاں ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے تصور نے بہت کچھ اس کے سامنے لانا شروع کر دیا۔ اس نے خود کا ایک گھر اور کمرے تک محدود ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ساری سنی سنائی باتیں اس کے ذہن میں آنے لگیں جو بنیاد پرست مسلمانوں کے بارے میں وہ سنتی آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ خود کو روشن خیال مسلمان کی حیثیت سے نہ صرف سمجھا تھا بلکہ اس پر فخر بھی محسوس کرتی تھی۔ چہ جائیکہ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روشن خیالی آخر ہے کیا چیز؟ اس کے ذہن میں جو ایک خاص تصور بن چکا تھا، وہ اسی کے تابع سوچتی چلی جا رہی تھی۔

سب سے پہلے مجھے حجاب میں رہنا ہوگا، سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ڈھکی ہوئی۔ اُف۔! میرا تو دم گھٹ کر رہ جائے گا، میں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکوں گی، میرے بارے

میں دوسرے دیکھ کر کیا کہیں گے، میرا مذاق اُڑائیں گے۔ بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی ماہا کیسی دکھائی دے گی؟ اس نے تصور میں خود کو ابھارنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ کر سکی۔ لیکن اسے وہ قہقہے ضرور سنائی دے گئے جو اس حالت میں اس پر لگنے والے تھے۔ وہ تو اپنے سارے گروپ اور سارے ملنے والوں سے کٹ کر رہ جائے گی، شادی کے بعد تو یہی ہونے والا ہے نا، ممکن ہے ہنی مون کو غیر اسلامی شعائر قرار دے کر بلال اس سے منع بھی کر دے۔ کیا کچھ سوچا تھا اس نے، سارے خواب، امیدیں اور خواہش مٹی میں مل جائیں گی۔

چند ماہ پہلے انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں ترجیحات طے کیں تھیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ شادی کے فوراً بعد ہم ہنی مون منانے یورپی ممالک میں چلے جائیں۔ وہاں جس قدر رہنا ممکن ہو سکا ہم رہیں گے۔ یہاں جو ایک گھر بن چکا ہے، اسے خوبصورت انداز میں زندگی کی تمام تر سہولیات، آسائشات اور تعیشات کے ساتھ سجائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس پہلے ہی بہت دولت ہے لیکن فارن میں اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر اس کو خوب بھرنے کی کوشش کریں گے۔ بلال کا سرکاری افسر بننا یونہی تو نہیں تھا۔ نجانے کتنے لوگوں نے کتنی ڈھیر ساری رقم بنائی ہوئی تھی، جس کی بازگشت وہ سنتی رہتی تھی، اور پھر اس نے سوچا تھا کہ سبکدوش ہو جانے کے بعد وہ کسی یورپی ملک میں اپنی بقیہ زندگی سکون و اطمینان سے گزاریں گے، لیکن اگر بلال۔۔۔ تو پھر۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا، وہ تو سادگی کو اپنائے گا، اور یہیں اس ملک میں رہنے پر مجبور ہوں گے۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا یہ خواب تو نہیں ہے۔۔۔ کیا ایسی زندگی جس کی جانب بلال بڑھ رہا ہے، میں گزار سکوں گی؟ یہ خیال آتے ہی اس کا فوراً جواب نفی میں تھا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے، میں اِس میں خود کو پابند کر کے، ذرا ذرا سی اشیاء کے لیے نہیں ترس سکتی۔

ایک سرکاری افسر کی بیگم کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا، وہ بھی چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ لمبی گاڑی میں بیٹھ کر مختلف تقریبات میں جانا، وہاں پر اپنی اَمارت کی نمائش کرنا، گھر میں پارٹیاں دینا اور سماجی طور پر اعلیٰ رتبے کی خواہش کرنا ان بیگمات کا معمول ہے۔ کیا وہ اُن جیسا کر سکے گی، اس نے تو پہلے ہی سے پلان ترتیب دیا تھا کہ ایک این جی او بنائے گی، اور اسی کے سہارے اعلیٰ سماجی حیثیت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گی، اس نے اپنے سامنے ایسا ہوتے ہوئے دیکھا تھا، زیورات سے لدی پھندی بیگمات جب تقریبات میں اپنی سماجی حیثیت منواتی ہیں تو اس کے لیے یہ لمحات کس قدر پرکشش ہوتے تھے۔ مگر بلال نے اسے منع کر دیا تھا، بلاشبہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تو وہ نہ سمجھ سکی تھی لیکن اب اس کے ذہن میں ساری بات آ گئی تھی۔ یہ بنیاد پرست مسلمان، این جی اوز کے بھی خلاف ہیں۔ ان کا وجود تو انہیں برداشت

ہی نہیں۔ بھلا سماجی بھلائی کے کاموں میں انہیں کیا تکلیف ہوتی ہے۔ جبکہ رقم بھی وہ خود خرچ کرتے ہیں۔ اُن کا کیا جاتا ہے؟ یہ بات بھی ماہا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''تو کیا وہ بلال سے محبت نہیں کرتی، محبت میں تو انسان کانٹوں بھری راہوں پر بھی چلتا ہے، اسے تو بلال سے محبت ہے وہ تو اس کا اپنا ہوگا۔ پھر اسے دنیا کی کیا پروا ہے، کوئی کچھ کرتا پھرے، اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' یہ خیال آتے ہی وہ چونک گئی، کیا صرف اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ زندگی کی راہوں پر نہیں چل سکتی؟ یہیں پر اس کے سامنے دوراہا آ گیا، ایک جانب بلال کھڑا تھا، جو اس کی محبت ہی نہیں، حاصلِ زندگی بھی تھا، یہ کوئی چند دنوں کی محبت تو نہیں تھی کہ کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ جاتی، یہ محبت تو اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھی، ریشے ریشے میں سما گئی تھی، اس میں بچپن کی معصوم خواہشوں سے لے کر جوانی کی ترنگوں تک کا سفر تھا۔ وہ اس کی ذات سے آسانی کے ساتھ جدا نہیں ہونے والی تھی، یہ جدائی تو خود اسے لہو رنگ کر دے گی۔ یہ کیا ہو گیا؟

''لیکن اسے بھی تو میرا خیال رکھنا چاہیے۔ کیا اسے نہیں خبر کہ میری امیدیں، خواہشیں اور خواب کیا ہے۔ وہ بھی تو خوب جانتا ہے، میں کس طرح کی زندگی میں خوش رہ سکتی ہوں۔ اس نے مجھ سے دھوکہ کیوں کیا، کیوں میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔''

''کیا اس نے تم سے کوئی بھی مطالبہ کیا، کوئی حق چھینا، کیسا دھوکہ اور کیسا اعتماد؟ تم یہ کیا اوٹ پٹانگ سوچتی چلی جا رہی ہو۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔

''میں کیا کروں؟، میرا تو اپنا آپ بلال کے حق میں ہے، لیکن۔۔۔ کچھ ایسا ضرور ہے جس سے وہ ذہنی رابطہ جس سے پورے من میں سکون تھا، وہ نہیں رہا، کہیں نہ کہیں کوئی گڑ بڑ ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم معلوم کرو، کیا واقعی بلال کسی سرکاری کام سے فارن گیا ہے؟، پھر سارا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔'' اس نے اپنے تئیں سوچا اور پھر اس نے ساری سوچیں ایک جانب جھٹک دیں۔ شاید وہ کسی مزید سوچ سے الجھتی، انہی لمحات میں ملازمہ آ گئی کہ ذکیہ بیگم بلا رہی ہیں، تو وہ نیچے ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

اسے اپنا ڈرائنگ روم بھرا بھرا سا لگا۔ اس کی پھوپھو نجمہ، فہد، اس کے پاپا احسان نور اور ماما ذکیہ بیگم بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس نے وہاں آ کر سلام کیا تو پھوپھو نجمہ نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور بڑے پیار سے پوچھا۔

''اب میری بیٹی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں پھوپھو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ تب پھوپھو

نجمہ نے اپنے بھائی احسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"یہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تو پھر آپ لوگ تنہا یہاں کیا کریں گے؟"

"بہت سارے خیال ہیں، لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ یہ سب اس کی وداعی کے بعد ہی سوچیں گے۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا

"لیکن خوشی تو بہرحال ہے کہ ہمارے جیتے جی یہ اپنے گھر کی ہو رہی ہے۔" ذکیہ بیگم نے جذبات بھرے لہجے میں کہا تو ماحول ایک دم سے بوجھل ہو گیا۔ تو احسان نور نے کہا

"اچھا، آپ لوگ گپ شپ کریں، مجھے ایک دوست سے ملنے کے لیے جانا ہے، کھانے پر ملاقات ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ تبھی وہ باتیں کرنے لگے۔ موضوع گفتگو شادی ہی تھا، جس میں ماہا بالکل بھی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ پھر جب فہد فریش ہونے کے لیے اٹھ گیا تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

"میں ذرا کچن میں جھانک لوں، ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ تبھی پھوپھو نجمہ نے ماہا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماہا، کیا بات ہے بیٹا۔! لڑکیوں کو تو اپنی شادی کی خوشی ہی بہت ہوتی ہے، وہ کھل جاتی ہیں، مزید نکھر جاتی ہیں، لیکن تم تو بالکل مرجھا کر رہ گئی ہو، کیا بات ہے بیٹا؟"

"پھوپھو، ایسی تو کوئی بات نہیں، بس بلال کے بارے میں ذرا سی الجھن ہے۔" وہ بولی۔

"الجھن؟" وہ حیرت سے بولے، "کیسی الجھن ماہا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ انتہائی دردمند لہجے میں یوں بولی جیسے ماہا اس کے سامنے بہت بڑا مسئلہ بیان کر رہی ہو۔

"اتنے دن ہو گئے لیکن اس کا نہ کوئی فون ہے اور نہ ہی کچھ معلومات۔" ماہا نے کہا۔

"اوہ! میں نے تو یہی سنا ہے کہ وہ کسی فارن ٹور پر گیا ہے، اپنے کسی سرکاری کام سے، چند دن بعد آ جائے گا، تم کیوں پریشان ہو؟" پھوپھو نجمہ نے کرید کی۔

"دیکھیں نا پھوپھو۔! وہ پہلے روزانہ فون کرتا تھا، میرا نہیں خیال کہ اتنے عرصے میں کوئی دن بھی ایسا ہو کہ اس نے مجھے فون نہ کیا ہو۔ لیکن یہ اچانک فارن ٹور، پھر پکا پتہ نہیں کس ملک میں گیا ہے۔" اس نے پھر سے الجھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو فہد نے بتایا تھا کہ وہ ملائیشیا گیا ہے، سب یہی کہہ رہے ہیں؟" پھوپھو نجمہ نے حیرت سے کہا۔

"لیکن ملائیشیا میں کہاں؟ کسی جزیرے پر یا کسی گمنام ویرانے میں جہاں سے فون نہ ہو سکتا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ ادھر گیا ہوگا، وہ یہیں کہیں اس ملک میں ہے۔" اس نے یوں

کہا جیسے اسے پکا یقین ہو۔ تو پھوپھو نجمہ چند لمحے سوچتی رہی پھر خیال انگیز لہجے میں بولی۔

"تمہیں ایسا یقین کیوں ہے؟" تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ فارن ٹور پر نہیں ہے۔"

"بس میرا دل کہتا ہے۔" اس نے اختصار سے کہہ کر اصل بات چھپا لی۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، وہ تو ویسے بھی کنفرم ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں گیا ہے یا نہیں۔" پھوپھو نجمہ نے انتہائی دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے کنفرم کریں گی؟" ماہا نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"یہی۔! ابھی تمہارے انکل کو فون کرتی ہوں۔ وہ کچھ ہی دیر میں ان کے محکمے کے لوگوں سے، بلکہ اس کے قریب ترین لوگوں سے پوچھ لیں گے کہ بلال کہاں گیا ہے اور اس کے رہائش کدھر ہے، رابطہ نمبر وغیرہ سب معلوم ہو جائے گا۔" پھوپھو نجمہ نے یوں کہا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

"چلیں، آپ کریں فون انکل کو، یہ تصدیق تو ہو نا، پھر میں خود کر لوں گی اسے فون۔" ماہا نے کہا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اگر اس کے اپنے ہی واہمے کی تصدیق ہو گئی تو وہ جو سوچ رہی ہے سچ ثابت ہو گیا تو؟ اگر بلال وہاں نہ ہوا تو؟ وہ انہی سوالوں میں گھر گئی۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں کوئی جواب نہ آیا، مگر۔۔۔ پھوپھو نجمہ فون پر نمبر ملا کر اپنے شوہر سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا، بات پھوپھو نجمہ کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، اب جو بھی اسے سوچنا ہوگا، انکل کے فون آنے کے بعد ہی سوچنا تھا۔

بظاہر بہت ہی خوشگوار ماحول میں ڈنر کر لیا گیا تھا، لیکن ماہا کے من میں بے چینی کی انتہا تھی، کسی کے فون کی بھی گھنٹی بجتی، وہ چونک جاتی جیسے اس میں بلال کے بارے میں کوئی خبر ہو سکتی ہے۔ وہ سارا وقت خاموش رہی تھی، باقی سب باتیں کرتے رہے تھے۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں اپنے گھر کی، کچھ ان کے بارے میں، کچھ مستقبل میں امکانات کے حوالے سے لیکن ماہا کو کسی سے بھی قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا دھیان فقط انکل کے فون آنے کی جانب ہی لگا ہوا تھا۔ ڈنر سے کافی دیر بعد جب ماہا اور پھوپھو نجمہ باہر لان میں چہل قدمی کر رہی تھیں تو الطاف انور کا فون آ گیا۔ پھوپھو نجمہ چند لمحے سنتی رہی پھر اس نے یہ کہہ کر فون ماہا کی جانب بڑھا دیا کہ ماہا کو ساری تفصیل بتا دیں، اس کے لیے ہی میں نے فون کیا تھا۔ ماہا نے فون لیا اور الطاف انور سے چند تمہیدی باتیں کرنے لگی، پھر اس نے بتایا۔

"بیٹی! مجھے نہیں معلوم کہ بلال نے ایسا کیوں کیا ہے؟ لیکن وہ کسی بھی سرکاری ٹور پر نہیں ہے، بلکہ اس نے دس دن کی ذاتی نوعیت کی چھٹیاں لی ہیں۔ یہ چھٹیاں بیرونِ پاکستان

والی ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ پاکستان سے باہر گیا ہے۔''

''یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ کس ملک گیا ہے؟'' ماہا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں! دراصل یہ ساری معلومات مجھے اس کے آفیسر سے ملی ہیں، وہ میرا کولیگ رہ چکا ہے اور بلال کے بارے میں میرے تعلق کو جانتا ہے۔ پھر میں نے اس کے قریبی کولیگ سے بھی پوچھا، انہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کس ملک میں کیوں گیا ہے؟، یہ بہر حال کنفرم ہے کہ وہ کسی بھی سرکاری ٹور پر ملائیشیا نہیں گیا۔''

''تھینک یو انکل!'' ماہا نے مرے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر فون پھوپھو نجمہ کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اس سے مزید کرید کرنے لگی جبکہ ماہا کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اس کے واہمے، شک اور اندازے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ اسے اچانک ہی اپنا خواب یاد آنے لگا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ یوں دہل کر رہ گئی جیسے اب اس نے بلال کے بارے میں کچھ بھی غلط سوچا تو وہ سچ ثابت ہو جائے گا۔ پھوپھو نجمہ بات ختم کر چکی تھی، تو اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

''یہ بلال نے جھوٹ کیوں بولا کہاں گیا ہے وہ؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ تشویش تھی۔

''پھوپھو! میرا دل یونہی واہموں کا شکار نہیں ہو رہا تھا، لگتا ہے کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے۔ اب اس کے بارے میں کہاں سے پتہ چلے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چونک گئی، پھر بولی، ''فہد! اسے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے اس نے بتایا تھا کہ بلال کا فون آیا تھا، بلکہ مجھے بتایا بھی تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے، پلیز پھوپھو، اس سے پوچھیں، وہ کہاں ہے؟'' ماہا ایک دم سے بے چین ہو گئی، پھوپھو نجمہ نے چند لمحے اس کی جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''بیٹی! میں تمہاری بے چینی کو اچھی طرح سمجھتی ہوں، میں بھی ایک عورت ہوں لیکن۔! جہاں تک میرا خیال ہے بے صبری اور جلد بازی سے کام مت لو، ممکن ہے فہد کو بلال کے بارے میں سب معلوم ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی پتہ نہ ہو، پھر اصل بات کیا ہے؟ یہ تو ابھی ہمیں نہیں معلوم، سو، ابھی خاموش رہو، بالکل خاموش، کسی سے کچھ بھی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں میری بیٹی کہ جس طرح تم اور میں پریشان ہو رہی ہیں، دوسرے بھی ہو جائیں گے، سو جب تک اصل بات کا پتہ نہیں چلتا، خاموش رہو، میں تمہارے ساتھ ہوں میری بیٹی، تم حوصلہ رکھو۔'' پھوپھو نجمہ نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھوپھو، وہ فون۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن پھوپھو نجمہ نے اس کی بات

کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا، میں ساری بات معلوم کر لوں گی، میں فہد کو اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ سچ بات کب بتاتا ہے، لہٰذا مجھ پر اعتماد کرو، اور سکون سے رہو، یوں سوگواری رہو گی تو سبھی شک کریں گے۔ اس لیے اپنی شادی کے انتظامات میں بھرپور طریقے سے حصہ لو، کسی کو بھی شک نہ ہونے دو، میں سب سنبھال لوں گی، تم فکر نہ کرو، میں ابھی فہد کے پاس جاتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھوپھو، جیسے آپ کہیں۔'' اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاباش میری بیٹی، حوصلہ رکھو، بات نکلنے سے، معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے، اس وقت تک خاموش رہنا ہے جب تک اصل بات معلوم نہیں ہو جاتی۔'' پھوپھو نجمہ نے سمجھایا تو دونوں اندر کی جانب چل پڑیں۔

ماہا اپنے کمرے میں تنہا تھی، رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی جا رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی۔ پہلی بار زندگی میں ایسا ہوا تھا کہ اسے بلال کی بے اعتمادی کا احساس ہوا، ورنہ وہ تو اس پر خود سے بھی زیادہ اعتماد رکھتی تھی۔ جس قدر اس کے اندر اس کا اپنا دکھ تھا، اس قدر بلال کے بارے میں خوف سر ابھار رہا تھا، نجانے وہ کہاں ہوگا؟، کس حال میں ہوگا؟ اسے جہاں بھی جانا تھا کم از کم اسے بتا کر جاتا، یوں اُس کا جھوٹ تو نہ پکڑا جاتا، کس قدر دکھ ہوا تھا اور وہ۔۔۔ وہ نجانے کہاں ہوگا؟ اس کا تصور اسے خوفناک تصویریں دکھانا چاہتا تھا لیکن وہ خود نگاہیں چرا گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلال کا چہرہ اس کے سامنے کسی اور طرح سے آئے، وہ خود سے لڑتے لڑتے بے بس ہو گئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے، پھر روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

❁.....❁.....❁

اس شام میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ مغربی افق پر سرخی چھائی ہوئی تھی اور سورج سیاہی مائل نارنجی ہو رہا تھا، سنہری مائل سمندر کے پانی پر ایک لمبی لکیر روشنی کی تھی جیسے سورج اپنے ساتھ سارے پانی کو بھی لے جانا چاہتا ہو۔ سیاہی مائل نارنجی کرن پانی میں ٹمٹما رہی تھی جسے وہ سمندر سے جدا ہونے کے لیے مچل رہی ہو۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور باتھ روم میں جا کر خوب نہایا۔ فریش ہو جانے کے بعد میں کمرے میں آیا تو شام اتر آئی تھی اور اس کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ انہی لمحات میں نجانے کیوں مجھے ہمت سنگھ یاد آ گیا۔ ممکن ہے پہلا دن کے انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے میں نے ایسا کیا ہو۔ میں نے اس کے نمبر ڈال دیے اور فون کال جانے کی بیل سنتا رہا، تھوڑی دیر بعد فون ریسیو کر لیا گیا۔

’’ہیلو بلال بھاء جی، کیا حال ہیں؟‘‘ ہمت سنگھ نے دبنگ لہجے میں خوشی سے بھر
انداز میں پوچھا۔

’’میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ ویر جی، ٹھیک ٹھاک ہونا؟‘‘ میں نے پوچھا تو وہ
ہوئے بولا۔

’’اور بھاء جی، میں نے تو آپ کو اس لیے کال نہیں کی کہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں، ورنہ میرا بڑا دل کر رہا تھا کہ آپ سے ملوں اور گپ شپ لگاؤں، جندکور تو روزانہ ہی پوچھ ہے۔‘‘ اس نے تفصیل سے بتایا۔

’’یار! میں کون سا پھنسا ہوا ہوں جو تم ڈسٹرب نہیں کرو گے۔ آج گھر جاتے میری بات کروانا، ویسے یہ تمہاری دوکان ہے کدھر، میرے پاس وقت ہوا تو میں آ جاؤں گا۔‘‘ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

’’یہ شہر کے جنوبی حصے میں بڑی مشہور جگہ ہے واکنگ سٹریٹ، یہ ایک طرف سا علاقے سے شروع ہوتی ہے تو دوسری جانب بولی ہائی پھیر تک ختم ہوتی ہے، یا پھر آپ اس الٹ پھیر کرلو، دونوں طرف سے بڑے بڑے خوبصورت گیٹ لگے ہوئے ہیں، میری دوکان بولی ہا پھر کے باہر والی پہلی گلی میں ہے، دائیں ہاتھ پر۔‘‘ اس نے تفصیل سے بتایا۔

’’میں وہاں کس طرح پہنچوں گا؟‘‘ میں نے پوچھا

’’بڑی مشہور جگہ ہے، آپ ٹیکسی سے آئیں تو مجھے بتا دیں، میں آپ کو لے لوں گا ویسے میں رات دیر تک دوکان کھولتا ہوں، آپ کے آنے پر زیادہ دیر تک بیٹھ جاؤں گا۔‘‘ اس نے کہا۔

’’میں نے آنا ہوا تو بتا دوں گا، اور سناؤ۔‘‘ میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

’’بس کچھ نہیں، واہگرو کی کرپا ہے۔ ویسے آپ چکر لگا ہی لو تو اچھا ہے‘‘ اس نے یوں کہا جیسے اس کا دل مجھ سے ملنے کو چاہ رہا ہو۔

’’میں نے ابھی شام کا پروگرام نہیں بنایا، میں تھوڑی دیر بعد بتاتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا، اور پھر الوداعی جملوں کے بعد فون بند کر دیا۔ تو مجھے بڑا سکون سا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ملک میں میرا بھی کوئی اپنا ہے۔ جو میری بات سمجھ سکتا ہے اور میرے لیے اپنے دل میں چاہ رکھتا ہے۔ دیارِ غیر میں ذرا سی مشابہت بھی کس قدر اپنائیت دے جاتی ہے۔ یہ میں نے ان لمحات میں محسوس کیا۔

میں لاشعوری طور پر پی اون کا انتظار کر رہا تھا، لیکن رات کا اندھیرا پھیل جانے تک

وہ نہیں آئی تھی۔ میں چاہتا تو اس کے فون پر کال کر کے پوچھ سکتا تھا کہ اسے دیر کیوں ہو گئی ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اس کا انتظار کر لینا مناسب جانا۔ تبھی دروازے پر دستک ہونے سے میں نے دروازہ کھولا، میرے سامنے پی اون ایک الگ ہی روپ میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جو شاید میری حیرت دیکھ کر مزید گہری ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا اور اس کی جانب غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے سلیولیس سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ آف وائٹ پر گہرے سبز چھوٹے چھوٹے پھول تھے۔ پاؤں میں آف وائٹ سلیپر، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ، سیاہ بالوں میں سبز اور پیلے رنگ کا پھول، وہ بالکل ہی منفرد دکھائی دے رہی تھی، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا سیاہ بیگ ایک جانب پھینکا تو میں اپنے آپ میں آ گیا۔ اس کے بدن پر لگی بھینی بھینی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

’’پی اون! یہ تم ہو؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’کیسی لگ رہی ہوں؟‘‘ اس نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

’’بہت اچھی، بالکل منفرد، پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ تم لڑکی ہو، ورنہ پہلے تو تم آدھی مرد دکھائی دیتی تھی۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے کھلکھلا دی جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ وہ ایک ادا سے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے فریج تک گئی، اس میں سے بیئر نکالی اور اس کی چسکیاں لینے لگی۔

’’بور تو نہیں ہوئے اکیلے میں؟‘‘ اس نے تجسس سے پوچھا

’’بس کوفت نہیں ہوئی۔‘‘ میں نے مختصر سا جواب دیا تو وہ بولی۔

’’اچھا۔! یہ بتاؤ کہ باہر نکلنے کا ارادہ ہے یا یہیں پڑے رہنے کو دل چاہ رہا ہے؟‘‘ اس نے یوں پوچھا جیسے وہ میری مرضی معلوم کرنا چاہتی ہو۔

’’جیسے تم چاہو۔ میں تو مہمان ہوں۔‘‘ میں نے یہ کہہ کر فیصلہ کن بات سے بچنا چاہا۔

’’تو ٹھیک ہے، تمہارے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک یہ کہ پیدل سیر کی جائے یا پھر کسی جگہ سکون سے بیٹھ کر تفریح سے لطف اندوز ہوا جائے، مطلب، کسی تھیٹر، سینما وغیرہ میں جایا جائے یا پرہجوم لوگوں کے درمیان پتایا کا اصل روپ دیکھا جائے۔‘‘ اس نے الجھے ہوئے انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

’’تمہارا دل کیا چاہ رہا ہے کہ مجھے کونسی جگہ دیکھنی چاہیے؟ کیا واکنگ سٹریٹ دیکھنے والی جگہ ہے؟‘‘ میں نے کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہوئے کہا۔

’’میں تمہیں واکنگ سٹریٹ دکھا سکتی ہوں۔ یوں سمجھو کہ یہ بین الاقوامی ملاقات کی

جگہ ہے۔تم چلو گے تو تمہیں بہت اچھا لگے گا۔ دنیا بھر کے سیاح وہاں آتے ہیں تمہیں
پتہ؟۔'' اس نے مجھے وجہ بتاتے ہوئے پوچھا، جبکہ میرے ذہن میں ہمت سنگھ تھا۔

''اوکے! واکنگ سٹریٹیا جیسا تم چاہو۔ میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ
اس نے خالی ٹن ڈسٹ بن میں پھینکا اور ہم ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔
تک ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور پی اون نے واکنگ سٹریٹ بتایا تو میں نے ہمت سنگھ کو فون کر
میں آرہا ہوں۔

وہ پتایا کا گنجان آباد علاقہ تھا جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ پی اون میرے ساتھ
کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بدن سے اٹھنے والی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا کر ایک
احساس دے رہی تھی۔ وہ راستے میں مجھے واکنگ سٹریٹ کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔
دوران میں نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ کس طرف سے اس گلی میں داخل ہونا چاہتی ہے۔
طور پر وہ شمالی راستے کی جانب سے جانا چاہتی تھی کیونکہ ہم اسی طرف سے آرہے تھے۔
کرایہ ادا کر کے جب میں مڑا تو پی اون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگرچہ یہ شہر کا محفوظ ترین علاقہ ہے لیکن یہاں پر جیب تراشی کے مسئلے کو حل
کیا جا سکا، اس لیے بہت محتاط رہنا یہاں پر گوگو بارز، نائٹ کلب، بیئر بار اور وہ سب کچھ
مرد اپنی تسکین کے لیے چاہتا ہے، وہ سب موجود ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے ایک
انداز سے کہا جسے میں سمجھ نہ سکا لیکن اس کے بدلتے ہوئے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا
ان لفظوں میں چھپا ہوا کوئی اور پیغام دینا چاہتی ہے۔ یا شاید اس وقت میں ہمت سنگھ کو
کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس لیے پوری طرح دھیان نہیں دے پایا تھا۔ اس
میں نے بے دھیانی میں پوچھا۔

''یہ بالی ہائی پھیر ہے نا؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا اور پھر پوچھا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں تمہیں ایک شخص سے ملواتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ہمت سنگھ کے نمبر
کر دیئے۔ اس نے فوراً ہی فون ریسیو کر لیا تو میں نے پوچھا۔

''ہم یہاں پر آ گئے ہیں۔ تم تک پہنچنے کے لیے میں کدھر سے آؤں؟'' میں
ہی تھا کہ وہ چہکتے ہوئے بولا

''عشق کی بھٹی عش کے۔۔۔ ساتھ میں کڑی ہے یا منڈا؟''

''تم نے کیسے اندازہ لگا لیا۔''

''آپ نے پہلی بار جو ہم کہا ہے۔'' پھر اس نے ایک خاص نیون سائن کی پہچان بتا کر گلی کا بتایا۔ ''آپ آؤ، میں بھی آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، پھر پی اون کے ساتھ ادھر بڑھ گیا۔ وہ حیران سی میرے ساتھ چلنے لگی۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی سامنے سے وہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میری طرف دیکھنے کی بجائے پی اون کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ بھرپور انداز میں گلے ملا اور پھر پی اون کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ ملے اور ست سری اکال کہا۔ جبکہ اسی کے سے انداز میں نے دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر پی اون نے اسے ''وائی'' کہا۔ تب میں نے دونوں کا تعارف کروایا۔ تو ہم اس کی دوکان کی جانب بڑھ گئے۔ انہی چند قدموں کے دوران اس نے کہا۔

''ویسے بھاء جی! کڑی بہت خوبصورت ہے۔ آپ کا انداز پسند آیا۔ خود شکار کر کے کھانے کی جو لذت ہے، اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا جیسے وہ مطمئن ہو گیا ہو۔ میں نے اس کے ریمارکس پر ایک بھی لفظ نہیں کہا اور دوکان میں پہنچ گئے۔

وہ ایک عام سی ٹیلرنگ شاپ تھی، ہمت سنگ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں ساتھ میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد ہی سوڈے کے گلاس آ گئے۔ وہ گاہے بگاہے پی اون کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جس نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

''شعیب بھاء جی کے دو تین فون آ چکے ہیں۔ آپ کی خیریت اور رابطے کے بارے میں پوچھا تھا۔'' اس نے کہا۔

''تو وہ خود فون کر لیتا۔'' میں نے بے خیالی میں کہا۔

''میں نے پوچھا تھا تب اس نے کہا کہ جب تک آپ خود رابطہ کر کے فون نہیں کریں گے، وہ نہیں آئے گا۔ شاید آپ کی مصروفیت کی وجہ سے کہہ رہا ہو۔'' اس نے وجہ بھی بتا دی تو میں اس کی سمجھداری کا قائل ہو گیا۔ پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران ہمت سنگھ نے پہلے میرا ماپ لیا، پھر پی اون کا، تب تک وہ اس سے خاصی مانوس ہو چکی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ اس کے پاس بیٹھ کر ہم وہاں سے اٹھ آئے۔

واکنگ سٹریٹ میں داخل ہوتے ہی رنگوں بھری روشنیوں سے آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔ وہاں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ سارا پتایا یہیں اُمنڈ آیا ہے اور یہاں ابھی کچھ دیر پہلے دن چڑھا ہے۔ انہی لمحات میں پی اون نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور ساتھ چمٹ کر چلنے لگی۔

''میں یہاں سے بھاگ تو نہیں جاؤں گا، یا پھر اتنے ہجوم میں گم ہونے کا بھی ڈر

نہیں، ہم دونوں کے پاس فون ہیں ہم رابطہ۔۔۔'' میں نے مسکراتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔! میں نے اس لیے تمہارے ہاتھ میں ہاتھ نہیں ڈالا بلکہ اس لیے کہ دوسروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں دوست ہیں۔ اس طرح نہ کوئی تمہاری طرف آئے گی اور نہ میری جانب آئے گا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم دیکھ نہیں رہے یہاں قدم قدم پر لڑکے اور زیادہ تر لڑکیاں کھڑی ہیں، جن کا ''عصمت فروشی'' دھندہ ہے۔ اس گلی کے آخر تک یہ سب دیکھنے کو ملے گا۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک اور بہت بڑا دھوکا ہے اور وہ ہیں لیڈی بوائے، وہ ہیں تو مرد لیکن عورت دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ وہ دیکھو!'' اس نے ایک جانب کھڑے ہیجڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ یہ مخلوق بھی شاید پوری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس نے سچ کہا تھا، بھانت بھانت کے لوگ تھے، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے، دعوت گناہ دیتی بے لباس لڑکیاں کسی متوقع گاہک کی تلاش میں انتہائی مختصر لباس میں عورتیں، سٹور، کھانے پینے کی دوکانیں، زندہ اور تعفن زدہ گوشت بکنے کے لیے تیار تھا، میں انہیں دیکھتا رہا، ان لمحات میں مجھے دو لوگ بہت یاد آئے، ایک شکیل بدایونی جس کی نظم ہے، ''ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟'' وہ نظم مجھے اپنے کچھ ٹکڑوں سمیت یاد آنے لگی، اور دوسرا افسانہ نگاری کا امام سعادت حسن منٹو، جو اگر یہاں ہوتا تو شاید اسے اپنا معاشرہ بہت پردہ دار معلوم ہوتا۔ اس کے ہاں مجبور طوائف پائی جاتی ہے، لیکن یہاں ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اسے اپنے خیالات میں ضرور تبدیلی کرنا پڑتی، وہ جو مشرق کو خالص انداز میں دیکھنا چاہتا تھا، اس پر کچھ اور ہی ملمع کاری ہو چکی تھی، جس کا میں مشاہدہ کر رہا تھا، یورپ، جس نے خاص طور پر صلیبی جنگوں کے بعد پوری دنیا کی ثقافت اور مذہب تبدیل کرنے کے لیے ''عظیم کھیل'' کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ یہاں اِن لوگوں نے مزاحمت نہیں کی تو اس کا اظہار گلی اور بازاروں میں کھڑی ننگی عورتیں دعوت نگاہ دے رہی ہیں۔ لیکن جہاں مزاحمت ہوئی، وہاں پر آگ اور بارود ہے۔ کوئی بھی مسلمان اپنی خواتین کو یوں نہیں دیکھ سکتا جس طرح یورپ والے عورت کو بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا باپ کون ہے؟، یا وہ کس کی اولاد پیدا کر رہی ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ جنہیں اپنی نسل کی شناخت نہیں وہ دنیا کا کلچر تبدیل کرنے کی کوشش میں ہیں۔

''اے بلال! کہاں کھو گئے ہو؟'' پی اون نے مجھے جھنجھوڑا تو میں اپنے خیالات سے

باہر آ گیا۔

''کہیں نہیں، بس یہ دیکھ رہا تھا۔'' میں نے اردگرد اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مجھے لیتی ہوئی ایک بار کی جانب بڑھ گئی۔

اندر بہت شور تھا، بہت سارے لوگ تھے، ننگ دھڑنگ مرد و عورتیں جو دوسرے لوگوں سے بے نیاز تھے۔ ہم بھی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ فوراً ہی ایک ویٹرس ہمارے سر پر آ دھمکی تو پی اون نے بیئر کا آرڈر دے دیا۔

''یہ الکحل والی ہوں گی یا بغیر الکحل کے؟'' میں نے پوچھا

''بغیر الکحل کے پینے کا کیا مزہ، کیا تم شراب نہیں پیتے ہو؟'' اس نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر تم پینا چاہو تو میں منع نہیں کروں گا۔''

''اوہ یار۔! تم لوگ زندگی کس طرح گزارتے ہو، یہاں ہم مزے اور لطف کے لیے آتے ہیں اور تم بالکل کسی مونک[1] کی مانن ہو۔ بالکل بھی انجوائے نہیں کر رہے ہو۔'' وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

''یار! تم انجوائے کرو، میں تمہیں تو منع نہیں کر رہا۔'' میں نے کہا تو ویٹرس بیئر لے کر آ گئی، اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے پہلے اپنا گلاس ختم کیا، پھر میرا ختم کرنے لگی، اس دوران ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی، میں اردگرد دیکھتا رہا، کچھ لوگ مست ہو چکے تھے۔ گلاس ختم کرتے ہی اس نے بل دیا اور ہم دونوں اٹھ آئے۔

اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ وہ خوشگواریت جو یہاں آتے ہوئے اس کے چہرے پر تھی، وہ نہیں رہی تھی، نجانے اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا، مجھے اس کی قطعاً سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ جب اس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا تھا، اور میرے ساتھ چپک کر چل رہی تھی، اب ویسا نہیں تھا، وہ سامنے دیکھتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی، تب ایک خالی سی جگہ دیکھ کر جہاں رش نہیں تھا، میں نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پی اون! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

وہ میرے چہرے پر ہونقوں کی طرح چند لمحے دیکھتی رہی، پھر ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔

''تھی، لیکن اب نہیں ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے تجسس سے پوچھا

''تھوڑی دیر کے لیے میں یہ بھول گئی تھی کہ تم مسلمان بھی ہو، میں نے تمہیں فقط اپنا

دوست سمجھا تھا۔''

''وہ تو ہوں۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں دوستی سے زیادہ اپنا مذہب پیارا ہے، کوئی بات نہیں، اتنا تو ہے کہ تم میرے ساتھ ہو اور مجھے منع نہیں کر رہے ہو۔ کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟''

''ہاں!'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تمہیں یہاں سے شاید ہی حلال کھانا ملے، اس لیے تمہیں بھوکا رہنا پڑے گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا، مجھے کھانا مل جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس دی، پھر ہم نے قدم بڑھا دیئے۔

کچھ دور تک چلتے رہنے کے بعد اسے ایک سی فوڈ ریستوران ملا، شاید وہ اس کی پسند کا تھا ورنہ وہ اپنے پیچھے بہت سارے ریستوران چھوڑ آئی تھی، وہ اس میں گھس گئی اور ایک میز کے گرد جا بیٹھی۔ میں بھی اس کے سامنے جا بیٹھا، وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''تم مینو میں کوئی بھی چیز پسند کر سکتے ہو، میں تو اپنے لیے چن ہی لوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ ''لیکن، اس سے پہلے میں کچھ ڈرنک لوں گی۔''

''تم جو چاہو کرو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میز پر پڑے مینو کو دیکھنے لگا، اس میں سلاد کی ڈش تھی، میں نے اندازے سے دو تین منگوالیں۔ جبکہ پی اون پینے لگی، تیسرے پیگ کے بعد وہ ترنگ میں آ گئی، اس کی آنکھیں خمار آلود ہوگئیں اور گال ضرورت سے زیادہ سرخ ہوگئے، جو تھوڑی بہت لپ اسٹک اس کے لبوں پر لگی ہوئی تھی، وہ اتر چکی تھی، وہ خاموش ہو چکی تھی، ہمارے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا۔ اس کا آرڈر کیا ہوا کھانا آ گیا۔ میں سلاد سے پیٹ بھر کے سافٹ ڈرنک پی چکا تھا، وہ کھانا ختم کر چکی تو میں نے بل دے دیا۔

''چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں'' اس نے ہنکارا بھرا اور میری جانب بہت غور سے دیکھا۔ جب وہ اٹھی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ریستوران سے باہر آئے تو وہ اپنے طور پر درست چل رہی تھی، لیکن ایسا نہیں تھا، میں پریشان ہوگیا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ گلی آخر کس حد تک طویل ہے اور نہ ہی اس میں کوئی ٹریفک تھی کہ ٹیکسی وغیرہ مل جاتی۔ ہم دونوں پیدل چلنے پر مجبور تھے۔ میں نے کسی بھی متوقع پریشانی سے بچنے کے لیے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا تاکہ اسے سہارا مل جائے۔ میں حیران تھا کہ وہ بالکل خاموش ہو چکی ہے۔ وہ کوئی بھی بات نہیں کر رہی تھی، میں

اسے لے کر چلتا رہا یہاں تک کہ ساحلی روڈ پر وہ گلی ختم ہوگئی، میں نے ایک طویل سانس لی اور ٹیکسی کے لیے نگاہیں دوڑانے لگا، تھوڑی دیر بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔ پی اون تو ان سے بھاؤ تاؤ کر لیتی تھی، اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے لے کر ہوٹل پہنچ جاؤں، خاموش پی اون آنکھیں بند کیے میرے ساتھ لگی رہی، یہاں تک کہ ہم ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس وقت رات کا دوسرا پہر ختم ہونے والا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی، میری جانب ہونقوں کی مانند دیکھ رہی تھی، میں نے اسے وہیں چھوڑا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے جلدی سے بدن پر پانی بہا کر چپچپاہٹ ختم کی، لباس بدلا اور باہر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں پی اون سے کہوں گا کہ وہ نہا لے تو اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ جیسے ہی میں باہر آیا وہ اپنے سامنے شراب کی چھوٹی بوتل اور گلاس رکھے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''آؤ! میرے سامنے بیٹھو۔''

میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں عادی نہیں ہوں، کبھی کبھار پیتی ہوں۔ لیکن آج میں اس لیے لڑکھڑا گئی ہوں کہ مجھے تمہارے حصے کی بھی پینی پڑ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بوتل کھولی اور دو گلاس بھر لیے۔ دونوں میں برف ڈالی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں ٹکرایا اور پھر ایک ہی سانس میں ایک خالی کیا اور دوسرا رکھ دیا۔ میں اس کا پاگل پن دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد اس نے دوسرا اٹھایا اور وہ بھی پی لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''تم مسلمان ہو! میں جانتی ہوں، جب سے تم مجھے ملے ہو، اپنے مذہب کا پرچار کرتے چلے جا رہے ہو، میں مانتی ہوں تم ٹھیک ہو، تمہیں حق حاصل ہے کہ تم میرے طنزیہ اور چبھتے ہوئے سوالوں کے جواب دو، لیکن، میں تمہاری دوست ہوں، تم مجھے مسلسل نظر انداز کرتے چلے جا رہے ہو۔ تم میرا دل توڑ رہے ہو، کیا تمہیں احساس ہے، کیا تمہارے مذہب میں دل توڑنا حرام ہے یا حلال؟ بولو۔''

''پی اون! میرا خیال ہے کہ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تم تھک چکی ہو، ہم باتیں کریں گے۔'' میں نے بڑے پیار اور تحمل سے کہا۔

''نہیں! تم مجھے بتاؤ، اگر تم لوگ سچے ہو، دہشت گرد نہیں ہو تو پھر تمہارے اپنے ملکوں میں آگ کیوں لگی ہوئی ہے۔ تم لوگوں کے اپنے بچے مر رہے ہیں، تمہاری عورتیں ظلم کا شکار ہو رہی ہیں۔ سب بھوکے ہیں، تم ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہی کیوں ہو؟ اس لیے کہ تم میں

لڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تم کیوں دوسری قوموں کے ظلم کا شکار ہوتے ہو؟ آخر کیا وجہ ہے؟، تم مجھے اپنے مذہب کے بارے میں تو بتا رہے ہو، اپنی قوم سے کیوں نہیں کہتے ہو کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ اصل میں تم لوگ بہت ظالم ہو، تم لوگ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہو اور دوسروں پر بھی۔ میں تین دن سے تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ تم اپنی دوست کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہو، جس نے تمہارے ساتھ نجانے کتنے خواب دیکھے ہیں۔ میں نے خود کو فقط تمہارے لیے بچا کر رکھا ہے اور تم صرف اس لیے مجھے نظر انداز کرتے چلے جا رہے ہو کہ یہ سب تمہارے مذہب میں حرام ہے، پھر تم کیوں یہاں تک آئے ہو؟ کیوں کی ہے مجھ سے دوستی؟، کیا ہے یہ حلال وحرام کی تھیوری؟، تم لوگوں نے اگر مونک کی مانند زندگی گزارنی ہے تو پھر غاروں میں چلے جاؤ، ہمارے مونک بھی غاروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن۔۔۔ نہیں مونک نہیں۔۔۔ ان میں اور تم میں بڑا فرق ہے۔۔۔ تم ظالم ہو۔۔۔ تم انتہا پسند۔۔۔"

وہ جوش میں کہتے کہتے اچانک ڈھیر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ واضح لفظ بھی بڑبڑاہٹ میں بدل گئے، وہ پوری طرح نشے میں تھی۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی مجھے اس سے غرض تھی۔ ان لفظوں میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ ہم جب یہاں ہوٹل سے نکلے تھے، تب سے لے کر یہاں واپس آ کر اس بڑبڑاہٹ تک پی اون کی ایک ایک حرکت میرے ذہن میں آنے لگی۔ میں کوئی فرشتہ نہیں تھا۔ واکنگ سٹریٹ ایک ایسی جگہ تھی جہاں میرے مطابق انچ انچ پر دعوت گناہ تھی۔ وہاں میرا لڑھک جانا یقینی تھا، پی اون کا جوان بدن میرے ساتھ چپکا ہوا تھا، نگاہیں لباس سے عاری جسموں کو دیکھ رہی تھیں، قانونی تحفظ کے علاوہ روایتی آزادی بھی تھی، میں اپنی مرضی یا وِل پاور پر وہاں سے بچ کر نہیں آیا تھا بلکہ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہاں سے بچ کر آ گیا۔ لیکن یہاں آتے ہی ایک نئی افتاد میرے سامنے تھی، پی اون بپھری ہوئی تھی مگر دھیرے دھیرے نشے میں مدہوش ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے روم سروس سے کہہ کر وہاں سے شراب اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات اٹھوا دیئے۔ صوفے پر بیٹھی پی اون کو اپنے بازوؤں میں بھر کر بیڈ پر لٹایا اور خود تکیہ لے کر نیچے قالین پر آ گیا۔ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ اس لیے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

❁......❁......❁

ماہا لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ صبح کی سنہری نرم دھوپ ہر جانب بکھری ہوئی تھی لیکن وہ اس سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دھرے ہوئے میز پر رکھی چائے ٹھنڈی یخ ہوگئی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کی کوئی بھی خبر اس کے ذہن میں نہیں

رہی تھی۔ وہ تو بس مسلسل بلال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بھی اس سے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اور اگر اس نے کسی بھی وجہ سے یہ جھوٹ بولا تھا، اسے کہیں جانا تھا تو کم از کم اسے اعتماد میں لے لیتا۔ کیا وہ اس کے دوستوں سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے؟ کیا اس کی ترجیحات بدل گئیں ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان کا ساتھ پائیدار ہو پائے گا، کیا ان میں عشق کی حدوں تک محبت یونہی قائم رہے گی یا پس منظر میں چلی جائے گی، اس کا یقین تڑخ رہا تھا، جس کے تڑخنے کی آواز سے وہ ذہنی طور پر ماؤف ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یقین ٹوٹنے کا مطلب اس کی اپنی زندگی کا سارا چین وسکون اور قرار ختم ہو جانے والا تھا۔

اصل میں ماہا کا اتنا قصور نہیں تھا کہ وہ کیوں حد درجہ اضطرابی کیفیت میں آ گئی تھی۔ اس نے بچپن کے لاشعوری دھندلکوں سے لے کر جوانی کی شعوری کیفیات تک میں اس نے بلال کی ٹوٹ کر چاہنے والی محبت کی شدت کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اسے محسوس بھی کیا تھا۔ جس طرح ہر عام آدمی کو یہ یقین ہوتا ہے کہ الف کے بعد ہمیشہ ب ہی آئے گا، ج نہیں آ سکتا، لیکن اگر اچانک اس کے سامنے جیم والی صورت حال آ جائے تو وہ چونک جائے گا اور پھر جب ایسی صورتحال کی کوئی منطقی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو اضطرابی کیفیت پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ کیونکہ یقین جو ہے وہ ارادہ کی منطقی اور مطمئن کر دینے والی حیثیت ہے۔ جب تک خواہش نہ ہو تب تک یقین پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ماہا، اپنے طور پر اس صورتِ حال کو دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے یا پھر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بھی ان وجوہات کو تو بہرحال سامنے رکھنا ہوتا ہے جس کی بنیاد پر نتیجہ سامنے آئے۔ اس نے پچھلے چند مہینوں کے دوران بلال کے ایک ایک رویے کو پرکھا اور ان کا جائزہ لیا۔ پہلے اس کے پاس بلال کے رویے کے بارے میں کوئی وجہ نہیں تھی، اس لیے اتنی اہمیت بھی نہیں تھی، لیکن جب سے اس نے کتابیں وغیرہ دیکھی تھیں، ساری باتیں ایک ایک کر کے اس پر کھلتی چلی جا رہی تھیں۔ ان باتوں کا حتمی نتیجہ تو یہی تھا کہ اب شاید ان کا ساتھ نہ رہے اور اگر ساتھ ہو بھی گیا تو وہ ناپائیدار ہوگا، وہ اپنے بارے میں تو کم از کم یہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ بلال کی سوچ کے مطابق کبھی نہیں ڈھلنے والی تھی اور نہ ہی اسے یہ امید تھی کہ وہ بلال کو دوبارہ اسی مقام پر لا سکتی تھی، جو اس کا من پسند تھا۔ وہ جب بھی یہ ساری جمع تفریق کرتی تھی اور آخر میں نتیجہ نکال کر بھی بیٹھ جاتی تھی لیکن اندر کہیں کوئی بیٹھا اس ساری حقیقت کو واشگاف الفاظ میں جھوٹ قرار دے دیتا، اس نتیجے کی کوئی اہمیت نہ رہتی۔ ایسے لمحات میں اس کی کیفیت یوں ہو جاتی جیسے شدید پیاس کے عالم میں ایسا پانی سامنے آ جائے جو کسی دشمن نے پیش کیا ہو، اس پانی کے

ناپاک ہونے کا شبہ ہو، یا پھر اس کے پینے سے کسی بیماری کے لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسے میں ماہا کے پاس سوائے رونے کے اور کچھ نہ رہ جاتا۔

''ماہا! تم رو رہی ہو؟''

وہ اپنی ماما کی آواز پر چونکی، پھر چند لمحوں تک اسے احساس ہی نہ ہو سکا کہ اس کی ما نے کہا کیا ہے، پھر جب اس کی سمجھ میں آیا تو لاشعوری طور پر اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور اپنی ماما کی جانب دیکھ کر مسکرا دی، بلاشبہ ایسی مسکراہٹ جو آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہو، جذباتی تعلق میں جگر پار کر دینے کی سکت رکھتی ہے۔ اس کی ماما بھی تڑپ گئیں اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر بولیں۔

''ماہا بیٹی! کیا بات ہے، تم یوں، یہاں پر بیٹھ کر آنسو بہا رہی ہو؟ مجھے بتاؤ۔''

ماہا نے اپنی ماما کے چہرے پر دیکھا اور پھر چند لمحوں بعد بولی

''کچھ نہیں ماما! بس یونہی آپ سے، پاپا سے جدائی کا خیال آ گیا تھا۔''

وہ ایک ہی لمحے میں سب کچھ چھپا گئی تھی۔

''میری بیٹی!'' ماما نے اسے اپنے ساتھ لاڈ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو رسم دنیا ہے میری جان، پھر ہم بھلا تم سے کہاں دور ہوں گے۔ ممکن ہے تمہارے پاپا گلاب نگر ہی میں جا بسیں، یا پھر تم اور بلال ادھر یہیں رہو ہمارے پاس۔ ابھی تو چند سال تک تم لوگوں کو خود احساس نہیں ہوگا کہ وقت پَر لگا کر کہاں اڑا جا رہا ہے۔ تم لوگ اپنی دنیا میں یوں کھو جاؤ گے کہ دوسروں کا ہوش بھی نہیں رہے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ماما، لیکن اگر تعلق میں کہیں خرابی آ جائے تو زندگی کتنی اجیرن ہو جاتی ہے۔''

''یہ تم کیا سوچ رہی ہو؟ کیا بچپن میں تم لوگ آپس میں نہیں جھگڑا کرتے تھے یہاں تک کہ اب بھی تم دونوں میں ذرا سی بات پر اختلاف ہو جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر ماما چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''دیکھ بیٹی! میں مانتی ہوں کہ عورت کے حق حقوق ہونے چاہئیں۔ لیکن اس وقت جب وہ اپنے فرائض نبھائے۔ کسی بھی گھر کا مرکز عورت ہوا کرتی ہے۔ وہ جس قدر مضبوط ہوگی، گھر اس قدر مضبوط ہوتا ہے۔ شوہر کے گھر میں ماں اس وقت بنتا ہے جب وہ تمہارا ہم خیال ہوگا اور اس دنیا پر ہم خیالی ہی جنت ہے۔''

''لیکن اگر ہم خیال نہ بن پائے تو؟'' اس نے پوچھا

''ایسا ممکن نہیں ہے، دراصل، چھوٹی چھوٹی خواہشیں، تمنائیں، ذاتی انا اور ایسی انا چیزیں درمیان میں رکاوٹیں بنتی ہیں۔ اگر انہیں۔ ۔ ۔ ایسا ممکن ہے اور پتہ ہے بیٹی؟

محبت کی طاقت سے ہوتا ہے۔ جب محبت ہوتا تو ایسا کچھ بھی واقع ہو جاتا ہے جس کی ہم توقع بھی نہیں کر رہے ہوتے۔'' اس کی ماما نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے پوچھا

''ماما! اگر کبھی اچانک یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا ساتھی بدل گیا ہے، پہلے جیسا نہیں رہا، اور ان میں بہت زیادہ اختلافات پیدا ہو جانے کا خدشہ ہو تو پھر۔۔۔ تو پھر کیا کیا جائے ماما؟''

''پہلی بات تو یہ میرے بچے کہ جب دو لوگ قریب ہی اتنے ہوں تو وہاں ان کے درمیان ''اچانک'' کچھ نہیں ہوتا بلکہ ہوتے ہوتے کچھ ہوتا ہے۔ پھر ایک شے ہوتی ہے، شک، جب وہ تعلق میں آ جائے تو اس کے اثرات دیمک کی مانند ہوتے ہیں۔ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ماہا کے چہرے پر دیکھا پھر بڑے ہی پیار سے پوچھا۔ ''ماہا! میری جان، تمہارے دل میں اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے بتاؤ، میری تمہاری ماں ہوں، مجھے اپنی اولاد کی خوشیاں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ بولو بیٹی۔۔۔''

ذکیہ بیگم کے یوں کہنے پر ماہا ایک لمحے کو تڑپ کر رہ گئی، اس کا دل چاہا کہ ساری بات اپنی ماما کو بتا دے لیکن ایک انجانی طاقت نے ایسا کرنے سے روک دیا اس لیے بولی۔

''نہیں ماما! ایسی کوئی بات بھی تو نہیں ہے، بس یونہی اوٹ پٹانگ سے خیال آ رہے تھے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی ماں کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''ایسے تنہا ان گوشوں میں بیٹھی رہو گی تو یونہی اوٹ پٹانگ خیال ہی آئیں گے۔ خیر، میں کیا پوچھنے آئی تھی۔'' اس کی ماما نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جیسے اسے آ گیا تو جلدی سے بولی۔ ''وہ تمہاری نجمہ پھوپھو آج حویلی جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ مجھے بھی کہہ رہی ہے کہ ساتھ چلوں، تمہارا کیا پروگرام ہے۔''

''جیسے آپ چاہیں۔'' اس نے کہا۔ لیکن اس کے دل میں اک بار پھر سے تجسس جاگ گیا تھا کہ بلال کے کمرے میں پڑے ہوئے کمپیوٹر کو ایک نگاہ ضرور دیکھے، ممکن ہے، اس میں سے کچھ چیزیں مل جائیں۔

''ٹھیک ہے۔'' اس کی ماما نے کہا اور اٹھ گئی تو اس کے ساتھ ہی ماہا بھی چل دی۔

ڈرائینگ روم میں پھوپھو نجمہ اپنے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ انہیں آتا دیکھ کر بات سمیٹ لی، پھر فون بند کر کے ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ذکیہ بیگم نے حویلی جانے کا عندیہ دیا تو وہ بولی۔

''ادھر بیٹھو بھابی! میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے، ماہا تم بھی ون مشورہ دینا۔''

"ایسی کیا بات ہے نجمہ؟" ذکیہ بیگم نے تجسس سے پوچھا اور پھر قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی، ماہا انہی کے ساتھ بیٹھی تو اس نے کہا۔

"ابھی الطاف صاحب کا فون تھا، میں انہی سے بات کر رہی تھی، آپ کو بھی پتہ ہے بھابی۔۔۔ ایسے ہی شادی بیاہ کے موقعے پر ہم اپنے بچے بچیوں کے بارے میں بہت سوچتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ ماہا کو اپنی بیٹی بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن۔۔۔"

"تم نے اپنی اس خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا؟" ذکیہ بیگم نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

"وہ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جس طرح میرا فہد ہے، بلال بھی تو ویسا ہی ہے۔ ماہا اور بلال اکٹھے پلے بڑھے ہیں، ان میں ایک دوسرے کے لیے خاص جذبات ہیں۔ میں ان باتوں کو سمجھتی ہوں، یہ بھی تو ہمارے ہی بچے ہیں۔ ماہا میری بیٹی نہ سہی، بھائی کی بیٹی بن جائے۔" اس نے حسرت سے کہا پھر فوراً ہی بات بدلتے ہوئے بولی۔ "خیر، یہ تو یونہی بات درمیان میں آ گئی، میں اصل میں تم دونوں سے ایک اور ہی مشورہ چاہ رہی تھی۔"

"کیسا مشورہ؟" ذکیہ بیگم نے تجسس سے پوچھا۔

"یہی کہ رقیہ بھی تو اپنے ہی گھر کی بیٹی ہے، اگر ہم اسے اپنے فہد کے لیے۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"میرے خیال میں تو یہ خوشی کی بات ہے۔ اس طرح آپ سب بہن بھائی آپس میں ملتے رہیں گے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ماہا تمہارا کیا خیال ہے؟" پھوپھو نجمہ نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

"مطلب! میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ افضال بھائی یا زبیدہ بھابی کا کہیں اور خیال تو نہیں ہے اور خصوصاً رقیہ کے خیالات کیا ہیں؟ میں چاہتی ہوں کہ کہیں بھی کوئی زور زبردستی والی بات نہ ہو۔ تعلق میں خوشی ہو تو ہی ساتھ خوب نبھایا جا سکتا ہے۔ ورنہ بہت مشکل ہو جاتی ہے۔" پھوپھو نجمہ نے ماہا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو اسے یوں لگا جیسے یہ بات اسی کے لیے کہی جا رہی ہے۔ اگر اس کے اور بلال کے درمیان خوشی کی بجائے محض ایسا بندھن ہو جس میں بس تعلق ہی نبھایا جاتا ہے تو پھر۔۔۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکی کیونکہ اس کی ماما اور پھوپھو کے درمیان ایک طویل بات چل نکلی تھی۔ جس کا نتیجہ کچھ دیر بعد یہی نکلا کہ فی الحال ماما کے ذمے یہ لگایا جائے کہ وہ رقیہ کا عندیہ لے۔ پھر اس کے بعد بات آگے بڑھائی جائے گی۔ بات چل نکلی تو شادی کے دوران ہی ان کی منگنی بھی کر دی جائے گی۔ سو ماہا نے یہ ذمے داری

لے لی اور انہوں نے گلاب نگر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

❁……❁……❁

میری آنکھ کھلی تو نیم تاریک کمرے میں پی اون نہیں تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ باتھ روم میں ہو گی، اس لیے اٹھ کر چند لمحے بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ روشنی اندر آ گئی تو کمرے کا ملگجا اندھیرا دور ہو گیا۔ میں چند لمحے سمندر کا نظارہ کرتا رہا پھر پلٹ کر بیڈ پر آن بیٹھا۔ باتھ روم کی جانب سے کوئی آواز نہیں آئی تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کا بیگ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنا والٹ اور دیگر کاغذات چیک کیے، وہ سب تھے، میں نے باتھ روم میں جا کر دیکھا، پی اون وہاں بھی نہیں تھی۔ میں یہی خیال لیے واپس بیڈ پر آ بیٹھا کہ وہ ناراض ہو کر جا چکی ہے۔ مجھے افسوس ہوا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، تبھی مجھے پی اون کو فون کرنے کا خیال آیا۔ میں نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پش کیے۔ دوسری جانب بیل جاتی رہی۔ میں نے چند بار کوشش کی لیکن وہ بار آور نہ ہو سکی۔ سو میں نے فون ایک طرف رکھا اور نہانے چلا گیا۔

میں فریش ہو کر بھی یہی سوچتا رہا کہ پی اون اتنی جلدی ناراض ہو سکتی ہے مگر میرا اس میں قصور کیا تھا۔ یہی کہ میں نے اس کے بدن کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے افسوس بھری کیفیت میں ناشتے کے لیے کہا اور یہی سوچنے لگا کہ آج ہمت سنگھ کی جانب جاؤں گا۔ شام کے وقت اگر پی اون ڈیوٹی پر آئی تو اس سے ملنے کی کوشش کروں گا، اسے اپنی بات سمجھاؤں گا۔ اگر وہ سمجھ گئی تو ٹھیک، ورنہ پھر ایک دن میرے پاس ہو گا، وہ شعیب کے ساتھ انجوائے کر کے واپس جانے کی کوشش کروں گا۔ پی اون کا رویہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں ہمت سنگھ کی جانب چل دیا۔ میں نے اسے فون کیا اور "شاہانہ ہوٹل" کے باہر سے ٹیکسی میں بیٹھ کر "بولی ہائی پیر" کی جانب چل پڑا۔ اسے میری آمد کی اطلاع تھی، اس لیے وقت سے ذرا پہلے پہنچ گیا۔

"بھاء جی! وہ کڑی بس رات کے لیے ہی تھی؟ یا۔۔۔" ہمت سنگھ نے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد پوچھا تو میں نے اسے رات کی تفصیل سنا دی۔

"پھر بھاء جی آپ ادھر پتایا میں کرنے کیا آئے ہیں۔ انہی پیسوں سے کوئی عمرہ کر آتے۔" ہمت سنگھ نے افسوس سے کہا تو میں اس کی جانب دیکھتا رہ گیا اور لوگوں کی طرح اس کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ لوگ پتایا صرف اس لیے آتے ہیں کہ عیاشی کر سکیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ میں اب اسے پوری تفصیل نہیں سمجھا سکتا تھا، اس لیے مسکرا تا

ہوئے بولا۔

''ہمت سنگھ! آج تم میرے ساتھ ہونے سے بور تو نہیں ہو جاؤ گے، تمہارے کام بھی حرج ہوگا۔''

''اُو نا جی! آپ ایسا سوچنا بھی مت۔ ادھر کام چلتا رہے گا۔ آپ حکم کرو، باہر چلتے ہیں۔ کوئی واٹر سپورٹس۔۔۔''

''ٹھیک ہے سوچتے ہیں، لیکن پہلے اچھی سی چائے پی لیں اور تم بھی اپنے کاریگروں کو کام دے دو۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً مان گیا۔ میں نے صوفے کے پاس دھرے ٹیبل پر سے میگزین اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ وہ وہیں کے بارے میں تھا۔ میں کچھ دیر تو پڑھتا رہا، پھر میرا جی اُوب گیا۔ اتنے میں چائے آ گئی تو ہمت سنگھ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر پینے لگا۔

''بھاء جی! وہ رات والی لڑکی، وہی نہیں تھی جو اس ہوٹل میں کاؤنٹر پر ملی تھی؟'' اس کے دماغ پر اب بھی پی اون چھائی ہوئی تھی۔

''ہاں! وہی ہے۔ دراصل ہم دونوں کی دوستی نیٹ پر ہوئی تھی۔ میں بس دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسی ہے؟'' میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے ''وجہ'' بتا دی، جس پر وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''بس اتنی سی بات کے لیے اتنا سارا پیسہ خرچ کر دیا؟'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے بولا۔ ''خیر! کوئی بات نہیں پیسہ آنے جانے والی شے ہے۔ اپنی خواہش تو پوری کر لی۔'' اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو میں اس کے خلوص پر مسکرا کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ میری دلجوئی کر رہا تھا اور جو میرا متوقع نقصان ہوگیا تھا وہ میرے ذہن سے محو کرنا چاہتا تھا، حالانکہ اتنی رقم میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی ہمت سنگھ میرے پس منظر سے متعارف تھا۔

''چل چھوڑ ہمت سنگھ۔! تو مجھے یہ بتا کہ کبھی تو پاکستان گیا ہے؟'' میں نے اس کی ذہن سے پی اون کو محو کرنا چاہا۔

''نہیں! پر بڑا دل کرتا ہے کہ بابا جی کے گردوارے کا درشن کروں۔ یہ تو ہمارے لیے آپ کے حج برابر ہوتا ہے نا۔'' اس نے بڑی حسرت سے کہا تو میں اس کی خواہش پر مسکرا دیا اور بولا۔

''میری طرف سے جب بھی جی چاہے پاکستان آ جانا، میرے پاس رہنا، میں تمہیں سب جگہ لے جاؤں گا۔'' میرے یوں کہنے پر وہ کھل گیا اور حیرت سے بولا۔

''سچ بھاء جی۔''

''چاہو تو میرے ساتھ چلو، پر ان دنوں وقت نہیں دے پاؤں گا۔''

''میں اتنی جلدی نکل بھی نہیں سکوں گا، چلیں بہت جلدی پروگرام بناؤں گا۔'' اس نے کھو جانے والے لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ ''پہلے میں بھارت جاؤں گا، پھر وہاں سے پاکستان آؤں گا۔''

''جیسے تمہارا دل چاہے۔'' یہ لفظ میرے منہ میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے سکرین پر پی اون کے نمبر دیکھے تو ایک لمحے کے لئے خوشگوار احساس میرے اندر سرائیت کر گیا۔ میں نے فون ریسیو کیا تو اس نے مختصر سا پوچھا۔

''کہاں ہو؟''

''تم پہلے بتاؤ کہ کہاں چلی گئی تھی اور اس وقت۔۔۔''

''میں ہوٹل میں ہوں تمہارے کمرے کے باہر، بولو کہاں ہو؟'' اس نے میری بات اُچکتے ہوئے کہا۔

''ہمت سنگھ کی دوکان پر۔''

''اوہ۔!'' اس نے حیرت سے کہا اور پھر بولی۔ ''وہیں رہنا میں آ رہی ہوں۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے جھٹ فون بند کر دیا۔ ہمت سنگھ اتنی تو انگریزی سمجھتا تھا، اس لئے مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ کڑی فون کر رہی تھی نا؟'' اس نے پوچھا تو میں مسکرایا۔ تب وہ بولا۔ ''ہوسکتا ہے اسے کوئی مجبوری ہو۔''

''چل آ کے بتا دے گی نا۔'' میں نے کہا اور صوفے سے ٹیک لگا لی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد پی اون دوکان میں داخل ہوئی۔ اس نے بلیک ٹی شرٹ اور نیلی جین پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں تھائی طرز کے کھلے جوتے تھے۔ بال کھلے ہوئے اور چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھی۔ چونکہ ہمت سنگھ بھی وہیں تھا اس لئے پی اون نے رات والی کوئی بات نہیں کی۔ مگر میں نے وہ بات چھیڑ دی۔

''میں شرمندہ ہوں بلال، مجھے تمہیں فورس نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے احساس ہے کہ میں تم پر بہت چیخی چلائی تھی لیکن مجھے اف کرنا، اس وقت میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔ ممکن ہے تم اپنے الگ سے نظریات رکھتے ہو اور میں نے تو اپنے معاشرہ کی روایات کے مطابق رویہ اپنایا ہے نا۔۔۔'' پی اون ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی جیسے وہ ہمت سنگھ کے سامنے ہی نہیں مجھے بھی اس موضوع پر کچھ کہنا نہ چاہ رہی ہو۔ اس پر ہمت سنگھ نے انگریزی میں کہا

"پی اون جی! اس معاملے میں ہمارے معاشرے کی باتیں سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔"

"خیر! کوئی بات نہیں، تم بتاؤ، کیا پروگرام ہے، واپس ہوٹل چلیں یا کہیں سیر کرنے نکل پڑیں۔" میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"میں بہت تنہائی میں تم سے باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔ ہوٹل میں یا کہیں پارک میں۔۔۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا پھر فوراً ہی بولی۔ "یہیں قریب ہی ایک جزیرہ ہے۔ کوہ لرن (Koh Larn) وہاں چلتے ہیں۔ شام تک واپس آجائیں گے۔" اس نے کہا اور ہمت سنگھ نے جو اسے ٹن پیک سوڈا دیا تھا، اسے کھول لیا۔

"اگر مجھے وہاں لے جانا چاہتی ہو تو چلو، میں تیار ہوں۔" میں نے ایک دم فیصلہ سنا دیا۔ اس پر ہمت سنگھ ہنس دیا۔

بولی ہائی پیر ہی وہ جگہ تھی جہاں سے کوہ لرن یا دیگر جزیروں کے لیے کشتیاں جاتی تھیں ہم پیدل ہی وہاں تک پہنچے، ساحل پر سے دور اندر سمندر تک جیٹی بنی ہوئی تھی، جس کے سرے پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ پی اون ٹکٹ لینے لگی تو میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں کی خاص بات یہی تھی کہ سامنے بڑے بڑے نیون سائین میں پہاڑی پر پتایا لکھا ہوا تھا۔ جو یقیناً رات کے وقت جگمگاتے ہوں گے۔ ہم کشتی کی جانب بڑھے، جہاں پہلے بھی کچھ سواریاں تھیں۔ بڑی آرام دہ رنگین کرسیاں جمائی گئیں تھیں۔ پی اون بیٹھ گئی۔

"وہاں کی خاص بات کیا ہے پی اون؟" میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"سفید ریت، شفاف پانی، چاہو تو شور شرابا اور چاہو تو پرسکون جگہ۔" اس نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا

"خود ہی دیکھ لینا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک یونہی بیٹھی رہی پھر میری بوریت کا احساس کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "کوہ لرن تھائی زبان میں شفاف ساحل کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں کا پانی بہت شفاف ہے۔ وہ جزیرہ سات کلومیٹر لمبا اور تقریباً دو کلومیٹر چوڑا ہے۔ بہت سرسبز، جنگل نما، شور شرابا چاہو گے تو ساحل پر ہر طرح کی سپورٹس ہے، سکون چاہو گے تو جنگل میں چلے جاؤ، اس جزیرے کے ہر جانب تقریباً چھ ساحل ہیں۔"

"کیا یہ قدرتی ساحل ہیں یا انہیں بنالیا گیا ہے؟" میں نے معلومات چاہیں۔

"ہماری نگاہ میں خوبصورتی اسے کہتے ہیں جہاں سے دولت ملے، جتنی زیادہ دولت اتنی زیادہ خوبصورتی، سو، قدرتی ہو یا مصنوعی، ہم نے دولت بنانے کے ذرائع پیدا کرلیے ہیں۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو میں خاموش ہوگیا۔ کھڑی کشتی میں دیگر عورتیں اور

مرد سوار ہو رہے تھے۔ ان میں مقامی باشندے کم اور ٹورسٹ زیادہ تھے۔ یہاں تک کہ کشتی چل پڑی اور ہمارے درمیان خاموشی بھی اتنی ہی گہری ہوگئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد پی اون نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بلال! میں تمہیں ایک تھائی نظم سناؤں؟ جو یہاں کے ایک شاعر نائے راتی بت کی طویل نظم کے حصے ہیں۔"

"جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تھائی زبان بالکل بھی نہیں آتی۔" میں نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، تمہیں تو میں ترجمہ ہی سناؤں گی نا۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سناؤ۔" میں نے کہا اور اپنا کان اس کے قریب کرلیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"جدائی پھیل جائے گی
میرے محبوب خوش رہنا
ستارے آنکھ میں رکھنا
یقین رکھنا جدائی ختم بھی ہوگی
یقیناً ہم ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔"

"میری سانسیں
کشتیوں کے ساتھ چلتی ہیں
میرے دل میں
کوئی جذبہ ہے بہتے پانیوں جیسا
میرے ہونٹوں پر اُجلے لفظ تجھے جب یاد کرتے ہیں
تو بہتے پانیوں پہ پھول جیسے ناز کرتے ہیں
کوئی جنگل میں تنہا گا رہا ہوگا میری خاطر"

"دریا کے اس پار بھی جانا
پھولوں کے ہونٹوں پہ لکھنا
میرا اپنا نام
دریا بہتا جاتا ہے
اس سے کوئی بات کرو۔"

"بہت خوب۔" میں نے اس شاعری میں چھپے احساسات کو محسوس کرتے ہوئے

بے ساختہ کہا تو پی اون نے میری جانب دیکھا اور بولی۔

''تمہیں یہ اچھا لگا؟''

''ہاں! اس میں بہت خوبصورت جذبات ہیں، منفرد سی کیفیت ہے۔''

''ایک اور سناؤں، سنتھورن بھیپو کی طویل نظم ''پھوکا دھونگ'' سے ذرا سا حصہ۔''

''ہاں سناؤ۔'' میں نے اشتیاق سے کہا تو وہ سنانے لگی۔

''پانیوں میں چلتے چلتے
ذہن یکدم ماضی کی یادوں میں گم ہوجاتا ہے
میں چشم تصور سے وہ خوبصورت بجرہ دیکھتا ہوں
جس میں بیٹھ کر میں بادشاہ سلامت کا منتظر ہوتا ہوں
بادشاہ سنہری تاج سجائے آتا تھا
میں اس کے روبرو اپنی نظمیں پڑھتا تھا
جب تک دریا کی روانی ساتھ دیتی، میں شعر سناتا رہتا
میرا محبوب بادشاہ میرے روبرو ہوتا
سارا ماحول معطر اور خوشبودار ہوتا
یہ سفر ختم ہوتا تو ایک خواب آنکھوں میں بس جاتا''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو میری زبان سے بے ساختہ ''بہت خوب'' نکلا تو وہ میری جانب دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا جسے میں باوجود خواہش کے پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنا رخ موڑ لیا۔ جب پتایا کے ساحل سے چلے تھے تو بیچ سمندر میں سے بلڈنگیں، فائر ہاؤس اور بہت کچھ دھیرے دھیرے چھوٹا ہوتا گیا۔ اس طرح کوہ لرن جزیرہ واضح ہونے لگا۔ ویسی ہی ایک جیٹی وہاں پر تھی جو لکڑی سے بنی ہوئی تھی لیکن ہمیں تھوڑا دور اتارا۔ ہم چھوٹی کشتی میں سوار ہوئے اور پھر جیٹی تک جا پہنچے۔ وہاں سے چلتے ہوئے ہم ساحل کے اوپر جزیرے پر پہنچ گئے۔ تبھی پی اون نے بتایا۔

''یہ نیابان ساحل ہے۔ یہاں گاؤں بھی ہے اور ریستوران بھی۔''

''کھانے کو مل جائے گا۔'' میں نے پوچھا

''کوشش کرتی ہوئی کہ تمہارے لیے کچھ مل جائے، ورنہ پھلوں سے گزارا کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ ہم پیدل ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سامنے ہی سرخ چھت والا ایک ریستوران تھا۔ ہم اس میں بیٹھے۔ یخ ٹھنڈا سوڈا پینے کے بعد پی اون نے کہا۔

''آؤ چلیں، یہاں قریب ہی گاؤں ہے۔''

ہم چلتے ہوئے گاؤں میں پہنچ گئے جہاں گھاس پھوس سے چھتیں بنائیں ہوئیں، مکان پختہ تھے اور تارکول کی سڑکوں کے ساتھ دکانیں قطار میں تھیں۔ ایسے ہی ایک ریستوران نما ڈھابے میں ہم جا بیٹھے۔ پی اون خود کچن تک گئی، پھر تھوڑی ہی دیر بعد ابلے ہوئے چاول، تلے ہوئے آلو اور اناناس کے ٹکڑے لے آئی۔ میں نے پیٹ بھر کھائے، سوڈا پیا اور فریش ہو گیا تو جزیرے کی سیر پر نکل گئے۔

موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ بادل سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس دوران اگر دھوپ نکلتی تو وہ اچھی لگتی تھی۔ میں اور پی اون دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے جا رہے تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ صبح بنا بتائے کیوں چلی گئی تھی لیکن بات ہونٹوں پر آنے کے باوجود میں اس سے نہ پوچھ سکا۔ سو ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ کافی دور تک نکل جانے کے بعد اچانک پی اون نے کہا۔

''بلال! ہماری اب تک کے ساتھ میں بہت باتیں ہو چکیں ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہارا لہجہ، انداز اور لفظ کا چناؤ وہ نہیں ہے جو نیٹ پر چیٹ کے دوران ہوتا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھے کوئی چیز سمجھانا چاہ رہے۔ کیا میں درست کہہ رہی ہوں!'' اس نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا تھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں یہ بات تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر تم میری ذات تک محدود رہتی تو شاید میں ایسی بات کبھی نہ کرتا لیکن تم نے براہِ راست اسلام پر الزام تراشی کی جو کہ غیر مسلم بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی صدیوں پرانی مہم ہے، اس کے زیرِ اثر تم بہت کچھ کہتی چلی گئیں۔ سو پی اون! میرا حق بنتا ہے اور فرض بھی کہ تم پر اسلام کی درست اور صحیح تصویر واضح کروں۔''

''کیا تم فقط اسی لیے یہاں تک آئے ہو؟'' اس نے گھمبیر لہجے میں پوچھا

''بالکل، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تو اس نے دھیرے دھیرے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہے کہ جس طرح تم مسلمان ہو، میں بھی کسی مذہب سے اتنی ہی مخلص ہو سکتی ہوں اور......'' یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گئی، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور میں تمہاری بات سننے سے انکار بھی کر سکتی ہوں۔''

''وہ تمہاری مرضی! تمہیں حق حاصل ہے لیکن یہ حق بالکل نہیں کہ تم کسی دوسرے

مذہب پر تنقید کرتی پھرو۔''

''دیکھو! جو میں نے اب تک سنا ہے، پڑھا ہے اور دیکھ رہی ہوں اس پر رائے کی آزادی تو ہے۔ کیا اسلام اس پر پابندی عائد کرتا ہے۔''اس نے کہا تو میں مسکرایا اور کہا۔

''دراصل تم نے کچھ بھی نہیں سنا، نہ پڑھا اور نہ دیکھ سکی ہو، اس میں تمہارا قصور نہیں، بہت سارے نام کے مسلمان بھی اس پروپیگنڈے کے زیر اثر آ چکے ہیں۔ حالانکہ جس قدر انسانی حقوق کا علمبردار دین اسلام ہے پوری دنیا کے لوگ اور مذاہب مل کر بھی انسان کو اس کا حق نہیں دے سکے۔ کیا یہ بات تم نے نہیں پڑھی، دیکھی اور سنی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''خیر! یہ ایک نیا موضوع ہے، میں اس پر تم سے بات کروں گی۔ لیکن میرے ذہن میں اس وقت تین سوال ہیں۔ جو میں تم سے کروں گی اور ان کا جواب بھی چاہوں گی، پہلا سوال یہ ہے کہ تم نے خدا کے وجود کے بارے میں اتنے سائنسی دلائل دیئے، ممکن ہے تمہارے پاس مزید بھی ہوں، تم فلسفہ سے بھی ثابت کرسکو، مگر تم نے آخر میں ایک بات کی تھی کہ یہ سب ہونے کے باوجود دلائل وغیرہ تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک جانب تم اتنے دلائل۔۔۔'اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اس کا جواب دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور تارکول کی سیاہ سڑک پر رُک گیا جو کافی آگے جا کر نیچے کی جانب گر گئی تھی۔ پی اون میری جانب دیکھ رہی تھی۔ تب میں بولا۔ ''مجھے ان دلائل اور براہین کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہ کوئی نئی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ انکشافات تو صدیوں پرانے ہیں اور جس ہستی نے یہ انکشاف کیے ہیں۔ اُس ہستی نے خدا کے ہونے کے بارے میں بتایا۔ بلاشبہ خدا کا وجود برحق ہے اس کی سائنسی اور فلسفیانی ہر طرح کی توجیہہ ہوگی لیکن میرے لئے اتنا ہی کافی اس لیئے ہے کہ میرے رسولِ برحق حضرت محمد ﷺ نے فرما دیا اور پھر جس طرح بتایا، ویسا اللہ ہی میرے لئے کافی ہے۔'' میں نے انتہائی جذبات میں کہا تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ پھر بولی

''یعنی جو محمد (ﷺ) نے کہا تم اس کے مطابق عمل کرتے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھا دیئے۔

''بالکل اسے ہی تو ایمان کہتے ہیں۔ وہ شخص جس کے بارے میں بدترین دشمن بھی اس کے سچا ہونے کی گواہی دیتے ہیں، جس نے پوری انسانیت کو ایسا نظام دیا جس میں انسانی حقوق تو کیا حیوانات کے حقوق بھی شامل ہیں۔ اس کائنات کے حقوق ادا کرنے کی بات کی گئی

ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں اسلام، نام ہے قرآن پاک اور محمد ﷺ کے عمل (سنت) کے مطابق اللہ کی رضا حاصل کرنا۔ اس سے انحراف کرنے والا مسلمان نہیں ہے۔''

''دنیا میں جو تشدد پسند مسلمان ہیں، کیا وہ انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔'' وہ بولی۔

''ممکن ہے جسے تم تشدد کہہ رہی ہو، وہ سرے سے تشدد نہ ہو اور جسے انسانی حقوق کا نام دیا جا رہا ہے وہی ظلم و تشدد ہو۔ غور کرو، انسانی حقوق اور تشدد کو واضح کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا معیار ہے؟'' میں نے کہا تو سوچ میں پڑ گئی، تب میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا کہ تم کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون سا مذہب ہے جسے تم چھپانا پسند کرتی ہو؟''

''بنیادی طور پر یہ بدھ مت ہے، لیکن میں جن لوگوں سے تعلق رکھتی ہوں اس کا نام ''دھا چالو'' ہے۔ اس کا مرکز بنکاک کے شمالی علاقے میں ہے۔ میں نے چھپانا اس لیے چاہا کہ اس پر تنقید بہت کی جارہی ہے کیونکہ اس کے سب سے بڑے مخالفین روایتی بدھ مت کے لوگ ہیں۔ وہ چاہ رہے ہیں قدیم مذہبی کتابوں کی تشریح نہ ہو۔ وہ خامیاں جواب تک بدھ مت میں ہیں انہیں دور کیا جارہا ہے، پوری دنیا میں اس کے مراکز ہیں۔ امریکہ میں 280 ہیکٹر زمین......''

''سوال یہ ہے پی اون کہ کیا تعلیمات کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے تو پھر بدھا کی اہمیت کیا رہ جائے گی؟ کیا اس کی تعلیمات فرسودہ ہو چکی ہیں؟ کیا وہ اس قابل نہیں رہیں کہ نروان دے سکے؟ یا پھر تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ مذہب بھی لالچی، متعصب اور ہوس پرستوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے؟'' میں نے کہا تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ تب میں نے اس کی حیرت کو کم کرنے کے لیے کہا۔ ''میں تمہارے مذہب پر تنقید نہیں کر رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں، جو میں نے اخذ کیا۔''

''تم بھی وہی کہہ رہے ہو، جو یہاں کے مخالف اخبار اور رسالے لکھ رہے ہیں۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن تم پورے انصاف سے ایک بات کا جواب دو اور وہ یہ کہ ناپائیدار شے کے مقابلے میں پائیدار شے میں سے کون سی بہتر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے پائیدار چیز۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''وہ تعلیمات! جو صدیوں سے اسی طرح چلی آرہی ہیں کہ ہر آنے والے دن کے تقاضوں پر پورا اترتی ہیں، وہی تعلیمات میرے پیارے رسول ﷺ نے ہمیں دی ہیں۔ میں تمہارے سامنے فقط ایک بات رکھتا ہوں۔ لیکن اس سے قبل میں اس ذاتِ بابرکات کے

بارے میں ذرا سی بات کہوں گا جو ذرا سی نہیں ہے کیونکہ اس کی مثال پوری انسانیت میں نہیں ملتی کہ نبی ﷺ کے بدترین دشمن بھی انہیں کہیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے اللہ کے واحد ہونے کا اعلان کیا تو مخالف ہو گئے، الزامات کی بھرمار میں بھی انہیں صادق اور امین ہی تسلیم کرتے رہے۔"

"آخر ان کی تعلیمات میں کیا تھا جو مخالف ہو گئے۔" اس نے پوچھا۔

"نفس پرستی، اُن کی دولت، سرداری، اور وہ سب کچھ چھن جاتا جس سے وہ عام آدمی کے برابر آ جاتے۔ یہیں سے کشمکش شروع ہوئی۔ ایک غلام کو حیوانوں کی سی زندگی سے نکال کر اسے انسان ہونے کا حق دلانا، اور فقط 23 سال میں یہ کام کر دکھایا کہ ایک غلام اور سردار برابر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کی بات ہی کو لے لو، اپنے آخری خطبے میں لازوال انسانی حقوق دیئے، جب پورا یورپ وحشیانہ زندگی بسر کر رہا تھا، یہ وہی دور ہے جب یونان اور روم میں یہ بحث چل رہی تھی کہ عورتیں بھی بنی نوع انسان سے تعلق رکھتی ہیں یا نہیں، کیا ان میں روح ہوتی ہے یا نہیں، انہیں کوئی حقوق دیئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب میرے آقا ﷺ نے تمام انسانیت کے لئے لائحہ عمل دے دیا کہ کسی گورے کو کالے اور کالے کو گورے پر، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سب انسان برابر ہیں، کوئی بھی مذہب لاؤ، جہاں یہ تعلیمات ہوں۔"

"تو پھر یہ تشدد کیوں؟" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو میں نے انتہائی تحمل سے بتایا۔

"دیکھو! اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جس طرح قدیم بدھ مت، جدید بدھ مت کے درمیان تصادم کی راہ بن جائے، کچھ گروہ غلط تشریحات کے تحت اسلام کا غلط تاثر لیں۔ یا پھر دنیا کے ان مذاہب کی مانند جن میں اختلاف و انتشار پیدا ہو یا گہری سازش سے پیدا کر دیا گیا ہو، دولت و اقتدار کی ہوس نے مذہب کو اپنے شیطانی خیالات کی تکمیل کے لیے استعمال کرنے کی خاطر، بہرحال کچھ بھی ہو، معیار آپ کے پاس ہے۔ جو اس معیار پر پورا اترتا ہے، وہ ٹھیک ہے، باقی سب غلط۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، مسلمانوں میں بھی اختلاف و انتشار ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ قصہ آج کا نہیں، صدیوں پرانا ہے۔ کون درست ہے، کون غلط، اس کا فیصلہ ہم نہیں، اسلامی تعلیمات خود کر دیتی ہیں کہ جو پائیدار تعلیمات نہیں۔ کون تشدد کر رہا ہے اور کون مزاحمت اور کون جہاد کے ذریعے فتنے کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا

ہے کہ بہت سارے مسلمان بنیادی اسلامی تعلیمات سے بھی واقفیت نہیں رکھتے حالانکہ یہ فقط دین اسلام ہی ہے جس میں علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اب کوئی مسلمان علم حاصل نہ کرے تو اس میں اسلام کا تو کوئی قصور نہیں۔ اس شخص کا جس نے علم حاصل نہیں کیا ہے، حالانکہ اسلامی تعلیمات میں واضح ہے کہ علم نور ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ علم حاصل کر کے نور تک رسائی حاصل کرنے کا تجربہ کرے۔ اس حقیقت کو پائے۔"

"کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اسلامی تعلیمات میں زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ہدایت موجود ہیں۔" اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔ اس وقت ہم اس جگہ پر آ گئے تھے جہاں تارکول کی سڑک کو دورویہ ایستادہ درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔

"بے شک! تمہارے ذہن میں جو مسئلہ، جو بات بھی ہو، اس کے بارے میں ہدایت ملے گی۔" میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو وہ چند لمحوں کے لئے خاموش رہی۔ پھر بولی

"عورتوں کے حقوق! کیا اس بارے میں بھی؟"

"ہاں! اسلام ہی نے عورت کو وہ بلند مقام عطا فرمایا ہے، جو کسی اور مذہب میں نہیں۔ یہاں میں دلائل کے انبار لگا سکتا ہوں۔ لیکن تم شاید انہیں اس وقت تک تسلیم نہ کرو جب تک تم خود اس کی گہرائی میں نہ اترو۔ دیکھو! خود پڑھو اور اپنی ہر سوچ کا جواب حاصل کرنے کے لیے قرآن و حدیث تک جاؤ اور تجربہ حاصل کرو۔ کیا واقعی اسلام نے انسان کو وہ حقوق عطا کئے ہیں۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات تو بتاؤ، جب اسلام نے انسان کو حقوق دیئے، اسے بلند مقام تک پہنچا دیا، تو پھر جہاد کو شہادت کے لالچ سے کیوں فروغ دے رہے ہو۔ کیوں لالچ دیتے ہو لوگوں کو کہ تم مر جاؤ، اس طرح تم زندہ رہو گے اور جنت بھی پاؤ گے، جس کا کسی کو بھی تجربہ نہیں ہے اور لوگ اسی لالچ میں اپنی زندگی ختم کرتے چلے جا رہے ہیں اور جس سے امن۔۔۔"

"تم نے ایک نئے سرے سے، ایک لمبی بحث چھیڑ دی ہے، لیکن میں کم از کم تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کی، پھر کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ انسان کو موت آتی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ لوگ روزانہ مر رہے ہیں۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"انسان فنا نہیں ہوتا، بلکہ زندگی کے مختلف مدارج یا مقامات ہیں۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی تک۔ تم انسانی زندگی کے نمو ہونے پر غور کر سکتی ہو۔ ماں کے رحم میں ایک قطرہ پورے وجود کی صورت اختیار کرتا ہے۔ کہاں سے آ جاتی ہے زندگی، لیکن ایک وقت معین پر اس

نے ماں کا رحم چھوڑ دینا ہے اور ایک نئی جگہ پر آ جانا ہے جہاں سے اسے پھر ایک نئے جہان میں جانا ہے۔ یہ تمہارے سمجھنے کے لئے ایک معمولی سی مثال ہے۔ کیا تمہیں اس دور کی کوئی بات یاد آتی ہے، تمہاری تشکیل ماں کے رحم میں کس طرح ہوئی، بتا سکتی ہو؟ وہ ہستی، جو ایک قطرے سے پورا وجود بخش سکتی ہے، وہ مردے کو بھی زندگی دے سکتی ہے۔ اور جہاں تک جنت کی بات ہے تم نے اپنے پورے وجود کو دیکھا ہے، کیا تم نے اپنے دل کو دیکھا ہے؟ لیکن تمہیں یہ کیا احساس ہے کہ تم زندہ ہو؟ خیر! یہ میں کیا باتیں کر رہا ہوں، جنت اور دوزخ اس وقت سمجھ میں آتے ہیں، جب آخرت کا تصور ہو۔ میرا نہیں خیال کہ تم اس تصور کو نہ سمجھتی ہو۔ معاف کرنا مجھے یہ کہنے دو کہ بدھا کو یہ خوف لاحق تھا کہ وہ مر جائے گا۔ فنا ہو جائے گا، پھر اس کے بعد کچھ نہیں رہے گا، اسی خوف سے وہ اپنی زندگی ہی میں مر گیا۔ نروان کیا ہے؟ اس کی تعریف کر کے ہو تم لوگ، خود بدھا بھی نہیں کر پایا، اور تمہارے دھما چایو فرقے میں مراقبہ ہی کو اہمیت حاصل ہے، لیکن میرے خیال میں مراقبہ تو یکسوئی کا نام ہے، وہ یکسوئی جس میں کوئی خیال نہ ہو، غور سے سنو پی اون! اصل مراقبہ وہی ہے جو رحم مادر میں ہوتا ہے۔ یہاں تو یکسوئی فقط ایک شے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ ہے عشق، بندہ خود بخود یکسو ہونا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جان کو بھی معمولی شے سمجھتا ہے۔''

''یہ عشق کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا، جو شاید اس کے لئے نیا لفظ تھا۔

''چاروں طرف دشمن ہوں، کوئی بھی مددگار پہنچنے کی امید نہ ہو، دشمنوں نے باندھا ہو، وہ اقرار چاہ رہے ہوں کہ تم محمد ﷺ کے خدا کا انکار کر دو، ورنہ چار گھوڑے، تمہارے بازوؤں اور ٹانگوں کو بدن سے الگ کر دیں گے تب وہ عاشق صادق خاتون اقرار کو انکار میں تبدیل کروانے والے کے منہ پر تھوک دے اور جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں یہ آغاز ہے جس کی انتہا امام عالی مقامؑ ہے، اپنا نہیں، اپنے خاندان کو اللہ کے لئے دشتِ کربلا میں شہید کروا دیا۔'' میں نے جذب سے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔

''اپنے آپ کو ختم کر دینے کی کیا فلاسفی ہے؟''

''یہ اپنا آپ ختم کرنا نہیں، خودکشی نہیں ہے۔ وہ غیرت ہے جو صرف ایک مسلمان ہی میں پیدا ہوتی ہے جس میں یہ غیرت نہیں، اس کے مسلمان ہونے پر شک ہے۔ کیونکہ جس نے شہادت چاہی دراصل وہ امام عالی مقامؑ کے نقشِ قدم پر چلا ہے۔ جس نے جو چاہا وہ اسی راہ پر چلا۔ یہ فلاسفی نہیں، زندہ حقیقت ہے۔ قوم، قبیلہ، اُمت انہی کی بدولت زندہ رہتی ہے۔'' میں نے کہا تو پی اون خاموش رہی۔ یہاں تک کہ یہ خاموشی ہمارے درمیان کافی دیر تک رہی۔

ہم خاصا فاصلہ طے کر آئے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ہمیں پتہ ہی نہیں چلا تھا، تبھی پی اون ایک سبز قطعے پر جا بیٹھی جو سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

''کیسا لگا تمہیں یہ جزیرہ۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ موضوع بدل دینا چاہتی ہو۔ پھر خود ہی بولی۔ ''ہم نے باتیں ہی اتنی کیں ہیں کہ جزیرہ دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''تم دکھاؤ نا، میں تمہاری نظر سے دیکھوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سچ، تم جزیرہ دیکھو گے، میں نے تو سمجھا فقط تم مجھے بہلا رہے ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اب میں اس پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے کہا تو وہ کھل کر قہقہے لگانے لگی۔ جیسے میں نے کوئی لطیفہ کہہ دیا ہو۔

''چلو پھر اٹھو، یہ ساتھ ہی میں ساحل ہے، وہاں چلتے ہیں۔ وہاں کے نظارے ہی اس جزیرے کی اصل جان ہیں۔'' اس نے کہا اور فوراً ہی اٹھ گئی۔

''یہاں سے کتنا فاصلہ ہو گا؟'' میں نے یونہی سرسری سے پوچھا

''بس چھوٹے سے سوال کا۔'' وہ یہ کہہ کر کھلکھلا کر ہنس دی۔ جیسے میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔ جس پر میں مسکرا دیا اور پھر بڑے ہی تحمل سے کہا۔

''پوچھو! کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟''

''تم کھانے میں، پینے میں حتیٰ کہ دوستی میں حلال و حرام کے قائل ہو، کیوں؟'' اس نے بڑے ہی نرم لہجے میں پوچھا

''دوستی میں نہیں، یہ الگ معاملہ ہے، اس میں تعلق کی بات کرو تو۔۔۔ خیر، یہ حلال و حرام فقط کھانے پینے تک محدود نہیں یہاں تک کہ سوچنے کی حد تک بھی ہے۔ حلال و حرام کا فلسفہ کوئی نئی بات نہیں اسلام سے پہلے کا بھی ہے۔ لیکن کیوں ہے؟ تم یہی پوچھنا چاہ رہی ہو نا؟''

''بالکل یہی۔'' اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''تم چیزوں کے اثرات کی قائل ہو، جو بدن پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے جو ہم کھاتے پیتے ہیں۔ ان کے اثرات ہمارے بدن پر ہوتے ہیں۔ آف کورس۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔

''یہاں تک کہ سوچوں کے بھی اثرات ہم اپنے بدن پر محسوس کرتے ہیں۔ اسلام دراصل پاکیزگی چاہتا ہے۔ وہ پاکیزگی جو مثبت راہوں پر لے جاتی ہے۔ تم فلاسفی کی بات کرتی ہو تو یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر تحقیق در تحقیق کی جا سکتی ہے تاہم میں تمہاری تسلی کے لیے

محض اشارہ کردیتا ہوں۔ حلال اور حرام کا مقصد بنیادی طور پر انسان کے اپنے تحفظ کے لیے دیا گیا ہے۔ وہ ساری چیزیں جو حرام قرار دی گئیں ہیں ان میں انسان کا مادی ہی نہیں روحانی نقصان بھی ہے۔ انسان مادہ اور روح کا مجموعہ ہے، دونوں کو اپنی اپنی غذا چاہیے ہوتی ہے کثافت، لطافت کو جنم دیتی ہے اور ایسا عمل دوسری جانب ہوتا ہے۔ پاکیزگی سے روح معمور ہوتی ہے۔''

''ممکن ہے اس میں پسند و ناپسند کا عنصر بھی ہو۔ خیر! تم مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی کبھار میں اگر اس فرق کو ختم کرلیا جائے تو اس میں کیا ہے؟''

''صرف جان بچانے کی حد تک، کیونکہ ہماری جان، یہ زندگی اللہ کی ودیعت کی ہوتی ہے، اس کی امانت ہے۔ ہمیں اس کی حفاظت کرنا ہے اور اگر جان دینی بھی ہے تو اس اللہ کے لیے۔ اصل میں اسلام کے سارے اعمال انسان کی نیت پر ہیں۔ نیت کیا ہے؟'' میں نے کہا تو ان لمحات میں اچانک نشیب آنا شروع ہوگیا۔ میں اور پی اون دونوں ہی احتیاط سے اترنے لگے۔ ہمارے سامنے سفید ریت اور شفاف پانی والا ساحل تھا۔ جہاں پر رش تو نہیں لیکن لوگوں کی خاصی تعداد دکھائی دے رہی تھی۔ ماحول ایسا ہی تھا جیسے ان ساحلوں پر ہوتا ہے۔ لوگ انتہائی مختصر لباس میں تھے۔ کئی عورتیں تو محض ایک ہی دھجی میں تھیں۔ ساحل پر آتے ہی پی اون نے کہا۔

''بلال! باقی ساری باتیں پھر کبھی سہی، میرا تیسرا سوال ابھی تم پر قرض ہے مگر وہ پاپا جا کر پوچھوں گی، اس وقت کوئی فلسفہ نہیں، صرف انجوائے کرنا ہے۔ بولو کیا خیال ہے؟'' وہ انتہائی بے چارگی سے بولی۔

''جس طرح تمہاری مرضی، میں تمہارے ساتھ انجوائے کروں گا۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ ایک دم سے یوں خوش ہوئی جیسے بچے کو اپنا کوئی پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔ وہ ایک جانب بڑھ گئی جہاں ادھیڑ عمر تھائی بیٹھا ہوا تھا، پی اون نے چند نوٹ نکالے اور اسے دے دیئے۔ اس نے اشارے سے کرسیوں کی جانب اشارہ کیا جو وہاں ساحل پر موجود تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انہی کرسیوں پر بیٹھنے کا کرایہ ادا کر کے آئی ہے۔ وہ مجھے لیتی ہوئی ان کرسیوں پر آ بیٹھی۔

''یہاں سے ساحل کا نظارہ کرو، دیکھو لوگ کس طرح مست ہیں۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''دیکھ رہا ہوں اور یہاں کی ہواؤں میں چھپے پیغام کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا

ہوں۔'' میں نے یونہی بات چھیڑ دی۔

''کیا ہے پیغام ان میں؟''

''جدائی! بچھڑ جانے کا پیغام، لہر آتی ہے، ساحل سے ملتی ہے اور پھر پلٹ جاتی ہے۔ دیکھو لہر میں کتنا اضطراب ہے اور کتنی مستقل مزاجی۔'' میں نے لہروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' وہ خواب آگیں لہجے میں بولی۔

''کیونکہ اس کی فطرت میں ایسا ہے، ہر شے کی اپنی فطرت ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی بھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''پھر تم کہو گی فلسفہ کہتا ہے۔ اب میں مزید بات نہیں کروں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر پلٹ کر دیکھا تو ایک طرف سے تھائی لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دو ناریل تھے، جن میں اسٹرا لگے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دے گیا۔ بہت ہی لذیز پانی تھا۔ طبیعت خوشگوار ہوگئی۔

''ایک بات کہوں بلال؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بولو!'' میں نے اس کی جانب غور سے دیکھا تو ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔

''تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہ اور لوگوں کی طرح ساحل پر بھاگوں، سمندر میں جاؤں، واٹر سکوٹر سے لطف اندوز ہوں۔''

''تم چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا

''آف کورس، لیکن اگر تمہارا ساتھ ہو۔''

''چلو۔'' میں نے کہا تو وہ پھر سے کھل گئی۔ وہ اٹھی اور واپس اسی ادھیڑ عمر تھائی تک گئی، اس سے باتیں کرتی رہی اور پھر کتنے سارے بھات نکال کر اسے دے دیئے۔ ان کی آوازیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں، اگر سنائی بھی دے رہی ہوتیں تو مجھے ان کی کیا خاک سمجھ آنی تھی۔ وہ واپس آئی، اس کے ہاتھ میں بیگ تھا، اس نے اپنی ساری چیزیں، سیل فون وغیرہ اس میں ڈالے، مجھے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ پھر مجھے شرٹ اتارنے کو کہا وہ میں نے دے دی، پتلون کی جانب اشارہ کیا تو میں نے منع کر دیا۔ وہ واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آئی تو میں پہچان ہی نہ سکا، وہ انتہائی مختصر لباس میں تھی، جو وہاں سے مل گئے تھے۔ میں نے بس ایک نگاہ اسے دیکھا تو نجانے کیوں مجھے دھچکا لگا، میں دل مسوس کر رہ گیا۔

''آؤ سمندر میں چلیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے بادل نخواستہ

اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھیلتی رہی۔ پھر ایک تھائی وہاں پر سکوٹر بوٹ اور جیکٹ لے آیا۔ اس نے ہمیں پہنائیں اور واپس چلا گیا۔ پی اون کو سکوٹر بوٹ چلانا آتا تھا، اس نے مجھے پیچھے بیٹھنے کو کہا اور سمندر کے پانی میں چلی گئی۔

پی اون جی بھر کے کھیلی۔ میں بھی اس کا ساتھ دیتا رہا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھے یہ سب برا محسوس ہو رہا ہے۔ تقریباً گھنٹے بعد وہ واپس آئی اور پھر ہم انہی کرسیوں پر آن بیٹھے۔ میں تھک چکا تھا اور ایسی ہی حال پی اون کی بھی تھی۔ سہ پہر ہو جانے والی تھی۔

"کچھ کھانا پینا ہے یا پھر آرام کرو گے۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ابھی کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ میں نہا لوں۔" میں نے اپنی خواہش ظاہر کی، مجھے وہاں کا پانی عجیب سا لگ رہا تھا۔

"اگر فوراً نہانا چاہتے ہو تو پھر یہاں کوئی بندوبست دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر دو تین گھنٹے انتظار کر لو تو ہوٹل کے کمرے میں ہی جا کر نہا لینا۔" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم ابھی واپس چلے جائیں گے۔"

"اور کیا!" یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب دیکھا اور بولی۔ "اگر بہت زیادہ تنہائی میں وقت گزارنا ہے تو پھر یہاں رہائش گاہیں ہیں۔ رات یہیں گزار لیتے ہیں۔"

"نہیں ہوٹل ہی چلتے ہیں۔ کپڑے بھی تبدیل کریں گے۔" میں اسے انتہائی مختصر لباس میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ گئی۔

"چلو! ہمیں آخری سے پہلے والی کشتی مل جائے گی۔" اس نے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم جیٹی تک پہنچ گئے، کشتی جانے کے لیے تیار تھی، ہم اس میں بیٹھے جس نے ہمیں بڑی کشتی تک پہنچانا تھا۔ واپسی کے سفر میں پی اون مدہوش اور خاموش تھی، اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ کشتی رواں دواں تھی۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ دور سے دھیرے دھیرے پتایا شہر نمودار ہو رہا تھا، سمندر میں کشتیوں کے ریستوران جگمگانے لگے تھے۔ جب ہم نے واپس پتایا شہر کے ساحل پر قدم رکھا تو قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ پہاڑی پر لگے ہوئے حرفوں کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ جلد ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم ہوٹل کی جانب چل دیئے۔

حویلی میں وہ سب دوپہر کا کھانا کھا کر دیر تک گپ شپ کرتے رہے تھے۔ نور الٰہی البتہ ان میں سے جلدی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اسے کئی کام تھا جس کی معاونت کے لیے افضال نور کا جانا بھی ضروری تھا۔ باقی خواتین وہاں پر تھیں جن میں فہد نے بھی بوریت محسوس کی۔ وہ اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ جبکہ ان خواتین میں سے ماہا بہت بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا وہاں بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی پریشانی نجمہ پھوپھو نے بھانپ لی۔

"ماہا بیٹی! تم بے چینی محسوس کر رہی ہو کیا؟" اس کے لہجے میں پیار کے ساتھ ملائمیت بھی تھی۔

"ہاں پھوپھو! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔" وہ منمناتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے، جاؤ آرام کرو، ہماری باتیں تو ختم نہیں ہونے والی۔" نجمہ پھوپھو نے رقیہ کی جانب دیکھ کر کہا تو ماہا کے ساتھ رقیہ بھی اٹھ گئی۔ تب بلال کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے ماہا نے کہا۔

"بلال کا کوئی فون وغیرہ آیا؟"

"نہیں تو۔" اس نے عام سے انداز میں کہا تو پھر کمرے تک ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ وہاں جاتے ہی ماہا نے یوں پوز کرتے ہوئے کہا جیسے بہت اہم کام یاد آ گیا ہو۔

"ارے یار! میری تو بہت اہم میل آنے والی تھی۔ یا ممکن ہے بلال ہی نے کوئی میل بھیجی ہو۔" اس نے کمپیوٹر کی جانب دیکھ کر کہا۔

"تو یہ ہے نا۔" یہ کہتے کہتے وہ خود ہی سمجھ گئی۔ "مگر اس پر تو پاس ورڈ لگا ہوگا۔"

"تم ایسے کرو، فہد کو بلواؤ، شاید وہ اس کا کوئی حل نکالے۔" ماہا نے رائے دی تو رقیہ نے ملازمہ کو بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد فہد ان کے کمرے میں تھا اور ماہا کا مسئلہ سن چکا تھا۔

"ویسے پاس ورڈ ہٹا دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن بعد میں لگے گا نہیں۔ بلال کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کمپیوٹر استعمال کیا گیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ کوئی بات نہیں، میں سنبھال لوں گی۔" ماہا نے سنجیدگی سے کہا تو فہد نے کمپیوٹر کو کھولنے کے لیے اوزار مانگے، رقیہ لینے کے لیے باہر چلی گئی۔ تبھی ماہا نے فہد سے کہا۔

"فہد! تم میرے اچھے دوست ہو، مجھ سے بلال کے بارے میں جھوٹ بولتے رہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اس نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"وہ ملائیشیا نہیں گیا اور نہ ہی یہ ٹور سرکاری ہے۔ تمہیں سب معلوم ہے لیکن تم جھوٹ بولتے رہے ہو۔" ماہا نے تیز لہجے میں آہستہ آواز سے کہا۔

''دیکھو! اس نے مجھے یہی بتایا تھا، وہی میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب اصل بات کیا ہے۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا مگر ماہا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''تم معلوم ہی نہیں کرنا چاہتے، ایسا ہی ہے نا، یہ تو تمہارے پاپا نے تھوڑی سی دیر میں معلوم کر لیا اور تم اپنے اس دوست سے نہیں پوچھ سکے کہ اس نے کس ملک سے فون کیا ہے اس ملک کا کوڈ تو فون پر آ گیا ہوگا۔ نہ سہی، نہ کوڈ آیا ہو لیکن اسے معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔'' وہ کہتی چلی گئی تھی۔ جس پر فہد چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔

''ماہا! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے معلوم ہی نہیں کیا۔ لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ شام تک میں تمہیں بتا دوں گا۔ میں اپنے دوست سے اگلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''او کے! لیکن جو بھی معلومات ملے، وہ درست ہونی چاہیے۔'' ماہا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا، جس پر فہد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے من ہی من میں سوچا کاش یہ ماہا میرے لیے بھی اتنی تڑپ رکھتی، پھر خود کو ڈھارس دیتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھایا کہ کوئی باتیں ہیں، بہت جلد یہ فقط تمہارے بارے ہی میں سوچا کرے گی۔ شاید وہ کوئی مزید بات کرتا ایسے میں رقیہ اندر آ گئی، اس نے اوزار لانے کے بارے میں بتایا کہ ملازمہ لا رہی ہے۔ پھر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی، فہد نے تھوڑی دیر کے بعد پاس ورڈ ختم کر دیا اور کمپیوٹر چلنے لگا تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''رقیہ! اگر تم آرام کرنا چاہتی ہو تو لیٹ جاؤ، میں ذرا کام کر لوں۔'' ماہا نے کہا تو رقیہ فوراً ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی تو ماہا کی پوری توجہ کمپیوٹر کی جانب ہو گئی۔

یہاں بھی اسے مختلف موضوعات پر تحقیق ہی ملی۔ یہ سارے موضوعات اسلامی تھے یا وہ جن کا تعلق دہشت گرد یا انتہا پسندوں سے تھا، بہت ساری چھوٹی چھوٹی فلمیں تھیں۔ کئی لمبی لمبی تقریریں جن میں علماء خطاب کر رہے تھے۔ وہ کبھی پڑھتی کبھی سنتی رہی۔ یہاں تک کہ جب اس نے یہ تصدیق کر لی کہ بلال کی ذہنیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کمپیوٹر اسکرین دھندلی ہوئی تو اسے اپنے اشکوں کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو خشک کیا، نیٹ لگایا اور پھر اپنا میل بکس کھولا، وہاں بلال کی جانب سے کوئی پیغام نہیں تھا۔ ورنہ ہر روز ایک میل اس کے نام ضرور آیا کرتی تھی۔ اس کا دل شدت سے رو دیا۔ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں فقط ایک فقرہ لکھا کہ ''میں بلال کو کھو چکی ہوں۔'' اور بلال کو ای میل کر دیا۔ کبھی تو وہ پڑھے گا، تب اسے احساس ہوگا کہ وہ کیا کچھ کھو چکا ہے۔ اس نے کمپیوٹر بند کیا اور رقیہ کے ساتھ آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے سارا جہاں آنسوؤں میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا، کاش

بلال تم میرے پاس ہوتے تو میں پوچھتی کہ تم ایسے کیوں ہو گئے ہو؟ میرے پیار میں کہاں کمی آ گئی تھی جو تم دنیا کی جانب دیکھنے لگے ہو میرا قصور ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ نیند میں کھو گئی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہوا، کچھ دیر کے لیے ہی سہی، یادوں سے چھٹکارا تو ملا۔

جب وہ بیدار ہوئی تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اسے بلال کے کمرے سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یوں جیسے اس کمرے نے اس کے بلال کو نگل لیا ہو۔ اس نے حسرت بھری نگاہ کمرے پر ڈالی اور وہاں سے نکل آئی۔ اس نے جو دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا یہاں قطعاً دل نہیں لگنے والا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر نور پور چلی جائے، لیکن وہ محض سوچ ہی سکی، حویلی کے لان میں سب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، وہ دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس چلی گئی۔ یہاں تک کہ شام کے سائے ڈھل گئے۔ اس کی نگاہ فہد پر تھی۔ ایسے ہی وقت میں اس نے فہد کو بلایا اور پھر سب سے الگ ہو کر پوچھا۔

''ہاں بولو! کچھ پتہ چلا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ پر تجسس تھا۔

''وہ سب کچھ سچ ہے جو تم نے کہا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست نے ملک کا نام بھی نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ لیکن تم ذرا صبر کرو، میں معلوم کر لوں گا۔''

''مطلب؟'' اس سے شدتِ جذبات میں بولا ہی نہیں گیا۔

''تم فکر نہ کرو، اب تو مجھے خود تجسس ہونے لگا ہے، مجھے بھی اس نے اس قابل نہیں سمجھا کہ بتا دے۔''

''لیکن کام کی بات تو معلوم نہیں ہوئی نا'' اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں بھی حیران ہوں کہ آخر وہ کیا مقصد ہے جس کیلئے وہ کسی دوسرے دیس گیا اور پھر ایسا خفیہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گی جسے وہ چھپانا چاہتا ہے۔'' فہد کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

''تم چاہے اپنے دوست کے پاس چلے جاؤ، لیکن جو بات بھی ہے پوچھو، تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن میں یوں ماما کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ یا پھر کوئی ایسا کام نکل آئے تو کوئی بہانہ بنے۔''

''میں کچھ چیزیں بتا دیتی ہوں بلکہ ماما سے کہتی ہوں، فی الحال ہم لاہور نہیں جائیں گے، وہ تم ہی لے آنا اور بس، تم آج یا کل کے لیے تیار رہو۔'' ماہا نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔" فہد نے فوراً ہی عندیہ دے دیا۔ تب وہ دونوں باہر گھر والوں میں آ بیٹھے۔ ماہا سوچنے لگی کہ وہ اپنی ماما سے کس طرح بات کرے کہ فہد کو لاہور جانا پڑے۔ فی الحال اس کی ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی بے چینی حد درجہ بڑھ گئی تھی۔

❀......❀......❀

پی اون کمرے میں آ کر بیڈ پر یوں گری جیسے بہت زیادہ تھک گئی ہو۔ بلاشبہ میں بھی بہت تھک گیا تھا، اس لیے اس کی تھکن کا مجھے احساس تھا۔ میرے ذہن میں فقط یہی تھا کہ خوب نہاؤں، کھانا کھاؤں اور پھر سو جاؤں۔ اس لئے میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا تا کہ فریش ہو جاؤں۔ میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سون وہاں آ چکی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پورے چہرے سے ہنس دی، پھر روایتی انداز میں 'وائی' کیا اور میرا حال پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اچانک کیسے؟" میں نے پوچھا تو اس نے ایک نگاہ پی اون پر ڈالی اور پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی

"چند دن پہلے آپ نے مجھے ہزار بھات دیئے تھے۔ آج پی اون نے بتایا کہ آپ بے حد تھکے ہوئے ہیں، سو میں مساج کرنے آئی ہوں۔"

"اوہ! کوئی بات نہیں، میں بس اب سونا چاہوں گا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پاکستانی مالشیے آ گئے کہ جو رگ دبا کر بندے کو بے ہوش بھی کر دیتے ہیں اور پھر مجھے کبھی بھی مالش کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ میں نے اس کی عادت ہی نہیں ڈالی تھی۔

"تمہیں شاید یہاں کے روایتی مساج کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ تھائی مساج محض مالش ہی نہیں ایک فلسفہ اور آرٹ بھی ہے۔ جو تقریباً پچیس سو سال سے اس سرزمین پر موجود ہے۔ یہ بدھ مت، بدھا ٹمپل اور یہاں تک کہ بدھ کے زمانے میں سے ہے۔ جب جسم، روح اور دماغ کمزور پڑتے ہیں تو انہیں مساج ہی سے دوبارہ طاقتور کیا جاتا ہے۔ شکستہ اعصاب میں قوت بھر دینے کے لیے ہی مساج یہاں پر موجود ہے۔ انسان کی مدافعتی قوت بحال کرنے کے لیے اعصاب میں جہاں بھی، کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ ہوتی ہے اسے دور کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تم مساج کراؤ میں نے سون کو خاص طور پر بلایا ہے۔" پی اون نے مساج کے حق میں زبردست تقریر کر دی۔ میں خاموش رہا تو سون نے قالین پر ایک چادر بچھا دی۔

"جاؤ، تھکن اتارو، میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" پی اون نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم کی جانب چل دی۔ میں نے سون کی جانب دیکھا وہ مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ تبھی اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے آرام سے لٹا دیا۔ سون کی انگلیوں میں

جادو تھا، وہ نہ تو زور لگا رہی تھی اور نہ ہی دباؤ ڈال رہی تھی، بس انگلیوں کے دباؤ سے میرے جسم میں ایک اجنبی سنسناہٹ پیدا کر دی تھی۔ میں سکون محسوس کرنے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے اندر حیوانی جذبات بھڑکنے لگے، کچھ دیر تک میں نے اس جانب دھیان نہیں دیا۔ میرے ذہن میں پی اون کا بدن گھومنے لگا تھا۔ وہ لمس یاد آنے لگا جو واٹر سکوٹر پر مجھے محسوس ہوا۔ دھیرے دھیرے میرے بدن میں اینٹھن ہونے لگی، مجھے یوں لگا جیسے میرا دوران خون بڑھ گیا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سون اپنی مستی میں مساج کر رہی تھی۔ اس نے شروعات میرے پاؤں سے کی تھی اور اس وقت تک وہ میری گردن تک پہنچ چکی تھی، اس کے ساتھ جہاں یہ شروعات انگلیوں کے لمس اور دباؤ سے ہوئیں تھیں، اب اس کا پورا بدن میرے جذبات کو برانگیخت کر رہا تھا، پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ محض مساج نہیں ہے بلکہ میرے لئے امتحان ہے۔ اگرچہ وہ لمحات ایسے تھے جب اپنا دھیان کسی دوسری جانب لگانا انتہائی مشکل تھا، میرے ذہن میں آنے والے خیال نے اس جلتی ہوئی آگ پر پانی کا کام کیا۔ دھیرے دھیرے شعلہ جوالہ ہو جانے والا بدن اچانک ہی سرد پڑ گیا۔ اس 'خیال' نے میری حفاظت کر لی تھی، اب سون اپنا 'آرٹ' جتنا مرضی آزما لیتی، میرے بدن میں اک ذرا سی بھی حرارت پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے پہلے جو میں خود میں سمٹا ہوا تھا، اپنے آپ کو سون کے آگے ڈال دیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد پی اون واپس آئی تو اس کے جسم پر محض تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ ایسا نجانے کیا سوچ کر اس نے کیا تھا اس نے آتے ہی انتہائی حیرت سے تھائی زبان میں سون سے کچھ پوچھا تو اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کافی کچھ پی اون سے کہا۔ وہ حیرت سے سنتی رہی۔ پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرانے لگی۔

"تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا، لیکن جس قدر تم نے تعریف کی تھی، اس قدر سکون نہیں ملا۔" میں نے جان بوجھ کر اسے چڑایا۔ میرے یوں کہنے پر ایک رنگ اس کے چہرے پر آ کے گزر گیا۔

"شاید سون اچھی مساج کرنے والی نہیں ہے۔ اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ تمہیں تھائی مساج کے آرٹ کا تجربہ کراؤں، یہیں ہوٹل کے مساج پارلر میں بہت تجربہ کار خواتین موجود ہیں۔ ہم وہاں جائیں گے، میں خود بھی مساج کی طلب محسوس کر رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سون کی جانب دیکھا تو تیز تیز انداز میں کچھ کہنے لگی، جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ ایسی ہی تیز باتوں کے تبادلے کے بعد سون جانے لگی، اس نے مسکراتے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

''میرے خیال میں مساج کی بجائے اگر ہم باہر کھلی فضا میں بیٹھ کر کھانا کھائیں تو کیسا رہے گا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

''پھر اس کے بعد بھی اگر تم مساج کی ضرورت محسوس کرو تو ہم مساج پارلر میں چلے جائیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

ہم ہوٹل ہی میں ساحل کی جانب کھلی فضا میں آ بیٹھے تھے۔ ایک جانب پام کے درختوں کی قطاریں تھیں جس پر روشنی کے چھوٹے چھوٹے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ سبز سبزہ زار میں ذرا فاصلے پر کرسیاں رکھی گئیں تھیں۔ تھوڑی دور سوئمنگ پول تھا، دھیمی روشنی میں رومان پرور ماحول تھا۔ وہاں بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ کھانے کا سارا آرڈر پالا ہی نے دیا تھا۔ جب ویٹر چلا گیا تو وہ بولی۔

''کیسا رہا آج کا دن؟''

''بہت شاندار۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کل تمہارا ہوٹل میں آخری دن ہوگا، مطلب تم نے اتنے دن ہی کی بکنگ کروائی تھی۔'' وہ بولی۔

''ہاں۔'' میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا تم کل چلے جاؤ گے؟'' اس نے پوچھا

''نہیں! مزید دو دن رہوں گا، لیکن یہ دو دن مجھے یہاں اپنے میزبان ہمت سنگھ کے ساتھ گزارنے ہیں اور اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا تو وہ حیرت سے بولی۔

''یہاں جو تم پانچ دن رہے ہو فقط میرے لیے تھے؟''

''ہاں! صرف تمہارے لیے، تاکہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ! تو پھر میں کتنی پاگل ہوں، یونہی وقت گزار دیا۔'' وہ افسوس سے لہجے میں بولی۔

''یونہی سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا

''یہی کہ تم سے الجھتے، تم سے ناراض ہو کر، تمہارا امتحان لیتے ہوئے۔'' اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''امتحان، کیا مطلب؟'' میں نے جان بوجھ کر پوچھا، مجھے احساس تو ہو گیا تھا کہ

کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

''ابھی کچھ دیر پہلے، سون کو میں نے صرف اس لئے بلایا تھا کہ مجھے تم پر شک ہو گیا تھا، تم میں مردپن ہے بھی یا نہیں، کم از کم سون اس معاملے میں بڑی ماہر ہے، وہ اپنی انگلیوں کے جادو سے مرد کے جذبات بھڑکا دینے کا فن جانتی ہے۔ وہ دعویٰ ہی کرتی رہی کہ تم میں سب کچھ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی قوت بھی ہے جو تمہاری حفاظت کرتی ہے۔ تم خود کو بچا سکتے ہو۔ مگر میں نہیں مانی۔'' اس نے یوں کہا جیسے اپنے ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ اتار رہی ہو۔

''سون ٹھیک کہہ رہی تھی پی اون۔'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر خاموشی سے میری جانب تکتی رہ گئی۔'' میں چند لمحے نہیں سمجھ سکا تھا کہ اسکی نیت کیا ہے، لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو پھر میں اپنے آپ میں آ گیا۔ اب سون جتنا مرضی کوشش کر لیتی یا تم اب بھی مجھے مساج پارلر تک لے جانا چاہتی ہو تو چلو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ یونہی میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر تجسس سے پوچھا۔

''میں نے مان لیا کہ تم میں سب کچھ ہے، لیکن تم ایسا کیسے کر لیتے ہو؟ کیا تم نے اس کے لیے خاص ریاضت کی ہے؟''

''نہیں! اس کے لیے کسی بھی طرح کی ریاضت نہیں چاہیے، بس دل میں عشق ہونا چاہیے۔'' میں نے پھر سمجھایا۔

''سوری! میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکی ہوں۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''دیکھو! تم بدھ مت کے دھاچاؤ فرقے سے تعلق رکھتی ہو، جس میں مراقبوں کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ مراقبہ کس لئے؟ اور وہ خاص منزل کیا ہے جہاں تک تمہیں پہنچایا جاتا ہے؟'' میری بات ختم ہوتے ہی اس نے لب کھولنا چاہے مگر میں نے اشارے سے روک دیا اور کہا۔ ''وہ کچھ بھی ہے، لیکن اس میں بنیادی اہمیت خیال کی ہے۔ تم جس کا خیال کرو گی نا، تو دراصل وہ تمہارے من میں آ چکا ہوگا اور تم وہاں پر ہو گی، مثال کے طور پر تم لارڈ بدھا کے مجسمے کے سامنے کھڑی ہونے کا خیال کرو تو......''

''یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں جہاں بھی ہوں گی، خیال آتے ہی ویسا ہو گا جیسے تم کہہ رہے ہو۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''میرے خیال میں ایک قوت ہر وقت میرے ساتھ ہے، مجھے دیکھ رہی ہے، یہاں تک کہ جو میں ارادہ کر رہا ہوں، میرے خیال کی باریک اتھاہ گہرائیوں کے بارے میں بھی واقف ہے، میرے ساتھ ہے، کیا میں اس کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں؟''

''مطلب! کوئی قوت۔۔۔''

''میرا اللہ! ہمہ وقت میرے ساتھ ہے، اور جس کے سامنے میں شرمندہ نہیں ہونا چاہتا، وہ ذات ہے، جس نے آ کر مجھے بتایا کہ میں کیا ہوں، میرا مقام کیا ہے؟ وہ مجھے ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا، اس نے میری شان بتائی ہے کہ میں کون ہوں۔ میری حیثیت اس بلکہ اس کائنات میں کیا ہے، وہ مجھے بہت اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں اس نے کہ اللہ کیا چاہتا ہے اور کیوں چاہتا ہے، تو دوسری جانب اس نے انسان سے اللہ کے رابطہ کا احساس بھی دیا، انسان کو اس کا مقصد دیا۔ اس نے بتایا کہ عورت کا مقام کیا ہے، کے ساتھ کیسا تعلق ہونا چاہیے۔ تو کیا میں اس کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں؟ یہ محض خیال جس میں قوت صرف اور صرف عشق کی ہے۔ جو میرے بدن ہی کو نہیں، میری روح میں تبدیلی کر دینے کا باعث ہے۔ تمہارا صدیوں پرانا آرٹ یہاں بے بس ہو جاتا ہے۔''

''کون سی ایسی ہستی ہے وہ؟'' اس نے انتہاء حیرت میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میرے آقا، میرے مولا، نبی رحمت العالمین، حضرت محمد ﷺ، جو پوری کائنات کے لیے رحمت ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا ان کے بارے میں تم مجھے بتا سکتے ہو؟'' وہ بولی۔

''بہت کچھ لیکن میں تمہیں فقط وہی بتاؤں گا جو کسی بھی بات کا ریفرنس ہوگا۔ میں بھی اور جتنا بھی کہوں گا، تم چاہو تو اس پر یقین نہ کرنے کا حق رکھتی ہو۔ لیکن میں تمہیں بات بتا دوں کوئی بھی شخصیت کتنا معیار رکھتی ہے، اس کا اندازہ اس کسوٹی سے لگایا جا سکتا ہے اس نے کیا، کیا اور کیا، کہا۔ مطلب اس کا کردار اور تعلیمات، کیا ہر انسان کے لیے باعمل، کیا ان پر عمل کر کے انسان وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جو اس نے بتایا؟ میرے نبی کی ساری زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے، یہ ان کی ذات ہی ہے جن کا لمحہ لمحہ محفوظ ہو گیا تا کہ دوسرے انسان ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ میں تو ان کے ماننے والا ہوں، ان سے عشق کرتا ہوں، میں تو ان کے بارے میں تعریف ہی کروں گا، لیکن وہ لوگ خود تحقیق کرتے رہے ہیں اور رہے ہیں جو نہیں مانتے جس نے بھی انصاف کے ساتھ دیکھا وہ گرویدہ ہو گیا اور کوئی خامی تلاش نہ کر سکے۔''

''کیا ایسی شخصیت بھی ہو گزری ہے؟'' وہ پھر حیرت سے بولی۔

''اصل میں یہ جو میڈیا کا طوفان آیا ہے نا، یہ ایک منہ پھٹ بچے کی مانند ہے، اسے نہیں معلوم کہ وہ انسانیت کے لیے کیا کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لیے پنیر کا ٹکڑا اور آگ کا

برابر شے ہے۔ اس منہ پھٹ بچے کو متعصب، ظالم اور شیطان لوگوں نے اس طرح استعمال کیا کہ انسانیت کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ امریکہ، یورپی دنیا بلکہ میں کہوں گا، عیسائی اور یہودی دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا، کیا ویسی ہی معلومات ان کے بارے میں دی جا رہی ہے، جیسی مسلمانوں کے بارے میں دیتے ہیں۔ عیسائی اور یہودی دنیا انسانیت سے تو کیا، اپنے انسان ہونے پر بھی شک کر رہے ہیں کہ ان کا کردار اس قدر کریہہ ہے۔ میں یہاں ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں دے سکتا ہوں۔'' میں نے ایک لمحے کو سانس لیا اور پھر بولا۔ ''یہ میڈیا اور اس کے پیچھے سوچ کی بدنیتی، ظلم اور شیطانیت ہے کہ وہ حقیقت پیش نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس حقیقت بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ کیا پیش کریں۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں ایک دین فطرت موجود ہے۔ وہ آج جس قسم کی بھی اخلاقیات یا انسانیت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس وقت دے دی گئی تھی، جب یہ خود جاہل تھے اور اپنی جاہلیت میں اندھے ہو کر مخالفت کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل خصوصاً غیر مسلم دنیا اس جھوٹ، فریب اور مکر کے زیر اثر ایک سوچ کو پختہ کرتی چلی گئی جو فقط اسلام مخالف تھی۔''

''کیا اس کا اثر مسلم دنیا پر نہیں ہوا؟'' اس نے ایک نئے پہلو پر حیرت ظاہر کی۔

''ہوا، اور بہت زیادہ ہوا، ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ایک جانب میڈیا جیسا اژدھا اپنا زہر اگلتا رہا اور دوسری جانب ہم اب تک اس بحث میں ہیں کہ آیا اس کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں کیا جائے، میزائل کے مقابلے میں تلوار ہو تو یہ طاقت کا توازن نہیں ہوتا، نئی نسل کے ذہن میں انتشار ضرور ہے، کیونکہ اس کے سامنے انہی میں سے لوگ مختلف خیال لے کر آتے ہیں۔ لیکن اسلام کے بنیادی نظریات اس قدر راسخ ہیں کہ اسلام کی حرمت پر اپنی جان دے دیتے ہیں۔ جس شخص میں بھی عشق الٰہی اترتا ہے تو پھر وہ سارے انتشار سے ماورا ہو جاتا ہے۔ جیسے میں تھا۔''

''مطلب، تم کیا تھے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''میں بھی ایک عام مسلمان تھا، جسے بس بنیادی نظریات کا علم تھا، لیکن تمہاری وجہ سے، میں نے اسلام کے بارے میں تحقیق کی، اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی، میں نے یہ دیکھا کہ آخر وہ کس سے بحث کرتا ہے، اس کے پاس انسانیت کے لیے کیا ہے، وہ سوال جو تم مجھ سے کرتی تھی، وہی میں نے اپنے سامنے رکھے اور اس حقیقت تک پہنچ گیا کہ میں کیا ہوں۔ میری اہمیت کیا ہے، میں اس دنیا میں کیوں ہوں، تم میری محسن ہو، اس لیے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں سب سے پہلے حقیقت سے آگاہ کروں، یہی مقصد مجھے یہاں تک لایا ہے۔ میں

یہاں عیاشی کرنے نہیں آیا۔ تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ میں سوچ تمہارے سامنے رکھوں گا، تم چاہو تو اسے پرکھو، دیکھو اور جانچو۔ اسے قبول کرو یا نہیں۔‘‘

’’بلال! میں تمہاری ساری بات کو درست تسلیم کرتی ہوں، لیکن کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ جس شے کو من چاہ رہا ہو، شدید ترین خواہش میں پورا وجود تڑپ رہا ہو، خود پر ضبط کر کے صرف اس لیے روک دیا جائے کہ مذہب کہتا ہے، کیا یہ انسان کا حق نہیں ہے؟‘‘ اس کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی، سو میں نے انہی لمحات میں فیصلہ کرلیا کہ اسے پوری تفصیل سے بات سمجھاؤں گا۔ اس وقت کہ جب میں اپنے خیال جمع کر رہا تھا، کھانا آ گیا۔ تب میں نے کہا۔

’’پی اون! اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہ بات پوری طرح سمجھا دوں گا، فی الحال کھانا کھاتے ہیں۔ اس دوران تم مجھے یہ بتا دینا کہ کل ہم کیا کریں گے۔‘‘ میں نے کہا تو وہ بولی۔

’’جب کل آئے گی تو دیکھا جائے گا، لیکن تم اس وقت مجھے بتاؤ کہ کیا فقط تمہارا مذہب نہیں ہے جس میں بیک وقت چار عورتوں کو رکھنے کی اجازت ہے۔ کیا اس طرح عورت کا استحصال نہیں ہوتا، جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ عورت کو اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں تمہیں سمجھاتا ہوں، تمہارے سارے سوالوں کے جواب اس میں ہوں گے۔‘‘ یہ کہہ کر میں کھانے کی جانب متوجہ ہوگیا تو وہ بھی خاموش ہوگئی۔ پھر گاہے بگاہے ہمارے درمیان کوئی ایک آدھ فقرے کا تبادلہ ہوتا رہا۔

ہمارے سامنے سے برتن ہٹا لئے گئے تو میں نے بل دے دیا، پھر ہم اٹھ کر ذرا سا آگے ان کرسیوں پر آ بیٹھے جن کے پاس چند لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر جوڑے ہی تھے، جن میں سرگوشیاں چل رہی تھیں۔ نیم تاریک سے ماحول میں ہم آرام دہ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پی اون کی جانب دیکھا، وہ میری طرف متوجہ تھی۔

’’تمہارے ذہن میں جو عورت کا استحصال ہے، اس میں بنیادی بات جنس کی ہے، جو میں نے یہاں عام دیکھی ہے، تم ضبط نفس کو ظلم قرار دے رہی ہو۔ اسلام میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم مثبت انداز میں سوال کرتی تا کہ اسلام میں جنس (Sex) کے بارے میں کیا تصور ہے تو میں تمہیں وہ بتاتا، تمہارے منفی انداز میں سوال کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ تم نے بنا تحقیق یونہی سنی سنائی بات کہہ دی ہے، جس کے پس منظر کا تمہیں بھی نہیں پتہ، خیر۔ تم نے کبھی موتی دیکھا ہے، سچا موتی جو سیپ میں بند ہوتا ہے؟‘‘

’’نہیں، مگر اس کا احساس کرسکتی ہوں۔‘‘ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

’’چلو! اس بات کو ذرا ایک جانب رکھو، اسلام نے فیمیل (Female) کو ’’عورت‘‘ کہا ہے، جس کا مطلب ہے، ڈھکی ہوئی، چھپی ہوئی، اسلام عورت کو ڈھانپ کر پردے میں اس لیے رکھنا چاہتا ہے کہ وہ بہت قیمتی ہے، جنس کا عمل بہت قیمتی ہے، اس قدر قیمتی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔ یہاں تک کہ یہ ہمارے لئے تقدس کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ لذت یا عیاشی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ افزائش نسل جیسے مقدس فریضے کے لیے ہوتا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ، ہم چار صدی بعد کی جب بات سوچتے ہیں، وہ کیوں؟ جبکہ ہم زیادہ سے زیادہ ایک صدی تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر آج عورت سے اس کی تخلیق کرنے کی صلاحیت کو سلب کرلیا جائے، وہ کوئی بچہ پیدا نہ کرسکے تو مجھے بتاؤ، انسان چار صدی بعد ہوگا؟‘‘

’’بالکل نہیں ہوگا، یہ زمین تو ویران ہوجائے گی۔‘‘

’’اس کے علاوہ تم مجھے کوئی راستہ بتاؤ کہ انسان کی افزائش کیسے ہوگی، صدیوں پرانی حکمت و دانش اگلی نسلوں تک کیسے منتقل ہوگی؟ یہ ایک عام سی بات ہے، اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس پس منظر میں مجھے بتاؤ کہ جنسی عمل ایک تقدس بھرا احساس رکھتا ہے یا نہیں؟‘‘

’’اس صورت میں تو ہے کہ انسان کی بقا ہی اس میں ہے۔‘‘

’’اب مجھے بتاؤ، کیا اس کی حفاظت کرنی چاہیے؟ عورت جو اس دنیا پر تخلیق کا عمل پورا کرتی ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہیے یا نہیں؟، کیا اسے ایسا ماحول نہیں دینا چاہیے جو جنسی بیماریوں اور غلاظتوں سے پاک ہو۔ جو جگہ جگہ ذلیل ہونے کی بجائے، ایک مرکز پر رہتے ہوئے تخلیق و تربیت جیسا اہم فریضہ ادا کرتی جائے۔ ہم عورت کے اس مقام کو ’’عصمت‘‘ کہتے ہیں، پاک بازی جس کا اصل حسن ہے۔ میری بات کا برا مت ماننا، چند نوٹوں کے عوض اس عمل سے گزر جانے والی عورت تو نہیں رہتی، اس نے اس مقدس فریضے کے عوض ایک وقت کی روٹی لے لی، اس روٹی نے اسی پیٹ میں جانا ہے، جہاں کچھ دیر بعد پھر سے بھوک کا احساس جاگ اٹھے گا۔‘‘

’’اور چار شادیاں......!‘‘ اس نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

’’اسلام میں چار شادیوں کا کوئی قانون نہیں بلکہ رعایت ہے۔ وہ بھی ماحول اور حالات کے باعث۔ یہ عیاشی نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے، جب عورتیں زیادہ ہوجائیں تو کیا کریں، انہیں مویشیوں کی طرح منڈیوں تک لے آئیں۔ جیسا میں نے واکنگ سٹریٹ میں دیکھا۔ وہ عورت جو خود کو پاک باز باعصمت اور اپنی تخلیق کی حفاظت کرنا چاہتی ہو وہ کیا کرے؟ وہ لوگ جو اپنے اعضائے تناسل کی حفاظت کرنے والے ہیں، وہ چاہے مرد ہوں یا عورتیں

اسلام میں ان کا اعلیٰ مقام ہے۔ انہیں مومنین کہا گیا ہے۔ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں اجازت موجود ہے، وہاں اس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ عدل کرسکو تو۔ اگر عدل نہیں کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی شادی کرنے کا حکم ہے۔ جب معاشرہ ہی اپنی عورت کی حفاظت نہیں کرے گا تو پھر دوسری قوم کے لوگ آکر انہیں بے آبرو کریں، یا پامال کریں یا محض جنسی کھلونا بنائیں۔"

"اسلام نے عورت کے بارے میں کیا کہا ہے؟" اس نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا

"وہ میں تمہیں ایک ہی نشست میں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ کوئی تھوڑا بہت نہیں ہے۔ ہاں مگر ایک بات ضرور سمجھا دیتا ہوں کہ اسلام نے عورت کو جنسی کھلونا نہیں بنایا بلکہ باوقار انسان کا مقام دیا ہے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کی طرح اپنی عبادت گاہوں میں رکھ کر انہیں جنسی استحصال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا، تمہارے مونک براہِ راست تم لوگوں سے کوئی شے کیوں نہیں لیتے، عورت سے مس ہونے کا مطلب ہے کہ وہ پلید ہو جائیں گے، کیا یہ عورت کی توہین نہیں ہے۔ عورت معاشرے کا باوقار رکن ہے۔ اسے تنہا نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ ایک مرد کو اس کا نگران بنایا گیا تاکہ اس کی تمام تر ضرورتیں پوری ہوں اور وہ افزائش نسل کے پاک فریضہ کو سرانجام دیں۔" میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑگئی، پھر بولی۔

"اگر ان باتوں کے تناظر میں دیکھیں تو جنس بڑا گھٹیا سا کام نظر آیا ہے میرا مطلب ہے، یہ جو میں اپنے اردگرد دیکھ رہی ہوں۔"

"میں نے تمہیں اصول اور کسوٹی بتادی، جب تک تم کپڑوں میں تھی، ایک تجسس تھا کہ تم کیسی ہوگی؟ اب تم نے میرے سامنے اپنے کپڑے اتار دیئے تو باقی کیا بچا، پی اون، اس قیمتی موتی کا تصور کرو، جو سیپ میں بند ہو، میں تمہیں اس موتی کی مانند دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا تو ایک دم سے چونک گئی۔

"آؤ چلیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ہم اٹھے اور نیم تاریک ماحول میں پتھر والی سے بنی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہاں سے ہوٹل کے اندر آگئے۔

"بلال! اگر آج رات میں اپنے گھر جاؤں تو۔۔۔ صبح آجاؤں گی۔" اس نے اجازت طلب انداز سے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کہا تو اچانک مجھے یاد آیا، تب میں نے کہا۔ "پی اون! کیا تم مجھے اپنے گھر والوں سے نہیں ملواؤ گی؟"

میرے اس سوال پر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ سی ہوگئی جیسے میں نے کوئی بہت غلط بات کہہ دی ہو پھر فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"نہیں! میرا باپ مسلمانوں کے بہت خلاف ہے، وہ تمہیں ذرا بھی احترام نہیں دے گا، ویسی ہی میری ماں بھی ہے، میں نہیں چاہتی کہ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب دیکھا اور پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ "صبح کا ناشتہ مل کر کریں گے۔ اب اجازت۔"

"اوکے۔۔۔" میں نے کہا تو وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے دوسری جانب سے باہر چلی گئی اور میں لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں بھرپور نیند لینا چاہتا تھا۔

ماہا کی آنکھ کھلی تو وہ بلال کے کمرے میں تنہا تھی۔ رقیہ نجانے کب کی اٹھ کر جا چکی تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر کلاک کی جانب دیکھا تو چونک گئی۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ یقیناً جب وہ رات دیر تک جاگتی رہے گی تو اٹھے گی بھی دیر سے۔ اس نے اٹھ کر بال سنوارے، منہ ہاتھ دھویا اور باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگی، یہ وہ وقت تھا جب حویلی میں ناشتے سے فراغت لے لی جاتی ہے، اسے معلوم تھا کہ تمام خواتین بڑے کمرے میں جمع ہوں گی۔ سارے مرد اپنے اپنے کاموں پر نکل گئے ہوں گے اور فہد! اس کا خیال آتے ہی وہ چونک گئی۔ اس نے تو لاہور جانے کا وعدہ کیا تھا کہ اپنے دوست سے بلال کے بارے میں پوری معلومات لے کر آئے گا۔ وہ گیا ہے کہ نہیں؟ یہ سوچتے ہی وہ بے چین ہوگئی۔ اس نے فوراً اپنا فون اٹھایا اور اس کے نمبر پش کر دیئے۔

"کہاں ہو تم؟" رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

"یہیں حویلی میں، خیریت تو ہے؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا

"وہ لاہور جانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟" اس نے فہد کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے خود پوچھ لیا۔

"اوہ! میرا دوست چند دنوں کے لیے اسلام آباد چلا گیا ہے۔ اس کا کوئی بزنس ٹور تھا۔ دو دن بعد وہ آجائے گا تو میں چلا جاؤں گا۔" اس نے نرم سے لہجے میں کہا تو ماہا ایک دم سے مایوس ہوگئی۔

"وہ جھوٹ بول رہا ہوگا، اسے کہو کہ تم اسلام آباد آرہے ہو۔" وہ الجھتے ہوئے بولی۔ تو اس نے انتہائی نرمی سے بولا

"ماہا! میں تمہارے لیے ابھی اسلام آباد جانے کے لیے تیار ہوں، لیکن وہ شاید ہی بتائے۔ ظاہر ہے بلال نے اسے روکا ہوگا، ہم نے بہت زیادہ تجسس کیا تو وہ چونک جائے گا، تم ذرا سا صبر کرو، میں سارا معاملہ حل کرلوں گا، تم اپنے آپ کو سنبھالو۔"

"ٹھیک ہے۔" ماہا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ان لمحات میں
بلال پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔ وہ خود پر قابو پا رہی تھی کہ ملازمہ اس کے کمرے میں آئی
"ماہا بی بی! بڑے میاں جی آپ کا ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔"
"ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں، مطلب۔۔۔؟" اس نے انتہائی حیرت سے پو
"پتہ نہیں جی، انہوں نے تو مجھے کافی دیر پہلے ہی کہا تھا کہ جیسے ہی آپ بیدار
میں ان کا پیغام آپ تک پہنچا دوں۔" ملازمہ نے بڑے مودب انداز میں کہا تو وہ چونک گ
خود میں شرمندگی محسوس کرنے لگی تھی۔
"کہاں ہیں وہ؟" اس نے پوچھا
"وہ باغ میں بیٹھے ہیں۔" ملازمہ نے بتایا۔
"اچھا ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں انہی کے پاس۔" ماہا نے کہا اور پھر کمر
سے نکلتی چلی گئی۔

باغ کے ایک گوشے میں گلاب کی کیاریوں کے پاس دادا نورالٰہی بید کی کرسی پر
اخبار پڑھ رہا تھا، اس کے پاس خالی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، جن کے درمیان میز دھرا تھا
اس وقت خالی تھا۔ ماہا نے جاتے ہی سلام کیا تو نورالٰہی نے بڑی شفقت سے اس کی طر
دیکھا۔ پھر سلام کا جواب دیتے ہوئے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔ وہ بیٹھتے ہی بولی۔
"دادا جی! سوری، ویری سوری، میں رات دیر سے سوئی تھی۔"
"پہلے ناشتہ کرتے ہیں، پھر باتیں۔ میں نے اپنی بیٹی سے بہت ساری باتیں کر
ہیں۔" نورالٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ملازمہ ناشتہ لے کر آ گئی۔
"دادا جی! میں بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں کہ آپ نے میری وجہ سے ناشتہ
نہیں کیا حالانکہ آپ۔۔۔" ماہا نے کہنا چاہا لیکن دادا نے پھر ٹوک دیا۔ پھر لسی کا گلاس اٹھا
ہوئے کہا۔
"بیٹے! ہمارے پاس باتوں کے لیے بہت وقت ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے گلا
ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر خاموشی میں ناشتہ کر لیا گیا، ملازمائیں برتن اٹھا کر لے گئیں تو دادا
کہا۔ "ماہا بیٹی! زندگی میں بہتیرے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ انہی طوفانوں سے نبرد آزما ہو
نام زندگی ہے۔ خیر! یہ تو میں نے یونہی بات کہہ دی ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم چند دن
بہت زیادہ ڈسٹرب ہو اور ایسا اچانک ہی ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے میرے پتر؟"
"کوئی نہیں۔۔۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے آج ناشتہ اسی لیے تمہارے ساتھ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ میں نے جو محسوس کیا ہے، اس پر تم سے بات کر سکوں، میرا دل کہتا ہے کہ میری بیٹی بے چین ہے۔ کچھ ہے ایسی بات، اب اگر تم اپنے دادا کو نہیں بتانا چاہتی ہو تو یہ الگ بات ہے، کیونکہ ہر بندے کو حق حاصل ہے کہ وہ۔۔۔"
"نہیں دادا جی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے تڑپ کر جلدی سے کہا۔
"ممکن ہے، میرا اندازہ غلط ہو، بوڑھا ہو گیا ہوں نا، اس لیے اب ٹھیک طرح سے اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔" نورالٰہی نے کہا اور اس کا ردعمل ماہا کے چہرے پر دیکھا۔ تب وہ بے چین سی ہو کر بولی۔
"دادا جی، بات ہے، لیکن پتہ نہیں وہ مجھے آپ سے کہنی چاہیے یا نہیں، میں خوفزدہ ہوں۔" ماہا نے جلدی سے کہا۔
"وہی تو! جب بات معلوم ہو گی نا میری بیٹی تو پھر اس کا حل بھی مل جائے گا۔" نورالٰہی نے اسے حوصلہ دیا۔
"دادا جی! ایسا حل، ممکن ہے اس سے دو خاندانوں کے درمیان کوئی غلط فہمی جنم لے لے۔ یا......" ماہا نے کہا اور خوف زدہ سی دادا کی جانب دیکھنے لگی۔
"اس کے لیے میں ہوں نا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تعلق بھی ہو اور اس میں کوئی غلط فہمی، شک یا رنجش پیدا نہ ہو۔ انہی وجوہات ہی سے تو تعلق کی مضبوطی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتنا مضبوط یا کمزور ہے اور اسی کے باعث سے اعتماد آتا ہے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" دادا نے بہت پیار سے سمجھایا تو وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔
"دادا جی! میں بلال کے بارے میں پریشان ہوں، پچھلے چند ماہ سے اس کی سرگرمیاں بہت پراسرار ہو گئیں ہیں۔ اس کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ اس نے ہم سب سے جھوٹ بولا، وہ کسی بھی سرکاری ٹور پر ملائیشیا نہیں گیا۔ نجانے وہ اس وقت کہاں ہے؟"
"ہاں! اس کی تو مجھے بھی تشویش ہے، میں نے اپنے طور پر بھی معلوم کیا ہے، یہ تو اس نے جھوٹ بولا، جس کا بہر حال مجھے بہت دکھ ہے۔" نورالٰہی نے دکھ ملے لہجے میں کہا۔
"لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک بات میرے علم میں آئی ہے۔" ماہا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
"وہ کیا؟" دادا نے پوری توجہ سے پوچھا۔
"آپ نے شاید اس کا کمرہ نہیں دیکھا۔ وہاں پر ایسا لٹریچر موجود ہے جس سے ایک

عام مسلمان، ایک انتہا پسند مسلمان بن سکتا ہے۔ میں نے اپنے تجسس سے مجبور ہو کر ان کتابوں
ان نوٹس کو دیکھا ہے، انہیں پڑھا ہے، وہاں اب کوئی ادبی سیاسی یا ایسا کوئی مواد موجود نہیں۔ یہاں
تک کہ رات میں نے اس کے کمپیوٹر کو بھی کنگھالا ہے۔ اس میں بھی وہی کچھ ہے۔ غیر ملکی لوگوں
کے رابطے، ان کے نظریات اور نجانے کیا کچھ، وہ اب ایک عام سا بلال نہیں رہا، جسے ہم جانتے
ہیں، بلکہ وہ کچھ اور ہی بن چکا ہے، آپ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت پوری دنیا میں کیسی کیسی تحریکیں
چل رہی ہیں۔ ان کے لیے تو بلال بہت اہم بندہ ثابت ہوگا۔'' وہ جوش میں آ کر کہتی چلی گئی۔

''کیا ایسا ہے؟'' دادا نے حیرت سے پوچھا تو ماہا اٹھ گئی اور بڑے اعتماد سے کہا۔

''آئیں میرے ساتھ، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔''

اس کے یوں کہنے پر دادا چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھا اور ماہا کے ساتھ چل دیا۔

ماہا نے دادا کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا دیا۔ مختلف درازوں سے نوٹس نکال کر ان
کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر ان کتابوں پر لگے حاشیے پڑھائے، یہاں تک کہ ماہا نے اپنا سارا
خوف دادا کے سامنے رکھ دیا۔ دادا نور الٰہی بڑے تحمل اور برداشت کے ساتھ وہ سب کچھ دیکھتا
رہا جو وہ اسے دکھا رہی تھی۔ پھر اس نے کمپیوٹر کھول لیا اور اس میں سے وہی کچھ دکھانے لگی جو
اس کے موقف کے تائید کر رہی تھیں۔ پھر بولی

''بتائیں، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں یا یہ محض میرا شک ہے، وہم ہوا ہے مجھے؟''

''میں تمہاری بات رد نہیں کر سکتا بیٹی، لیکن بعض اوقات ہوتا یوں ہے کہ ہم جو دیکھ
رہے ہوتے ہیں اور پھر جو سمجھ رہے ہوتے ہیں، دراصل وہ ویسا نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور ہی ہوتا ہے
بلال آ جائے تو اس سے..........'' دادا کہہ رہا تھا کہ ماہا بولی۔

''یہی تو خوف ہے مجھے دادا جی کہ وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔''

''اللہ نہ کرے بیٹی، ایسا ہو، وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ پھر ہم مل بیٹھ کر یہ طے
کر لیں گے کہ آخر وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ میرے خیال میں پریشان ہونے یا خوف زدہ
ہو جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔'' دادا نے اسے حوصلہ دیا۔

''دادا جی! اصل میں بات یہ نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے، بلکہ اس ذہنیت کی ہے جو
اس نے اپنا لی ہے، آپ خود بتائیں، میں ایک سخت گیر جیون ساتھی کے ساتھ رہ پاؤں گی، جو
مجھے سو پردوں میں پابند کر دے۔'' ماہا جذبات میں وہ بات کہہ گئی، جس کا اسے خوف تھا۔ دادا
نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ماہا تم بالکل ہی غلط راستے پر سوچ رہی ہو۔ بلال تو بہت نرم طبیعت کا بندہ ہے۔

دونوں میرے ہاتھوں میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہو۔ میں اگر تمہارے بارے میں جانتا
ہوں تو اتنا اس کے بارے میں بھی مجھے معلوم ہے، تم گھبرانا مت، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے،
جسے حل نہ کیا جا سکے، اس وقت تو محض ہمارا اندازہ ہے، جب بلال سامنے آئے گا تو ہر شے
واضح ہو جائے گی۔''

''جیسے آپ کہیں، لیکن اگر وہ ایسا ہی ہوا، جیسے میں سوچ رہی ہوں تو؟'' ماہا نے
الجھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے اس سوال میں آدھا رسک ہے، یعنی ہو بھی سکتا ہے نہیں بھی، جب تک
تصدیق نہیں ہو جاتی، تب تک خواہ مخواہ جلنے کڑھنے کا فائدہ؟'' دادا نے اتنا کہا اور پھر بولا۔
''جیسے میں نے پہلے کہا، زندگی میں بہت ساری مہمات سے واسطہ پڑتا ہے۔ تم اپنے آپ کو
اس کے لیے تیار کرو، زندگی سہل ہو جائے گی۔'' دادا نے اٹھتے ہوئے کہا، پھر ماہا کے سر پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے باہر کی جانب چلا گیا اور وہ یوں بیڈ پر ڈھیر ہو گئی جیسے جنگ جیتنے سے پہلے ہی
کوئی سپاہی حوصلہ ہار دے۔

وہ سوچنے لگی، دادا نے اس کی بات مانتے ہوئے بھی بلال کی تائید کی، جیسے اس نے
کوئی آدھا سچ کہا ہو۔ وہ چاہے آدھا ہی سہی، تھا تو سچ، پھر کیوں انصاف سے کام نہیں لیا جاتا،
حتمی فیصلہ کیوں نہیں دیا گیا کہ بلال قصوروار ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی۔

''کیا واقعی بلال قصوروار ہے؟''

''ممکن ہے نہ ہو۔''

''تو پھر تم کیوں اس پر غصہ کرتی چلی جا رہی ہو؟''

''اس نے مجھ سے اپنی کوئی بات شیئر جو نہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں یہ سب
ہونے ہی نہ دیتی۔'' اس نے کتابوں کے ڈھیر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم خود ہی اپنی کوتاہی کا اعتراف کر رہی ہو، کیا تم نے محسوس کرنے کی کوشش
کی.....'' اس کے ضمیر نے پھر سے اسے وہی بات جتائی جو پہلے جتا چکا تھا تو وہ سوچنے پر مجبور
ہو گئی کہ کہیں اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے، ورنہ وہ جس قدر بلال کے بارے میں دعویٰ کرتی
تھی، وہ سب اس کی خود فریبی نکلا۔

''مگر مجھ سے کوتاہی ہوئی کہاں؟'' وہ یہی سوچتے ہوئے وہیں کتابوں کے ساتھ بیڈ
پر ڈھیر ہو گئی۔

❁......❁......❁

میں نے بیدار ہو کر جب بالکونی میں سے باہر دیکھا تو سورج کی کرنوں نے ابھی زمین کو نہیں چھوا تھا۔ سمندر میں وہی بے چینی تھی لیکن ہوا جیسے خمار آلود تھی اور بہت سنبھل کر چل رہی تھی۔ میں کافی دیر تک یونہی بالکونی میں بیٹھا رہا۔ وہ وقت مجھے بہت اچھا لگا تھا، جی چاہ تھا کہ ہمیشہ ایسا ہی سماں رہے اور میں یونہی بے خیال سا بیٹھا رہوں اور صدیاں بیت جائیں۔ پھر ذرا سی دیر بعد میں اپنے ہی خیال پر ہنس دیا۔ تب میرے خیال کی رو اس جانب مڑ گئی۔ آج اس ہوٹل میں میرا آخری دن ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے کیا کرنا ہے، یہ ابھی میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں واپس چلا جاؤں یا پھر ابھی مجھے کچھ دن مزید یہاں رہنا ہوگا، اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا، پی اون کو جو میں نے پیغام دینا تھا، وہ ابھی باقی تھا، میرے اور اس کے تعلق کے درمیان جو سوال پیدا ہوئے تھے، میں ان کے پورے جواب اسے دینا چاہتا تھا، اسے مطمئن کرنا چاہتا تھا، میری اب تک کی محنت کیا رنگ لائی تھی، میں اس کے بارے میں ایک فیصد بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ پی اون کا لہجہ اور انداز اب بھی وہی تھا، جو چیٹ کرتے وقت میرے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ میں اٹھا اور لیپ ٹاپ تک گیا۔ اسے اٹھا کر پھر بالکونی میں آ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب تک کیا باتیں رہ گئیں ہیں۔ میں نے نیٹ آن کیا اور اپنی ای میل کو دیکھا تبھی مجھے خوشگوار حیرت ہوئی، میرے سامنے ماہا کی ای میل تھی۔ جسے میں نے کھول لیا۔ تب میں نے چونک کر دیکھا، ایک فقرہ بہت زیادہ کہانی سنا رہا تھا کہ میں نے بلال کو کھو دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس فقرے پر خود ہی ہنس دیا۔ ماہا بھی کتنے تھوڑے دل کی ہے، چند دن کا ہجر بھی نہیں برداشت کر پائی۔ لیکن یہ فقرہ ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ میں نے لیپ ٹاپ پر جو کام کرنا تھا کیا اور پھر فوراً اسے بند کر کے رکھ دیا۔ وہ فقرہ میرے دماغ سے نکالے نہیں نکل رہا تھا۔ اس نے ایسا کیوں لکھا، کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی، یا پھر اس نے یونہی لکھ دیا۔ میں نے لاشعوری طور پر فون اٹھایا اور ماہا کے نمبر ڈائل کرنے لگا، مگر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اس طرح تو سارا جھوٹ پکڑا جائے گا، اور پھر وہاں تو ابھی سورج بھی طلوع نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے فوراً ہی فون ایک جانب رکھ دیا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی کہ آخر اس فقرے کا پس منظر کیا ہے؟ جو ظاہر ہے مجھے فوری طور پر معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

میں باتھ روم سے فریش ہو کر آیا تو بے چینی ہنوز اعصاب پر سوار تھی۔ میں نے سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور ماہا کی ای میل کھول لی اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کافی تک مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی تو میں نے جواباً اسے فقط اتنا پیغام بھیج دیا کہ بلال کھویا نہیں ۔۔۔ وہ اپنی ماہا کو ساتھ لیے پھرتا ہے، ماہا اپنے دل میں دیکھے، بلال ہے کہ نہیں ہے۔ یہ پیغام

بھیج کر مجھے ذرا سکون ملا اور میں نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر فریج میں سے جوس نکال کر پینے لگا۔ انہی لمحات میں مجھے خیال آیا کہ آج کا دن کیسے گزارا جائے؟ مجھے پتایا کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہو ہی گئیں تھیں۔ لیکن میری مرضی نہیں تھی، میں پی اون کی پسند کو ترجیح دینا چاہتا تھا، کیونکہ میرا مقصد یہاں کی سیر کرنا نہیں تھا۔ میں بالکونی میں کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے سکرین پر نمبر دیکھے وہ ہمت سنگھ کے تھے، میں نے فوراً کال ریسیو کی تو دوسری جانب جیت کور تھی۔ حال احوال کے بعد اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''بھاء جی میں آپ سے سخت قسم کی ناراض ہوں۔''

''واہ میری بہن، رہی نا وہی امرتسر کی پنجابن، جسے اردو بولنا نہیں آتی، تُو پنجابی میں بات کرتو مجھے لگے گا میری بہن بات کر رہی ہے۔'' میں نے فوراً ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''بھلا میری اس اردو میں کیا خرابی ہے؟''

''بھئی ناراض ہو بس، یہ سخت قسم کی کیا ہوا، نرم قسم کی......'' میں نے نرم سے لہجے میں کہا۔

''میں نے زور دینے کی خاطر کہا تھا، بس میں ایسی ہی ناراض ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

''چل بتا، میری بہن تو کیوں ناراض ہے؟'' میں نے پھر کہا۔

''پتا ہے پانچ دن ہوگئے یہاں آئے ہوئے اور گھر کا ایک چکر نہیں لگایا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ انہیں کہہ دیا کہ میں بات کرلوں، لیکن خود ایک بار فون تک نہیں کیا۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''کان پکڑتا ہوں، معافی مل جائے گی نا۔'' میں نے نرمی سے کہا تو وہ ہنس دی۔

''آج چھٹی ہے، لہٰذا سیدھے یہاں آئیں، پھر کہیں سیر پر نکلتے ہیں۔'' اس نے حکم جاری کردیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر کھلاؤ پلاؤ گی کیا؟'' میں نے یونہی کہا۔

''جو میرا بھائی کہے گا، بناؤں گی، ویسے میں نے فریج میں کھیر ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھ دی ہے، مرغی رکھی ہوئی ہے، خود آ کر ذبح کرلو تو میں پکا دوں گی اور بتاؤ؟'' اس نے کہا تو گھر کے خالص پاکستانی کھانوں کا سن کر گویا منہ میں پانی آ گیا۔ تبھی میں نے لمحوں میں فیصلہ کرلیا کہ آج کا دن انہی کے ساتھ گزارا جائے اور پی اون بھی ساتھ میں ہوگی۔

''بس تو پھر میں آ رہا ہوں۔ آلو گوشت کے ساتھ منڈے، واہ کیا بات ہے۔'' ممّا نے کہا تو جیت کور ہنس دی۔

''بس تو پھر آ جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے الوداعی جملے کہے اور فون بند کر دیا۔

تقریباً آٹھ بجے پی اون آ گئی۔ وہی نیلی جین، آف وائٹ شرٹ، کھلے بال، میک اپ سے بے نیاز چہرہ، پاؤں میں آف وائٹ چپل، بالکل سادہ سی۔ اس نے آتے ہی روم سروس کو ناشتے کے لیے کہہ دیا تو میں نے کہا۔

''پی اون! میں ابھی مزید دو دن پتایا میں رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے، مجھے اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہنا چاہیے یا پھر کسی اور جگہ پر۔''

''اگر تم مجھے بتا کر آتے تو میں ایک مسلم خاندان کے ساتھ تمہاری ایڈجسٹمنٹ کرا دیتی۔ بہت کم خرچ پر تمہارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ اب میرا نہیں خیال کہ دو دن کے لیے کہیں اور جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں ادھر ہی رہ لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پوچھا، ''تمہارا کسی مسلم فیملی کے ساتھ تعلق بھی ہے؟''

''اسے تم تعلق نہیں کہہ سکتے لیکن بس شناسائی، میں نے جو انگریزی زبان سیکھنے کے لیے اکیڈمی جوائن کی تھی، وہیں ایک مسلم لڑکی تھی، ملایا کی تھی، ان کا بڑا سا گھر تھا اور اکثر مسلم لڑکیاں وہاں ٹھہرتی تھیں۔ یہاں نزدیک ہی ان کا گھر ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں مجھے معلومات دیں۔

''پھر وہ مجھے وہاں نہ ٹھہرنے دیتے، کیونکہ وہ فقط لڑکیوں کے لیے مخصوص ہوگا۔ خیر! آج بتاؤ تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اتنے میں ویٹرس ناشتہ لے کر آ گئی۔

''تم اگر باہر نکلنا چاہو تو کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ورنہ ادھر ہی۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''چلو! باہر بھی نکلنا ہو تو......'' میں نے خواہ مخواہ بحث کا انداز اپنا لیا۔

''پھر کئی ساری جگہیں ہیں۔ وہ ہوٹل سے باہر نکل کر بتا دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے ناشتے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

''اگر آج میں کہوں کہ میری پسند کے مطابق......''

''یہ اچھی بات ہے، کہاں جانا ہے؟'' وہ بولی۔

''وہ ہوٹل سے باہر نکل کر بتاؤں گا۔'' میں نے اس کے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر

ہنس دی۔ ابھی ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ دروازہ ہلکا سا بجا اور ہمت سنگھ آ گیا۔

''ست سری اکال بھاء جی۔'' اس نے میری جانب دیکھ کر اور پھر پی اون کو وائی کیا۔

''ہمت سنگھ تم......؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''او یار! یہ جو بیویاں ہوتی ہیں نا، بندہ تو ان کا غلام ہی ہو جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ فون پر بات کیا کر لی اس وقت سے کہہ رہی تھی کہ آپ کو لے آؤں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بھی ناشتے میں شامل ہو گیا۔

''یار! میں آ جاتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ کھا پی لو پھر اپنا سامان باندھو اور چلو، باقی کے دو دن بھی ادھر ہی رہنا ہے۔'' اس نے ہدایات سنائی تو میں نے ایک لمحہ کو پی اون کی جانب دیکھا جسے پنجابی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں اس وقت مصلحتاً خاموش رہا۔ ہمت سنگھ نے جلدی سے چائے پی اور میرا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ اس پر پی اون نے میری جانب دیکھا۔

''ممکن ہے اب مجھے یہ دو دن وہیں رہنا پڑے، لیکن تم میرے ساتھ ہی رہو گی۔''

میرے یوں کہنے پر ہمت سنگھ نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم تینوں اپنے سامان سمیت ٹیکسی میں تھے۔ وہاں کے واجبات کی ادائیگی میں پی اون نے کافی مدد کی۔ اب وہ میرے ساتھ کافی حیران سی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم میں خاموشی رہی یہاں تک کہ ہمت سنگھ کا گھر آ گیا۔ جیت کور نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اس کے ہاتھ میں دیا اور پرشاد والا تھال تھا، اس میں سے اس نے تیل دروازے کی دونوں جانب گرایا تو پی اون میری جانب دیکھ کر بولی۔

''یہ کیا؟''

''یہ پنجابی روایت بلکہ رسم ہے، اسے کرنے دو، یہ اس مہمان کے لیے ہوتی ہے جو قابل عزت و احترام ہو۔'' میں نے کہا تو وہ خوشگوار حیرت میں مسکرا دی۔ ہم دروازہ پار کر گئے تو میں نے جیت کور کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں جیت سنگھ بھاگتا ہوا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''یار جی، اتنے دن کدھر رہے، ہم بڑا یاد کرتے تھے آپ کو۔''

''یار سو کام ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا تو جند کور نے پی اون سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھ سے پوچھا، اس کے لہجے میں شک تھا۔

''یہ کون ہے؟'' اس کے یوں پوچھنے میں ''بہت کچھ'' بھی ہو سکتا تھا، اس لیے میں نے صاف لفظوں میں کہا۔

"جند بہن! میں اس کے لیے ہی یہاں آیا ہوں، لیکن میرا اس کے ساتھ ایسا تعلق ہے، جس میں ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہے۔"

میں نے یہ بات پنجابی میں کہی تھی۔ بلاشبہ جند کور سمجھدار تھی۔ لمحوں میں سمجھ گئی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تب اس نے پی اون کو گلے لگایا اور تھائی زبان میں بہت کچھ کہتے ہوئے اندر لے گئی۔ ہم ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تو تھوڑی دیر بعد جند کور دہی کی ٹھنڈی لسی لے کر آ گئی۔ میں نے بڑے مزے سے پی اور پھر پی اون کو بتایا کہ یہ ہمارا روایتی مشروب ہے۔ وہ بھی بڑے مزے سے پی گئی۔ تب ہمت سنگھ نے کہا۔

"بھاء جی! مرغی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

اس کے یوں کہنے پر میں اٹھا۔ میں نے کمرے سے باہر لان کے پاس مرغی ذبح کی اور اسے صاف کرنے لگا۔ اس دوران پی اون مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے صاف گوشت بنا کر دے دیا تو جند کور پکانے لگی۔ جیت سنگھ کو بازار سے کچھ لینا تھا ہمت سنگھ اسے بازار لے کر چلا گیا۔ تب میں اور پی اون ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے یہ تمہارے رشتے دار ہیں۔" پی اون نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، رشتے دار تو نہیں، ان کا تو مذہب بھی مجھ سے الگ ہے۔ ہاں جہاں میں رہتا ہوں، اس زمین کی مناسبت سے تعلق ہے۔ وہاں کی سرزمین سے ان کا روحانی تعلق ہے ورنہ شاید انہوں نے وہ جگہ بھی نہیں دیکھی ہے اور پھر جو یہاں پر میرا میزبان ہے، اس کے تعلق سے......" میں نے اسے تفصیل سے بتایا۔ تو وہ بڑے تجسس سے بولی۔

"یہ جو تم نے مرغی خاص انداز میں کاٹی ہے یا ذبح کی ہے تو اس طرح یہ حلال ہو گئی؟"

"ہاں!" یہ کہتے ہوئے میں نے سوچ لیا کہ اسے بتا دوں کہ اسلام میں حلال و حرام کا تصور کیوں ہے۔ اس لیے میں نے صوفے پر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ "دراصل! اسلام ہر انسان سے اور خصوصاً مسلمان سے پاکیزگی کی سختی سے توقع کرتا ہے۔ یہ پاکیزگی ہر معاملے میں ہے۔ ہر معاملے میں چاہے وہ عبادت ہو یا پھر کھانا پینا، یہاں تک کہ ہر وہ عمل جو زندگی میں ہمیں درپیش ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں سوچنا بھی شامل ہے۔ چونکہ اسلام، پورا ایک نظام زندگی دیتا ہے، اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ زندگی گزارنے کا جو ضابطہ اسے دیا گیا ہے وہ اس پر عمل کرے۔"

"کیوں؟، ایسا کیوں چاہتا ہے اسلام؟ وہ ہر انسان کو آزاد کیوں نہیں کر دیتا؟" پی اون نے کہا۔

"اس لیے کہ اسلام کا مطلب ہے سلامتی، امن، بھائی چارہ، مساوات، انسانیت کی فلاح، وہ ہر انسان کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہی اس نے ایک ضابطہ زندگی دیا ہے۔ ایک جانب اچھائی ہے تو دوسری جانب برائی درمیان میں لکیر کھینچ دی۔ فرق بتا دیا کہ یہ ٹھیک ہے اور یہ غلط، جیسے کہ ہر ملک کا قانون ہوتا ہے کہ وہاں کے معاملات درست چلتے رہیں۔ یہ سب ضابطے، یہ روک ٹوک، ان کا ایک خاص مقصد ہے کہ ایک خاص قسم کا کردار تخلیق کیا جائے جو دوسروں کے لیے رحمت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ میں بھی بلند اور مثالی خصوصیات کا حامل ہو۔ زندگی گزارنے کا کوئی شعبہ بھی ہو، انسانی زندگی کے ہر معاملے میں اسلام، ہر جگہ پر صفائی و پاکیزگی چاہتا ہے۔ اس پر ذرا سا سوچا جائے تو یہ ایسی تحریک ہے جس سے منفی خیالات کے مضر اثرات سے تحفظ روح کی سلامتی، راست بازی، پرسکون ذہن، ذاتی کردار اور صحت مند جسم رکھنے کو تقویت ملتی ہے۔ جس کی بدولت، ایک مسلمان اپنے دین میں خالص ہوتا ہے، اسلامی ذہنیت، زندگی، جائیداد، اپنی آئندہ آنے والی نسل، ذاتی احترام اور سچائی کا تحفظ ممکن ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اب میں نے ذبح کیا تو اس کا مطلب ہے کہ ذبیحہ میں اس بات کا یقین ہے کہ گوشت اعلیٰ معیار کا ہوگا کیونکہ اس میں خون نہیں ہے۔ جاؤ پوری دنیا کی تحقیق اس معاملے میں جا کر دیکھ لو۔ اور اسی طرح عورت! عقائد کی پختگی، معاملات کی صفائی اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی اسلام کا مقصد ہے۔ جبکہ تم جانتی ہو کہ جنسی بیماریاں یہاں تک کہ ایڈز کیسے لگتی ہے؟" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بہت تحمل سے کہا۔

"تو کیا ہر مسلمان اس پر پورا اترتا ہے؟" پی اون نے پوچھا۔

"میں نہیں کہوں گا، کیونکہ ہر انسان ہر طرح کا مزاج رکھتا ہے۔ وہ سارے مزاج ایک ضابطے کے تحت کر دیئے گئے ہیں، حق و باطل، اچھائی و برائی اور حلال و حرام اسے بتا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے پاس ارادہ و اختیار کی قوت بھی موجود ہے۔ اب یہ اس پر ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ جو حلال کو اپنائے گا اور حرام کو چھوڑ دے گا، اسے سارے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔ اسے چاہے کوئی غیر مسلم بھی اپنا لے۔" میں نے اسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

"تم نے کہا زندگی کے ہر معاملے میں تو یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"دیکھو! پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ پاک نے پوری دنیا ہی نہیں پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے، ہر شے انسان کے لیے ہے کہ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے لیکن ان اشیاء سے منع کیا گیا ہے جو انسان کے لیے مضر ہے اور کسی نہ کسی حوالے سے

نقصان دہ ہے۔ وہ زندگی کا کوئی بھی معاملہ ہو۔ اس میں ایک حد ہے، جہاں سے تجاوز نہیں کرنا، کیونکہ ایک لکیر ہے جس کے ایک جانب حق اور دوسری جانب باطل ہے، ازل سے حق اور باطل نبرد آزما رہے ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز سے حق و باطل خلط ملط نہیں ہوتے، بلکہ ان میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔'' میں نے اسے پھر سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''عورت کے معاملے میں کیا حد ہے، اس سے عورت کو کیا فائدہ ملتا ہے۔'' پی اون نے پوچھا۔

''پہلی بات یہ ہے کہ اسلام عورت اور مرد کو دو الگ الگ نوع کی صورت میں نہیں دیکھتا۔ بلکہ مرد اور عورت کو انسان تصور کیا ہے۔ دونوں کے حقوق و فرائض برابر ہیں، لیکن عورت اور مرد میں صنف کے لحاظ سے الگ الگ شناخت ہے اور جسمانی اعتبار سے اپنے اندر الگ الگ نظام رکھتے ہیں تو جہاں پر علیحدگی کی حد شروع ہوتی ہے، وہاں پر احکامات بھی الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس گردانا گیا ہے۔ مطلب وہ اپنی عائلی زندگی میں برابر ہیں۔ جس طرح مرد کا اس کائنات پر حق ہے اسی طرح عورت کا بھی۔ تمام مذاہب جو گزر چکے یا موجود ہیں، ان میں عورت کی حیثیت کیا ہے؟ میں اس کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے جبکہ اسلام نے عورت کی نسوانیت کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ پورے احترام کے ساتھ اسے تحفظ بھی دیا۔ اقوام متحدہ کا چارٹر برائے انسانی حقوق 10 دسمبر 1948 کو منظور ہوا جو صدیوں پیشتر کے ظلم و جبر کے خلاف ردعمل تھا، ایک تحریک نے اپنا آپ منوایا۔ لیکن 6 مارچ 632ء میں محسن انسانیت ﷺ نے انسانی حقوق کا منشور دے دیا جو نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات کا نچوڑ تھا۔ اس میں عورتوں کے حقوق کا تاریخی اعلان کیا گیا۔ ایک مسلمان پر یہ فرض عائد کر دیا گیا کہ جس طرح سے وہ ان سے حق چاہتا ہے، ویسا ہی ان کا حق بھی ہے۔ اللہ ہی کے باعث وہ حلال ہیں مگر تم ان پر جبر و ظلم نہیں کر سکتے، ان کے تمام تر ضروریات کا خیال کرنا مرد کی ذمے داری ہے اور یہاں تک فرما دیا کہ ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ ان کی بھلائی چاہو۔'' یہ کہہ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر کہا۔ ''دوسری جانب...... آج کے اس جدید ترین دور میں جبکہ برطانیہ کا میگنا کارٹا، فرانس کا معاہدہ عمرانی، امریکہ کا بل آف رائٹس یا اقوام متحدہ کا چارٹر برائے انسانی حقوق بھی ہیچ نظر آتے ہیں۔ مغرب، امریکہ یا غیر مسلم دنیا انسانی حقوق کی سب سے بڑی داعی ہے مگر! آج بھی عورت وہیں کی وہیں کھڑی ہے، صرف ایک مثال دوں گا، حقوق نسواں کی عالمی بیجنگ کانفرنس 1995ء میں ہوئی، جس کی تفصیلات پڑھو تو تمہیں معلوم

ہوگا کہ بیس سال کی جدوجہد اس کے پس منظر میں ہے۔ اس کا اعلامیہ پڑھ لیا جائے تو مغرب، امریکہ اور غیر مسلم دنیا کے سارے دعوؤں پر لکیر پھر جاتی ہے۔ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ وہاں عورت خود کو بھی غیر محفوظ تصور کرتی ہے، جہاں مساوات دی جا رہی ہے، ایسا کیوں ہے، یہ تضاد کس لیے؟ یہ سب تو اسلام نے بہت پہلے دے دیا۔''

''واؤ! تو مغرب ان اصول و قوانین کو کیوں نہیں اپنا لیتا؟'' پی اون نے کہا۔

''اپنایا ہے، مثال کے طور پر عیسائی دنیا میں عورت کا حق ملکیت نہیں تھا، لیکن اسے ایک خاص صورت میں اپنا کر رائج کیا گیا ہے، متاثر ہو کر، اور پھر یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ اسلام محض مسلمانوں کے لیے ہے، یہ عالمگیر نظام ہے اور فطری مطابقت رکھتا ہے۔ اسے کوئی بھی اپنا لے۔ اصل میں وہ لوگ جو اپنی سرداری جمائے بیٹھے ہیں، ان کی وہ سرداری ختم ہوتی ہے، وہی جو عرب جاہلیت میں تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ان قوانین کو لاگو کیسے کیا جائے، جس میں عورت کا احترام ہو۔''

''فرد سے لے کر معاشرے تک، لیکن وہاں جہاں ایک عظیم طاقت کو تسلیم کر لیا جائے، اچھا! میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں چند لمحے خاموش ہوا۔ پھر بولا۔

''ایک گھر ہے، جو چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی۔ اس میں ایک عورت ہے۔ جس کی تمام تر ضروریات پوری کرنے کا ذمہ اس کے شوہر کے ذمے ہے۔ کھانے پینے سے لے کر اس کی جنسی زندگی تک، پھر اس کے ساتھ ساتھ احترام و عزت اور وقار بھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے سکون محسوس کرتے ہیں۔ مرد کے ذمے معاشی ذمے داری اور عورت کے ذمے نئی نسل کی تخلیق اور اس کی تربیت۔ ان کے تمام تر اعمال فقط اللہ کی رضا کے لیے ہوں۔ یہاں تک کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی۔ اس کے برعکس، اگر عورت پر کمانے کی ذمے داری بھی ہو، اس کا کوئی خاندان نہ ہو، کوئی مرکز نہ ہو۔ وہ فطری طور پر تخلیق کے عمل سے بھی گزرے تو وہ اس معاشرے میں سوائے انتشار کے اور کیا ہوگا۔ جس طرح تمہارے پتایا میں عورتیں جگہ جگہ ٹھیلا لگائے کھڑی ہیں۔ تم ان کی عائلی اور ازدواجی زندگی کی مشکلات کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔ اسی ایک چھوٹی سی مثال کو تم ہر ملک، قوم، نظام اور مذہب کے تناظر میں دیکھو، تمہیں خود سب معلوم ہو جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے عورت فقط بچوں کی پیدائش اور خاوند کی خدمتگار ہے؟ اس کی اپنی سماجی اور معاشی زندگی نہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہے، عورت کی ہر روپ اور مقام کے احترام کے علاوہ اسے ہر طرح

کے حقوق دیئے گئے ہیں۔ وہ اگر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد کاروبار کرتی ہے تو اسے اجازت ہے کوئی قدغن نہیں۔ میرے نبی حضرت محمد ﷺ نے عورت کی تعلیم وتربیت کرنے والے کو یعنی اپنی بیٹی کی پرورش اور تربیت کرنے والے کو جنت کی بشارت دے دی۔ وہ بھی اپنے ہمراہ ہونے کے ساتھ۔ مسلمان کے لیے اس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا۔ عورت پر اس طرح علم حاصل کرنا فرض قرار دے دیا گیا جیسے مرد پر، ایک تربیت یافتہ عورت جو علم بھی رکھتی ہے، کیا ایک بہترین قوم کی تشکیل نہیں کرسکتی، یہی اسلام کا مطمع نظر بھی ہے کہ پوری قوم کی تربیت وتشکیل عورت کے ذمے ہے۔ اگر وہ بہترین ماں ہے تو بہترین بیٹا اور بیٹی پیدا کرے گی، جو نہ صرف معاشرے بلکہ قوم کے لیے، دنیا کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔“

”بہت مشکل ہے، جہاں اتنی ذہنیت مادہ پرست ہو، مغرب زدہ ہو......“ پی اون نے کہا۔

”اس میں دو باتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ منزل ومقصد حاصل ہو یا نہ ہو، خلوص نیت سے کوشش کرنا ہی اللہ کے نزدیک بہترین عمل ہے اور یہی قبولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے ہی جہاد کہتے ہیں۔ فتنہ کہیں بھی ہو، اسے دور کرنا، اور دوسری بات یہ ہے کہ جس قدر بھی تاریکی ہو جیسے ہی اسلام کی طرف جائے گا، روشنی اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں ہے ہی روشنی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اچھی ہے وہ اچھائی کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ آلودگی اترنے میں تھوڑا وقت لگ سکتا ہے۔ اسلامی احکام وقوانین بھی فطری ہیں۔“ میں نے دھیرے دھیرے اسے بتایا۔

”تو پھر اس قدر اچھا نظام، فطری دین، انسان قبول کیوں نہیں کرتا؟“ پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

”اس دنیا میں تمام تر اچھائیاں اور برائیاں موجود ہیں۔ حق و باطل واضح ہے۔ دوسری طرف انسان کو ارادہ اور اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ یہی امتحان ہے کہ انسان کس طرف جاتا ہے۔ یہی کشمکش ہے، یہی آزمائش ہے۔ جس کا نتیجہ آخرت میں ملنے والا ہے۔“ میں نے کہا تو پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

”آخرت۔۔۔! مطلب؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ تو سامنے آنا چاہیے نا، یعنی اچھے عمل پر انعام! برے عمل کی سزا، تمہیں یہ سمجھنا اس لیے مشکل ہوگا کہ بدھ مت میں جنت اور دوزخ کا تصور نہیں ہے۔ اس میں تمام تر مذہبی زندگی کا مقصد نروان ہے اور نروان کیا ہے؟ جس کی اتنی

وضاحت نہیں ہے کہ فوراً بات سمجھ میں آجائے۔ نروان کو تو فقط تشبیہوں اور استعاروں میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ کب ملتا ہے، جب موت واقع ہوجائے؟ ممکن ہے بدھا، اسی جنت کے بارے میں بتانا چاہتے ہوں، ایک لمحے کے لیے ہم مان بھی لیں کہ اسلام اور بدھ مت میں نروان ایک ہی شے کا نام ہے تو پھر اس کے حصول کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ فطری یا غیر فطری؟“

”ظاہر ہے فطری طریقہ ہونا چاہیے۔“ پی اون نے کہا۔

”تو پھر ہمیں اپنی زندگی کے لیے وہی اپنانا چاہیے جو ہمارے لیے بہترین، فطری اور اعلیٰ ہو اور پھر اس کے اپنانے سے انعام، اجر یا نروان مل جائے۔“ میں نے انتہائی تحمل کے ساتھ اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ تھی اس وقت میں چاہتا تھا کہ آخرت کے بارے میں اسے مزید بتاؤں لیکن اتنے میں جند کور چائے لے کر آگئی۔

”لو ویر جی! گپ شپ کے ساتھ چائے بھی پیو۔“

”لیکن، یہ ہمت سنگھ نے اتنی دیر کیوں کردی ہے؟“ میں نے مگ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جیت ہے نا، اسے کوئی بھی شے پسند بڑی دیر بعد آتی ہے۔ ابھی آتے ہوں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پی اون کو مگ تھما کر بولی۔ ”تمہیں پسند آئے گی۔“

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کچن میں آپ کی مدد کروں مگر افسوس مجھے کھانا بنانا نہیں آتا۔ ہاں! جب ہم کھانا کھالیں گے تو میں سارے برتن دھو دوں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”او نہیں! بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔“ جند کور نے انگریزی میں کہا اور پھر واپس پلٹ گئی۔ پی اون نے سپ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”جب تم واپس جاؤ گے تو کیا اپنے پیاروں کے لیے تحفے لے کر نہیں جاؤ گے۔“

”کیوں نہیں؟، میں نے سوچا ہے کہ جانے سے ایک دن پہلے شاپنگ کروں گا اور ظاہر ہے تم ہی میری مدد کروگی۔“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”او کے!“ اس نے یوں سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے اس کا کوئی تجسس دور ہوگیا ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی مزید بات کرتے، ہمت اور جیت سنگھ اندر داخل ہوئے۔ پھر ہمارے درمیان شاپنگ کی باتیں چل نکلیں۔ جیت اندر چلا گیا تھا۔ اور ہمت کبھی پنجابی، انگریزی اور کبھی تھائی میں باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جند کور نے کھانا لگا دیا۔ دیسی کھانے دیکھ کر طبیعت ویسے ہی خوش ہوگئی۔ جند کور نے پی اون کے لیے تھائی ڈشیں بھی بنالیں تھیں۔ پھر دیسی کھانا

اصرار کر کے کھلاتی رہی۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچن میں چلی گئیں اور ہم دونوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دونوں جب آئیں تو ان کے ہاتھ میں چائے تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے میرے حوالے سے پی اون کو خاص اہمیت دی تھی۔ وہ جو ایک عام تھائی لڑکی کے بارے میں تصور ہوتا ہے، اسے وہ نہیں سمجھا۔ ممکن ہے جند کور نے پی اون سے اس بارے میں باتیں کی ہوں۔

ہم میں اس وقت ایک خوشگوار ماحول تھا۔ میں لاشعوری طور پر سوچنے لگا۔ مذاہب ہوں یا تہذیبیں، ان میں اگر انسان کو فوقیت دی جائے اور احترام انسانیت پیش نظر رہے تو نہ صرف مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان میں بہت سارے اختلافات بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ بدھ، سکھ اور مسلمان ان تینوں مختلف مذاہب کے لوگ وہاں موجود تھے۔ اگر سب ایک دوسرے کو کھلے ذہن و دل سے، فقط انسانیت کے ناطے قبول کرتے ہیں تو امن کوئی مشکل بات نہیں۔ نفرت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مفاد پرست لوگ تعصبات کو ہوا دیتے ہیں۔ انہی لمحوں میں میرے خیالات کی رو اپنے ملک کی فضا کی جانب چلی گئی۔ جہاں فرقہ پرستی نے ماحول خاصا مکدر کر رکھا ہے۔ ایسے معاملات بھی وجہ تنازع بنے ہوئے ہیں جنہیں اسلام میں معمولی سی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اختلاف رائے کوئی غیر فطری بات نہیں لیکن اختلاف جب نفرت اور عناد میں تبدیل ہوتا ہے تو اپنے اندر بہت زیادہ تباہی لے کر آتا ہے۔ پھر سڑکوں پر گرنے والا خون رائیگاں جاتا ہے۔ وہی خون جو امت مسلمہ کے لیے، اس کے عظیم وقار کے لیے، انسانیت کی فلاح کے لیے کام آسکتا تھا۔ میں اکثر خود سے یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم قصوروار ہیں یا نہیں؟ ہم مفاد پرست ہیں یا پھر ہماری تربیت ہی درست خطوط پر نہیں ہوسکی؟ کہیں نہ کہیں خامی ضرور ہے۔ ورنہ ایک طرف اگر پاکستان جیسا اسلامی نظریاتی ملک ایٹمی قوت بن سکتا ہے تو دوسری جانب ایسا مثالی اسلامی ملک بھی بن سکتا ہے جو اسلام کی درست تصویر پیش کرے۔ چہ جائیکہ فرقہ پرستی ختم کرنے کے لیے تدبیریں کی جارہی ہیں۔

”بلال بھاء جی، آپ کہاں کھو گئے ہیں؟“ ہمت سنگھ نے پوچھا تو میں چونک گیا۔ تب میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہیں نہیں! بس یونہی ایک سوچ آگئی تھی۔“

”آپ کہیں ہماری ہونے والی بھابی کے پاس تو نہیں پہنچ گئے تھے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا، پھر قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”ہاں یار! آپ پاکستان فون کر کے پوچھ لیں۔

شادی کے لیے یا ویسے ہی ضرورت ہو تو یہاں سے سلک بھی اچھی ملتی ہے۔ وہ لے جائیں۔“

”یار، مجھے اچھی، بری سلک کا کیا پتہ؟“ میں نے اس موضوع سے بچنا چاہا۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ذرا سی دھجی جلا کر دیکھ لیں۔ راکھ بن جائے تو وہ ٹھیک ہے۔ ورنہ اگر پلاسٹک کی مانند جل کر جم جائے تو وہ غلط ہوتی ہے۔“ اس نے مجھے پہچان بتائی تو میں نے فون کر کے پوچھ لینے کی حامی بھر لی۔

”ویسے کب ہو رہی ہے آپ کی شادی؟“ جند کور نے پوچھا۔

”تین ہفتے بعد! یہاں سے جاؤں گا تو حتمی تاریخ مقرر ہوجائے گی۔ ویسے انتظامات تو سارے ہوگئے ہوں گے۔“ میں نے کہا تو جند کور نے انتہائی حسرت سے کہا۔

”کاش! ہم بھی پاکستان جاسکتے۔ مجھے بڑی خواہش ہے۔“

”تو یہ کون سی بات ہے، آپ لوگ تیاری کرو اور میرے ساتھ چلو۔“ میں نے پورے خلوص سے آفر کی۔

”کاش ایسا ہوسکتا، ویسے ہم پہلے امرتسر جائیں گے اور پھر لاہور۔ دیکھیں کب جاسکتے ہیں۔“ ہمت سنگھ نے بھی حسرت سے کہا۔

”آپ اپنی تیاری کر کے مجھے بتادیں، پھر میں جانوں میرا کام۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دیئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ چونکہ ہم پنجابی میں بات کر رہے تھے۔ اس لیے پی اون خاموشی سے ہماری جانب دیکھے چلے جارہی تھی۔ جیسے ہی مجھے احساس ہوا تو میں نے انگریزی میں بتایا کہ ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ وہ خوش ہوگئی۔ تب جند اور پی اون باتیں کرنے لگیں تو ہمت سنگھ نے مجھے بتایا کہ جند اسے پنجابی رسومات کے بارے میں بتا رہی ہے، جو شادی پر ہوتی ہیں۔ ایسی ہی باتوں میں سہ پہر ہوگئی۔

زندگی میں بہت کم لمحات ایسے آتے ہیں جب بندہ خود کو پرسکون محسوس کرتا ہے۔ ہوٹل میں چاہے جس قدر سہولیات تھیں لیکن گھر کے ماحول میں جو سکون ہوتا ہے، اس میں ایک خاص لذت ہوتی ہے۔ شاید ہم روحانی طور پر اپنے گھروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ گلاب نگر کی یاد دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگی تو میں بے چین ہونے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں میرے بارے میں تشویش ضرور پائی جاتی ہوگی۔ انہی لمحات میں مجھے ماہا کی ای میل یاد آگئی کہ بلال کھو گیا ہے۔ ایک لمحے کو میرا دل چاہا کہ میں گلاب نگر پہنچ جاؤں لیکن! میں ایسے جذباتی لمحات میں بہہ جانے والا نہیں تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور ان کے ساتھ، اپنے آپ کو بہلانے لگا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ہمت سنگھ نے پوچھا کہ کیا میں باہر جانا پسند کروں گا؟ نہیں۔ میں بھی کھلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔ تب میں نے پی اون سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

"میں کچھ دیر جند کور کے ساتھ رہوں گی، پھر اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

"لیکن یہ ذہن میں رہے کہ میرا کل اس ملک میں آخری دن ہے۔ کل دوپہر تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا تو اس نے بڑے پرسکون انداز میں سن کر کہا۔

"میں جانتی ہوں۔"

تب میں نے کوئی بات نہ کی اور ہمت سنگھ کے ساتھ باہر نکل گیا۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ماہا بلال کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا دل حویلی سے اکتا گیا تھا۔ نجانے کیوں اک احساس اس کے ذہن پر بوجھ بن گیا تھا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ دادا اس کی بات کو اہمیت نہیں دیں گے۔ بلکہ اسے توقع تھی کہ اس قسم کا انکشاف ہونے کے بعد دادا پوری کوشش کریں گے کہ فوراً بلال کو بلایا جائے، اس کی تحقیق کو اہمیت دیتے ہوئے اسے حق بجانب قرار دیں گے۔ لیکن ان کا رویہ تو ایسا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو، بلکہ اس کی غلط فہمی قرار دے دی گئی تھی۔ کیا دادا کو علم تھا کہ وہ ایک بنیاد پرست بن رہا تھا یا پھر ان کی بھی خواہش تھی۔ دادا نے جانب داری دکھائی، حالانکہ وہ بھی اس کی پوتی ہی تھی۔ مگر بلال ان کا زیادہ چہیتا ہے یہ تو اسے بچپن ہی سے معلوم تھا۔ مگر اس قدر کہ اسے نظر انداز کر دیں گے۔ یہ انصاف تو نہیں ہوا نا۔ وہ اسی نہج پر سوچتی چلی جا رہی تھی اور نجانے کہاں کہاں کے خیال اس کے دماغ کو منتشر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا جی حویلی سے اُوب گیا تھا۔ خاص طور پر بلال کا یہ کمرہ اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھے اور فوراً اپنے گھر چلی جائے۔ وہ اگر یہاں اکیلی ہوتی تو ایسا اس نے کر بھی لینا تھا، لیکن اس بار تو اس کی ماما بھی ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اب وہ ان کے ساتھ ہی جا سکتی تھی، جب بھی وہ جائیں۔

"ارے ماہا......! تم یہاں ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری!" نجمہ پھوپھو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں پھوپھو، میں بالکل ٹھیک ہوں، بس یونہی پڑی ہوئی تھی یہاں۔" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تب تک نجمہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

"ماہا......! تم کچھ تنہائی پسند نہیں ہو گئی ہو؟" نجمہ نے پوچھا۔

"آپ نے ایسا کیوں محسوس کیا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بھئی میں جب سے آئی ہوں نہ تمہیں ہنستے بولتے دیکھا۔ نہ تم میں وہ جوش و جذبہ دیکھا ہے جو نئی نویلی دلہنوں میں ہوتا ہے۔ یوں بیمار بیمار سی ہو، کیا بات ہے؟" اس نے انتہائی تجسس سے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے اور جوش و جذبے کی مجھے نہیں سمجھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"مطلب ہوتا ہے نا، ایک نیا گھر بنانے کی جب سوچ آتی ہے تو ہزار خریداری کے باوجود بھی چیزیں رہ جاتی ہیں، لیکن میرے سامنے تم ایک بار بھی بازار نہیں گئی ہو۔" وہ پھر دھیمے سے انداز میں بولی۔

"اوہ......! پھوپھو! ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حویلی کا یہ حصہ تو میں نے سجا دیا ہے، ہر شے یہاں موجود ہے۔ کپڑے تقریباً تیار ہیں اور جو بہت خصوصی خریداری ہے وہ چند دنوں میں بلال کے آجانے پر لاہور سے ہو جائے گی۔ میرا نہیں خیال کہ مزید کسی تیاری کی گنجائش رہ گئی ہو۔" ماہا نے قدرے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ......! میں کچھ اور ہی سمجھی تھی۔" نجمہ نے یوں کہا جیسے اس کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

"کیا سمجھی تھیں آپ؟" ماہا چونکتے ہوئے بولی۔

"دیکھو ماہا، تم بھی میری بیٹی ہو، میرے دل میں عجیب و غریب قسم کے وہم اٹھ رہے تھے۔ یہ تمہاری حالت دیکھ کر، اب تم نے بتایا تو میرے دل کو ڈھارس بندھی ہے۔" نجمہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

"کیا سوچ رہی تھیں آپ؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"ہوتا ہے، کہ بعض فیصلوں پر بچیاں منہ سے کچھ نہیں کہتیں، لیکن دل سے وہ نہیں چاہ رہی ہوتی ہیں؟ یونہی گھٹ گھٹ کر مرتے ہوئے اپنے والدین کی لاج رکھتی ہیں۔ نجانے کیوں مجھے یونہی وہم ہو رہا تھا کہ تم اس رشتے پر راضی نہ ہو۔" نجمہ نے انتہائی محتاط انداز میں کہا تو ماہا ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی، لیکن......" ماہا نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو نجمہ چونک گئی، وہ ایسے ہی کسی لمحے کی تاک میں تھی۔ بڑے ہی پیار سے بولی۔

"تھی...... لیکن...... تم کہنا کیا چاہ رہی ہو میری بیٹی۔"

"پھوپھو، پتہ نہیں، حالات کیا کہہ رہے ہیں اور میری قسمت کیا ہے، مجھے ذرا بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ میرا دماغ اس قدر ماؤف ہو گیا ہے کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں

''۔ ماہا نے منتشر سے لہجے میں کہا۔

''ایسی کیا بات ہے، مجھے بتاؤ، مجھ پر اعتماد کرو، کیوں دماغ سوزی کر رہی ہو، تم نے ایک بات کہی میں نے فوراً پوری کر دی، بڑوں سے بات کرو گی تو وہ تمہیں کوئی اچھا مشورہ ہی دیں گے۔ میں فقط ایک بات جانتی ہوں اگر اس رشتے میں کوئی ذرا سی بھی الجھن ہے تو شادی سے پہلے پوری طرح مطمئن ہو جانا تمہارا حق ہے۔ بعد میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے سے اچھا ہے کہ پہلے ہی سارے معاملات صاف کر لئے جائیں۔ اگر تم کوئی بات نہیں کہہ سکتی ہو تو مجھے بتاؤ، میں کہہ دیتی ہوں۔'' نجمہ نے بہت تحمل اور پیار سے کہا۔

''کس سے کہیں گی آپ؟ جس سے بھی بات ہوگی، وہ سو طرح کے سوال کرے گا، آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔'' اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھئی......! مجھے معلوم کہ بات کیا ہے، لیکن جو بھی ہے وہ میں بعد میں سن لوں گی اور تم چاہو تو مجھے نہ بتاؤ، مگر ایک فیصلہ ضرور کر لو کہ آخر تمہیں کرنا کیا ہے۔ قدرت نے انسان کو ذہن ہی اس لئے دیا ہے کہ وہ اپنے حالات کا تجزیہ کر کے اس پر فیصلہ دے سکے۔ اگر حالات تمہارے مطابق ہوتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ دوسری صورت میں خود کو تیار رکھو کہ تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔'' نجمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مجھے بہرحال پورے حالات کو ایک نئے انداز میں دیکھنا چاہئے اور پھر مجھے طے کر لینا ہے کہ میں کیا کروں گی۔'' وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

بالکل......! یہی تو میں کہہ رہی ہوں، ہمارے معاشرے میں جب ایک بار کسی کو جیون ساتھی چن لیا جاتا ہے، تو پھر بہت مشکل ہے کہ اس سے الگ ہونے کا سوچا بھی جائے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور اس میں کامیاب وہی ہوتا ہے جو وقت پر درست فیصلہ کرے۔'' نجمہ نے دھیرے سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھوپھو، میں بہت جلد کوئی فیصلہ کر لوں گی اور بلاشبہ مجھے ایسا ہی کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔'' اس نے پختہ سے لہجے میں کہا۔ تب نجمہ نے اس کی حالت زار پر ایک لمحہ کو غور کیا اور بولی۔

''تم اپنے بارے میں بہترین فیصلہ خود کر سکتی ہو۔ خیر......! میں جس مقصد کے لئے تمہارے پاس آئی تھی وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ماہا کی جانب دیکھا جو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے پوچھنے پر وہ چونکی اور پوچھا۔

''جی پھوپھو، کیا کہا آپ نے؟''

''یہی کہ تم نے رقیہ سے بات کی، جو میں نے تمہارے ذمے کام لگایا تھا؟'' اس نے ماہا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''او......! سوری پھوپھو، میں بھی اپنی پریشانی میں اس سے کوئی بات ہی نہیں کر سکی ہوں۔ میں ابھی اس سے بات کر لیتی ہوں۔'' اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

''نہیں......! تم ابھی مت پوچھنا، جب ذرا ذہنی طور پر سکون ہو تو بات کر لینا۔'' نجمہ نے لاڈ سے کہا۔

''اس کوئی بات نہیں ہے، میں اس سے پوچھ لیتی ہوں۔'' ماہا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

؟؟چلو، جیسے تمہاری مرضی، تمہارے کہنے پر ہی میں ابا جی سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کروں گی۔'' نجمہ نے کہا تو ماہا نے سر ہلا دیا جیسے اس کے ذمے بہت اہم نوعیت کا کام ہے۔ پھر دونوں ہی اٹھ کر باہر کی جانب چل دیں۔

اس وقت مغرب ہو جانے والی تھی، جب ماہا نے رقیہ کے بارے میں پوچھا، وہ ابھی تک وہ اپنے کمرے میں تھی۔ ماہا وہیں چلی گئی۔ وہ کپڑوں کی الماری کے ساتھ مصروف تھی۔

''یہ کون سا وقت ہے اس طرح کی مصروفیت کا؟'' ماہا نے پوچھا۔

''میرے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا، سوچا الماری ہی ٹھیک کر لوں۔'' اس نے کپڑوں کی تہہ جماتے ہوئے کہا۔

''اچھا ادھر آؤ، میں نے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' ماہا نے کہا اور اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ایسی کیا بات ہے جو یہاں نہیں پوچھی جا سکتی۔'' رقیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے پاس آ گئی۔

''ہے نا بابا......!'' ماہا نے کہا اور پھر بہت زیادہ سنجیدگی سے بولی۔ ''اچھا، تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں فہد کیسا لگتا ہے؟''

''کیسا لگتا ہے مطلب، اچھا ہے......'' رقیہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ارے گھامڑ......! اس طرح سے کیسے اچھا لگتا ہے، مطلب، جب لڑکی سے یوں پوچھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کی رائے......'' وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ رقیہ کھکھلا کر ہنس دی، پھر بولی۔

''دیکھو ماہا......! میں لڑکی ہوں اور کہیں نہ کہیں بیاہی جاؤں گی اور یہ سب کچھ

میرے والدین کی مرضی سے ہوگا، وہ میرے لئے اچھا ہی سوچیں گے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری اپنی کوئی پسند نہیں ہے۔'' ماہا نے مسکراتے ہوئے کہا

''نہیں......! میں نے کبھی ایسے سوچا ہی نہیں۔ اب میرے والدین میرے بارے میں جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ چاہے کوئی بھی ہو۔'' ماہا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے میری ہونے والی بھابی جی، میں یہ بالکل نہیں پوچھوں کہ آپ سے یہ کس نے کہا کہ میری رائے معلوم کرو؟ کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے میرے والدین اچھا برا دیکھ کر ہی فیصلہ کریں گے نا۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

''چلو، میں تمہیں بتا ہی دیتی ہوں، نجمہ پھوپھو چاہ رہی ہیں کہ تمہیں فہد کے پلے باندھ دیں۔ مگر انہوں نے بات کرنے سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا بہتر سمجھا اور وہ اب میں انہیں بتا دیتی ہوں کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ماہا نے کہا تو رقیہ بولی۔

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے پسند ہے، حتمی اور آخری فیصلہ میرے والدین کا ہی ہوگا۔''

''او کے بابا، میں سمجھتی ہوں۔'' ماہا نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ''لاؤ......! میں تمہارے ساتھ مدد کراؤں۔'' وہ دونوں الماری ٹھیک کرنے میں مصروف تھیں اور ساتھ میں اسی موضوع پر باتیں بھی کرتی چلی جارہی تھیں کہ ملازمہ اندر آئی اور بولی۔

''ماہا بی بی، آپ کو بڑے کمرے میں آپ کی ماما یاد کر رہی ہیں۔''

''آتی ہوں۔'' اس نے کہا تو ملازمہ واپس چلی گئی اور وہ جلدی جلدی کپڑے رکھنے لگیں۔ وہاں سے فراغت کے بعد دونوں ہی بڑے کمرے میں جا پہنچیں۔ جہاں نجمہ پھوپھو کے ساتھ زبیدہ خاتون اور ذکیہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔

''جی ہاں......! آپ نے بلایا تھا مجھے۔''

''ہاں چلیں اب......! تمہارے پاپا اکیلے ہوں گے۔'' ذکیہ بیگم نے کہا۔

''پھوپھو بھی جارہی ہیں نا؟'' اس نے یونہی پوچھا۔

''ہاں بیٹی کیوں نہیں۔ ابھی شادی کو پورے تین ہفتے پڑے ہیں۔ میں پھر آ جاؤں گی۔ بس ایک دو دن نور پور میں رہوں گی اور پھر واپس جانا ہوگا۔'' نجمہ نے بتایا اور اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو رہی تھی، فہد گاڑی کے پاس ہی تھا۔ سورج غروب ہو رہا

تھا جب وہ گلاب نگر سے نکلے۔ ماہا کا دل بھی ایسے ہی ڈوب رہا تھا۔

اگلے صبح ناشتے کی میز پر یہ فیصلہ ہو گیا کہ پہلے ہاتھی گاؤں جایا جائے گا اور پھر کسی بھی پارک میں جایا جا سکتا تھا۔ جیت سنگھ کو ہاتھی بہت پسند تھے، اس فیصلے میں اس کی پسند کو اولیت دی گئی تھی۔ تبھی میں نے پی اون کو فون کر کے بتایا تو وہ بولی۔

''آپ وہاں پہنچیں، میں ادھر ہی ملتی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں مطمئن ہو گیا کہ وہ وہاں پر ضرور پہنچے گی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم ٹیکسی کے ذریعے ہاتھی گاؤں پہنچے جو سیام کنٹری کلب کے عقب میں واقع تھا۔ بانسوں سے بنے ہوئے ہال کمرے کے باہر براؤن رنگ کے تختے پر زرد رنگ سے تھائی اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ ہم اس ہال میں چلے گئے۔ جہاں سے ٹکٹ لیا گیا۔ وہاں اور بہت سارے سیاح آئے ہوئے تھے، لیکن میں پی اون کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک جب وہ مجھے نظر نہ آئی تو میں نے اسے فون کیا۔ فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی پہنچ جانے والی ہوں، تقریباً دس منٹ لگیں گے۔'' اس نے کہا۔

''او کے......! میں تمہارا باہر ہی انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا اور فون بند کر دیا۔ یہ کہہ کر میں نے ہال سے باہر نکلنا چاہا تو ایک شخص وہاں کے بارے میں بتانے لگا۔

''یہ ہاتھی گاؤں 1973ء میں ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لئے بنایا گیا۔ یہاں تقریباً تیس ہاتھی ہیں اور ہزاروں کام کرنے والے کارکن، یہاں ہاتھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، ہاتھی پر سواری دو طرح کی ہے......'' لوگ اس کی جانب متوجہ تھے جبکہ میں باہر آ گیا۔

اس دن پی اون نے سیاہ سوتی پتلون اور گلابی شرٹ پہنی ہوئی تھی، اس کے ساتھ بند جوتا، زلفیں سنواری ہوئی تھیں۔ لیکن چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی مسکرا دی۔

''یہاں کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے تو کچھ نہیں، لیکن تمہارے آنے سے اچھا محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ویسے مجھے جند کور کی کمپنی اچھی لگی ہے۔ میں ان سے ملتی رہوں گی، بہت اچھی ہے۔'' اس نے خوش کن لہجے میں کہا اور ہم دونوں اندر کی جانب چلے دیئے۔ پی اون کے آنے

سے خاصی خوشگواریت آ گئی تھی۔ سبھی اچھے انداز میں ملے۔
ہاتھی پر دو افراد ہی بیٹھتے تھے اور تیسرا مہاوت تھا۔ پہلے جیت سنگھ، جند کور اور ہر سنگھ اور پھر پی اون اور میں دوسرے ہاتھی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھی چل دیا۔ انہی ہچکولوں کے درمیان ہم باتیں کرنے لگے۔

''یہاں آ کر مجھے لگا کہ لوگ ہاتھی کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں۔'' میں نے یونہی باتوں کی ابتداء کی۔

''بس یہ تھائی روایات میں اس کی اہمیت ہے اور وہ بھی جنگی حوالے سے۔ اب جبکہ دنیا بدل چکی ہے، ہاتھی کی اہمیت یہی کھیل تماشے کی سی رہ گئی ہے۔ ہم جو آج بھات خرچ کر کے ہاتھی پر سواری کر رہے۔ کوئی وقت تھا، عام آدمی ایسے تجربے سے نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ زمانے کی ترقی ہے کہ جو سہولیات کبھی بادشاہوں، شہنشاہوں یا شہزادیوں کو حاصل تھی، وہ آج ایک عام آدمی کو بھی حاصل ہے۔''

''یہ ایک فطری امر ہے پی اون، وقت کے ساتھ ساتھ شعور بڑھتا ہے، زمانے کے انداز و اطوار بدلتے ہیں، رہن سہن سے لیکر خیالات تک میں تبدیلی آتی ہے۔ یہی تبدیلی ہی تو آگے ہی آگے لئے جا رہی ہے۔'' میں نے ہلکورے لیتے ہوئے کہا۔ تب چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پی اون بولی۔

''کوئی چیز ایسی بھی ہے جو نہیں بدلتی۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا کہ جیسے وہ بہت سوچ کر بات کر رہی ہے۔

''ہاں ہے! اور وہ ہے حق و باطل کی کشمکش۔ یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس کشمکش میں زندگی ہے، قوموں کا عروج و زوال بھی ہے۔'' میں نے کہا تو پی اون نے الجھے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری یہی بات سمجھ میں نہیں آتی، ایک جانب تم کہتے ہو کہ اس کائنات کو بنانے والا ایک خدا ہے اور وہ اس سارے نظام کو نہ صرف چلا رہا ہے بلکہ اس کی دیکھ بھال بھی کر رہا ہے۔ اگر اسے مان لیا جائے تو پھر یہ حق کیا ہے اور یہ باطل کیا ہے، جنگیں وبائی امراض، زلزلے، آفات، ایک طرف اتنے امیر لوگ اور دوسری جانب کھانے کو ترستے لوگ۔ یہ سب کیا ہے، کیا خدا یہ سب دیکھ نہیں رہا ہے؟''

''بالکل وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، پی اون......! اصل میں اس سے بھی پہلے تمہارا یہ سوال ہونا چاہئے تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے! لیکن پھر بھی میں تمہارے سوال کا جواب

دیئے دیتا ہوں کہ یہاں جو برائی ہے یا اچھائی ہے، اس میں سارا انسان کا اپنا عمل دخل ہے۔ اللہ پاک کی نعمتیں اور وسائل سب کے لئے یکساں ہیں۔ جیسے دھوپ، یہ ہوا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ یہ انسان ہی جو دوسرے انسان سے روٹی چھین رہا ہے، اس نے اپنے نظام ہی ایسے بنا لئے ہیں، جس میں اس کا لالچ، ہوس اور خوف ہی دور نہیں ہو رہا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں ارادہ واختیارات کے ساتھ زمین پر بھیجا۔ اب اگر وہ دوسرے انسانوں سے ان کا رزق چھینتا ہے یا طاقت کے زور پر انہیں دبا دیتا ہے تو یہ باطل ہے، لیکن اگر وہ دوسروں کی فلاح کے لئے سہولیات پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے تو وہ حق ہے۔''

''تو کیا مظلوم لوگ کو خدا نے یونہی چھوڑ دیا ہے؟'' پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......! اسلامی تعلیمات کے مطابق، وہ لوگ جو اللہ کی راہ پر چلتے ہیں وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ ان میں درجہ کوئی بھی ہو، کوئی بہت چھوٹے مقام پر ہوتا ہے اور کوئی بہت اعلیٰ مقام پر اور جو اللہ کی راہ پر چلنے والے نہیں ہوتے وہ باطل والوں میں قرار دیتے جاتے ہیں۔ اس میں یہ تخصیص نہیں کہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں۔ یہ سیدھا، سیدھا انسانیت کا معاملہ ہے۔ یہاں پر انفرادی انسان۔ اللہ سے رابطے میں ہوتا ہے۔ اللہ نہ صرف اس کی مدد کرتا ہے، بلکہ بہت سارے کام اس شخص کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اللہ کی رضا میں راضی ہوتا ہے۔''

''وہ تو خاص لوگ ہوں گے نا، میں عام لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔'' پی اون نے کہا۔

''خاص و عام کی بات نہیں، بلکہ اس دائرے میں آ جانے کی ہے۔ اس پر اللہ کی نوازشات شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری جانب باطل۔''

''یہ حق و باطل کیوں؟'' پی اون نے پھر سے الجھتے ہوئے کہا۔

''تاکہ وہ کردار پیدا ہو سکے جو اللہ چاہتا ہے۔ اچھائی اور برائی ہونے ہی سے کردار واضح ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہیں ہے۔ اگر دنیا سے مل کر برائی ختم کر دی جائے تو اچھائی کے کردار کا تصور ہی بے معنی ہو جائے گا۔ اب دنیا میں تم دیکھ رہی ہو کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، کیا اس میں انسان کے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ دنیا امن کا گہوارہ نہیں رہا۔ اہل باطل طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے حق کی قوتوں کو ختم کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ یہ انسانی اختیار ہے جسے منفی طریقے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں کے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں، ان میں مغربی طرز جمہوریت سب سے بڑا جھوٹ ہے، جہاں ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور حلف بائیبل پر لیتے ہیں؟ انسانیت کے ساتھ کتنا

بڑا مذاق ہے۔ جس نظام کی بنیاد ہی منافقت پر ہے وہ انسانیت کی فلاح کیا چاہے گا۔'' میں کس قدر جذباتی لہجے میں کہا تو پی اون نے میرا دھیان بٹانے کے لئے پائن ایپل کے درختوں کی جانب اشارہ کیا۔

''دیکھو......! وہ کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔''

''بالکل یہ فطرت ہمیشہ سے ہی خوبصورت رہی ہے، ہم انسان ہی اسے برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا تو انہی لمحوں میں مہاوت نے ہاتھی کو ایک چھوٹی سی ندی میں ڈال دیا اور پانی کا شور ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکورے ذرا کم ہوئے تو سکون سا محسوس ہوا۔ تب میں نے پی اون سے کہا ''یار......! اس مہاوت سے پوچھو، ابھی کتنی دیر تک یونہی سفر میں گزرے گا؟''

''کیوں تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔'' اس نے پوچھا پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ''تصور کرو اس وقت کا جب ہاتھیوں پر بیٹھ کر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ لوگ شاہانہ انداز میں اس پر سفر کرتے تھے۔ وہی تجربہ تمہیں ہو رہا ہے تو تمہیں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''اگر تم انجوائے کر رہی ہو تو میں صبر کر لیتا ہوں، ورنہ......'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تو اس نے مہاوت سے پوچھا، وہ معلومات دیتا رہا تو پی اون نے مجھے بتایا۔ ''تقریباً ایک گھنٹے کا سفر ہے، جس میں ابھی صرف بیس منٹ ہی گزرے ہیں، اس راستے میں دیہاتی علاقے، پائن ایپل اور ربڑ کے درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے سلک بنانے والے کارخانے سے قریب سے گزریں گے، چاولوں کے کھیت بھی آئیں گے اور واپسی پر موسمی پھلوں، چائے یا کافی سے آپ کی مہمان داری کی جائے گی۔''

''کیا تم انجوائے کر رہی ہو'' میں نے پھر پوچھا۔

''کیوں نہیں......! سب سے بڑا لطف تو یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، لیکن یہ ہنسی بہت پھیکی تھی۔

''پی اون......! تم نے مجھے اپنے گھر والوں سے نہیں ملوایا، چلو کوئی بات نہیں، اپنے کسی دوست یا سہیلی سے بھی نہیں ملوایا، حالانکہ جو کچھ مجھے تمہارے میں معلوم ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ تمہارے بہت سارے فرینڈ ہیں اور ان میں تم بہت نمایاں ہو۔'' میں نے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو میری جانب دیکھ کر بولی۔

''جب سے تمہارا اور میرا رابطہ ہوا ہے، تب سے اب تک ہمارے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی کتنی حسرت تھی، جواب پوری ہوئی ہے تو پیاس مزید

بڑھ گئی، دل چاہتا ہے کہ یہ سفر یونہی چلتا رہے، ہم دونوں ساتھ رہیں۔ یہ چند دن کس طرح گزر گئے، مجھے احساس نہیں ہوا۔ اس میں اگر میرے دوست بھی شامل ہو جاتے تو میرے لئے کتنا وقت بچتا تھا؟ تم بھی اتنے لوگوں میں تقسیم ہو کر رہ جاتے۔ پھر پتہ نہیں کس کا تاثر تمہارے بارے میں کیا ہوتا، بعد میں اچھا یا برا سب مجھے سننا پڑتا، اب جیسے کل کا دن اور آج، ہمارے درمیان دوسرے لوگ ہیں تو ہمارے پاس کتنا وقت بچا، اس تھوڑے سے وقت میں ہم نے کتنی باتیں کر لیں۔ میں جانتی ہوں کہ ہمارا ساتھ کل شام تک کا ہے، پھر پتہ نہیں...... یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تو مجھے اس کے اندر کی اتھل پتھل ہوتی ہوئی دنیا کا احساس ہوا۔ انہی لمحات میں مجھ پر انکشاف کی صورت یہ خیال اترا کہ کہیں پی اون کسی جذباتی رو میں تو نہیں بہہ رہی ہے۔ مگر یہ سوال اس سے کیا نہیں جا سکتا تھا، لہٰذا میں خاموش رہا۔

''مجھے خوشی ہوئی پی اون کہ تم مجھے اس قدر اہمیت دی رہی ہو، ورنہ تھائی لڑکیوں کے بارے میں تو عالمی طور پر یہ طے کر لیا گیا ہے کہ وہ بھات کے سوا آپ سے بات بھی نہیں کرتیں اور بھات دینے کے بعد جو چاہو سو کرو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں......! شاید ہم اپنی روایات کو بھول رہے ہیں، ہم یہ تو نہیں تھے۔ دولت کے حصول میں ہم تھائی بھی بہت بدل گئے ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں بھی نمائش گاہیں بن چکی ہیں، وہاں بھی دولت کمانے کے رنگ ڈھنگ بن چکے ہیں۔ کہیں بھی تو کوئی خلوص نہیں ہے جو من کو پرسکون کر دے۔'' پی اون نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جنگ کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے وسائل اور زمین پر ہی نہیں بلکہ وہاں کے لوگوں پر بھی قابض ہو جاتی ہے۔ یہ فتح ادھوری ہوتی ہے، حقیقی فتح اس وقت ہوتی ہے جب ذہن قابو میں کر لئے جائیں۔ میرے خیال میں یہ فتح تب بھی ادھوری رہتی ہے۔ اصل فتح دلوں کو جیتنا ہوتا ہے، جو جنگ سے نہیں امن سے ہوتی ہے۔ اگر ایک قوم دوسری قوم کے نظریات کو بلاحیل وحجت اور بلامزاحمت کے اپنا لے تو ہتھیار اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ تم لوگ اس پر تو فخر کرتے ہو تا کہ تم کبھی ''کالونی'' نہیں رہے، لیکن بغیر مزاحمت کے تمام پر اہل مغرب کے فلسفے کا تسلط ہو چکا ہے جو...... مادیت پسندی ہے، اس میں تمہاری تھائی قوم کا کوئی قصور نہیں ہے، کیونکہ محض روحانیت انسان کے مسائل کا حل نہیں، جیسے فقط مادیت پسندی انسان کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ کوئی خاص نظام بھی نہیں جس سے پوری انسانی زندگی رہنمائی پا سکتی ہو۔ مادیت پرستی سے ناواقف قوم کے لئے مادیت نئی شے ہے اور اس کے ثمرات ونتائج بھی دیکھنا ہوگے جو منطقی طور پر ہوتے ہیں۔''

’’تمہارے خیال میں مادیت پرستی کے ثمرات ونتائج کیا ہیں؟‘‘ وہ بولی۔

’’وہی جو تم آج اہل مغرب میں دیکھ سکتی ہو، تم غور کرو وہاں کے انسان کی کیفیت کیا ہے۔ روحانی اعتبار کو ایک جانب رکھ دیں محض نفسیاتی امراض ہی کا جائزہ لیں تو جو بندہ مادیت پرستی میں آگے ہے وہ زیادہ مریض ہے۔ اتنی سہولیات، اردگرد کی دنیا، معاشرہ اور ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ تنہائی کا شکار ہو گیا ہے۔ مجھے اخلاقی طور پر مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، ان کی سماجی زندگی سامنے ہے، جسے ان ثمرات کو جاننا ہے وہ مغربی طرز زندگی کو ذرا غور سے دیکھ لے۔ اب اگر وہی طرز زندگی اور سوچ ہم بھی اپنا لیں گے تو ہمارا دُہرا نقصان ہے۔ خصوصاً مسلمان ممالک میں تو تہرا عذاب لے کر آتی ہے۔ وہ جو غیرت ہے، وہ اسے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جیسے تم اپنی قوم کے بدل جانے پر افسوس کر رہی تھی، تمہیں افسوس اس لئے ہے کہ تم میں ابھی تھوڑی سی غیرت باقی ہے۔‘‘ میں نے کہا تو وہ سوچتے ہوئے سے بولی۔

’’اچھا......! ایک بات بتاؤ، پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔ وہ تو اس وقت دنیا پہ جنت کا نمونہ پیش کر رہا ہو گا، کیونکہ وہاں پر اسلامی قانون، اصول اور قواعد کے مطابق زندگی ہو گی۔‘‘ پی اون کا لہجہ طنزیہ تھا۔

’’کاش ایسا ہو سکتا، لیکن بہت سارے ایسے عناصر ہیں جو پاکستان کو جنت ارضی بننے سے روک رہے ہیں۔ باہر کی دنیا ہم پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکتی اگر اندر سے لوگ اسے قبول نہ کریں۔ وہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہیں۔ ہمارے ہاں بھی مغربی طرز زندگی کا اثر ہے، لیکن مزاحمت بھی اسی قدر ہے، ہمیں شعور کے راستے پر ابھی بہت دور تک جانا ہے۔ آغاز سفر ہے اور کئی سنگ میل راہ میں ہیں۔ یہی حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ یہاں انسان کو خود فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ لکیر کے کس جانب ہے۔‘‘ میں نے افسوس ملے لہجے میں کہا اور ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ اس وقت ہم ایک دیہاتی علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ کئی دوسرے اور ہمت سنگھ کے ہاتھی ہمارے آگے تھے۔ ہم میں خاصہ فاصلہ تھا۔ ہم گاہے بگاہے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے محوِ سفر تھے۔

’’اچھا یہ بتاؤ......! اہل مغرب کے تمام تر پروپیگنڈے کا رخ اسلامی دنیا ہی کی جانب کیوں ہے؟‘‘

’’کہا نا کہ ہمارے ہاں مزاحمت ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اہل مغرب کی پوری علمی دنیا تک کے دامن میں کچھ نہیں ہے۔ خیر......! میں تمہیں اس کا مختصر ترین تجزیہ دیتا ہوں، تم خود نتائج اخذ کر لینا۔‘‘ میں نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد بولا۔ ’’دراصل جب یورپین سائنس

دانوں کے انکشافات سامنے آنے لگے تو اہل کلیسا نے انہیں اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے کر ان سے انتہائی ظالمانہ رویہ رکھا۔ یہاں تک کہ انہیں زندہ جلانے اور ساری عمر قید کرنے کے احکامات بھی دیئے۔ سائنس دانوں کی زندگی اس معاملے کی گواہ ہے۔ مغربی سائنس دانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ انہیں بائبل سے رجوع کرنے کے باوجود اپنے خیالات وافکار کے لئے کوئی مدد نہ ملتی۔ کیونکہ بائبل ایسے موضوعات سے بحث ہی نہیں کرتی۔ اہل کلیسا یہ سمجھتے تھے کہ اگر سائنسی انداز فکر غالب آ گیا تو ان کی اہمیت وحکومت ختم ہو کر رہ جائے گی، چونکہ عیسائیت کوئی کامل مذہب نہیں تھا، اس لئے فطری طور پر سائنسی انداز فکر کی ترقی، متعصب وظالم کلیسا پر غالب آ گئی۔ تب سائنس دانوں نے کلیسا یعنی مذہب کو بری طرح رگید کر رکھ دیا۔ یہیں سے سائنس اور مذہب کا تصادم ہوا۔‘‘

’’جو آج تک جاری ہے؟‘‘ پی اون نے پوچھا۔

’’اس کا جواب میں تمہیں بعد میں دیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور پھر اپنی بات کو جاری رکھا۔ ’’مادیت پرستی کا رجحان اس قدر بڑھا کہ انسان محض مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا اور مشین کے نزدیک روحانیت، یا اخلاقیات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس کشمکش کی کوکھ سے آمریت، سرمایہ دارانہ نظام اور آمرانہ جمہوریت پیدا ہوئی، یوں مغرب کی نفسیات سے اخلاقیات کی جگہ صرف اور فقط ’’فائدہ‘‘ رہ گیا ہے۔ فائدہ سے مراد افادہ یا افادیت کہ انسان کو اس دنیا سے جو بھی فائدہ میسر آ جائے جو اس کی لذت کا باعث بنے۔ اس سے لطیف خیالات، منصفانہ رویہ، پاکیزہ خیالات وجذبات، ضمیر انسانی، عقل سلیم، دردمند دل، یہ سب مفقود ہو گیا۔ ان کے نزدیک محض افادہ ہی منزل ہے، مثلاً ایک آرٹسٹ اگر کوئی تصویر بناتا ہے تو یہ جتنی مہنگی بکے گی، اتنی اعلیٰ و اچھی تصور کی جائے گی، اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے گا کہ یہ روح کو بھی تسکین دے رہی ہے یا نہیں؟ یہ غیر فطری عمل ہے۔‘‘

’’پھر اس کا نتیجہ کیا ہے؟‘‘ پی اون نے پوچھا۔

’’لازمی بات ہے کہ افادہ کا حصول جیسے بھی ممکن ہو۔ سازش سے لیکر خون بہانے تک، دھوکہ دہی سے لیکر ہندسوں کی ہیر پھیر تک، اسی سوچ نے ان کے خاندانی نظام سے لیکر ازدواجی وفاداری تک کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جس قوم کے پاس اخلاق ہی نہیں ہے تو اس کی اپنے معاشرے پر اخلاقی نہیں، جبری گرفت ہو گی۔ وہ ہر معاملے میں زوال کا شکار ہو رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ یعنی مغربی دنیا اپنے بدترین اخلاقی ومعاشرتی زوال سے گزر رہا ہے۔ اب وہ کسی کے بارے میں جھوٹ بولیں، سازش کریں، غلط اور بیہودہ پروپیگنڈا کریں۔ قتل کریں، دہشت

گردی کریں، وہ تو اپنے بچاؤ کی فکر میں بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ اپنی نسل کشی کر چکے ہیں۔ اگر ہم یہی مادیت پرستی اپنانا چاہیں تو خدا نہیں روکے گا۔ ہم اگر خودکشی کی راہ پر جا رہے ہیں تو ہمارا اپنا ارادہ واختیار ہے اور اس کا نتیجہ ہم پا لیں گے۔'' میں نے دھیرے کہا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں دیا کہ مغرب کی کشمکش اسلامی دنیا ہی سے کیوں؟؟ پی اون نے مجھے یاد دلایا۔

''مغرب میں گزشتہ صدیوں کے سائنس دان بھی جھوٹ بولتے آ رہے ہیں۔ ان میں اخلاقی جرات ہی نہیں ہے اس معاملے کے بیش بہا ثبوت منظر عام پر آ چکے ہیں اور مزید آ رہے ہیں کہ انہوں نے مسلمان سائنس دانوں کے ابتدائی کام سے تصورات لئے، مگر اعتراف نہیں کیا۔ مثلاً گلیلیو کو دوربین کا موجود تصور کیا جاتا ہے جو 1642ء کا واقعہ ہے، جبکہ ابو اسحاق ابراہیم بن جندب 776ء میں ٹیلی سکوپ ایجاد کر چکا تھا۔ جابر بن حیان کو اب بھی کیمیا کا بابا آدم تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کا بہت سارا کام دوسروں سے منسوب ہے۔ وہ جہاں مسلمانوں کے علمی خزانے سے فیض یاب ہو رہے تھے تو دوسری جانب انہیں حریف بھی خیال کرتے تھے۔ یہ جاہلانہ رویہ ظہور اسلام ہی سے ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ نبی آخر الزماںؐ ان کی نسل سے کیوں نہیں ہوئے، حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے کی نسل سے کیوں ہوئے۔''

''کیا ایسا بھی ہوا ہے؟'' پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ایسا ہوا ہے اور یہی جاہلانہ رویہ اب تک برقرار ہے، لیکن اب وہ دور آ گیا ہے کہ ان کا اپنا ہی جاہلانہ رویہ انہیں اخلاقی لحاظ سے انتہائی تنزلی کا شکار کر چکا ہے۔ وہاں کا مشینی انسان روحانی سکون کا طلب گار ہے۔ تب عیسائیت کے تعصب اور یہودیت کی سازش نے یہاں بھی ان لوگوں کے ساتھ ظلم کیا، انہیں مسلمان دشمن بنا دیا۔ کیونکہ......! قرآن حکیم زندہ معجزہ ہے، جہاں وہ ایک جانب اخلاقی نظام کی رہنمائی کرتا ہے، روحانی مسائل کا حل ہے تو دوسری جانب مغربی سائنس دانوں کے کام پر لکیر پھیر رہا ہے۔ دن بدن جو بھی انکشافات ہو رہے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کے نتائج پہلے ہی دے دیئے گئے ہیں۔ یورپی دنیا جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے، ان کے دانشور و عقل مند اسی لئے اسلام دشمنی پر تلے ہوئے ہیں کہ اپنی قوم سمیت فنا نہ ہو جائیں۔ اس لئے پورے زور سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ دہشت گردی کا بازار گرم ہے۔ ایک وحشت ناک جانور جسے اپنی بقا کی فکر ہے، اس سے انسانیت کے

تقاضے نبھانے کے بارے میں کیا توقع کر سکتے ہیں۔''

''یہ کبھی ختم بھی ہوگا؟'' اس نے کہا۔

''اب کا یہ عمل بھی انہی کے تعصبات کے باوجود ناکام ہو گیا ہے۔ یورپین کھلے دل سے اسلام کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔ ان پر سچائی واضح ہو رہی ہے۔ ان دنوں جس قدر اسلام پھیل رہا ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک فطری سا عمل ہے کہ اچھائی کی وضاحت اچھائی ہی کرتی ہے اور برائی خود اپنا آپ ثابت کرتی ہے۔ کم از کم میں مغربی پروپیگنڈے سے خوفزدہ نہیں ہوں، کیونکہ کسی کو زہر دینے والا ہاتھ، خود بھی زہریلا ہو جاتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغرب اور اسلام کے درمیان سوچ کا فرق ہے اور اسی بنیاد پر کشمکش جاری ہے۔'' وہ بولی۔

''بنیادی چیز ہی یہی ہے۔ اسلام کے نزدیک انسانیت اور اس کی فلاح کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کی جائے، اس میں اگر افادہ ہے تو وہ اللہ ہی کی جانب سے انعام سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اصل اجر نیکی ہے، جبکہ مغربی طرز فکر مادی ترقی کے لئے انسانیت کی فلاح ہے۔ جس میں انسان محض مشین ہے، روح سے انہیں کوئی بحث نہیں۔ غیر فطری عمل ہمیشہ تباہی کا باعث بنتا ہے۔''

''تو پھر مشرقی دنیا میں یہ مغربی فکر، دولت کے حصول کے لئے مشین بن جانا، مشرقی روایات کو ختم کرنا، یہ مشرقی لوگوں کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا، جیسے میری قوم مادیت پرستی میں خودکشی کر رہی ہے۔ اپنی نسل تباہ کر رہی ہے۔ یہ تو پوری قوم کی ذمہ داری......''

''میں پوری قوم کا قائل نہیں ہوں، انفرادی طور پر اپنی سوچ کو ٹھیک کرنا ہوگا، قوم افراد سے بنتی ہے اور پھر اسلام میں فرد کے دل میں جو کچھ ہے اس سے بھی اللہ واقف ہے۔ اس کی ذرا سی کوشش بھی شمار ہوگی، نتائج پھر اسی ذات پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، جس کے قبضہ قدرت میں یہ ساری کائنات ہے۔'' میں نے کہا تو اس وقت مہاوت نے پھر سے ہاتھی کو ندی میں اتار دیا تھا، شاید وہ اب واپسی کے سفر میں تھا، ہمت سنگھ اپنے فون سے نہ صرف تصویریں لے رہا تھا، بلکہ اس نے ویڈیو بھی بنالی تھی۔ یہاں تک کہ ہم واپس اس چبوترے پر آ گئے جہاں سے گئے تھے۔ وہیں سے ہم ایک ہال میں چلے گئے، جہاں لکڑی کی بینچ اور میز پر بیٹھ کر موسمی پھل کھائے اور چائے پی۔ سبھی کے موڈ خوشگوار تھے، وہیں پر یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اب جایا جائے یا نہیں۔

''نہیں ماما......! میں نے ہاتھی شو دیکھنا ہے۔'' جیت سنگھ نے ضد کی تو ہمت سنگھ نے

میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اپنے انکل کا خیال کرو، یہ ہمارے مہمان ہیں۔''

''پھر میری چھٹی کا کیا فائدہ، اس سے اچھا تھا کہ میں سکول چلا جاتا؟'' جیت سنگھ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں اسے شو دیکھنے دیں۔'' میں نے کہا تو فیصلہ ہوگیا تو وہاں کے ماحول وغیرہ کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ہاتھی شو کا وقت ہوگیا اور ہم اس جانب بڑھ گئے۔

❀.........❀.........❀

سبھی اس وقت دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں ماہا کی شادی کے بارے میں باتیں چل رہی تھیں، جبکہ ماہا اور فہد خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہی باتوں کے دوران نجمہ پھوپھو نے احسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! میں آپ سے ایک مشورہ بھی کرنا چاہ رہی تھی۔''

''ہاں بولو!'' احسان نور نے عام سے لہجے میں کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں اپنے فہد کے لئے رقیہ بیٹی کو افضال بھائی سے مانگ لوں۔'' نجمہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے، لیکن تمہیں یہ بات اباجی سے کرنا ہوگی، مگر اس سے پہلے کیا تم نے دونوں بچوں کی رضامندی معلوم کی ہے؟'' احسان نے فہد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ آپ پوچھ لیں، جبکہ رقیہ کا یہی کہنا ہے کہ جو اس کے والدین کی مرضی ہوگی، وہ اسی میں خوش ہے۔''

''ہاں بڑی پیاری بچی ہے......'' ذکیہ بیگم نے اپنی رائے دی تو احسان نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے نجمہ کی جانب دیکھا۔

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا......'' اس نے نجمہ سے پوچھا تو اس سے پہلے وہ جواب دیتی ماہا نے کہا۔

''پاپا......! پھوپھو نے یہ میرے ذمے لگایا تھا، میں نے اس سے یہ پوچھا ہے، اس نے یہی کہا ہے''

''الطاف بھائی کیا چاہتے ہیں۔'' احسان نے پوری بات معلوم کرنا چاہی۔

''میں یہ بات انہی کی رضامندی سے کر رہی ہوں، ورنہ میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا

سکتی۔'' نجمہ نے صاف انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر اباجی سے بات کرلو۔'' احسان نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''نہیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ ہی میری طرف سے بات کریں، پھر میں الطاف کے ساتھ آکر باقاعدہ منگنی کرکے جاؤں گی۔'' نجمہ نے ذرا سے جوش کے ساتھ کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ اس میں کوئی نہ ماننے والی بات ہے، فہد گھر کا بیٹا ہے اور رقیہ بھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا، ٹھیک ہے، میں نے چند دن بعد گلاب نگر جانا ہے، میں ان سے بات کرلوں گا یا پھر ہم اکٹھے ہی بات کرلیں گے۔''

''نہیں اب تو میں وہاں سے آگئی ہوں، کل واپس لاہور چلی جاؤں گی، آپ مجھے فون پر بتادیں گے تو پھر بلال کی شادی پر حتمی بات ہو جائے گی، یہ کیسا رہے گا؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، ظاہر ہے اتنا بڑا فیصلہ فوراً ہی تو نہیں ہو جاتا اور یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے کہ بچوں کی رائے معلوم کرلی، یہ بہت ضروری ہے۔'' احسان نور نے کہا۔

''جیسے اپنی ماہا اور بلال کا معاملہ ہے۔ ان دونوں کی رائے ہی سے یہ بات آگے بڑھی تھی۔'' ذکیہ بیگم نے وضاحت کی پھر تھوڑی دیر مزید باتوں کے بعد وہ سب آرام کے لئے اٹھ گئے۔

فہد اپنی ماں کے ساتھ ہی اس کے کمرے تک گیا، جہاں تنہائی پاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

''ماما......! یہ آپ نے کونسی بات شروع کردی ہوئی ہے۔ میں نے رقیہ سے شادی نہیں کرنی۔''

''خاموش......! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' نجمہ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں وہ بات بھی نہ کہہ سکوں جو مجھے پسند نہیں ہے۔'' وہ دبے دبے لہجے میں احتجاجاً بولا۔

''دیکھو بیٹے......! اس طرح رقیہ کے بارے میں بات کرنے کے کئی مقصد ہیں۔ ماہا سے تمہاری شادی ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو طے ہے ناکہ تم نے یہاں آنا ہے اور یہیں سے سیاست شروع کرنی ہے۔ اس لئے رقیہ کے ساتھ شادی بہت ضروری ہے۔ میں اپنے بیٹے کو یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ میں نے تو کبھی ماہا کو مانگا ہی نہیں تھا۔ ہاں سوچا ضرور تھا۔ لیکن اب میری خواہش یہی ہے کہ میں اپنے میکے کے ساتھ جڑی رہوں۔ اگر کل کو بلال اور ماہا کے درمیان اختلاف ہوتے ہیں تو بلال کی جگہ تمہارا نام ہے۔'' نجمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت لمبا راستہ ہے، اس میں اس وقت ہی کامیابی کا امکان ہے جب بلال کے دل میں ماہا کا خیال نہ رہے اور یہ بہت زیادہ حد تک ناممکن ہے۔" فہد نے اسے سمجھایا۔

"تم اب تک کیا کرتے رہے ہو؟ تم نے ہی تو...... خیر" اس نے کہا اور پھر لمحہ بھر بعد بولی "اگر ماہا ہی اسے اپنے دل سے نکال دے تو...... تم نے اس کے قریب ہو کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس نے اپنے دل کا حال تمہیں بتایا ہے۔ وہ ذہنی طور پر بلال سے متنفر ہو چکی ہے۔ بس چند ثبوت چاہئیں۔"

"کیسے ثبوت؟" فہد چونکا۔

"ماہا بہت گہری ہے، ویسے میں ابھی اسے پوری طرح نہیں سمجھ سکی ہوں۔ پتہ نہیں یہ اس کا وقتی اشتعال ہے یا وہ واقعتاً ذہنی طور پر بلال سے متنفر ہو گئی ہے، اس کی تصدیق مجھے اس لئے نہیں ہو سکی کہ اس نے وجہ نہیں بتائی، لیکن اتنا میں معلوم کر چکی ہوں کہ وہ اسے جھوٹا سمجھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ باتیں اسے بتائیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب منزل پانے کے لئے مجھے بہت زیادہ چوکنا ہونا پڑے گا۔" فہد خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"اس کے جھوٹا ہونے کے ثبوت اگر اسے مل جائیں تو میرا انہیں خیال کہ وہ ذہنی طور پر اس شادی کے لئے تیار ہو گی، اور دوسری بات، کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ یہ شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جائے تو پھر میں سب سنبھال لوں گی، بہت کم وقت ہے یہ......" نجمہ انتہائی افسوس کے ساتھ بولی۔

"وہ ٹھیک ہے، میں اسے دیکھ لوں گا، لیکن آپ یہ رقیہ والی بات کو ابھی اتنا زیادہ مت کریں۔ بس بہت ہو چکا، کہیں وہ گلے ہی نہ پڑ جائے۔" فہد نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ میں نے جتنی بات کرنی تھی کر لی، اب سارا دھیان صرف اور صرف اس معاملے پر دینا ہو گا کہ جو تھوڑی بہت نفرت ماہا کے دل میں بلال کے لئے ہے، اسے بہت زیادہ کرنا ہے۔ اتنا کہ وہ کوئی تعلق رکھنے کے بارے میں نہ سوچے۔" نجمہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ تب فہد نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

"اس کے لئے تو کوئی ایسا کام کرنا ہو گا، جس میں اگرچہ رسک بھی ہو گا، لیکن نفرت بہر حال ہو جائے گی۔"

"کیا کرو گے تم؟" نجمہ نے پوچھا، اس کے لہجے میں خاصی بد دلی تھی۔

"میں نے فی الحال کچھ نہیں سوچا، لیکن میں کر لوں گا" اس نے پر خیال لہجے میں کہا اور پھر چونکتے ہوئے بولا۔ "لیکن ماما کیا آپ کو ان دنوں میں یہاں نہیں رہنا چاہئے؟" فہد نے پوچھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے یہاں رہنے کا، بس ماہا سے رابطہ چاہئے، وہ میں فون پر رکھوں گی اور جہاں تک ہو سکا اسے اپنی راہ پر لے آؤں گی۔ محض تین ہفتے...... کاش کہیں تھوڑا سا زیادہ وقت ہوتا تو میں سارا معاملہ۔۔۔۔!" نجمہ کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی، جس سے فہد کو یہ احساس ہو گیا کہ بلاشبہ شادی ملتوی ہو جانے پر ہی سارا معاملہ سیدھا ہو سکتا ہے۔ وہ اسی لمحے سے یہی سوچنے لگا۔

اس کے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ وہ بلال کے اس جھوٹ کو ماہا کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ بلال سے متنفر ہو جائے، فی الوقت اس کے ذہن میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا، لیکن ایک موہوم سی امید کے سہارے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا کہ ماہا نے خود اس سے اس سارے معاملے کی تحقیق کرنے کے لئے کہا تھا۔ ماہا نے اس پر بھروسہ کیا تھا اور وہ اسی بھروسے کو پوری طرح اپنا مطلب نکالنے کے لئے استعمال کر لینا چاہتا تھا۔ اس کی ماما کی یہ بات بالکل ٹھیک تھی کہ اب انہیں زیادہ وقت یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ سارے خاندان میں ان کا تاثر بہت اچھا تھا۔ اگر یہ جائیداد والا معاملہ درمیان میں نہ ہوتا تو شاید ماما کبھی بھی اس کی مدد کے لئے تیار نہ ہوتی، جبکہ اس کے لئے تو ماہا ایک ایسا جذباتی معاملہ تھا؟ جس کے لئے اب وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ ماہا کو ہر حال میں حاصل کر لینا چاہتا تھا اور اب جبکہ منزل اتنی دور نہیں تھی، وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے پوری کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس کے لئے چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔

❁......❁......❁

ہاتھی گاؤں سے واپسی پر ہم ویگن کے ذریعے پتایا بس ٹرمینل پر آئے اور پھر سہ پہر کے وقت ہم واپس گھر پہنچے۔ ہم سبھی تھک چکے تھے۔ سب فریش ہو چکے تو جندکور نے کھانا لگا دیا۔ ہم کھانا کھا چکے تو میں نے ڈرائنگ روم میں تنہائی پاتے ہی پی اون سے کہا۔

"تمہیں احساس ہے کہ میری میں آج آخری شام ہے۔"

"ہاں......! اور میں چاہتی ہوں کہ آج کی شام کو بہت یادگار بنایا جائے۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ساری رات جاگ کر، وہ تم یہاں اس گھر میں میرے ساتھ جاگو یا پھر پتایا شہر

میں کہیں بھی۔'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ لہجہ بہت حد تک جذباتی تھا۔

''جیسا تم چاہو، میں تمہارے ساتھ ساری رات جاگوں گا'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

''تم نے صبح جانا ہے، ساری رات باہر گزارنے میں رسک بھی ہے۔ یہیں اس گھر میں رات گزارتے ہیں۔'' پی اون نے کہا تو میں اس کے جذباتی پن پر تھوڑا حیران ہوا۔ اس کے اندر پھر وہی بات عود کر تو نہیں آ رہی کہ میں اس کے بدن کو مسلسل نظر انداز کر رہا ہوں۔ میں نے اس بابت اس سے کچھ نہیں کہا۔ ہم میں خاموشی چھا گئی، شاید ہماری باتیں کسی اور جانب رخ اختیار کرتیں۔ جندکور اور ہمت سنگھ ڈرائنگ روم میں آئے اور ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بلال بھاء جی...... صبح کا پروگرام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا تو میں نے بلا جھجک کہا۔

''چونکہ یہ میری پٹایا میں آخری شام ہے، اس لئے میں پی اون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہوں گا۔ اگر ساری رات جاگتے رہے تو صبح دیر سے آنکھ کھلے گی۔ پھر میں تیار ہو کر بنکاک چلا جاؤں گا۔''

''میں آپ کو بنکاک......''

''نہیں......'' ہمت سنگھ میں نے تمہارا بہت زیادہ وقت لیا ہے اور تم مہمان نوازی میں بہت زیادہ وقت دے چکے ہو۔ تم مجھے یہیں سے سی آف کر کے اپنے کام پر چلے جانا، اس میں تو پورا دن لگ جائے گا۔'' میں نے صاف لفظوں میں اسے سمجھایا۔

''تو پھر کیا ہوا بھاء جی! میں آپ کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا۔

''تم میرے لئے کیا، کیا ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ باقی تم صرف اتنا کرنا کہ پاکستان آنے کا پروگرام بنا لینا۔ مجھے بہت خوشی ہوگی کہ تم سب آؤ گے۔'' میں نے جندکور کی جانب دیکھ کر کہا تو بڑے جوش سے بولی۔

''ہم آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بولی، ''آپ نے ویر جی کوئی شاپنگ نہیں کرنی؟''

''نہیں......!'' مجھے کوئی شاپنگ نہیں کرنی۔'' میں حتمی انداز میں کہا تو وہ بولی۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ گیا۔

''اب آپ آرام کریں۔'' میں کھڑے ہو کر کہا۔

''میرے اٹھتے ہی پی اون بھی اٹھ گئی اور ہم اوپر اس کمرے میں آ گئے جہاں میں

سویا تھا۔ میں بیڈ پر آ بیٹھا تو پی اون بھی میرے سامنے آ بیٹھی اور خوشگوار موڈ میں بولی۔

''تم نے یہاں اتنے دن گزارے لیکن بہت سی ایسی جگہیں تھیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔''

''ان میں کوئی بھی تاریخی جگہ نہیں تھی، یہ سب چند برسوں میں بنائی گئیں ہیں۔ صرف سیاحوں کی کشش کے لئے۔ ان میں محض ایک جگہ ایسی ہے جو دیکھنے کے قابل تھی اور وہ پل ہے جو جنگ عظیم دوئم میں اپنی اہمیت بنا پایا تھا، وہ چونکہ یہاں سے دور ہے اسی لئے وہاں نہ جا سکا اور پھر پی اون، میرا مقصد فقط تم سے ملنا تھا، تم سے باتیں کرنا تھا، اس لئے مجھے ان جگہوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔''

''کم از کم تھائی ثقافت کو تو سمجھنے کی کوشش کرتے۔'' اس نے کہا۔

''ابھی مجھے اس کی ضرورت نہیں، جب ہوگی تو میں ضرور اسے سمجھوں گا، تم آؤ نا پاکستان، وہاں بدھ مت کے بنیادی آثار موجود ہیں، وہاں ایسی تاریخ ہے جو صدیوں پرانی ہے۔'' میں نے اسے دعوت دی۔

''ہاں کبھی آؤں گی۔'' اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی!''ہم نے اپنے بارے میں اتنی باتیں نہیں کیں جتنا ہم نے مذہب پر کیں ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اسلام اور اپنی ذات دو مختلف چیزیں ہیں، کیونکہ اسلام فقط ذات ہی سے بحث کرتا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی سے لیکر اجتماعی زندگی تک۔''

''اچھا...... مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، اسلام نے اصول، ضوابط اور قانون و قاعدے دے دیئے۔ اس کا نتیجہ اسے آخرت میں ملنے والا ہے جو ابھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ یہاں پر اس دنیا میں وہ کیا شے ہے جو ان سارے اصولوں کو انسان اپنی ذات پر لاگو کر لے، وہ قوت کیا ہے؟'' پی اون نے بہت مشکل سے اپنی بات سمجھانا چاہی جو میں سمجھ گیا۔

''تعلق......! انسان کا خدا سے تعلق کیسا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک انسان اگر خدا کے وجود کا انکار کر رہا ہے تو وہ بھی اپنا تعلق ثابت کر رہا ہے، لیکن جو خدا کی ہستی کو مان لیتا ہے تو پھر اس کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتا ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہے کہ انسان یہ چاہتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ اس کا احترام کیا جائے، وہ پرسکون زندگی گزارے اور کسی ایسی طاقتور ہستی کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہو جائے جو اس کی نہ صرف ضروریات کا خیال رکھے بلکہ ان کے مصائب بھی دور کر دے۔ اسلام کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ انسان جیسے ہی اللہ کی ذات کا اقرار کرتا ہے تو اس کا تعلق اللہ سے جڑ جاتا ہے تو پھر اللہ بھی انسان کو اس کی اپنی ذات جانب متوجہ کرتا ہے۔ انسان کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اس کا اس

کائنات میں کیا درجہ ہے۔ اللہ سے رابطے اور تعلق کے بعد مسلمان کا رخ کائنات اور خود اس کی اپنی ذات کی جانب موڑ دیا جاتا ہے، تاکہ وہ تخلیق پر غور کر سکے۔ انسان اگر اس جانب ملتفت ہو گیا تو گویا تعلق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب انسان بھٹی میں چلا جاتا ہے جہاں اس کا کندن بنانا مقصود ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک لمحے کو سانس لیا اور پھر کہا۔

''اب رہی وہ قوت جو اس تعلق باہم کو بڑھاتی ہے اور مزید اضافے کا باعث بنتی ہے اور جس سے انسان وہ سارے اصول، قانون، قاعدے اور ضوابط خود پر لاگو کرتا چلا جاتا ہے، وہ ہے عشق......! عشق ہی وہ قوت ہے جو انسان کے ارتقاء کا باعث بنتی ہے۔''

''یہ میں نے تم سے پہلے بھی سنا ہے، عشق کیسے ہو جاتا ہے۔'' پی اون نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو......! تم اور میں ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ ہم میں شناسائی ہوئی، تو ایک خاص طرح کا تصور ہم دونوں کے پاس آ گیا۔ ظاہر ہے ہمارے تعلق میں کوئی تھوڑی بہت دلچسپی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آج ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک ان دیکھی دنیا سے حقیقت کی دنیا تک کے سفر میں کیا تھا۔ کوئی نہ کوئی قوت تو تھی، اس کا کوئی بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارا تعلق محو سفر ہو کر آگے ہی آگے بڑھ سکتا ہے، جہاں کہیں دونوں اطراف میں سے رکاوٹ آئی، وہیں یہ قوت بھی دم توڑ جائے گی، اسی طرح انسان کا اللہ سے تعلق باہم ہے اور اس کی نوعیت خالق اور مخلوق کی ہے، اب مخلوق جس قدر اپنے خالق کے احکامات مانتی چلی جائے گی، اس کے وضع کردہ نظام میں خود کو داخل کرے گا، اس قدر اس پر انعامات ہوتے چلے جاتے ہیں۔''

''ابھی تم نے کہا کہ جو خدا کو نہیں مانتا وہ بھی ایک طرح سے خدا کے وجود کا اقرار کر رہا ہوتا ہے، وہ کیسے؟'' پی اون نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''کسی بھی شے کے انکار کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ ہے لیکن میں اسے نہیں مانتا، گویا وہ کسی نہ کسی طرح سے ثابت ہو رہی ہو۔ دیکھو......! انسان میں اس قدر صلاحیتیں ہیں کہ اگر اللہ کے وجود کا انکار بھی کر دے تو بھی وہ اپنی حیثیت منواتا ہے۔ پوری دنیا میں تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے لوگوں نے بھی محیر العقول واقعات سے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا، کیونکہ خالق کی یہ تخلیق کوئی معمولی شے نہیں ہے، وہ اپنی ذات کا اظہار کرنے پر مجبور ہے۔ وہ یہ نہ بھی سمجھے کہ اس کی تخلیق کس نے کی ہے، لیکن پھر بھی وہ اپنی محنت سے عطا کی صلاحیتوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ ایک طرح سے وہ تعلق قائم کئے ہوئے ہے کہ وہ عطا کی

صلاحیتوں کو آزما رہا ہے۔ مگر وہ رابطہ، وہ تعلق باہم جو اس استعداد کو بڑھاتا ہے اس سے محروم ہے۔ کیونکہ اس تعلق کا اصول یہ ہے کہ مخلوق جب طلب کرتی ہے تو خالق مزید عطا کرتا ہے۔ شرط طلب کی ہے، پھر خالق اس طلب پوری کرنے کے سارے اسباب فراہم کر دیتا ہے۔'' میں نے دھیرے دھیرے سمجھایا۔

''کیا انسان کا اپنے آپ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی اس دنیا میں فساد ہے۔ قوم ایک دوسری کو جنگ کے ذریعے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔'' پی اون نے پوچھا۔

''ہر ذی روح امن چاہتا ہے، لیکن جب وہ اس دنیا میں آتا ہے تو یہاں کی مادی زندگی میں خواہشات کے زیر اثر اپنی انانیت میں آ جاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس لئے اللہ پاک نے انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے اپنے خاص بندوں کو چنا اور ان کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کی۔ یہیں سے حق و باطل کی تمیز ہوئی۔ اہل حق نے ہمیشہ عدل و انصاف کے ذریعے معاشرہ میں امن قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن اہل باطل اپنے ہی نظریات کو برتر ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے اصول تراش کر دوسروں کی حق تلفی کرتے کہ ان کا کوئی جواب ہی نہیں ہوتا تھا۔ انہی اصولوں کو اہل غرض و ہوس نے مذہب کا لبادہ اوڑھا دیا اور معاشرے کو اپنے طور پر پر سکون رکھنے کی کوشش کرتے رہے، مگر فطرت اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ جو اصول غیر فطری ہوں گے تو ان کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے، ان سے امن کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ یہی عمل فساد کی وجہ ہے۔'' میں نے اس کا جواب دیا اور پھر پہلو بدل کر دیوار سے ٹیک لگالی۔

''وہ لوگ جو خدا کا انکار کر رہے ہوتے ہیں؟ انہیں کہاں سے مدد مل جاتی ہے؟ آخر وہ بھی تو لوگوں پر برتری ثابت کرتے ہیں؟'' پی اون نے بہت سوچ کر سوال کیا۔

''میں یہاں کسی بھی مذہب کی بات نہیں کر رہا، محض انسان کی بات کر رہا ہوں۔ انسان اللہ کی بہترین تخلیق ہے۔ وہ لاشعوری طور پر جب اس کائنات سے ربط پیدا کرتا ہے۔ یا اپنے ہی اندر کی صلاحیتوں سے کام لے رہا ہوتا ہے تو دراصل وہ اللہ کے بنائے ہوئے نظام میں اپنا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ وہ جب قتل و غارت نہیں کرے گا۔ خون نہیں بہائے گا، اللہ کی مخلوق کو تنگ نہیں کرے گا تو اس کے اہل باطل ہونے کا ثبوت کیسے فراہم ہو گا، وہ اپنے اندر کی قوت کو استعمال میں لاتا ہے جو بہ[illegible]ں اللہ کی دی ہوتی ہے تو اس کی ایک حد ہے پھر اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا، چونکہ یہ مادی دنیا اس کے لئے تسخیر کر دی گئی ہوتی ہے، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہی اس کا امتحان ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ جو اللہ کی رہنمائی سے مستفید

ہوتے ہیں اور وہ اسی رہنمائی میں اپنا اظہار کرتے ہیں تو وہ اہل حق میں سے ہوتے ہیں۔ ان کے وجود سے حق ظاہر ہوتا ہے اور اللہ سے تعلق باہم میں اس کی نہ صرف استعداد کار بڑھتی ہے بلکہ انسان کی رسائیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ محض فلسفہ نہیں، ہر انسان اس کا انفرادی طور پر بھی تجربہ کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی

''دراصل یہ انسان کی خواہشات ہیں جو اس میں ہر طرح کی قوت و صلاحیت میں اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ انسانی خواہشات ہی تو ہیں جو نظریات کا روپ دھارتی ہیں۔ انہی خواہشات کی تکمیل میں انسان کو خوشی ملتی ہے۔ کیا مذہب انسان پر اپنا تسلط جما کر اس کی خوشیوں میں رکاوٹ ثابت نہیں ہو رہا ہے، جبکہ انسانی خواہشات نے ہی اسے غاروں کی زندگی سے نکال کر اس جدید دور تک پہنچایا۔ ایک شے سے مجھے خوشی ملتی ہے، لیکن مذہب روک دیتا ہے۔'' پی اون نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا۔

''میں تمہارے نکتہ نظر کی تردید نہیں کرتا، لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کیا انسان میں خواہشات کا کوئی انت ہے، کوئی حد ہے؟''۔

''نہیں، بلکہ اس کا لامحدود ہونا ہی فطری حسن ہے، بلکہ خوشی نام ہی خواہشات کی تکمیل کا ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے یا میری خوشی اس میں ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں، کیا یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو پی اون خوفزدہ سی ہو کر چونک گئی لیکن خاموش رہی۔ تب میں نے کہا ''جس طرح انسان میں لامحدود خواہشات ہیں، اس طرح اس کی خوشی کا انت نہیں ہے۔ اگر خواہش بالکل نہ رہے تو دائمی خوشی میسر آتی ہے۔ بعض اوقات خواہشات کے ساتھ خوشی میں ہی غم کا پہلو بھی در آتا ہے۔ مثلاً میں کار ڈرائیونگ میں خوشی محسوس کرتا ہوں لیکن اگر حادثہ ہو جائے تو......''

''تمہارے خیال میں اس فطری تقاضے کا پھر حل کیا ہو گا، وہی جو لوگ کرتے ہیں، اپنے آپ پر ضبط'' وہ بولی۔

''دراصل تم خوشی کی خواہشات کے ساتھ منسلک کر کے اس کو محدود کر چکی ہو، کیونکہ خوشی کا انحصار ان آلات پر ہوتا ہے جن کی مدد سے خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے خوشی حاصل کی جائے۔ اگر سامان عیش نہیں ہے تو پھر کہاں کی خواہش اور کہاں کی خوشی۔ میں مانتا ہوں کہ خواہشات کو ختم کرنا آسان نہیں ہے، لیکن انہیں اپنے تابع ضرور کیا جا سکتا ہے اور دوسری بات خوشی کے تمام تر سوتے ہمارے اندر سے پھوٹتے ہیں اور حقیقی یا دائمی مسرت ہمارے اندر

ہی موجود ہے۔ باقی رہی بات ضبط کی، تو یہ ضبط بھی اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اگر انسان کے خیال میں پختگی ہو۔'' میں نے بڑے نرم انداز میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ضبط بھی تو خیال ہی سے آئے گا'' اس نے کہا۔

''دیکھو......! اسلام نے مسلمان کو رہبانیت کا درس نہیں دیا بلکہ اسے ناپسند اس لئے کیا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنے معاشرے سے کٹ کر رہے۔ انسان کی سطح پر تعلق نبھانا بھی تو عین فطرت ہے۔ اس میں اگر جذبات آ جائیں تو بھی فطری ہیں۔ اب وہ خواہشات جو بنی نوع انسان یا تعلق انسانی کے لئے مضر ہیں، ان کی اہمیت صفر ہو جاتی ہے تو انسان کو خوشی ملتی ہے کہ اس نے اللہ سے تعلق کے لئے ان خواہشات کو چھوڑ دیا۔ کسی شے کو جبر سے روکنا اور بے اہمیت کر کے چھوڑ دینے میں بڑا فرق ہے۔ یہ سارا کمال فقط خیال کا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''یہ خیال کیا ہے؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

''انسان کے اندر کی دنیا، جسے نفس، من یا اس کی ذاتی شخصیت کہا جاتا ہے۔ جہاں سے ہمیں انسان کے اندر عالم افکار کا پتہ ملتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں کہ ہمارے حواس خمسہ تمام اطلاعات لے کر ذہن کے ایوان میں لاتی ہیں تو وہاں پر ایک تصویر بن جاتی ہے، وہ تصویر بننا ہی دراصل خیال ہے۔ ہر شے سے تعلق ہمارے خیال ہی کا ہے، جس چیز کے ساتھ خیال منسلک ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ہمارا تعلق بھی جڑ جاتا ہے۔ اس میں زمانے یا فاصلے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خیال جس قدر بلند ہو گا، انسان بھی اسی قدر بلند ہوتا جائے گا، میں اگر اس دنیا کی سپر پاور کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ میرے اندر آ موجود ہوتی ہے اور اسی طرح جب میں اللہ سے متعلق خیال کرتا ہوں تو اللہ میرے من میں موجود ہوتا ہے، میرا رابطہ، تعلق اسی سے جڑ جاتا ہے۔''

''ہم خواہشات کو کیسے الگ الگ کر سکتے ہیں، انہیں کیسے روک سکتے ہیں، انسان اپنی فطرت سے کیسے باز آ سکتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے نا۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں دوسروں کی نہیں فقط اسلام کے بارے میں بات کروں گا۔ اصل میں اللہ نے ہر انسان کی رہنمائی کے لئے تھیوری دی تو اس کے ساتھ پریکٹیکل بھی دے دیا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ، اللہ کی جانب سے معبوث کئے گئے تو اللہ کے تمام تر احکامات پر خود عمل کر کے دکھایا، تاکہ جو بھی اس کے ماننے والے ہیں، سرکارِ عالم کی ذات بابرکات کو دیکھیں، کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ اگرچہ نبوت کا منصب صرف اور صرف اللہ کی عطا ہے۔ مگر اس شخصیت کی اتباع کو لازمی قرار دیا گیا کہ میری اطاعت ہی دراصل رحمت العالمینؐ کی

اطاعت ہے۔ یہ ہے کہ دنیاوی انعام محض نبی رحمتؐ کی اتباع ہی سے انسان شرف انسانیت تک جا پہنچتا ہے۔ ویسے جو مقام رحمت العالمین، نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ کا ہے، تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔ کسی بھی ہستی کی حقیقی پہچان کے لئے اس کے مقام تک رسائی انتہائی ضروری ہوتی ہے، ورنہ پہچان کا مقصد ہی نہیں رہتا۔ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک آپ حضرت محمدؐ کی ذات اقدس کے بارے میں صحیح ادراک نہیں رکھتے، اس وقت تک اللہ کی ذات کا عرفان بھی لاحاصل ہے۔ سیرت نبویؐ ہی وہ واحد راستہ ہے، جس سے ذات خداوندی کا ادراک ممکن ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب دو چیزوں کو جوڑا جاتا ہے تو پہلے انہیں اچھی طرح صاف کرلیا جاتا ہے۔ اب عرفان چاہے اپنی ذات کا ہو یا ذات حق کا، ان میں بڑی خطرناک رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں۔ من کے اندر موجود سارے منفی جذبوں کو بے اہمیت کرنا پڑتا ہے۔ کثافت دور کرنا پڑتی ہے۔ جب کوئی بھی انسان رحمت العالمینؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنا شروع کرے گا، تو اس سے دو باتیں سامنے آئیں گی، پہلی بات تو یہ کہ یہ طریقہ اس کی اپنی زندگی کے لئے کس قدر فائدہ مند ہے۔ اسے ہم مادی پہلو کہہ لیں، دوسری بات یہ کہ یہ عمل اسے اللہ سے کس قدر نزدیک کررہا ہے، یہ اس کا روحانی پہلو ہے۔ جب انسان اپنی سرشت وفطرت کے مطابق نفع دیکھتا ہے تو محبت کا گراف اپنے اندر بڑھتا ہوا پاتا ہے، یہاں تک کہ پھر سب کچھ ماسوا ہو جاتا ہے اور وہاں پر فقط عشق رہ جاتا ہے۔ تم خواہشات کی بات کرتی ہو، عشق میں تو اپنا آپ وارنا عین سعادت سمجھا جاتا ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ عشق کی قوت ہے جو انسان کی خواہشات کو ختم کردیتی ہیں۔'' پی اون نے اپنے طور پر سمجھ کر کہا۔

''بالکل......! انسان کو کسی بھی شے سے عشق ہوسکتا ہے۔ ہاں عشق کے لئے کوئی صورت یا ہدف ضرور چاہئے ہوتا ہے۔ اب انسان پر منحصر ہے کہ اسے کس طرح کی صورت یا ہدف سے عشق ہوتا ہے۔ کیا وہ صورت اسے اعلیٰ ترین مقامات تک رسائی کا باعث بنتی ہے یا اسے گھٹیا بنا دیتی ہے کہ زمین پر رینگنے والا کیڑا بن جائے۔ فنا ہو جانے والے شے سے عشق انسان کو بھی فنا کردیتا ہے، جبکہ ہردم رہنے والی ذات سے عشق انسان کو بھی بقائے دوام دیتا ہے۔ اعلیٰ ترین شے کیا ہے اس کا تعین تم خود کرسکتی ہو کہ قدرت نے تمہیں بھی عقل سے نوازا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ پھر اس نے کلاک پر نگاہ ڈالی، رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی، تب اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو اب سو جاؤ، صبح تم نے جانا بھی ہے۔ آج بھی تم بہت تھک گئے ہوگے۔''

''نہیں......! اگر تم چاہو تو میں ساری رات یونہی باتیں کرسکتا ہوں۔'' میں نے صدق دل سے کہا۔

''سو جاؤ'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ کر لائٹ آف کردی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا تھا، پوری طرح اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ شاید کہیں سے روشنی آرہی تھی۔ میں جو لیٹا تو پھر مجھے خبر نہ رہی۔ پی اون نے نجانے کب سوئی تھی، اس کا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔

❀......❀......❀

صبح کے وقت گلاب نگر میں اگرچہ ہوا بہت خوشگوار چل رہی تھی، لیکن نور الٰہی کے لئے اس موسم کی تازگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے من کا موسم خوشگوار نہیں تھا۔ جب سے ماہا نے بلال کے بارے میں اسے بتایا تھا وہ اپنی ذات میں سوچوں کا محور بن کر رہ گیا تھا۔ ماہا نے جس انداز سے ایک ایک لفظ کہا تھا، اس کے لہجے کی شدت اس کے کانوں میں ویسے ہی گونج رہی تھی۔ دو دن ہوئے تھے، وہ یہی سوچے جا رہا تھا کہ اگر بلال کے بارے میں ماہا کا خوف درست ثابت ہوا تو کیا ہوگا؟ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں وقت بھی آسکتا ہے، جب اسے اپنے بکھرتے ہوئے خاندان کو بچانا پڑے گا؟

نور الٰہی اس دن اخبار بھی نہیں پڑھ رہا تھا، بلکہ وہ میز پر یونہی دھری ہوئی تھی۔ ناشتہ بھی یونہی بس واجبی سا کیا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں بڑا وحشت ناک سا تصور لئے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بیٹوں میں احسان نور پہلے تعلیم کی غرض سے اور پھر ملازمت کے باعث اس سے دور رہا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ ہی سے بڑا باادب، فرض شناس اور احترام کرنے والا تھا، لیکن ایک خلا بہرحال ان کے درمیان موجود رہا تھا۔ باہر کی دنیا میں رہ کر بہت سارے معاملات میں اس کا ذہن ان سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک واضح فرق کے باعث اس کا انداز زندگی الگ ہی رہا۔ اس کے برعکس افضال نور نے ہمیشہ اپنے باپ کی تابعداری کی تھی۔ بہت سارے اختلافات کے باوجود اس نے ہمیشہ اسی کے حکم کو فوقیت دی تھی۔ دونوں بھائیوں میں اگر کبھی کوئی تنازع نہیں بنا تھا تو وہ اس کی اپنی ذات تھی، جس نے کبھی کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ ہر معاملے میں افہام وتفہیم کے علاوہ ہمیشہ انصاف کو مدنظر رکھا تھا۔ پھر اس کے دونوں بیٹوں نے بھی اس کے احکام سے روگردانی نہیں کی تھی۔ ان دونوں بھائیوں میں اگر کبھی تنازع کی کیفیت اگر نہیں آتی تھی تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ آپس میں شیر وشکر ہیں۔ احسان نور اگر شہر کے علمی حلقے میں اپنی پہچان رکھتا تھا تو افضال نور اپنے علاقے میں ایک بھرپور سیاسی قد کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ ان کے درمیان کچھ ایسا کوئی مسئلہ درپیش ہی نہیں ہوا تھا کہ جس سے کوئی

باہمی تنازعے والا معاملہ بنتا۔ ابھی وہ موجود تھا اور دونوں بیٹوں کے درمیان پل کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جو بھی کہہ دیتا اس کے دونوں بیٹے اس کی ہر بات مانتے تھے۔

بلال اور ماہا کے رشتہ بارے اس نے بہت سوچا تھا۔ اس کے نزدیک بلال نے اپنا آپ بہت اچھا ثابت کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق تعلیم حاصل کی اور پھر اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس نے جتنی محبت بلال سے کی تھی اس سے بڑھ کر بلال نے ردعمل ظاہر کیا تھا۔ وہ سارے خواب جو اس کے اور اس کی اولاد کے بارے میں تشنہ رہ گئے تھے، وہ بلال نے پورے کیے تھے۔ اس نے شروع دن ہی سے بلال اور ماہا کے درمیان بڑھتی ہوئی محبت کو بھانپ لیا تھا۔ اسی وجہ سے نور الٰہی کے دل میں یہ بات آئی کہ کیوں نا اپنے پوتے اور پوتی کے باعث خاندان کو ایسی خوبصورت ریشمی ڈوری سے باندھ دیا جائے کہ ان کا شیرازہ نہ بکھرے۔ اس سوچ کے پس منظر میں وہی روایتی آرزو تھی کہ ان کی خاندانی جائیداد کہیں باہر نہ جائے، گھر کی گھر ہی میں رہے۔ یوں وہ دونوں بھائیوں کو باہم ملتے رہنے پر آمادہ کر کے یہ رشتہ طے کروا چکا تھا، جس سے وہ بہت خوش تھا۔

نور الٰہی کے لئے ایسی صورت حال پاگل کر دینے کے مترادف تھی کہ شادی ہو جانے سے تھوڑے دن قبل ماہا نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی تھی اور وہ بھی بڑے نفرت انگیز انداز میں۔ اسے کبھی کبھی یہ خیال ڈرا دیتا تھا کہ بلال تعلیم حاصل کر رہا ہے اور اس دوران ممکن ہے اس کا ذہن کسی اور کی جانب مائل ہو جائے یا پھر جب اس نے سرکاری عہدہ سنبھالا تھا اور آفیسر کے طور پر اپنا وسیع حلقہ رکھتا تھا، ممکن ہے اسے وہاں سے کوئی پسند آ جائے اور جو اس نے سوچا تھا، وہ سب خواب بن کر بکھر جائے، لیکن بلال کی جانب سے اسے کوئی ایسا معاملہ دکھائی نہیں دیا، لیکن ماہا.....؟ اس کی نور الٰہی کو قطعاً سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ اس قدر کیوں متنفر ہو گئی ہے؟ ایسی صورت حال میں اگر یہ شادی نہیں ہو پاتی تو صورتحال نارمل نہیں رہے گی۔ دونوں بھائیوں میں کشیدگی اس قدر بڑھ جانے کا امکان تھا کہ ممکن ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں اور پھر دوبارہ ان میں میل ملاقات بھی نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی جائیداد کا بٹوارہ لازمی تھا۔ کوئی ایک بھی اس کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اسے احسان نور سے زیادہ خوف آتا تھا، جس سے اس کی پوری طرح ہم آہنگی نہیں تھی۔ افضال تو پھر بھی اس کی بات مان جائے گا۔

اس کے ذہن میں جو خوفناک تصور بیٹھ گیا تھا وہ خود ہی اس سے دہل گیا تھا۔ اس کی ساری سوچیں یہیں آ کر ختم ہوتیں کہ کاش بلال ویسا نہ ہو جیسا ماہا نے سوچا ہے، ورنہ بہت ٹوٹ پھوٹ ہو گی۔ دو بھائی جدا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی ہی میں جائیداد کا بٹوارہ ہو

جائے گا۔ وہ خاندانی ساکھ جو اس نے ایک عمر خرچ کر کے بنائی تھی، اس کا شیرازہ دنوں میں بکھر جائے گا۔ اس کی تمام تر امیدوں کا مرکز صرف اور صرف بلال تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ بلال ویسا نہیں ہو گا جیسا ماہا نے سوچا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو وہ اپنے پوتے کو ہر حال میں ساری صورتحال بتا کر منا لے گا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ بلال جلد از جلد آ جائے تاکہ یہ جو جمود کی فضا بن گئی ہے، اس سے چھٹکارا مل جائے۔ وہ جس طرح یہ سوچتا، اسی طرح ذہن کے کسی کونے سے خوف سر ابھار لیتا کہ اگر بلال نہیں مانا تو......؟ وہ اس سے آگے ذرا بھی نہ سوچ سکتا، اس کے سامنے اندھیرا چھا جاتا اور وہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا۔

''میاں جی......!'' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' زبیدہ خاتون کی آواز پر وہ چونک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے پاس کھڑی پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آں......آں......نہیں تو......آؤ، تم بیٹھو......'' نور الٰہی نے بہت مشکل سے کہا۔

''میاں جی......!'' آپ چاہیں نہ مانیں لیکن آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا بات ہے، ہمیں بتائیں نا کیا پریشانی ہے؟'' زبیدہ خاتون تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''بہو......! دنیا کے سو بکھیڑے ہیں، ہر طرح کی سوچیں تو آتی رہتی ہیں۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔'' اس نے اصل بات چھپاتے ہوئے یونہی کہہ دیا اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لے آیا۔

''میاں جی......! اگر آپ کچھ نہ بتانا چاہیں تو آپ کی مرضی ہے، لیکن میں دو دن سے دیکھ رہی ہوں، آپ نہ تو ٹھیک طرح سے کھانا کھاتے ہیں، ہر وقت کھوئے ہوئے گم سم بھی رہتے ہیں۔ دنیا کے سو بکھیڑے تو آپ پہلے بھی نمٹاتے رہے ہیں، لیکن اس قدر پریشان میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔'' زبیدہ خاتون نے کہا تو نور الٰہی چونک گیا۔ کیا وہ اس قدر غافل ہو گیا ہے کہ دوسرے بھی محسوس کرنے لگے ہیں؟ یہ سوچتے ہی وہ مسکرایا اور بولا۔

''سچ پوچھو نا بہو تو میں بلال کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اب اس احمق سے بندہ یہ پوچھے کہ اتنے دن بغیر بتائے نجانے کس دیس کی خاک چھان رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو بھلا ہمیں کیسے پتہ چلے۔ بھی یہی خیال آتا ہے نا تو جی گھبرا جاتا ہے۔'' نور الٰہی بڑی خوبصورتی سے اصل بات کو چھپا گیا تھا۔

''ویسے میاں جی......! ایک بات بتاؤں۔'' زبیدہ خاتون نے ذرا سے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

''ہاں بولو'' وہ اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''بلال اتنا احمق نہیں ہے کہ ایسی کسی صورت حال کو نہ سمجھے۔ وہ ضرور اس کا بندوبست کر کے گیا ہوگا۔ اب دیکھیں، اس کے جانے کے فوراً بعد فہد یہاں آ گیا اور یہ بھی آ کر بتایا کہ اس نے بھیجا ہے۔ اس فہد کو سارا علم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور مجھے تو یقین ہے کہ دونوں میں رابطہ بھی ہوگا، ورنہ وہ اس قدر اطمینان سے یہاں نہ آ گیا ہوتا۔'' زبیدہ خاتون نے امید افزا بات کہی تو نورالہٰی چونک گیا۔ اسے فہد کے بارے میں بہو کی کہی ہوئی بات دل کو لگی۔

''تو پھر اس فہد نے بتایا کیوں نہیں، حالانکہ سبھی پریشان تھے اور میں۔۔۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''اب دونوں میں طے ہوا ہوگا تا کہ نہ بتائے، اس کے یہاں آنے سے لگتا نہیں ہے کہ دونوں میں کچھ نا کچھ طے ہوا ہوگا، ورنہ اس نے یہاں آ کر کیا کیا ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی ایسی صورتحال بنتی تو وہ ضرور بتاتا، ایسا کیوں ہوا، یہ سب تو بلال ہی بتا سکے گا نا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر بولی، ''اب یہ دیکھ لیں میاں جی، اس بارے میں نے اس کے خوب کان کھینچنے ہیں۔ آپ بھی درمیان میں مت آیئے گا۔ میں بھی نجانے کیسے صبر سے یہ سب کچھ دیکھ سن رہی ہوں، میں نے اپنے دل کی پوری بھڑاس نکالنی ہے، غضب خدا کا، بنا بتائے چپ چاپ نجانے کس دیس کی طرف منہ اٹھائے چل دیا، کسی کا دھیان ہی نہیں ہے کہ کوئی اس کے لئے پریشان بھی ہو سکتا ہے۔'' زبیدہ خاتون تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''ارے بہو بس کرو، ساری بھڑاس اگر ابھی تم نے نکال لی تو پھر اس کے کان کیسے کھینچ پاؤ گی۔'' نورالہٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دکھ ہوتا ہے نا میاں جی، ایک ذرا سی کوتاہی سے اتنے لوگ پریشان ہیں اور ماہا کی حالت دیکھی ہے، چند دنوں میں ہی یوں ہو گئی ہے جیسے کئی دنوں کی بیمار ہو، ظاہر ہے اسے تو بہت صدمہ ہوا ہوگا نا، سچ پوچھیں نا میاں جی، مجھے تو غصہ فہد پر آ رہا ہے۔ چلو بندہ اشارے کنائے سے ہی بتا دیتا ہے کہ وہ کہاں ہے، کیسا ہے، اس نے تو بس یہ کہہ دیا کہ کوئی کام ہے تو بتائیں۔'' زبیدہ خاتون نے پھر سے بھڑاس نکالنا شروع کر دیں۔ ''جہاں تک ماہا کا معاملہ ہے اس کے لئے تو خیر، میں بھی پریشان ہوں۔ لیکن بہو......! اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ جب تک بلال آ نہیں جاتا، تب تک تو کوئی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔'' وہ بولا۔

''اسی لئے تو میاں جی میں خاموش ہوں اور آپ بھی میاں جی، تھوڑا حوصلہ رکھیں میں ماں ہو کر اس صورت حال کو برداشت کر رہی ہوں، میں تو اس کی صحت و سلامتی کے لئے سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتی، آپ بھی دعا کریں کہ خیر و سلامتی سے گھر واپس آ جائے

باقی سارے معاملے بعد کے ہیں۔ یوں پریشان ہونے سے تو کچھ بھی نہیں ہونے والا'' زبیدہ خاتون نے یوں کہا جیسے وہ خود کو حوصلہ دے رہی ہو۔

''ٹھیک ہے بہو، اب میں اپنا خیال رکھوں گا، تم ذرا ماہا کو دن میں دو چار بار فون کر لیا کرو وہ بھی یونہی سوچتی رہتی ہوگی۔'' نورالہٰی نے ایک خاص سوچ کے تحت کہا۔

''جی، میاں جی، میں کر لوں گی فون، ویسے بھی آج نجمہ نے لاہور چلے جانا ہے۔ میں تو چاہ رہی ہوں کہ ان سب کو تھوڑے دنوں کے لئے ادھر ہی لے آؤں۔ یہاں ان کا بھی اور ہمارا بھی دل لگا رہے گا، ورنہ وہ تو اکیلی وہاں پڑی نجانے کیا اوٹ پٹانگ سوچے گی۔'' زبیدہ نے تشویش سے کہا۔

''ہاں......! ایسا تو ہے، خیر، میں آج شام ہی ادھر جاتا ہوں۔ پھر موقع محل دیکھ کر انہیں یہیں لے آؤں گا۔ احسان شاید نہ آئے'' نورالہٰی نے پھر خیالوں میں ڈوبتے ہوئے کہا، پھر چہکتے ہوئے بولا ''خیر بہو......! تم بھی پریشان نہیں ہونا اللہ سب ٹھیک کرے گا۔''

زبیدہ خاتون نے یوں حوصلہ افزا بات سنی تو یہ سوچتے ہوئے اٹھ گئی کہ بلال کی عدم موجودگی نے سب کو کتنا پریشان کر دیا تھا۔

❁......❁......❁

میری آنکھ کھلی تو پہلی نگاہ کلاک پر پڑی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے اونگھتے ہوئے سوچا کہ کافی سو لیا ہے، بس اب اٹھ جانا چاہئے۔ میں نے کروٹ لی تو پی اون بیڈ کے بجائے نیچے قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں مسکرا دیا۔ میں اٹھا اور باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ میں فریش ہو کر آیا تو پی اون بیدار ہو گئی۔ ایسے میں دروازہ کھلا اور جندکور اندر آ گئی۔

''ویر جی، آپ تو بڑی جلدی اٹھ گئے یا آپ سوئے نہیں تھے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''میری نیند پوری ہو گئی ہے۔ پی اون کا پتہ نہیں۔'' میں نے کہا تو وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''لیکن یہ یہاں نیچے کیوں پڑی ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھتے ہوئے یہی بات تھائی میں اس سے پوچھی، اس نے نجانے کیا جواب دیا کہ جندکور ہنسنے لگی۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ ''کہہ رہی ہے کہ آپ بھی ہوٹل میں ایسے ہی سوتے تھے۔''

''بس سمجھا کرو نا کہ ایسا کیوں ہے۔'' میں نے پنجابی میں کہا تو وہ بولی۔

''چلو......! آپ تیار ہو کر آ جاؤ، میں ناشتہ لگاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر جانے لگی تو میں

نے پوچھا۔

''ویسے جندکور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں جاگ گیا ہوں۔''

''میں تو کب کی جاگ رہی ہوں۔ اس انتظار میں تھی کہ آپ جاگیں تو میں ناشتہ بناؤں۔ وہ گئے ہیں جیت سنگھ کو سکول چھوڑنے، ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں اور پی اون جب نیچے ڈرائنگ روم میں آئے تو ہمت سنگھ آ چکا تھا۔ بہت خاموشی میں ناشتہ کیا گیا، پھر چائے پیتے ہوئے میں نے کہا۔

''آپ لوگ مجھے بہت یاد آئیں گے، لیکن یہ تو یاد ہے کہ نا کہ پاکستان آنا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ضرور......! میں نے تو رات ہی جندکور کے ساتھ پروگرام بنالیا ہے۔ بس جیت سنگھ کے سکول کا تھوڑا مسئلہ ہوگا، وہ بہرحال میں دیکھ لوں گا۔''

''بہت اچھی بات ہے، میں انتظار کروں گا، بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ فون کام نہیں کررہا ہوتا۔ میں پورا ایڈریس لکھ دیتا ہوں، ویسے اس کی اتنی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں آپ کو واہگہ ہی سے لے لوں گا۔'' میں نے کہا اور جندکور سے اپنا سامان منگوایا۔ میرا سامان کیا تھا، ایک بیگ اور لیپ ٹاپ، فون میری جیب میں تھا، میں نے صاف کاغذ پر پورا ایڈریس لکھا اور ہمت سنگھ کو دے دیا۔ اس دوران پی اون انتہائی خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہی۔

''یہ بس جی، یہ میری طرف سے'' جندکور نے میری جانب چند سوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی بھلا'' میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ضرورت ہو یا نہ ہو، اپنی تو روایت ہے نا، ویر چھوٹا ہو یا بڑا، اس وقت تک چھوٹا ہی ہوتا ہے، جب تک اس کی شادی نہ ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے تین سوٹ میری گود میں رکھ دیئے، پھر ایک گلابی رنگ کا زنانہ جوڑا نکال کر پی اون کی جانب بڑھایا۔

''یہ تحفہ میری طرف سے تمہارے لئے؟''

اس نے حیرت سے جندکور کی جانب دیکھا پھر میری جانب اور بہت ہی خوشگوار حیرت میں اس نے وہ تحفہ لے لیا، پھر بولی ''آپ نے دے دیا، میں نے لے لیا، لیکن ابھی اسے آپ رکھیں، میں بعد میں لے لوں گی۔''

''جیسے تمہاری رضی......!'' اس نے کہا اور سوٹ رکھ لیا۔ میں نے اپنی جیب میں

سے والٹ نکالا پتہ نہیں کتنے بھات تھے، وہ میں نے سارے جندکور کی جانب بڑھا دیئے۔

''اب انکار نہیں کرنا، یہ تمہارے ویر کی طرف سے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے بھات یوں پکڑے جیسے کوئی مقدس شے پکڑ رہی ہو، پھر اپنے ماتھے پر لگا کر اپنی مٹھی میں دبا لئے۔

''لو جی......! اب میں چلتا ہوں، شعیب بنکاک میں میرا انتظار کررہا ہوگا۔'' میں نے کہا تو ہمت سنگھ بولا۔

''چلیں، میں آپ کو بس ٹرمینل تک سی آف کردوں۔''

''چلیں......!'' میں نے کہا تو جیت کور بھی ساتھ میں اٹھ گئی۔

بس ٹرمینل پر اتنا زیادہ رش نہیں تھا۔ بنکاک جانے والی بس تیار تھی، ہمت سنگھ نے دو ٹکٹ لئے اور پھر سوار ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ تب میں نے جندکور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بہت اچھی دوست ثابت ہوئی ہے۔ نجانے اب کبھی دوبارہ اس سے ملنا ہو یا نہیں، لیکن تم اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا، اگر کبھی تم سے رابطہ کرے تو اسے مایوس مت ہونے دینا۔ اس پورے یقین کیساتھ کہ اس سے رابطہ کبھی شرمندگی کا باعث نہیں بنے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں ویر جی، میں سب سمجھتی ہوں۔ بندے کا تو تھوڑی دیر میں پتہ چل جاتا ہے یہ تو پھر اتنا وقت ساتھ میں گزار چکی ہے۔'' اس نے چند لفظوں میں مجھے بہت کچھ سمجھاتے ہوئے کہا تو میں مطمئن ہوگیا۔ پھر وہ ملنے ملانے کے بعد واپس جانے لگے اور ہم بس میں سوار ہوگئے۔ وہ میرے پہلو میں تھی اور اداس ہو رہی تھی، جبکہ میرے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بس چلنے کے تقریباً دس منٹ بعد شعیب کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ہمیں ایکامائی سے پک کرے گا۔ ہمت سنگھ نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم پٹایا سے چل پڑے ہیں۔

''لگتا ہے ابھی تمہارے معاشرے میں مشرقی روایات کی بہت پاسداری کی جاتی ہے۔'' پی اون نے لب کھولے

''ہاں......! کیونکہ ابھی ہم پوری طرح مادیت پرستی کی لپیٹ میں نہیں آئے، اسی لئے تو وہاں مزاحمت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے، کسی بھی قوم کا اگر کلچر بدل دیا جائے تو اس پر گولا بارود خرچ کرنا احمق پن ہے۔'' اس نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں پی اون یہ ایک فلسفہ ہے، وجود اور روح کا، چونکہ عام آدمی اسے نہیں سمجھتا اس لئے وہ اندھا دھند چمکتی ہوئی شے کی جانب بھاگتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''یہ کیسا فلسفہ ہے۔'' اس نے ذرا سا رخ میری جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو......! جب کوئی انسان مر جاتا ہے تو اس کی موت بارے کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ ختم ہو گیا۔'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ اس کی سانس ختم ہو گئی ہے۔ مطلب وہ سانس نہیں لے رہا ہے، وہ حرکت نہیں کر سکتا، اس کا کوئی بھی عضو حرکت نہیں کر پا رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یعنی اس وجود کی گواہی، وہی وجود ہی دے رہا ہے کہ اب اس کے اندر زندگی نہیں رہی۔ وہ جو اس کے اندر تھا، جس کے باعث زندگی تھی اب نہیں ہے، بلکہ وہاں پر موت آ گئی ہے۔ وہ قوت، وہ طاقت، وہ سوچ فکر، وہ روح، اسے جو بھی نام دے لیا جائے جو پہلے اس وجود کو حرکت میں رکھے ہوئے تھی اب وہ عنقا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ شے جو اندر تھی وہ اپنا اظہار وجود کے ذریعے سے کر رہی تھی۔ اتنی بات تم سمجھ گئی ہو۔'' میں نے اس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں یہ تو سمجھ گئی، یا اس کا کوئی دوسرا پہلو بھی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......! وہ اندر کی قوت سے اس قدر طاقت ور ہوتی ہے کہ جب اس میں کسی خواہش کا ارادہ آ جائے تو پورے وجود کو لئے پھرتی ہے، جیسے میں نے ارادہ کیا یہاں ہتایاآ جانے کا تو میں پورے وجود کے ساتھ آ گیا۔ یعنی وجود وہی کچھ کرنے پر مجبور ہے جو اس کا ارادہ چاہتا ہے۔''

''آخر اندر کی شے کا کوئی حتمی ایک نام تو ہو گا۔'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہے اور وہ ہے فکر، جو اس کے اندر پڑی ہوئی ہوتی ہے یا جیسے میں نے تمہیں خیال کے بارے میں سمجھایا تھا، یہ خیال کی خصوصیات ہیں، جس کے تابع ہو کر وجود حرکت پذیر ہوتا ہے۔ جب خیال رک جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے، اسی طرح خیال کی تبدیلی کے ساتھ ہی جب سوچ فکر تبدیل ہوتی ہے تو وجود بھی اپنی حرکت اس کے تابع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت بلند بات ہے لیکن محض سمجھنے کی حد تک تم اس کی مثال وی سی ڈی پلیئر کی لے لو، تم اس میں جیسے سی ڈی ڈالو گی، اس کا اظہار ٹی وی سکرین پر ہو جائے گا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ہاں، اس حد تک میں تو بات سمجھ گئی ہوں کہ جب کسی بھی قوم کی سوچ اور فکر تبدیل کر دی جائے تو پھر ان کا کلچر تو کیا ارادہ تک تبدیل ہو جاتا ہے۔ آج یہاں ہمارے معاشرے میں بدھ روایات ہیں، ہماری ثقافت ہے، یہ اس لئے ہیں کہ ابھی تھوڑی بہت رمق ہم میں

موجود ہے، لیکن چونکہ ہم مادیت پرستی کو قبول کر چکے ہیں، جس کے باعث دھیرے دھیرے معاشرہ تو کیا سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔'' اس نے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔

''ہر نظام، مکتبہ فکر، فلسفہ کا ایک مرکز ہوتا ہے، جس کے اردگرد ہر شے گھوم رہی ہوتی ہے جیسے مادیت میں لوگ دولت کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس سے وہ ہر طرح کا افادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ افادہ مطلب لذت، اس سے آگے کوئی سوچ ہی نہیں ہے۔''

''یا جیسے بدھ مت میں نروان مرکز ہے۔'' اس نے میری بات بڑھائی اور پھر تجسس سے پوچھا۔ ''اسلام کا مرکز کیا ہے؟''

''اللہ کی رضا، نبی رحمتؐ کے طریقے سے۔'' میں نے اگلے ہی لمحے میں کہا۔

''طریقہ......! مطلب جو انہوں نے کیا، ویسا ہی کرنا، لیکن اس میں ایک بات آ جاتی ہے کہ اتنے سو سال پہلے اور آج میں فرق ہے، ممکن نہیں ہے کہ ویسا ہی کیا جائے، جیسے کہ ہم سفر کر رہے ہیں، ایسی کوچ تو اس دور میں نہیں ہو گی تو پھر سفر کے معاملے میں تم ویسا تو نہیں کر رہے ہونا۔'' اس نے اپنی الجھن مجھے بتائی۔

''سب سے پہلی بات تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ جو اللہ پوری انسانیت کو دینا چاہتے تھے، وہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف انبیاء کو جزوی طور پر دیتے رہے، یہاں تک کہ نبی آخر الزماںؐ پر اس کی تکمیل ہو گئی اور پھر اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا۔ نبی رحمتؐ کے طریقے کا مطلب ہے کہ انہوں نے ہر کام کے اصول بتا دیئے، جیسے سفر، کھانا پینا، شادی، موت وغیرہ ہر کام میں طریقہ بتا دیا۔ اب تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ مسلمانوں میں شادی کی اصل مذہبی رسم یعنی نکاح ہے، اس پر خرچ نہیں آتا۔ دو گواہ جن کے سامنے مرد اور عورت ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ اس شادی کے اعلان کے لئے دعوت ولیمہ ہوتی ہے۔ اب یہ اس مرد پر منحصر ہے وہ چند آدمیوں کو بلا کر مختصر سی دعوت کر دے یا ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلا دے۔ یہ اس کی توفیق اور استطاعت پر ہے۔ پھر ایک حد قائم رکھنے کے لئے ساتھ میں یہ حکم ہے کہ فضول خرچی نہیں۔'' میں نے اسے اختصار سے بتایا۔

''بنیادی طور پر اصول وضع کر دیئے جو ہر زمانے میں موثر ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''بالکل......!'' جیسے حلال و حرام کے معاملے میں ہے۔ اب جو ان سے انحراف کرے گا، دراصل اس کے اندر سوچ و فکر کی تبدیلی ہو گی تو اس کا بدن اظہار کرے گا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ جو مسلمان اسلام کے بارے میں جتنا تھوڑا لگاؤ رکھتے ہوں

گے، وہ کسی دوسرے نظریے، سوچ یا فکر کو قبول کر لیتے ہوں گے اور میرا خیال ہے انکی ذریعے اہل مغرب دوسرے مذاہب میں مداخلت کر رہا ہے۔'' پی اون نے اپنے طور پر نتیجہ نکالا۔

''اہل مغرب نے ایک نئی اصطلاح گھڑی ہے اور وہ ہے تہذیب اور اس تسلط پر سوچ کو تہذیبوں کے تصادم کا نام دے دیا ہے، کیونکہ وہ مذہب کو رد کر چکے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح جانچ پرکھ لیا ہے کہ مذہبی طور پر وہ پختہ نہیں ہیں۔ وہ کاملیت و اکملیت ان کے پاس نہیں ہے، جو اس وقت دین اسلام کے پاس ہے۔ لہٰذا تہذیبوں کے تصادم کے نام پر وہ تسلط جمانے کی فکر میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''لیکن تم یہ مانو کہ اسلام کمزور ہوا ہے۔'' پی اون نے کہا۔

''نہیں! اسلام کمزور نہیں ہوا اور نہ ہی قیامت تک کمزور ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں سے اپنے اصول وضوابط لیتے ہیں وہ زندہ حقیقت کی مانند محفوظ ہے اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک محفوظ رہے گا۔ اصل میں مسلمان کمزور ہوا ہے۔ اس کے اندر جہاں فکر سوچ کی کمزوری آئی تو وہ کمزور ہو گیا۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کے بعد زوال کے فقط دو ہی سبب ہیں۔ جو نظریہ حیات قرآن وسنت نے دیا اس کے ساتھ وابستگی میں کمزوری ہوئی تو دوسری جانب عیسائی و یہودی دنیا نے سازشوں سے مزید کمزور کرنے کی کوششیں کیں، جو کامیاب ہوئیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ اہل مغرب ہوں، یہودی عیسائی یا جو بھی اسلام مخالف قوت، اسلام یا مسلمانوں کو کمزور نہیں کر سکتی، یہ مسلمان ہی ہیں جو اپنے اندر کمزوری لاتے ہیں۔''

''کیا کبھی مسلمانوں کا دوبارہ عروج آئے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''انفرادی اور اجتماعی عروج کی بنیاد نظریہ حیات کی مضبوط وابستگی سے ہے۔ آج اگر ایسا ہو جائے تو عروج ہی عروج ہے۔ اس میں اسلام نظریاتی قوت ہے، جو قومیت، سرحدوں، رنگ ونسل کا محتاج نہیں ہے۔ اس لئے اپنے اندر بہت بڑی قوت رکھتا ہے اور اسلام کا نظریہ حیات مخصوص وقت، علاقے یا قوم سے متعلق نہیں پوری انسانیت کے لئے ہے۔ نظریاتی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ اس میں جو شخص انفرادی طور پر اس نظریہ حیات سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جائے گا، اس کے اندر وہی فکر وسوچ اتر آئے گی، جس سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔'' میں نے دھیرے دھیرے اسے سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئی، نجانے وہ کس سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ کوچ اپنی مخصوص رفتار سے جاری تھی۔ یہاں تک کہ پی اون اونگھنے لگی اور میں نے بھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لی، میں سو تو نہ سکا لیکن میرے ذہن میں بہت ساری باتیں گردش کرنے لگیں۔

میرے اس سفر کے بارے میں نجانے کس کس بندے نے کیا رائے قائم کی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے بھی چھپ کر یہاں آنا پڑا۔ میں جب یہاں آ رہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں کیا کیا خدشات تھے، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا، پی اون کے بارے میں میرے تخیل نے نجانے کیا کچھ گھڑا تھا، کیسی کیسی تصویریں میرے سامنے پیش کی تھیں، لیکن پوری طرح مجھے اس بات معلوم ہوا جب میں اس سے ملا، اس کے ساتھ میں بہت سارے ایسے مواقع آئے تھے کہ میں بہک سکتا تھا، لیکن میرے اندر خاص سوچ وفکر اس قدر مضبوط ہو چکی تھی، جس نے میرے کردار پر دھبہ لگنے نہیں دیا۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ عادت یا فطرت بھی، اس خیال کی مرہون منت ہے، جو ہمارے اندر موجود ہے اور اس وابستگی کو قوت دینے والی فقط ایک شے ہے اور وہ ہے عشق......!

عشق کی بھی اپنی ہی ادا ہے، یہ اگرچہ انسان کے اندر ہی پڑا ہوا ہے، لیکن اس وقت تک اپنا احساس نہیں دلاتا، جب تک کوئی صورت اس کے سامنے نہ ہو، جیسے ہی صورت سامنے آتی ہے۔ یہ اپنا آپ منوانا شروع کر دیتا ہے کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا ہدف وہ صورت قرار پاتی ہے اور وجود پوری طرح اس کا تابع ہو جاتا ہے۔

وجود کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مادے کی ترکیب سے بنا ہے، لیکن روح کی ترکیب کیا ہے؟ اس سے بحث نہیں لیکن جو انسان کے اندر فکر، شعور، فیصلہ، ارادہ جیسی قوتیں ہیں ان کی کوئی مادی ترکیب نہیں ہے۔ اس لئے روح کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مادی وجود کو چلانے، اسے متحرک کرنے والی شے ہی ہے، بلکہ وہ خاص جوہر ہے جس کی وجہ سے سوچ، فکر، ارادہ، شعور، ذاتی، انفرادیت، انانیت اور اس وصف خاص کا حامل جس کی بدولت خلیفہ اللہ قرار پاتا ہے۔ مندرجہ بالا سارے غیر مادی جواہر کا اظہار وجود کے ساتھ ہے، اگر وجود نہ ہو تو وہ اپنا اظہار کر ہی نہیں پاتیں اور نہ کوئی دوسرا ذریعہ ہے۔

یہ وہ باتیں تھیں جو ابتدائی مرحلے پر نہ پی اون سمجھ سکتی تھی اور نہ ہی سمجھایا جا سکتا اور تصوف کا معاملہ تو اس سے بھی آگے کی بات تھی، حالانکہ ابھی ان ممالک میں یا اس کے اپنے معاشرے میں روحانیت ختم نہیں ہوئی تھی، اس کی صورت چاہے جیسی بھی تھی۔

ہم ایکامائی بس ٹرمینل پر پہنچے تو شعیب ہمارا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، جیسے ہم سے مل کر وہ بہت خوش ہوا ہو۔ اس وقت دن کے تقریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ نیلے آسمان پر بادل تیر رہے تھے، جس سے دھوپ چھاؤں کا سا سماں بن رہا تھا۔ میں نے بس میں سے اپنا سامان لیا تو اس نے پکڑ لیا

’’آئیں بلال بھائی......!‘‘ وہ سامان کے ساتھ چل پڑا۔ پارکنگ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی، ہم اس میں بیٹھے تو وہ چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد پی اون سے تعارف کا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ فضاء میں اجنبیت ختم ہوئی تو وہ بولا۔

’’بلال بھائی......! ویسے اس موقع پر مجھے کہنا تو نہیں چاہئے، لیکن دل چاہ رہا کہ آپ سے اپنے جذبات شیئر کروں کہ آپ سے میں ناراض ہوں۔‘‘

’’وہ کیوں بھائی؟‘‘ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

’’آپ نے مجھے ذرا سی بھی خدمت کا موقع نہیں دیا۔ میں چاہتا تھا......‘‘

’’تم جو بھی چاہتے تھے وہ میرے سر آنکھوں پر، لیکن میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ ادھورا رہ جاتا، سو اس لئے میں کسی جانب بھی توجہ نہیں دے سکا ہوں۔‘‘ میں نے وضاحت کر دی۔

’’خیر......! کیسا پایا آپ نے پٹایا؟‘‘ اس نے موضوع میں تبدیل کر دیا تو میں نے پی اون کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

’’پٹایا کا تو پتہ نہیں لیکن اس نے مجھے ایک اچھا دوست دے دیا ہے۔‘‘

’’اور تمہاری وجہ سے بھی مجھے یہاں اچھے دوست مل گئے ہیں۔‘‘ پی اون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’تم انہیں ہمیشہ اچھا پاؤ گی۔‘‘ میں نے بڑے مان سے کہا تو شعیب بولا۔

’’بالکل......! جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، میں حاضر ہوں گا، بنکاک اور پٹایا کا اتنا فرق نہیں ہے۔‘‘

’’تمہارا بہت شکریہ شعیب۔‘‘ وہ بولی تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

’’شعیب تمہیں پتہ ہے کہ اب میرے پاس کتنا وقت ہے؟‘‘

’’ہاں......! محض چار گھنٹے کے بعد آپ کی فلائٹ اڑ جائے گی، یوں ایئر پورٹ تک پہنچنے کے لئے تین گھنٹے چاہئے، لیکن میں اس دورانیے میں تھوڑا سا وقت ضرور لوں گا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’مطلب......! کیا تم سیدھا ائیر پورٹ نہیں جاؤ گے‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں......! بلکہ اسی مسلم ریستوران سے کھانا کھلاؤں گا، پھر ائیر پورٹ۔‘‘ اس نے کہا تو میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس مسلم ریستوران میں تھے۔ مجھے لگا جیسے شعیب انہیں پہلے ہی بتا گیا تھا، اس لئے وہ ہمارے انتظار ہی میں تھے، حالانکہ وہاں پر اس وقت لوگوں کی خاصی تعداد تھی، وہ دونوں میاں بیوی بڑے تپاک سے ملے اور ہمارے

لئے میز تک رہنمائی کی۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے کہا۔

’’شعیب تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے میری مدد کی، تمہارا لیپ ٹاپ گاڑی میں پڑا ہے اور یہ رہا تمہارا سیل فون۔‘‘ میں نے جیب سے اس کا فون نکالتے ہوئے کہا، پھر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بنا کچھ کہے فون اپنی جیب میں ڈال لیا تو میں نے کہا ’’یار......! مجھے تھوڑا بہت آئیڈیا تو ہے، لیکن اگر تم مجھے بتا دو تو میں تمہیں اتنی رقم دے دوں۔‘‘

’’نہیں بلال بھائی......! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔‘‘ اس نے کہا تو میں نے بعد اصرار اسے اندازاً رقم ڈالر کی صورت میں دے دی۔ انہی لمحات میں اچانک مجھے ایک خیال آیا تو میں نے پی اون سے پوچھا۔

’’پی اون......! کیا تمہارے پاس اپنا کمپیوٹر ہے؟‘‘

’’نہیں......! میں وہ ہوٹل ہی کا استعمال کرتی ہوں۔ اس کے بعد مجھے اس کی اتنی ضرورت نہیں پڑی۔‘‘ اس نے صاف انداز میں کہا، تو میں نے اسی لمحے شعیب سے اردو میں پوچھا کہ لیپ ٹاپ کتنے کا آتا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔

’’آپ ایسا کیجئے کہ یہی لیپ ٹاپ......‘‘

’’نہیں......! بالکل نیا لے کر دو گے‘‘ میں نے کہا اور اندازے سے ڈالر اس جانب بڑھا دیئے جو اس نے لیکر جیب میں ڈال لئے۔ تب میں ذہنی طور پر مطمئن ہو گیا تھا۔

کھانے کے دوران مختلف باتیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ میری شادی بھی زیر بحث آئی، میں نے اسے تاریخ بتا دی، جو بہر حال حتمی نہیں تھی۔ دو چار دن آگے پیچھے ہو سکتے تھے۔ کھانا کھا لینے کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھے، اٹھ کر باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ایک بیگ ڈگی میں سے نکالا اور میرے آگے رکھ کر کھول دیا۔

’’بلال بھائی......! یہ میں نے آپ کے لئے اور تھوڑی سی شاپنگ ذیشان بھائی کے لئے کی ہے۔ اس کے لئے اب آپ انکار نہیں کریں گے۔‘‘ اس نے انتہائی خلوص سے کہا۔ تب میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’مجھے کیا پتہ کہ میرے لئے کیا ہے اور ذیشان کے لئے کیا؟‘‘

’’اس میں لسٹ ہے۔‘‘ اس نے کہا اور بیگ کی زپ بند کر دی۔ پھر جب ہم تینوں ائیر پورٹ پہنچے تو فلائٹ جانے میں محض ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ شعیب مجھ سے گلے ملا اور مڑتے ہوئے بولا۔

’’بلال بھائی......! آپ وعدہ کریں کہ آپ بھابی کے ساتھ یہاں ضرور آئیں گے۔‘‘

"بالکل......! ضرور آؤں گا، لیکن تمہاری شادی پر۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو پی اون بھی ہنس دی۔ تب شعیب بولا

"بس جاتے دفعہ سوڈا پیتے جائیں، میں وہ لے کر آتا ہوں، آپ اتنی دیر میں پی اون سے باتیں کریں۔" وہ سمجھدار تھا کہ ہمیں اکیلا چھوڑ گیا۔

میں اور پی اون آمنے سامنے تھے۔ وہ خاموشی سے میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے میرا وجود اپنی آنکھوں میں سمالینا چاہتی ہو۔ تب میں نے کہا۔

"ہمارا رابطہ رہے گا پی اون! تم اپنا خیال رکھنا۔"

"ہاں......! میں اپنا اب بہت زیادہ خیال رکھوں گی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر یوں بولی جیسے تصدیق چاہ رہی ہو۔ "بلال......! کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تم پتایا کیوں آئے تھے۔"

"صرف تمہارے لئے، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری دوست کیسی ہے، جس کے سوالوں کے باعث میں الوہی راز حیات تک پہنچا ہوں۔"

"اور وہی راز حیات تم نے مجھے بتانے کی کوشش کی۔"

"ہاں......! تاکہ تجھے تیرے سوالوں کا جواب مل جائے۔"

"مگر ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آسکی ہے بلال۔" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ تن گیا۔ اس کے ہونٹ ذرا سے تھرتھرائے اور پھر بولی "تم نے اپنا نظریہ حیات یا دین کا پیغام مجھ تک پہنچا دیا۔ تم نے بہت خوبصورت باتیں کی ہیں، جو بہت متاثر کن اور عقل کے ساتھ ساتھ دل بھی جسے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن......! جہاں تک مجھے علم ہے، مسلمان دن میں پانچ بار اپنی عبادت کرتے ہیں، مگر میں نے تمہیں ایک بار بھی عبادت کرتے نہیں دیکھا۔ کیا مسلمانوں میں عبادت کرنا یا نہ کرنا اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے؟"

پی اون لفظ لفظ کہتی چلی گئی اور میں شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ وہ نماز کے بارے میں کہہ رہی تھی، پی اون کے لفظ میرے احساسات پر کوڑے بن کر برسے، میں چند لمحوں تک کے لئے گونگا ہو گیا۔ میرے کمرے میں دھری الماریوں میں موجود کتابیں، کمپیوٹر سے کی ہوئی تحقیق، رسالوں کے انبار اور میری سوچ، سب اس وقت عاجز ہو گئے۔ اس ایک سوال نے میرے سارے مطالعہ پر لکیر پھیر دی۔ میں نے خود کو بالکل کورا محسوس کیا، جس پر دین کی تعلیمات نے ایک ذرا سا بھی اثر نہ کیا ہو۔ مسلمان، مومن تو کردار سے بنتا ہے، محض عالم فاضل ہونے سے تو نہیں۔ کردار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا مسلمان ہے؟ میرے پاس ایک بھی لفظ ایسا نہیں تھا جو میں اپنی صفائی میں کہہ سکتا۔ میری ساری ریاضت، میرا سارا کردار،

میرا سارا رویہ اور میری ساری باتیں، اس کے ایک سوال کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوں اور وہ مجھے میری اوقات یاد دلا رہی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں طنزیہ مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے اس سوال کا گمان بھی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں دور دور تک سناٹا چھا گیا تھا، کیونکہ میرے پاس اس کے سوال کا جواب تھا ہی نہیں۔ میں اتنی ہمت بھی نہیں پیدا کر پا رہا تھا کہ اس کا جواب دے دوں، بہت مشکل سے میں نے کہا۔

"نہیں......! اس میں مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔"

"تو پھر تم......؟" وہ بولی۔

"شاید میں پکا مسلمان نہیں ہوں؟" میں نے کہا اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ میرا گلا رندھ گیا۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر اپنی حالت زار پر روؤں، لیکن ایسا کر نہ سکا، شاید آنسو میرے گالوں پر ڈھلک جاتے، اتنی دیر میں شعیب سوڈے کے ٹن پیک لے آیا۔ میں نے جلدی سے سوڈا اپنے حلق میں اتارا، تاکہ خشک ہوتا ہوا گلا تر ہو جائے۔ میں نے خالی ٹین ڈسٹ بن میں پھینکا۔ پھر بے چارگی سے پی اون کی جانب دیکھا۔ شاید وہ میری حالت زار دیکھ رہی تھی۔ اس لئے بڑے نرم لہجے میں بولی۔

"بلال، میں تجھے گڈ بائی نہیں کہوں گی، کیونکہ میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔ ایک اچھے دوست کی مانند، مگر تمہارے اچھے سفر کی خواہش ضرور کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تھائی ثقافت کے مطابق دونوں ہاتھ جوڑ کر وائی کیا اور پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ گئی، میں نے بیگ کاندھے سے لٹکایا، ایک ہاتھ میں بیگ پکڑا، شعیب سے گلے ملا اور پھر ڈیپارچر لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

اس وقت دن کے تقریباً چار بج چکے تھے، جب جہاز نے حرکت کی، مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، وہ جوش و جذبہ جو یہاں آتے ہوئے میرے من میں تھا وہ میں ائیر پورٹ پر پی اون کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ کیونکہ پی اون نے میرے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ اس سارے فلسفے پر لکیر پھیر دی گئی تھی، جو پچھلے دنوں میں اس سے کہتا آیا تھا۔ لمبی لمبی تقریریں بے فائدہ ثابت ہوئی تھیں۔ میں جب اپنے وجود پر اس کا اطلاق نہیں کر سکا جسے میں پوری انسانیت کی فلاح مانتا ہوں تو میرے لفظوں میں بھی روح نہیں ہونی چاہئے۔ کیا میرا یہ سفر رائیگاں گیا؟ میں اس سوال کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر انہی لمحوں میں جب کہ میں پاکستان کی جانب محو سفر تھا، اللہ کے حضور جھک گیا، میں

نے وعدہ کیا کہ میں رحمت اللعالمینؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر پوری طرح زندگی بسر کرنے
کی کوشش کروں گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا عبادت سے صرف نظر نہیں کروں گا، میرے
وعدے میں اللہ پاک سے توفیق کی طلب بھی تھی، اس وقت میرا دل انتہائی درجے تک رقیق ہو
چکا تھا۔ میں نے پورے خلوص سے دعا مانگ کر جب سر اٹھایا تو دل کو ذرا سا حوصلہ ہوا۔ ایک
خیال میرے ذہن میں آیا کہ تم نے طلب کر لی، اب توفیق باری تعالیٰ خود دے گا۔ اس راہ میں
جو بھی رکاوٹ آئے گی، میں اس کا سامنا کروں گا، میں نے آہستہ سے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا
لی۔ میں لمحہ بہ لمحہ پاکستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

❋❋❋

اس وقت سہ پہر ڈھل رہی تھی جب فہد اپنے گھر کے لان میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا پاپا ٹینس کھیلنے چلا گیا تھا اور ماما ایک آفیسر کی بیگم کے ساتھ گپیں لگا رہی تھیں۔ گلاب نگر سے نور پور اور پھر لاہور تک ان میں بہت تفصیل سے باتیں ہوئی تھیں، لب لباب یہ تھا کہ اب ساری کہانی فہد پر ہے۔ وہ اگر بلال کو غلط بندہ ثابت کر دے تو ماما اس کے نزدیک ہو سکتی ہے۔ اس کا دل جیتنا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ یہ فیصلہ تو اس نے تب کر لیا تھا جب بلال نے تھائی لینڈ جانے کی بابت کہا تھا۔ اصل امتحان تو اب شروع ہونا تھا جب وہ واپس آ جاتا۔ وہ شک کا بیج ماما کے دل میں بو آیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہاں نفرت کا پودا ضرور اپنی کونپل نکالے گا۔ اب یہ اس پر منحصر تھا کہ اس پودے کی آبیاری کر لے۔ سازشی عناصر کے پاس فقط ایک شے ہوتی ہے اور وہ ہے ''ارادہ''۔ یعنی دوسروں کو نقصان پہنچانے والا اس لئے کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے ارادہ کر چکا ہوتا ہے اور دوسرا بے خبر ہوتا ہے اور اسی بے خبری میں وہ نقصان اٹھا لیتا ہے، ورنہ سازشی عناصر کی حیثیت تو ان بزدلوں میں شمار ہوتی ہے جو فائدہ بھی نہیں کر سکتے۔ فہد اس بات سے بے خبر اپنی دھن میں سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے؟ مگر اس کے پاس کوئی ایسا بنیادی نکتہ نہیں تھا، جس کے باعث وہ جھوٹ کی عمارت کھڑی کر لے۔ یہ سارے بنیادی نکتے اسے تب ملنے تھے، جب بلال واپس آ جاتا اور اپنے وعدے کے مطابق وہاں کی باتیں بتاتا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اندھیرے میں تھا۔ انہی چند لمحوں میں اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے کسلمندی سے فون جیب میں سے نکالا تو ذیشان کا نام سکرین پر جگمگا رہا تھا۔

''اسے کیا ہو گیا ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کال ریسیو کی تو ذیشان نے کہا۔

''اوئے بلال تھائی لینڈ سے نکل آیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد وہ کراچی ائیر پورٹ پر ہو گا۔'' ذیشان نے کہا تو فہد کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہیں کس نے بتایا، فون کیا تھا اس نے؟''

''نہیں، شعیب نے بتایا ہے، وہاں سے یہاں تک کا سفر تقریباً چار گھنٹے کا ہے۔ اسے اڑے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔'' وہ بولا۔

''ہاں تو اسے کراچی سے یہاں آنے میں بھی تو وقت لگے گا نا۔'' فہد نے گہری سانس لے کر کہا۔

''وہ کراچی پہنچ کر رابطہ ضرور کرے گا، تم ایسے کرو کہ میری طرف آ جاؤ۔ پھر وہیں سے ائیر پورٹ چلیں گے۔'' ذیشان نے کہا۔

''تمہاری طرف نہیں، بلکہ بلال کے گھر، نوکروں سے کھانا وغیرہ بنواتے ہیں۔ پھر رات ادھر ہی رہیں گے، باتیں نہیں سنی وہاں کی، وہ رنگین و سنگین وارداتیں جو بلال صاحب......''

''اوئے چل ادھر ہی آ جا، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔'' ذیشان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ تو فہد نے اپنے پورے وجود میں سنسنی محسوس کی۔ اس نے وہیں بیٹھے ہوئے اپنی ماما کو بتایا کہ وہ جا رہا ہے اور اپنی گاڑی لے کر نکل گیا۔ بلال کے گھر تک پہنچتے ہوئے اسے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ذیشان اس سے پہلے پہنچ چکا تھا۔

''کب کیا تھا فون شعیب نے تمہیں؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''یار اس نے وہاں سے نکلتے وقت کیوں نہیں بتایا۔'' فہد نے یوں کہا جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بات کر رہا ہو۔

''دراصل، شعیب کے ساتھ بلال کی ایک دوست تھی، جسے تھوڑی خریداری کرنا تھی، وہ ائیر پورٹ سے بنکاک شہر گئے، وہاں سے خریداری کی، اسے واپس بس ٹرمینل پر چھوڑا اور آ کر اس نے مجھے بتایا۔'' وہ اپنی جونک میں کہتا چلا گیا۔

'ارے واہ......! تم نے غور نہیں کیا، بلال کی دوست، وہ دوست کون ہو سکتی ہے، کوئی پاکستانی، بھارتی یا پھر کوئی تھائی......؟'' فہد نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تھائی......!'' ذیشان نے ہنستے ہوئے کہا ''موصوف نے اس کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارا ہے۔ شعیب کہہ رہا تھا کہ اس کی تصویریں وہ ای میل کر دے گا۔'' وہ مزے سے بولا۔

''اسے کہو نا یار ابھی کرے، دیکھیں تو سہی وہ کیسی ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''اچھا کر دے گا یار، اتنی جلدی کس بات کی ہے، ہو سکتا ہے بلال کے پاس بھی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"چار گھنٹے کے سفر کے بعد اسے اس وقت کراچی پہنچ جانا چاہئے تھا۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو اتنے میں خانساماں ان کے لئے چائے لیکر آ گیا۔ اس نے نفاست سے چائے بنا کر انہیں دی اور واپس چلا گیا۔ تب ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہی لاشعوری طور پر بلال کے فون کے منتظر تھے۔ تبھی ان مردرے لمحات میں ذیشان کا فون بج اٹھا۔

"اوئے، آ گیا......" وہ نعرے لگانے والے انداز میں بولا اور کال ریسیو کر لی اور یوں پوچھا۔

"ارے کہاں ہے تو......؟"

"کراچی میں ہوں اور ابھی تھوڑی دیر بعد لاہور کے لئے فلائٹ ہے۔" اس نے بتایا۔

"تقریباً نو اور دس کے درمیان یہاں پہنچے گا۔" ذیشان نے پوچھا

"ہاں ایسا ہی اندازہ ہے۔" وہ بولا

"اچھا ہم ادھر تیرے ہی گھر میں ہیں۔ کھانا وانا بنوا رہے ہیں، وہاں پتہ نہیں تو کیا سانپ چوہے کھاتا رہا ہوگا؟" اس نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے۔ فہد بھی دھر ہی کیا، وہ گاؤں سے آ گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، آج صبح ہی آیا ہے۔ ادھر یہیں مرے پاس ہے۔ لو بات کرو۔" ذیشان نے کہا اور فون فہد کو دے دیا تو اس نے پوچھا۔

"ہاں بلال خیریت سے پہنچ گئے ہو؟"

"ہاں......! یہ بتاؤ کہ گاؤں میں سب ٹھیک تھے نا، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"ویسے تو سب ٹھیک ہیں۔ تمہاری وجہ سے پریشان تھے۔ وہ میں نانا جی کو ابھی بتا دیتا ہوں کہ تم ٹھیک ٹھاک خیریت سے پہنچ گئے ہو۔ باقی باتیں یہیں ہوں گی۔"

"اچھا، میں فون کروں یا نہ کروں، تم لوگ ایئر پورٹ آ جانا، باقی باتیں بہرحال آ کر ہی کر لیں گے۔" بلال نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

"ابھی اسے دو تین گھنٹے لگیں گے یہاں آتے ہوئے۔ خانساماں کو بتا دو، پھر کچھ دیر بعد ہم یہاں سے نکلتے ہوئے۔" فہد نے کہا اور گلاب نگر کے نمبر ملانے لگا۔ اس دوران ذیشان اٹھ کر اندر چلا گیا اور فہد وہاں تنہا رہ گیا۔ نورالٰہی نے اپنا سیل فون رکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے خواہ مخواہ کی پریشانی کہتا تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد فون مل گیا، جسے زبیدہ خاتون نے اٹھایا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد فہد نے پوچھا۔

"نانا جی کدھر ہیں، ان سے بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو نور پور گئے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

"جی، وہ بلال آ گیا ہے، ابھی اس نے مجھے فون کیا تھا۔" فہد نے بتایا۔

"اچھا......!" زبیدہ خاتون نے یوں کہا جیسے اس خبر نے اس پر کوئی خاص اثر نہ کیا ہو۔

"میں نانا جی کو فون کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے زبیدہ خاتون کو پہلے ہی سے یہ خبر معلوم ہو، ممکن ہے بلال نے انہیں فون کر دیا ہو۔ یہی سوچتے اس نے ماہا کا نمبر ملایا۔ ذرا سی دیر بعد ماہا نے فون ریسیو کر لیا۔

"ماہا......! نانا جی ادھر ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ادھر ہی ہیں۔ پاپا کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ڈرائنگ روم میں۔"

"چلو انہیں بتا دو کہ بلال......" فہد نے کہنا چاہا لیکن اس نے بات کاٹ دی۔

"کراچی پہنچ چکا ہے" ماہا نے جلے کٹے انداز میں یوں کہا جیسے ابھی رو دے گی۔

"کیا یہ خبر......"

"ہاں......! بلال نے گلاب نگر فون کیا تھا۔ وہیں سے اطلاع آئی ہے، لیکن دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ اتنے دنوں بعد بھی یہاں آ کر اس نے اک ذرا سی کال بھی نہیں کی، ایسے ہی حالات میں پتہ چلتا ہے نا کہ کس کی کتنی اہمیت ہے۔" ماہا جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"تم دل چھوٹا مت کرو، ممکن ہے اس کی کوئی مجبوری ہو، خیر......! یہاں آئے گا نا تو اس سے پوچھ لینا۔" یہ کہتے ہوئے اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال رینگ گیا۔ تب اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ویسے ماہا......! میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟"

"کیسا مشورہ......؟" وہ تجسس سے بولی۔

"اس نے سب کے ساتھ جھوٹ بولا کہ وہ سرکاری ٹور پر فارن گیا ہے، یعنی ملائیشیا، تم اگر صبح تک یہاں پہنچ سکتی ہو تو اس کے سامان سے اس کا جھوٹ پکڑ سکتی ہو، اس کا پاسپورٹ......" اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کہتے تو تم ٹھیک ہو، بہانہ تو ہے کہ لاہور سے شاپنگ کرنی ہے، دادا جی بھی ادھر ہیں۔ خیر......! میں کچھ کرتی ہوں، مگر تم نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہنا، میں دیکھتی ہوں۔" ماہا نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ تب فہد کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ماہا اگر یہاں آ کر خود بلال کا جھوٹ ثابت کر دیتی ہے تو اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ تب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے اس نے اتنا کچھ کر

لیا تھا اور جب کچھ ہوگا تو وہ کیا کچھ نہیں کر پائے گا، وہ اس خیال ہی سے مسرور ہو گیا۔ تبھی اندر سے ذیشان آ گیا۔

”یار......! بلال کے آنے میں تو ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ کیوں نا تھوڑی دیر آفس سے ہو کر ہی ایئر پورٹ جایا جائے۔“

”یار، تو ٹھہرا کاروباری بندہ، تیرا دماغ تو اپنی دکان داری میں رہے گا، چل ادھر ہی چلتے ہیں۔“ فہد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی گاڑی ادھر ہی چھوڑ دو۔“ ذیشان نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ فہد بھی اس کے ساتھ چلتا چلا گیا۔

❁......❁......❁

طیارہ لمحہ بہ لمحہ لاہور کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا اور میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کراچی پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے امی کو فون کیا اور حال واحوال پوچھا، وہ مجھ سے سخت ناراض تھیں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا دل سے نہیں کہہ رہی ہیں۔ تب میں نے انہی سے کہا کہ وہ دادا جی کو بتا دیں اور فون بند کر دیا۔ پھر ذیشان سے بات ہوئی تو فہد بھی وہیں مل گیا۔ یقیناً وہ ایئر پورٹ پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہیں سے میں نے بنکاک میں شعیب کو فون کیا تو اس نے مجھے تفصیلات بتا دیں کہ اس وقت پی اون واپس پتایا پہنچ جانے والی ہو گی۔ اس نے میری طرف سے ایک نیا لیپ ٹاپ پی اون کو گفٹ کر دیا تھا۔ میں اس سے زیادہ باتیں نہیں کر سکا تھا۔ اس لئے لاہور پہنچ کر بات کرنے کا کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

پی اون کا خیال آتے ہی شرمندگی کا احساس پھر سے میرے اندر در آیا۔ اس نے طمانچہ میرے وجود پر نہیں میری روح پر مارا تھا۔ میں نے وہاں سے اڑنے کے تھوڑی دیر بعد جو فیصلہ کیا تھا، اگرچہ اس سے مجھے اطمینان ہوا تھا، لیکن سفر رائیگاں جانے کا دکھ مجھے بے چین کر رہا تھا۔ تمام راستے میں ایک اور فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اب مجھے پی اون کے ساتھ تعلق رکھنا چاہئے یا نہیں؟ تعلق رکھنے اور نہ رکھنے کی بہت ساری دلیلیں تھیں۔ جن کے درمیان میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا۔ میں نے سوچا کہ لاہور پہنچ کر اطمینان کے ساتھ اس بارے غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایسی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ طیارہ لاہور کی فضاؤں میں آ گیا اور لینڈنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

میں ایئر پورٹ سے باہر آیا تو سامنے ہی ذیشان اور فہد کھڑے تھے۔ دونوں کے چہروں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔ میں سامان دھکیلتا ان کے پاس آیا تو ذیشان میرے ساتھ

بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔

”ارے تم تو ذرا بھی نہیں بدلے ہو، کم از کم کوئی پلے بوائے قسم کی کوئی چیز تو دکھائی دیتے۔“

”میں کون سا کئی برس رہ کر آیا ہوں، محض ایک ہفتے میں کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں نے کہا اور فہد سے گلے ملا۔

”کیسا رہا ٹور؟“ اس نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

”نہ...... نہ...... ابھی ایک لفظ بھی نہیں، گھر چلتے ہیں۔ وہاں بہترین کھانا بنا ہوا ہے، فریش ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں چناں کتھاں گزاری ہے رات وے......“ یہ کہتے ہوئے اس نے بھرپور قہقہہ لگایا تو میں نے مسکراتے ہوئے سامان اٹھایا۔ فہد نے بیگ پکڑ لیا اور ہم گاڑی میں جا بیٹھے۔ راستے میں سفر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے شعیب کی تعریف کی تو ذیشان خوش ہو گیا کہ اس کی طرف سے کوئی غلطی کوتاہی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ہم گھر پہنچ گئے۔ جہاں ملازمین میرے انتظار میں تھے۔ ان سے فرداً فرداً ملنے کے بعد میں فریش ہونے کے لئے چلا گیا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے اور میں عشاء پڑھنے کے بعد ہی اپنے کمرے سے نکلا۔

خانساماں نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا۔ کھانے کے دوران پتایا میں کھانے کے حوالے سے باتیں چلتی رہیں۔ انہیں بتایا کہ مجھے حلال کھانا کیسے میسر آتا رہا۔ اس دوران ہمت سنگھ اور جند کور کا بھی ذکر ہوا۔ یہاں تک کہ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ذیشان نے کہا۔

”چل اب شروع ہو جا، ساری رنگین اور سنگین وارداتیں سنا دے، کہیں بھی ڈنڈی نہیں مارنی۔“

”دیکھو......! مجھ سے حلف لے لو، میں جو کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا، لیکن......! پہلے یہ سن لو کہ میں وہاں کس مقصد کے لئے گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”تم جو سناؤ، ہم سننے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہونا سارا سچ چاہئے۔“ فہد نے کہا تو میں چند لمحے خاموش رہا اور بولا۔

”جن دنوں میں نے مقابلے کا امتحان دینا تھا، ان دنوں نیٹ استعمال کرتے ہوئے ایک تھائی لڑکی میری دوست بن گئی، جس طرح دنیا میں کئی دوست بنے تھے۔ یوں کچھ ختم ہو گئے اور کچھ نئے دوست بنتے گئے، لیکن دو لوگ مستقل چلتے رہے۔ ان میں یہ تھائی لڑکی پی اون ہے اور دوسرا ارون درما ہے، جو ہے تو امرتسر کا لیکن ان دنوں لندن میں ہے۔ خیر......! یہ جو پی اون تھی، اس نے اسلام اور خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں اپنے انتہائی منفی خیالات کا اظہار

کیا۔ وہ باقی تو سب ٹھیک بات کرتی تھی، لیکن جیسے ہی اسلام اور مسلمان کی بات آتی تو مجھے لگتا جیسے ان دونا موں سے اسے چڑ ہے۔ وہ مجھ سے سوال کرتی اور میں سچ کہتا ہوں کہ ان سوالوں کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اگرچہ ایک سی ایس پی آفیسر تو بن گیا ہوں، لیکن اسلام کے بارے میں اور خصوصاً بنیادی تصورات کے بارے میں نہیں جانتا۔ مثلاً مجھے یہ تو معلوم تھا کہ فلاں شے حلال ہے اور فلاں حرام، لیکن اسلام نے انہیں کیوں حرام قرار دیا، ایک غیر مسلم کو یہ بات کس طرح سمجھائی جاسکتی ہے جو پہلے ہی متعصب ہو۔"

"تو کیا وہ بہت زیادہ متعصب تھی۔" ذیشان نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں......! دراصل، اس میں اس کا بھی قصور نہیں تھا، مغربی میڈیا اس قدر زوروشور سے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ الزام تراشی کر کے اسے ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور اس کے متبادل، مسلمانوں کی جانب سے ابھی تک اس طرح کا موثر دفاع نہیں کیا جارہا۔ تجزیہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے نا، جب دو موقف سامنے ہوں تو سچائی خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک خاص طرح کے ثقافتی حالات میں جب دن رات یہی بات کان میں پڑے کہ مسلمان بہت ظالم ہیں اور اہل مغرب بہت اچھے تو وہ مان لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی تھی۔"

"تمہیں اس تک پہنچنے کا خیال کیسے آیا؟" فہد نے پوچھا۔

"پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ اس کے پیچھے کوئی یہودی، عیسائی یا ایسا متعصب غیر مسلم ہے، جو باقاعدہ طور پر اسلام مخالف مہم چلا رہا ہے اور المیہ ہے کہ ایسا ہے، جنس کے نقاب میں ایسا متعصب گند پڑا ہوا ہے، جس سے کراہت آتی ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے وہ تھائی نہ ہو، کسی اور ملک میں بیٹھا ہو، نیٹ کی اندھی دنیا ہے۔ کوئی دیوار کے پیچھے بیٹھ کر آپ کو ہزاروں میل دور ہونے کی بابت کہہ سکتا ہے۔ میں اس تھائی لڑکی کے پیچھے کسی اور کو تلاش کرتے رہا، لیکن کامیاب نہ ہوسکا، مگر مجھے ضد تھی کہ میں اسے تلاش کر کے ہی رہوں گا، تب میں نے اسلام اور مسلمان کی بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تھائی لڑکی ہے۔" میں نے کہا اور سانس لینے کیلئے رکا تو ذیشان فوراً بول اٹھا۔

"اور تم صرف اسے دیکھنے کے لئے وہاں تک جا پہنچے۔"

"نہیں......! دراصل جب میں اسلام اور مغربی دنیا کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا تو قرآن پاک کی ایک آیت میرے سامنے آئی۔ یہ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 140 ہے کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا، جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔ تمہاری حرکات سے اللہ غافل نہیں ہے۔" میں نے کہا اور لمحہ بھر سانس لینے کے بعد کہا۔ "بس

اسی دن سے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام اور مسلمان کی عظمت اور اللہ کی گواہی میں اس لڑکی تک تو کم از کم ضرور پہنچاؤں گا، وہ لڑکی نہ بھی نکلے، کوئی مرد ہی ہو تب بھی میں اسے اللہ کی بات ضرور بتاؤں گا اور ہوتے ہوتے یہ وقت آ گیا۔"

"تو پھر تم وہاں پر تبلیغ ہی کرتے رہے ہو اور وہ آرام سے سنتی رہی۔" فہد نے انتہائی حقارت سے کہا جیسے وہ میری ساری بات کو جھوٹ کا پلندہ سمجھ رہا ہو۔

"ہاں......! میں گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا اور اس تک اللہ کا پیغام پہنچا آیا ہوں جو انتہائی تعصب سے میرے ساتھ جرح کرتی تھی۔" میں نے تحمل سے کیا۔

"یار اگر تم نے تبلیغ ہی کرنا تھی تو یہاں کرتے، یہاں جو مسلمان ہیں کیا وہ سچے اور کھرے مسلمان ہیں۔ پہلے ان کا کلمہ تو سیدھا کر لو اور تم چلے ہو غیر مسلم لڑکی کو تبلیغ کرنے، یار جھوٹ مت بولو۔" فہد نے اکتاہٹ سے اپنے دل کی بات کہہ دی، تو ذیشان نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔

"ویسے بلال......! اس کا کیا فائدہ ہوا ہے تمہیں، اتنا خرچ......"

"یار تم خرچ کیوں دیکھتے ہو، میرے پاس تھا، میں نے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور جہاں تک فائدے کی بات ہے، تم نہیں جانتے کہ میں اپنی ساری دولت خرچ کر کے بھی یہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا، جو مجھے حاصل ہوا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کو بھی وہ نعمت میسر نہیں جو مجھے مل گئی ہے۔"

"کیا خزانہ مل گیا ہے تمہیں۔" فہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کم از کم اتنا ضرور ہو گیا ہے کہ میں اب اہل مغرب سے مرعوب نہیں ہوں۔ مجھے یہ یقین آ گیا ہے کہ میرے پاس منبع علم وحکمت جو قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرنے کی قوت رکھتا ہے، وہ قرآن حکیم کی صورت میں میرے پاس موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب کے پاس تو کچھ بھی نہیں، وہ تو خود زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے اندر اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ اپنے بیگانے کسی کو نہیں دیکھتے۔ مجھے یہ عقل آ گئی ہے کہ اہل مغرب مادیت میں جہاں تک مرضی پہنچ جائیں وہ کولہو کے بیل کی مانند وہیں کے وہیں ہیں۔ انسانیت نام کی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ تم فائدے کی بات کرتے ہو، مجھے اپنی زندگی کا نصب العین مل گیا۔ مجھے مقصد مل گیا۔"

"دیکھو بلال......!" فہد نے کہا "تم اگر اپنی عیاشیوں کا احوال چھپانا چاہتے ہو نا تو مت بتاؤ؟ ہم قطعاً ضد نہیں کریں گے، لیکن یہ جو اسلام کے نقاب میں اپنے گناہ چھپا رہے ہو کم از کم یہ ظلم مت کرواپنے آپ پر، کیوں گنہگار ہوتے ہو۔"

"فہد......! میں نے تمہیں ایک ایک لفظ سچ بتایا ہے اور میری آئندہ زندگی اس بات کی گواہ ہوگی، جس پر میں ثابت قدم رہنے کی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو اسے موقع پر ذیشان نے ہمیشہ کی مانند مصلحت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"اچھا تو پھر تمہیں وہ لڑکی ملی۔"

اس نے پوچھا تو میں نے اختصار کے ساتھ اسے بتادیا کہ میں نے اسے کیسے تلاش کیا۔ فہد اس کے بعد نہیں بولا تھا، ذیشان ہی سوال و جواب کرتا رہا۔ اس نے جو پوچھا، میں نے ایمانداری سے سچ بتادیا۔ یوں رات کافی ہوگئی۔ سب کچھ سننے کے بعد فہد نے اپنے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہم نے تو یہ تمہاری کہانی سن لی، مگر کوئی اور اس پر اعتبار نہیں کرنے والا، لہٰذا کسی اور کو کہہ کر اپنا مذاق مت اڑوالینا۔ یہ میرا تمہیں مشورہ ہے۔"

"مجھے کسی اور کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، میرے بھائی! میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا ماما کے سامنے بھی جوابدہ نہیں ہو؟ اور ماما جی؟" فہد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ میرا معاملہ ہے، میں سنبھال لوں گا۔" میں نے کہا تو اس وقت شہر میں اذانِ فجر بلند ہوئی۔

"ساری رات بیت گئی یار۔" ذیشان نے کہا۔

"ہاں......!" میں نے ہنکارہ بھرا۔

"چل اب ہم چلتے ہیں، شام کو ملاقات ہوگی، ویسے تم گاؤں کب جارہے ہو؟" ذیشان نے پوچھا۔

"دو تین دن یہیں رہوں گا، پھر طویل چھٹی لیکر گلاب نگر، پھر اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" میں نے یونہی گول مول بات کی تو وہ دونوں اٹھ گئے۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے ذیشان سے کہا۔

"تمہارے لئے شعیب نے کچھ سامان دیا تھا، وہ تو لیتے جاؤ۔"

"لے لوں گا یار......! اب کہاں اٹھائے پھروں گا۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور باہر کی سمت چل دیا۔ میں ان دونوں کو دروازے تک چھوڑ کر آیا۔ وہ نکلے تو چوکیدار نے گیٹ بند کرلیا۔ تب میں ڈرائنگ روم میں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے سونا نہیں تھا، میں نے وضو کیا اور صبح کی نماز کے لئے جائے نماز بچھائی اور نماز پڑھنے لگا۔

جس وقت ماہا، دادا نور الٰہی اپنے ڈرائیور کے ساتھ بلال کے سرکاری گھر کے سامنے پہنچے تو صبح صادق کا وقت تھا۔ شہر بھر میں اذانیں ہوکر ختم ہوچکی تھیں اور مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن دیا تو چوکیدار فوراً ہی گیٹ پر آگیا۔ وہ آگے بڑھا اور پھر جیسے ہی اس نے پہچانا، فوراً ہی اس نے گیٹ کھول دیا، گاڑی پورچ میں جارکی۔ اس وقت اندر گھر میں بھی بتیاں روشن تھیں، جیسے یہاں کوئی سویا ہی نہیں ہے۔ اندرونی گیٹ کھولنے میں چند منٹ لگے اور وہ دونوں اندر آگئے۔

"بلال کہاں ہے؟" دادا نور الٰہی نے ملازم سے پوچھا، جس نے اندرونی گیٹ کھولا تھا۔

"جی، وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں گئے ہیں۔" ملازم نے ادب سے کہا۔

"تھوڑی دیر پہلے، مطلب؟" انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

"فہد صاحب اور ذیشان صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئے ہیں۔ اس لئے" وہ اسی ادب سے بولا۔

"اوہ......!" دادا نے کہا اور پھر بلال کے کمرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ، اسے بلا کر لاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ ملازم چلا گیا، چند لمحوں بعد ہی وہ واپس آگیا اور بولا

"جی......! وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد اطلاع دے دیتا ہوں۔"

اس نے کہا تو ماہا چونک گئی۔ اس نے تو پہلے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ یہ اب......" اس سے زیادہ وہ نہ سوچ سکی، اس کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا۔

"اچھا ہے، تم جاؤ۔" دادا نے کہا اور صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو ماہا نے کہا۔

"دادا جی......! میں دیکھوں ذرا، وہ واقعی ہی نماز پڑھ رہا ہے؟" اس کے لہجے میں انتہائی تجسس تھا۔ اس پر انہوں نے سر کا اشارہ کیا تو وہ بلال کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

اس وقت بلال سجدے میں تھا، جب ماہا اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک کونے میں جائے نماز بچھائے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ ماہا سیدھے اس کے بیڈ پر جابیٹھی اور وہ سامان دیکھنے لگی جو بلال اپنے ساتھ غیر ملک سے لایا تھا۔ تبھی اس کی نگاہ کونے میں دھرے بیگ اور سوٹ کیس پر پڑی، جس پر ائیر لائن کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ اس کی ساری توجہ اس جانب ہوگئی، یہیں سے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ کس ملک سے آیا ہے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بلال نے سلام پھیرا تو اس کی نگاہ ماہا پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سے جم کررہ گئی کہ وہ اس وقت یہاں کہاں؟ تاہم اگلے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پایا اور

اطمینان سے دعا مانگی اور پھر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسلام علیکم......! ماہا، تم یہاں؟''

''وعلیکم اسلام، میں ہی نہیں دادا ابو بھی ہیں، باہر بیٹھے ہیں۔'' اس نے خاصے غصے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ بلال نے ایک نگاہ اس کی جانب دیکھا اور پھر باہر کی جانب لپکا، ماہا کو فقط اتنا ہی موقع چاہئے تھا۔ وہ اطمینان سے اس سامان تک گئی، ٹیگ دیکھے، ''بنکاک سے کراچی'' پھر بیگ کھولا، اس میں سوائے کپڑوں کے کچھ نہیں تھا، پھر سوٹ کیس کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ سامنے ہی پیک کئے ہوئے سوٹ دھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا، ٹیلرز شاپ کے نام کے ساتھ پتایا، بنکاک لکھا ہوا تھا۔ چند منٹوں میں اس نے یہ جان لیا کہ بلال ملائیشیا نہیں بلکہ تھائی لینڈ کے شہر پتایا گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر دراز دیکھا جہاں پر پاسپورٹ کے ساتھ استعمال شدہ ٹکٹ بھی تھے، وہاں بھی اس کی تصدیق ہوگئی۔

''ہوں......! تو بلال نے جھوٹ بولا'' اس نے سوچا اور پھر باہر آگئی۔ جہاں وہ اپنے دادا کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

''بھئی کچھ بتا کے تو جاتے ہیں نا، صرف سوری کہہ دینے سے اتنے لوگوں کی پریشانی کا ازالہ ہو جاتا ہے؟''

''میں مانتا ہوں دادا ابو کہ آپ سب کو زحمت ہوئی، خیر......! چھوڑیں اس بات کو، کچھ کھائیں پئیں گے آپ؟'' بلال نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''ابھی نہیں، ابھی تو نماز پڑھوں گا، ماہا سے پوچھ لو۔'' دادا یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا تو بلال نے ملازم کو آواز دے دی تاکہ وہ دادا کا خیال کرے۔ تب اس نے ماہا سے پوچھا۔

''تم کچھ کھاؤ گی، بھوک تو لگی ہوگی۔''

''مجھے کھانا ہوا تو خود کھا لوں گی، تمہاری خاطر داری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شاید یہاں آتی بھی نا، اگر دادا ابو مجبور کر کے نہ لاتے۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''ماہا......! مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو، میں مانتا ہوں کہ تمہارا ناراض ہونا بجا ہے، لیکن اس میں کھانے پینے کا......''

اس نے کہنا چاہا تو ماہا نے پھر اسی لہجے میں بات کاٹ دی۔

''مجھے سے بات کرنے کے بجائے اگر آپ اپنے دادا کی خدمت کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں زیادہ دیر یہاں رکوں گی بھی نہیں۔ دادا جی نماز پڑھ لیں تو میں ان کے ساتھ پھوپھو کے ہاں جا رہی ہوں۔'' اس نے بالکل اجنبیوں کی مانند کہا تو بلال ایک لمحے کے لئے

گھوم کر رہ گیا۔ پھر بولا۔

''تمہاری مرضی، جو تم چاہو، لیکن ایسا ظلم تو مت کرو نا، ابھی تو ہم نے پوری زندگی ایک ساتھ گزارنی ہے۔ میں تو اس طرح کی ناراضگی افورڈ نہیں کر پاؤں گا۔'' اس نے مسکین سا لہجہ بناتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے اب ہم ایک ساتھ زندگی نہ گزار پائیں۔'' اس نے بلال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

''دیکھو، جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ اگر تمہاری جوڑی میرے ساتھ لکھ دی گئی ہے نا تو تمہاری کوئی مرضی نہیں چلے گی، ورنہ ہم لاکھ کوشش کر لیں تو ہماری شادی نہیں ہو سکے گی۔'' بلال نے انتہائی اطمینان سے کہا۔ ماہا کو بچپن ہی سے جانتا تھا، اس کی ناراضگی ایسے ہی تھی، جب تک وہ منتیں کرتا رہتا اس نے ناراض ہی رہنا تھا، جیسے ہی بلال بے رخی دکھاتا وہ فوراً مان جانے کے لئے رو دیتی تھی۔

''آسمان پر جوڑی لکھ بھی دی جائے تو ایک چھت تلے دو افراد کے رہنے کا نام ساتھ زندگی گزارنا نہیں ہوتا، ساتھ زندگی گزارنے کے لئے ہم خیال ہونا پڑتا ہے، میرا نہیں خیال کہ اب ہمارے درمیان کسی قسم کی کوئی ہم خیالی ہے۔'' ماہا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' بلال نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بلال۔'' ماہا نے کہا۔ اس سے پہلے کہ ان میں کوئی مزید بات ہوتی دادا نے ڈرائنگ روم میں آ کر کہا۔

''بھئی ماہا......تم چاہو تو جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو بیٹا، اتنا سفر کر کے آئی ہو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔''

''نہیں دادا ابو، میں اب پھوپھو نجمہ کے گھر جا کر ہی آرام کروں گی، آپ نماز پڑھ لیں تو چلیں۔ اس نے پھر اجنبی سے لہجے میں کہا تو بلال نے پھر چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ یہ وہ ماہا تو نہیں ہے جو چند دن پہلے تھی۔

''آ......آ...... چھا...... جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔'' دادا نے غور سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گیا۔ اس پر بلال نے چند لمحے اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

''ماہا......! یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''مجھے نہیں، تمہیں کچھ ہوا ہے۔ اپنے رویے پر غور کرو، پھر بعد میں مجھ سے بات کرنا، جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' ماہا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اب

غصہ چھلکنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے ماہا، ہم اس پر بعد میں بات کرتے ہیں۔ فی الحال تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔'' بلال نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر ایک کمرے میں چلی گئی۔ تب اس نے ملازم کو چند ہدایات دے کر اپنے کمرے کی راہ لی کہ وہ کچھ دیر سو جانا چاہتا تھا، تاکہ پھر سارا دن دادا اور ماہا کے ساتھ گزار سکے۔ ماہا نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اسے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ بلال اپنے کمرے میں چلا گیا ہے۔

میری آنکھ کھلی تو صبح کے نو بج چکے تھے۔ مجھے اس دن دفتر لازمی جانا تھا، اس لئے دیر ہو جانے کے احساس سے میں فوراً اٹھ گیا۔ میں تیار ہو کر باہر آیا تو گھر میں سناٹا تھا۔ میں نے ملازم سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئے ہیں۔''

اس کے جواب پر میں سوچنے لگا کہ ماہا کہیں ضرورت سے زیادہ نہیں غصہ دکھا رہی ہے۔ اسے اگر اپنی ناراضگی دکھانا ہی تھی تو مجھ سے بات کرتی۔

''اچھا ٹھیک ہے، جلدی سے ناشتہ لاؤ، مجھے دفتر جانا ہے۔'' میں نے ملازم سے کہا تو وہ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا اور میں نے سیل فون سے ماہا کا نمبر ملایا۔ اس نے بجائے سننے کے میرا فون کاٹ دیا۔ جب میں نے دو تین بار مزید کوشش کی تو اس نے اپنا فون ہی بند کر لیا۔ تب جانے کیوں مجھے یہ خیال آنے لگا کہ ضرور کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے، ورنہ ماہا اس قدر ناراض نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسے میرے ساتھ بات تو کرنی چاہئے کہ وہ ناراض کس معاملے میں ہے؟ میں اس کی وضاحت کرتا، معذرت کرتا یا پھر جو وہ چاہتی، یوں منہ پھلانے کا کیا فائدہ؟ تبھی ناشتہ آ گیا اور میں نے ناشتہ کر کے آفس کی راہ لی۔ دفتر کا وقت ختم ہوا تو ظہر ہو چکی تھی۔ میں نے وہیں دفتر میں نماز ادا کی اور وہاں سے نکلتے وقت فہد کو فون کیا۔

''ارے یار......! ماہا کدھر ہے؟''

''میرے اور ماما کے ساتھ، ہم بازار میں ہیں، شاپنگ کر رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور دادا ابو......!'' میں نے پوچھا۔

''وہ ادھر گھر میں ہیں۔'' اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

''اچھا یار......! جیسے ہی تم بازار سے نکلو تو مجھے فون کر دینا، میں پھر آپ لوگوں کے

ہاں آ جاؤں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔

''ماہا سے بات کرو گے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں......!'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے بھی اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں گھر پہنچا تو عصر کا وقت ہونے والا تھا۔ سردیوں میں ویسے بھی دن چھوٹے ہوتے ہیں اور نماز کا وقت قریب قریب ہونے لگتا ہے۔ میں نے نماز پڑھی اور لان میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے پی اون میرا انتظار کر رہی ہو۔ مجھے کمپیوٹر پر ہونا چاہئے۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھا اور اپنے کمپیوٹر کے پاس گیا اور اسے آن کر دیا۔ میری توقع کے مطابق پی اون آن لائن تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو اس کی طرف سے یکے بعد دیگرے پیغام آنا شروع ہو گئے۔ تان اس پر آ کر ٹوٹی کہ اس کے پاس میرا پاکستان کا فون نمبر نہیں تھا، ورنہ وہ کال کر لیتی۔

''شعیب سے لے لینا تھا۔''

''اوہ......! یہ مجھے خیال نہیں رہا، ویسے وہ بہت اچھا ہے۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا۔ میں اسی لیپ ٹاپ سے آن لائن ہوں، جو ان نے مجھے لے کر دیا، کیا تم نے اس کی ادائیگی کر دی تھی؟''

''ہاں، کر دی تھی۔'' میں نے پیغام بھیجا اور پھر وہ ساری تفصیلات شیئر کرنے لگا کہ میں کس طرح پاکستان آ کر لاہور پہنچا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ کس طرح پتایا پہنچ گئی تھی۔ مغرب کے وقت میں نے اجازت چاہی تو اس نے خود کو لاگ آف کر لیا۔ میں اٹھا اور نماز پڑھنے لگا۔

''نماز پڑھنے کے بعد میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فہد کو فون کروں، تبھی ذیشان آ گیا۔ اسے شاید نہیں معلوم تھا کہ گاؤں سے دادا جی آئے ہیں۔

''تم بتا دیتے نا یار، اور اب فہد نے بھی نہیں بتایا، مگر میں تو اپنے وعدے کے مطابق آ گیا ہوں۔'' اس نے صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چل اچھا کیا، میں بھی اسی کے فون کا منتظر ہوں، ویسے اسے فون کر دینا چاہئے تھا، ذرا پوچھو، کہاں ہے وہ؟'' میں نے ذیشان سے کہا تو اس نے فون کر دیا۔ وہ کب کا گھر پہنچ چکا تھا، لیکن اس نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔

''اچھا یار......! جب فون کرے گا تو چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور ملازم سے چائے اور سوٹ کیس لانے کو کہا۔ وہ لے آیا تو میں نے سوٹ کیس کھولا اور تحفے الگ الگ کر

لئے، پھر جب سوٹ کیس میں ڈال کر اسے دیا تو ذیشان نے یونہی کہا۔ ''ارے یہاں پر ایر
لائن کا ٹیگ نہیں ہے اور بیگ پر دو دو ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔'' میں نے دیکھا تو اس پر سے ٹیگ
گیا تھا، مطلب کسی نے اتار لیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ تقریباً عشاء کے وقت ذیشان
اٹھ کر چلا گیا۔ میرا ابھی باتیں کرنے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ دادا ابو کی وجہ سے میرا دل چاہ رہا تھا
کہ میں ابھی اٹھوں اور سیدھا ان کے ہاں جا کر انہیں یہاں لے آؤں، لیکن درمیان میں ماہا تھی
اور پھر فہد نے بھی تو فون نہیں کیا تھا۔ سو میں نے رات کا کھانا کھایا اور عشاء پڑھنے کے بعد
اپنے بیڈ پر آ گیا۔ میں سو جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں الطاف انور کا فون آ گیا۔

''بلال بھئی کیا حال ہے تمہارا، بڑے فارن ٹور لگ رہے ہیں۔'' اس نے اگرچہ
عام سے لہجے میں بات کی تھی لیکن اس میں چھپے ہوئے طنز کو میں بخوبی سمجھ گیا تھا۔ پھر اس کے
لہجے میں ایک آفیسرانہ تحکم بھی تھا۔

''میں جی بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن ٹور والی بات کا تم نے جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر اسی لہجے میں بات کی۔

''بس جی لگ گیا ٹور، رات گئی بات گئی۔'' میں نے بھی قدرے اکھڑے ہوئے
لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن تم گئے کہاں تھے۔ تمہارے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ تم کسی بھی
سرکاری ٹور نہیں گئے۔'' اس نے کھوج لگانے کی کوشش کی۔ تب میں سمجھ گیا کہ دفتر میں یہ بات
ہوئی تھی۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کھوج کس سے لگوائی تھی۔

''میں نے کب کہا تھا کہ میں سرکاری ٹور پر جا رہا ہوں۔ آپ سے کس نے کہا؟''
میں نے پوچھا۔

''نہیں......! وہ مجھے پتہ چلا تھا بھئی۔'' اس نے جواب دیا۔

''خیر......! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے بھی جان چھڑائی۔

''میں ذاتی معاملات میں تو دخل نہیں دے سکتا، لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں نا کہ
دوسرے سب پریشان تھے۔'' اس نے بات کو نیا رخ دے دیا۔ اس کا لہجہ چبھنے والا تھا۔

''یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ پریشان ہوئے۔ اس طرح مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ
کون مجھے چاہتا ہے اور کون نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے یونہی کہہ دیا۔ اب میرا ارادہ اسے
زچ کرنے کا تھا۔ اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ بہت کائیاں تھا۔ سمجھ گیا کہ اب ہتھے سے
اکھڑ سکتا ہوں۔ مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ صرف اس سے کھیلنے کا ارادہ تھا۔ تب وہ بولا۔

''نہیں......! اگر کہیں سرکاری ٹور لگانا ہو تو بتا دیتے ہیں نا، بندہ کہہ سن کر نام ڈلوا دیتا
ہے۔ یہاں لوگ عمرہ سرکاری خرچ پر کر آتے ہیں۔ چلو خیر......! لو یہ اپنے دادا ابو سے بات
کرو۔'' اس کے تھوڑی دیر بعد دادا ابو کی آواز سنائی دی۔

''بلال میاں......! تم ایسے کرو کہ تیار ہو جاؤ، پھر ہم اکٹھے ہی گلاب نگر کے لئے
نکلتے ہیں۔''

''کیا آپ نے آج ہی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میں نے حیران ہوتے
ہوئے پوچھا۔

''یہی صبح فجر کے بعد نکل جائیں، یہی تین چار گھنٹے کا تو رستہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن دادا ابو......! میں کم از کم دو دن مزید یہاں سے نہیں جا پاؤں گا۔'' مجھے کچھ
دفتری معاملات کے لئے ادھر رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد میں نے پھر گاؤں آ ہی جانا ہے۔''
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ بات ضروری ہے'' انہوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''جی......! میں نے پاکستان سے باہر جانے کی چھٹیاں لیں تھیں نا، اب حاضر
ہونے کے بعد کا معاملہ ہے، آپ کے پاس بہت بڑے آفیسر بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں۔''
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے نرم پڑتے ہوئے بولے۔

''چلو اچھا، ٹھیک ہے، دو دن بعد آ جانا، ہم سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں
نے کچھ بہت ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔''

''ٹھیک ہے دادا ابو، میں آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو فون بند کر دیا۔ تب میرے دل
میں ایک ذرا سی ٹیس پہنچی۔ کیا دادا ابو صرف ماہا کے لئے وہاں رہنے پر مجبور تھے؟ ماہا نے اس قدر
بے رخی کیوں ظاہر کی ہے کہ بالکل اجنبی بن گئی ہے؟ آخر ان چند دنوں میں کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا
کہ اس نے مجھے فون تک نہیں کیا، وہ کیوں؟ یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوال میرے
ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ بھاری ہو رہا ہے۔ میں
نے سب کچھ ذہن سے نکالا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب ایسے معاملات تھے جن پر
مجھے سوچنا تھا، میرے کرنے کے تو اور بہت کام ہیں۔ مجھے تو ان پر سوچنا ہے۔ میں ان پر
سوچ کر بھلا کیوں ضائع کروں۔ میں پرسکون ہو کر سو گیا۔

دوپہر سے ذرا قبل دادا انور الٰہی گلاب نگر پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر انتہائی درجے

کی افسردگی طاری تھی۔ وہ چپ چاپ سے آ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ تبھی زبیدہ خاتون چائے لئے ان کے پاس آئی تو چونک گئی۔ ان کی اس طرح خاموشی میں بلاشبہ کوئی ایسا پیغام تھا جو دوسروں کو بھی افسردہ کر سکتا تھا۔ زبیدہ خاتون نے کوئی بات نہیں کی اور چائے بنانے لگی، اتنی دیر میں افضال نور بھی آ گیا۔ وہ بھی اپنے والد کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"ابا جی......! آپ بلال کو ساتھ نہیں لے کر آئے، وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

اس سوال پر زبیدہ خاتون نے نورالٰہی کی جانب یوں دیکھا جیسے اس کے دل میں بھی یہی کچھ ہے اور وہ شدت سے پوچھنا چاہ رہی ہے۔ تبھی نورالٰہی نے ایک طویل سانس لی اور دونوں کی جانب دیکھ کر کہا۔

"اللہ کے فضل و کرم سے بلال بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اسے دفتر میں اہم نوعیت کی مصروفیت تھی۔ اس لئے وہ نہیں آ سکا۔ کہہ رہا تھا کہ دو تین دن بعد آ جائے گا۔" اس نے کہا اور زبیدہ خاتون کی طرف سے بڑھایا کپ تھام کر میز پر رکھ دیا۔

"ویسے اسے آنا چاہئے تھا، ایک دن کے لئے ہی آ جاتا؟" افضال نے یونہی عام سے لہجے میں کہا۔

"نہیں......! اس کے لئے یہ دو تین دن ضروری تھے۔ پھر وہ طویل چھٹیاں لے کر آ جائے گا۔" نورالٰہی نے کہا اور پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر بولا۔ "اچھا ہوا افضال تم ابھی آ گئے ہو ورنہ میں نے تمہیں بلوانا تھا۔ اب تم دونوں ہی بیٹھے ہو، میں ایک بہت ہی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے ابا جی۔" افضال نے چونکتے ہوئے کہا۔

"بلال کے بارے میں ہم یہ جو سنتے رہے ہیں کہ وہ کسی سرکاری ٹور پر باہر کے ملک گیا ہے، ویسا نہیں تھا، وہ اپنے کسی کام سے گیا تھا اور اب واپس آ گیا ہے، لیکن اس دوران کچھ ایسا ہوا ہے کہ ماہا اپنے بلال سے بہت زیادہ متنفر ہو چکی ہے۔" دادا نے کہا تو زبیدہ خاتون نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور بولی۔

"ہائیں......! یہ کیا بات ہوئی، وہ ایسا کیوں کرے گی۔"

"اصل میں وہ چند دن پہلے ہی اپنے ان جذبات کا اظہار میرے سامنے کر چکی ہے۔ اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ وقتی اشتعال ہے، بلال کے آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نور پور گیا ہوا تھا کہ بلال کے آنے کی خبر ملی، جس پر ماہا نے فوراً وہاں جانے کی بات کی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ چلو دونوں باتیں واتیں کر کے اپنا غصہ نکال لیں گے۔ پتہ نہیں ان کے

درمیان کیا بات ہے، لیکن......!" یہ کہہ کر نورالٰہی چند لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس پر افضال نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن کیا ابا جی!"

"لیکن......! میں نے وہاں دیکھا، ماہا کی نفرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ تو تھوڑی دیر بھی وہاں نہیں رہی۔ وہاں سے نجمہ کے گھر چلی گئی۔ میرے خیال میں بلال نے اسے فون کرنے کی بھی کوشش کی تھی، لیکن اس نے بات تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ جس پر بلال بھی نجمہ کے گھر نہیں آیا۔ اب جبکہ ان دونوں کی شادی کو دو تین ہفتے رہ گئے ہیں، ان دونوں کا رویہ ناقابل فہم ہے، میرا نہیں خیال کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔"

"وجہ معلوم ہوئی؟" افضال نے انتہائی اختصار سے پوچھا۔

"ہاں......! ماہا نے جو وجہ بتاتی ہے، وہ مجھے معلوم ہے۔" نورالٰہی نے مایوسانہ لہجے میں یوں کہا جیسے اسے بہت افسوس ہو۔

"کیا وجہ ہے؟" زبیدہ خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

"ماہا کے خیال میں بلال ایک انتہا پسند، بنیاد پرست اور کٹر قسم کا مسلمان بن چکا ہے، جسے مذہب سے لگاؤ ہے۔ اسی باعث اس کی سرگرمیاں خفیہ ہو گئی ہیں۔ وہ ایسے کسی شخص کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے چند دن پہلے جو ماہا نے بلال کے کمرے میں کہا تھا، وہ سب کہہ دیا۔

'اصولی بات یہ ہے کہ ابا جی، کہ یہ الزام جو ماہا لگا رہی ہے، ہمارے لئے فخر کی بات ہے اور دوسری بات کہ جب تک ماہا کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے کہ جس ذہنیت کے تحت وہ بلال کو انتہا پسند، بنیاد پرست اور کٹر قسم کا مسلمان کہہ رہی ہے، ویسا کچھ ہے بھی یا کہ نہیں؟" افضال نے پوچھا۔

"آج جب ہم لاہور سے واپس آ رہے تھے۔ تب اس نے بتایا کہ وہ جان گئی ہے کہ بلال جھوٹ بول کر کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔ وقت آنے پر وہ سب کچھ واضح کر دے گی۔ اس کا مطلب ہے وہ کچھ نہ کچھ تو جانتی ہو گی۔ کوئی ایسی بات ہے ضرور کہ دونوں میں اتنا فاصلہ آ گیا ہے۔" نورالٰہی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، تو زبیدہ خاتون بولی۔

"یہ جو بلال کے کمرے میں رہتی رہی ہے، تو اس کا مطلب ہے، اس کے بارے میں تفتیش کرتی رہی۔ چلیں یہ اس کا حق مان لیتے ہیں، لیکن بجائے بلال پر اعتماد کرنے کے، اس نے بذات خود پوچھنے کے، وہ خود ہی فیصلہ دے رہی ہے، آج اس کا یہ حال ہے تو پھر کل وہ کیا

کرے گی۔ میاں جی، آپ اس طرف بھی تو غور کریں۔''

''یہی.....یہی.....اس بات سے میں ڈرتا ہوں۔'' نور الٰہی نے کہا۔ پھر اپنا سارا خوف ان دونوں کے سامنے رکھ دیا کہ وہ ان دو خاندانوں کو الگ الگ نہیں دیکھنا چاہتا۔

''ابا جی.....! اس طرف سے تو آپ بے فکر رہیں، آپ کے ہوتے ہوئے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا اور نہ ہی مجھے ایسا کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس معاملے کو بخوبی حل کرلیں گے، لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے رشتے زور زبردستی کے نہیں ہوتے۔ یہ تو ہمارا اپنا خیال ہے نا کہ دو تین ہفتے بعد شادی ہوگی، اچھا ہوا کہ دن طے کرنے سے پہلے یہ بات سامنے آ گئی۔ آپ اس پر تحقیق کریں۔ جب اطمینان ہو جائے تو پھر فیصلہ کرلیں۔'' افضال نے بہت تحمل کے ساتھ بڑے ادب سے کہا۔

''تمہاری بات بہت معقول ہے، مجھے خوشی ہوئی بیٹا، لیکن اگر ایسے ہی جذبات احسان کے بھی ہوں نا تو پھر میں ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہوں۔ احسان یا ذکیہ کے جذباتی پن کے باعث یہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔'' نور الٰہی نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں میاں جی، معاملہ جس طرح ہے اسی طرح چلتے رہنا چاہئے۔ ہماری جانب سے کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے کہ ہمیں کسی قسم کا کوئی اعتراض ہے۔ اگر ماہا کو کوئی اعتراض ہے تو وہ خود بول پڑے گی، تب وہ اس کا جواز بھی دیں گے۔ میرے خیال میں میاں جی کی دخل اندازی کا وقت ہی وہی ہے۔ ہم کیوں خواہ مخواہ واویلا کرتے رہیں، اللہ خیر رکھے، دو چار دن کی بات ہے، بلال پتر بھی آ جائے گا۔ اس سے بات کریں گے۔ اب یہ تو کوئی الزام نہ ہوا نا کہ وہ کٹر مسلمان کیوں ہے؟'' زبیدہ خاتون جواب تک بھری بیٹھی تھی یوں کہتی چلی گئی جیسے اپنا اندر جمع کی ہوئیں ساری باتیں کہہ دینا چاہتی ہو۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے بہو، اس میں فقط ایک رسک ہے کہ احسان کہیں غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔'' نور الٰہی نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''غلط فہمی ماہا کو ہے، اور میرا خیال ہے کہ جب اس کے سارے وہم دور ہو جائیں گے تو پھر کوئی ایسی رکاوٹ نہیں رہے گی، بلال کے آتے ہی ہم اس سے بات کریں گے اور جس طرح طے ہے، اسی طرح دن لینے کے لئے جائیں گے اور شادی بھی ویسے ہی کریں گے جیسے ہم نے سوچ رکھا ہے۔'' زبیدہ خاتون نے اپنی رائے دی۔

''ٹھیک ہے، ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی معاملہ ہوا تو اسے بہر حال طے کرلیں گے۔'' نور الٰہی نے حتمی سے انداز میں کہا اور سامنے دھری چائے کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ اس

وقت تک یخ ہو چکی تھی۔

''لائیں میاں جی، میں نئی بنا کر لے آتی ہوں۔'' زبیدہ خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہ رہنے دو بہو، اب کھانا ہی کھاؤں گا، میں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔'' یہ کہتے ہوئے نور الٰہی اٹھ گیا اور اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ تب افضال اپنی ہی سوچوں میں گم ہو گیا۔ اسے تشویش ہو رہی تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس پر زبیدہ خاتون نے اس کے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولی۔

''مت سوچیں، اللہ بہترین کارساز ہے۔'' اس پر افضال مسکرا کر رہ گیا۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ مغربی افق پر سیاہی مائل نارنجی روشنی مزید گہری ہو گئی تھی۔ میں نے ایک نگاہ مغربی افق پر ڈالی۔ بادلوں کے باعث شام جلدی ہو جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے لاشعوری طور پر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ میری کوشش تھی کہ میں مغرب کی نماز گلاب نگر میں جا کر ادا کروں۔ تاہم اس میں رسک تھا، ممکن ہے دیر ہو جاتی، میں نور پور پہنچ چکا تھا، لیکن مغرب میں ابھی تھوڑا وقت تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ مغرب یہیں پڑھ کر اطمینان سے گلاب نگر جاؤں۔ میں نے نور پور پار کیا اور باہر کی جانب گلاب نگر کے راستے پر ایک چھوٹی سی مسجد کے سامنے گاڑی روک دی۔ اس وقت میں عام سے لباس میں تھا۔ میں مسجد میں داخل ہو گیا۔ ابھی جماعت ہونے میں کچھ وقت تھا۔ میری نگاہ کونے میں بیٹھے ایک باریش بزرگ پر پڑی جو بڑے جذب کے عالم میں اپنے سامنے بیٹھے چند لوگوں سے بات کر رہے تھے۔ میں بھی وقت گزاری کے لئے ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس نورانی چہرے والے بزرگ نے ایک بار میری جانب دیکھا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔

''تو میں کہہ رہا تھا اس جہان میں آنا، اس جہان کی زندگی کا مقصد امتحان ہے، لیکن ایسا بھی کڑا امتحان نہیں کہ دنیا کی نعمتوں سے منہ موڑ لیا جائے۔ اگر ہمیں ایک مادی وجود دیا ہے تو اس کی ضروریات بھی تو ہیں۔ ان کو بھی پورا کرنا ہے اور اللہ سے تعلق بھی جوڑنا ہے۔ ظاہر ہے اس میں کشمکش درپیش ہے.....اب یہی کشمکش دو طرح کی ہے، صرف دنیا کو حاصل کرنے کے لئے یا محض اللہ سے تعلق جوڑنے کے لئے۔ اسلام میں انتہا پسندی نہیں بلکہ اعتدال پسندی ہے۔ دنیا کی نعمتوں سے دو طرح سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، ایک اپنی مرضی سے اور دوسری اللہ کی مرضی سے۔ اس کشمکش کو لے کر، دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہو جانے کے بعد اس امتحان سے گزرنا ایک کردار تخلیق کرتا ہے، ہمارا اپنا کردار، اعمال ہی کسی کا کردار تخلیق کرتے ہیں۔ اب جو کردار اللہ کی رضا کے مطابق ہو گا، وہ امتحان پاس کر لے گا.....اس لئے ہمارے بزرگوں

نے...... تصوف کی تعلیم دی، جس کی روح عشق ہے، عشق کے بنا تصوف کا ادراک بھی ممکن نہیں ہے۔ تصوف کی تعلیم کا مقصد صرف اور فقط اللہ اور اس کے رسولؐ سے رابطہ اور ناطہ مضبوط کرنا ہے۔ تا کہ اپنے آپ میں ایک کردار بنائیں جس سے یہ ظاہر ہو یہ اللہ کی رضا اور نبی آخر الزماںؐ سے تعلق والے ہیں۔ ان کا مقصود جو کردار ہے، وہ ہم بن جائیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چند لمحے سانس لی پھر بولے۔ ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کردار کیسا ہے؟ اچھا بھی ہے یا نہیں، یہ ایک فطری سوال ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آخر ہم ایسا کردار کیوں بنائیں، ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس کے لئے ہمیں ان لوگوں کی جانب دیکھنا ہوگا، جنہوں نے اپنا کردار ایسا بنایا جو اللہ اور نبی رحمتؐ کو پسند تھا یا وہ ایسا کردار چاہتے تھے۔ صحابہ اکرامؓ کو دیکھیں، تابعیؒ، تبع تابعینؒ کو دیکھیں اور پھر آج تک کہ ان لوگوں کو دیکھیں، جن کا کردار ایسا تھا تو ہمیں سب کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ جس طرح قرآن پاک رہتی دنیا تک ہے۔ نبیؐ کی تعلیمات و فرمودات قیامت تک محفوظ ہیں۔ اسی طرح کردار کی تخلیق بھی قیامت تک ہوتی رہے گی۔ جس نے اپنا یہ کردار بنا لیا وہ کامیاب ٹھہرا۔ میں زیادہ دور کی مثال نہیں دیتا، اسی موجودہ زمانے کی مثال دیتا ہوں۔ حضرت اقبالؒ ایک شاعر ہو گزرے ہیں۔ فرماتے ہیں ''فقر کی سان پر جب چڑھتی ہے تیغ خودی...... ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ'' یہ محض شعر نہیں ایک زندہ حقیقت ہے اور وہ حقیقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ سرکار کو کتنا عرصہ ہو گیا اس ہندوستان میں آئے ہوئے۔ ان کی لگائی ہوئی ایک ضرب سے کیا ہوا نسل در نسل لوگ مسلمان ہو گئے اور تب سے اب تک مسلمانوں کی تعداد کیا ہے۔ اسے کہتے ہیں تیغ خودی کی ضرب جو لگائی گئی ہے تو آج تک چلتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کے مقابلے میں سپاہ تیار ہو گئی ہے۔ یہ ہے کروار اور اس کا فائدہ کہ پھر ایسے کردار کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اختتامی کلمات کہے...... ''آئیں دعا کریں، اللہ پاک ہمیں اپنی رضا کے مطابق ڈھلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!'' یہ کہہ کر انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے تو لوگ دھیرے دھیرے اٹھنے لگے۔ میں گم سم بیٹھا انہی کے لہجے کی سوچ رہا تھا جیسے ان لفظوں میں ڈوب گیا ہوں۔ تبھی ان بزرگوں نے ذرا سا آگے بڑھ کر میری جانب مصافحہ کے انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے عبدالعزیز کہتے ہیں، بیٹا......! آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔'' ایسا شیریں لہجہ کہ میں بے خود ہو گیا۔

''جی...... میں...... بلال...... میرا نام بلال نور ہے......'' میں نے کہا تو وہ زیر لب

مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بھئی بڑا خوبصورت نام ہے...... اس نام سے عشق ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ بلال...... عشق...... نور...... واہ۔'' وہ بھی بے خود ہو کر جھوم گئے پھر بولے۔'' کیا مسافر ہو بیٹا، پہلی بار ادھر دیکھا ہے۔''

''مسافر ہوں بھی اور نہیں بھی...... کیا آپ ادھر ہی ہوتے ہیں......'' میں نے یونہی اپنے بارے میں چھپاتے ہوئے ان سے پوچھا۔

ہاں بیٹا......! بس یہیں پڑا رہتا ہوں، یہ دوست مجھے ملنے کے لئے آ جاتے ہیں۔ آپ بھی ملنا چاہو تو میرا ٹھکانہ یہی ہے۔'' وہ بولے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا ''آؤ......! وضو کر لیں، اذان ہونے والی ہے۔'' تب ہم دونوں ہی وہاں سے اٹھ گئے۔

نور پور سے نکلتے وقت ماہا سے ملنے کی خواہش میرے دل میں تھی، لیکن اس کا رویہ بہت زیادہ دلبرداشتہ کر دینے والا رہا تھا۔ میں ماہا سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا، جب میں ان وجوہات کے بارے میں نہ جان لینا، جس کی بناء پر اس کا رویہ ایسا تھا۔ یونہی غصہ عود کر آنے لگا تو میں انہی بزرگ کو یاد کرنے لگا جو مجھے آج بے خود کر گئے تھے۔ میں گلاب نگر پہنچ گیا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے میں سیدھا کچن کی جانب گیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ امی اس وقت وہیں ہوں گی۔ وہ وہیں تھیں۔ بڑے بھرپور انداز میں ملیں اور پھر مجھے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

''مجھے پتہ تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔ اس لئے آج میں سارے کھانے تمہاری پسند کے بنائے ہیں۔''

''اس کشش کو تو ممتا کہتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو رشتوں پر سے اعتبار اٹھ جائے۔ خیر......! کیسی ہو آپ؟'' میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ پریشان تو نہیں ہوئیں تھیں۔'' میں نے شرارت سے پوچھا۔

''میری پریشانی کو چھوڑ، لیکن تیرے اس جھوٹ نے بہت کچھ ڈسٹرب کر دیا ہے۔ خیر......! چھوڑو ان باتوں کو، پہلے اپنے باپ سے ملو، دادا جی سے ملو، پھر بیٹھ کر باتیں ہوں گی، جاؤ شاباش فریش بھی ہو جاؤ۔'' امی نے کچھ اس قدر پیار سے کہا کہ ساری تھکان دور ہو گئی۔

میں دادا جی کے کمرے میں گیا تو ابا جی وہیں موجود تھے۔ نجانے ان کے درمیان کیا بات چل رہی تھی کہ مجھے دیکھ کر اچانک خاموش ہوئے اور میری جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان کی وہ حیرت میرے دماغ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے کئی بار انہیں سرپرائز دیا تھا۔ میں دونوں سے باری باری گلے ملا اور پھر ابا جی کے ساتھ ہی پڑی دوسری

کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سفر کیسا رہا بلال......!'' ابا جی نے یوں رسمی طور پر پوچھا جیسے بات کا آغاز کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی اور بات نہ ہو۔

''جی! بالکل ٹھیک گزرا......'' میں نے یوں کہا جیسے انہوں نے پوچھا تھا۔

''اچھا، تم ایسے کرو، فریش ہو جاؤ، پھر کھانے کے بعد باتیں کرتے ہیں۔'' انہوں نے بڑے تحمل سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس وقت کوئی اہم بات کر رہے ہوں گے، جو بہرحال میرے سامنے نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

حویلی کا وہ حصہ بالکل بدل چکا تھا۔ رنگوں کا امتزاج بہت اچھا تھا اور نگاہوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اس میں فقط میرا کمرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ اس سارے ماحول سے بالکل اجنبی ہو۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ کتابوں کی ترتیب وہ نہیں تھی جو میں نے لگائی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہاں کی ہر شے کی تلاشی لی گئی ہو۔ اسی شک کے تحت میں نے کئی جگہیں دیکھیں، وہاں میرے شک کو تقویت ملتی گئی۔ پھر میں نے کمپیوٹر کو چلایا تو وہاں پاس ورڈ نہیں تھا، سیدھے سبھاؤ کھل گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بعد اس کمرے کی تلاشی ضرور کی گئی ہے، یہاں تک کہ کمپیوٹر کو بھی کھنگالنے کی کوشش کی گئی۔ ایسا کون کر سکتا ہے؟ فوری طور پر میرے ذہن میں فقط دو ہی نام آئے، فہد اور ماہا۔ ان کے علاوہ کسی اور تیسرے بندے کو اس کی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ انہیں کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ انہی لمحات میں رقیہ کمرے میں آ گئی۔

''بھائی جان آپ آ گئے؟ اسلام علیکم!

''وعلیکم اسلام!'' میں نے اسے پیار دیتے ہوئے کہا اور پوچھا ''رقیہ......! اس کمرے کی تلاشی کون لیتا رہا ہے۔''

''تلاشی تو نہیں......! ماہا کتابیں وغیرہ دیکھتی رہتی تھی۔ وہ جب آتی تھی تو اسی کمرے میں رہتی تھی۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا۔ اسی کی کارروائی ہو سکتی ہے، کیونکہ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کمرے کی کسی شے کو نہ چھیڑے۔ شاید اسی ضد میں اس نے یہ کمرہ کھنگالا تھا۔

''اور کمپیوٹر بھی خراب ہوا تھا۔''

''پتہ نہیں، ایک دن ماہا سے چل نہیں رہا تھا تو فہد بھائی نے انہیں چلا کر دیا تھا۔''

رقیہ اپنی فطری سادگی میں کہتی چلی گئی۔

''ماہا اور فہد؟'' میں بڑبڑاتے ہوئے سوچنے لگا تو کئی سارے خیال ایک دم سے

میرے ذہن میں آتے چلے گئے۔

''آپ میرے لئے فارن سے کیا لائے ہیں بھائی؟'' رقیہ نے بچوں کی طرح سامان کی جانب دیکھ کر پوچھا تو میں ہنس دیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے چندا......! میں کسی کے لئے بھی کچھ نہیں لے کر آیا۔ ہاں مگر اب تم جو بھی فرمائش کرو، میں وہ ضرور پوری کروں گا۔'' میں نے اس کے اترے ہوئے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یقین جانو......! مجھے وقت نہیں ملا، یہ شاپنگ وغیرہ کرنے کا''۔

''چلو کوئی بات نہیں، لیکن میں وہ چیز ابھی نہیں بتاؤں گی جو میں نے مانگنی ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔'' اس نے ایک دم سے مانتے ہوئے کہا۔

''چلو، ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو واپس چلی گئی اور میں فریش ہونے کے لئے باتھ روم میں چلا گیا۔

میں عشاء کی نماز پڑھ کر ہی اپنے کمرے سے نکلا تو کھانا لگ چکا تھا۔ کھانے کے دوران مجھ سے کسی نے بھی فارن ٹور کے بارے میں نہیں پوچھا۔ بس یونہی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، جیسے میرے اتنے دنوں کی غیر حاضری ان کے لئے معمول کی بات ہو۔ امی نے اس دن کھانا خوب بنایا تھا۔ میں نے جی بھر کے کھایا اور پھر معمول کے مطابق باتوں کے لئے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ اس وقت امی اور رقیہ وہاں پر نہیں تھیں، بس دادا اور ابا جی تھے۔ تب دادا جی نے بات کا آغاز کیا۔

''بلال......! میں نہیں سمجھتا کہ تم چھوٹے ہو، ماشاء اللہ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر سے اس سمجھدار عاقل ہو۔ یہ تم آج اسی حالت میں دفتر گئے تھے؟'' ـان کرلوں گا۔'' میں

''جی ہاں......! کیا ہوا میری حالت کو؟'' میں نے حیرت ـ پیدا ہو۔ تب ابا جی نے کہا

''تمہارے چہرے سے تو لگتا ہے کہ جیسے تم نے تیـ یہ اس طرح نہیں مانے گا، اسے اس نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ ـت کرلوں گا اور میں پوری کوشش کروں گا

''اور اب میں نے شیو کرنی بھی نہیں ہے، وہ حالات سمجھ جائیں گے۔''

ہے۔'' میں نے خوشی سے کہا تو دادا بولے۔ ـدکھے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے

''بہت اچھی بات ہے۔ اس وقت تمہ چلے گئے تو میں وہاں تنہا رہ گیا۔ میں بھی اٹھ گیا۔

رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میں خاموش رہا، یہ سوچ رہا تھا کہ آج کا دن کس قدر مختلف ہے۔ میں تعلق ہم تم سے نہیں پوچھیں گے۔ لیکن تمہ والے بزرگ عبدالعزیز ملے، ان کا لہجہ، اپنائیت، نرمی

ـشت پسند، انتہا پسند قسم کے مسلمان بنتے

''جی ہاں......! یہ بات اس حد تک درست ہے کہ میں انتہا پسند ہوں، بنیاد پرست ہوں، لیکن یہ دہشت پسندی وغیرہ میرے کسی امکان میں بھی نہیں ہے۔ ایک سچا مسلمان دہشت پسند ہو ہی نہیں سکتا، اگر کوئی ہے تو مسلمان نہیں ہے۔'' میں نے ایک خاص تناظر میں پوچھے گئے سوال کا تفصیلی جواب دیا تو ابا جی نے کہا۔

''یار، ہم عام سے مسلمان ہیں، ہمیں کون سا مسجدیں سنبھالنی ہیں یا مدرسے چلانے ہیں اور نہ ہی ہم نے کوئی بڑا لیڈر بننا ہے۔ پھر یہ بنیاد پرستی کیوں؟''

''ہر مسلمان کو ہونا چاہئے۔ مسلمان کے پاس تو ایک نظریہ حیات ہے۔ اسلام وہ دین ہے......'' میں نے کہا تو دادا جی نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا......! میں نے تمہارا ساتھ بحث نہیں کرنی، بلاشبہ تمہارے پاس بہت مضبوط دلائل ہوں گئے اور میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تم بالکل درست ہو۔ لیکن......! تمہارے ان خیالات سے اگر خاندان کا شیرازہ بکھر رہا ہو تو؟ میں نے جواب تک محنت کر کے اس علاقے میں عزت، وقار اور ایک نام بنایا ہے، اس سب پر پانی پھر جائے گا، جو محبت، پیار ہمارے خاندان میں اس وقت ہے، اس کی جگہ اگر نفرت آ جائے تو، اس بارے تمہارا کیا خیال ہے؟''

''دادا جی......! میں بالکل نہیں سمجھ سکا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

''احسان اور افضال میرے دو بیٹے، ان سے آگے کی اولاد تم اور ماہا اور تیسری رقیہ جو اپنے گھر چلی جائے گی۔ تم اور ماہا، میری وہ اگلی نسل ہو جو اس خاندان کو پھر سے ایک کر دو گے

یہ زمین، یہ جائیداد، یہ عزت و وقار جو ہم نے برسوں کی محنت سے بنائے ہیں۔ اب ان کی

''وعلیم ا،ی ذمہ داری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ خاندان کا شیرازہ بکھرے۔'' یہ کہتے

کمرے کی تلاشی کون لیتا رہا جیسے یہ سب کہنے میں انہیں بہت مشکل ہو رہی ہو۔

''تلاشی تو نہیں......! ماہا کھل کر بات کریں، آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے ان

میں رہتی تھی۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہا، کیونکہ مجھے خود بھی سمجھ نہیں آ سکی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتے

کہ وہ اس کمرے کی کسی شے کو نہ چھیڑے۔ شاید مجھے بتانا شروع کر دیا۔ وہ جب پوری طرح کہہ

''اور کمپیوٹر بھی خراب ہوا تھا۔'' سمجھتا کہ اس نے ایسا کیوں کہا، لیکن اگر میرا اچھا

''پتہ نہیں، ایک دن ماہا سے چل نہیں رہے۔ مجھے زمین جائیداد کی پروا نہیں ہے اور نہ ہی

رقیہ اپنی فطری سادگی میں کہتی چلی گئی۔ ہیں، وہ جسے چاہے دے اور جس سے چاہے

''ماہا اور فہد؟'' میں بڑبڑاتے ہوئے سوچنے

''بلال یہ کیا کہہ رہے تم؟'' ابا جی نے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ابا جی، میں مانتا ہوں کہ ہمارے خاندان میں شرافت ہے، روایتی زمینداروں کی طرح ہم نے مخلوق خدا کو تنگ نہیں کیا۔ یہ دادا جی کی عظمت ہے کہ انہوں نے یہاں کی غریب عوام سے بہت اچھا سلوک کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ میں بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچانے والا۔ تو یہ سب خوفزدہ کس لئے ہیں؟ کس شے سے عزت و وقار چلا جائے گا۔ مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔'' میں نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات یہ نہیں ہے بیٹے......! آج کل کا جو ماحول بنا ہوا ہے۔ کئی تحریکیں ایسی چل رہی ہیں، جنہوں نے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔ ماہا کو یہ خوف ہے کہ تم بھی کہیں ان میں شامل نہ ہو جاؤ۔ یہ حویلی جو ہمیشہ سے امن، محبت اور دوستی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ کہیں آتشیں اسلحے کا ذخیرہ نہ بن جائے۔'' دادا جی نے دھیرے دھیرے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''دادا جی......! یہ سب وہم ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتا اور نہ ہی ایسا چاہنے والوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہاں مگر ان ساری چیزوں سے بچنا چاہتا ہوں جن سے اللہ اور اس کے پیارے نبیؐ نے منع فرمایا ہے اور وہ کچھ کرنے کی کوشش کروں گا، جو انہیں محبوب ہیں۔ اگر اس وجہ سے ماہا میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تو نہ سہی۔'' میں نے حتمی انداز میں کہہ دیا۔

''بات تو پھر رہی نا، اس رشتے کے نہ ہونے سے تیرے باپ اور تایا میں ایک خلیج آ جائے گی۔'' دادا جی نے کہا

''کل ماہا مجھے یہ کہے گی کہ میں رشوت لوں، لوگوں پر ظلم کروں، کرپشن کروں، تو کیا مجھے وہ بھی ماننا پڑے گا، دادا جی......! میں آپ کا دکھ سمجھ رہا ہوں، لیکن اس نے مجھ سے اس معاملے میں ذرا سی بات بھی نہیں کی۔ وہ مجھ سے بات کرے گی تو میں اسے قائل کر لوں گا۔'' میں نے صلح جو انداز میں کہا تا کہ ان دونوں کے دل میں تھوڑی بہت نرمی پیدا ہو۔ تب ابا جی نے کہا

''ابا جی......! اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ اس طرح نہیں مانے گا، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں احسان بھائی سے بات کر لوں گا اور میں پوری کوشش کروں گا کہ ہم میں کوئی ایسی نفرت نہ آئے۔ میرا خیال ہے وہ حالات سمجھ جائیں گے۔''

''لیکن اس بلال نے تو مایوس کیا؟'' دادا جی نے دکھے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑے۔ چند لمحوں بعد ابا جی بھی چلے گئے تو میں وہاں تنہا رہ گیا۔ میں بھی اٹھ گیا۔

میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ آج کا دن کس قدر مختلف ہے۔ میں جب نور پور میں آیا تو ایک نورانی چہرے والے بزرگ عبدالعزیز ملے، ان کا لہجہ، اپنائیت، نرمی

اور محبت بھرا انداز کس لئے تھا؟ میں کسی ایسے لباس میں بھی نہیں تھا کہ سرکاری عہدے کا آفیسر یا کوئی امیر کبیر آدمی دکھائی دوں۔ میں نے عام سا شلوار قمیص سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں ان کے بارے میں جس قدر سوچتا چلا جارہا تھا اس قدر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ممکن ہے مجھے ان سے مستقبل میں رابطہ رکھنا پڑے۔ میں ان سے پہلی بار ملا تھا اور پہلی ملاقات کا تاثر میرے دل میں بہت گہرا ہو گیا تھا۔ ان کا لہجہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

اس دن پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ حویلی میں بہت سارے ایسے معاملات بھی ہیں، جن میں شمولیت کے لئے مجھے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ پہلی بار مجھے دیکھتے ہی دادا اور ابا جی خاموش ہو گئے تھے۔ میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس بات کو سمجھتا تھا کہ میری ذات شاید اب قابل اعتماد نہیں رہی ہے اور......! یہ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک اچھا مسلمان بننے کے بجائے عام سا مسلمان بنے رہنے ہی کو فوقیت دی جائے اور اس پر زمین، جائیداد اور عزت و وقار کو ترجیح دی جائے۔ ایسا تو تعلیمات اسلام میں نہیں ہے۔ پہلی بار انہوں نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا ہوں۔ ایسا کیوں ہوا؟

ماہا جو میرے بچپن کی ساتھی تھی، اسے مجھ پر اعتماد ہونا چاہئے۔ لیکن مجھ سے بات کئے بنا اس نے فیصلہ صادر کر دیا۔ میری عدم موجودگی میں دلائل اور ثبوت اکٹھے کرتی رہی اور فہد......! اس نے آخر کیوں ماہا کی مدد کی؟ تاکہ میرے بارے میں ایسا تاثر پیدا ہو جائے، کیا اس میں فہد کا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ آخر یہ حالات اس قدر کیوں تنگ ہوتے چلے جارہے ہیں کہ کسی کو بھی مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔ حالانکہ میں نے ایسا کوئی منفی کام نہیں کیا تھا۔ میں انہی سوچوں میں تھا کہ اچانک ایک خیال نے میرے تپتے ہوئے وجود کو انتہائی خوشگوار احساس دے دیا۔

یہ طے ہے کہ جب بھی اور جس کے من میں بھی نورانیت آجاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ عشق ہی ہوا کرتا ہے۔ تب شیطانیت اسی کے درپے ہوتی ہے۔ یہیں سے کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے نہ صرف بندے کی آزمائش ہوتی ہے، بلکہ یہ عشق کا تقاضا بھی ہے۔ جس من سے بھی عشق کا ظہور ہوتا ہے۔ وہی دنیا داروں کی نگاہوں کا ہدف ہوا کرتا ہے۔ میرے ساتھ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ میں مسکرا دیا اور پرسکون نیند کے لئے کوشش کرنے لگا۔

اس دن ماہا شدید ترین بے چینی کا شکار تھی۔ ایک طرف اس نے بلال کو اپنے رویے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس سے سخت ناراض ہے تو دوسری جانب اس کے اپنے

من میں خوف بھی تھا کہ کہیں اس کے والدین بلال کے ساتھ شادی کی تاریخ نہ طے کر دیں۔ بلال نے اس کا تاثر قبول تو کیا، لیکن پھر اس کی وجوہات جاننے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اگر اس کے دل میں ماہا کے لئے محبت ہوتی تو وہ ضرور اس سے رابطہ کرتا، اس سے پوچھتا کہ وہ ناراض کیوں ہے، مگر اس نے تو پلٹ کر بھی نہیں پوچھا، یہاں تک کہ اس نے فون بھی نہیں کیا۔ وہ اس بات کو سمجھتی تھی کہ وہ اگر انا رکھتی ہے تو بلال بھی کوئی کم خوددار نہیں تھا۔ جب اس نے غصے میں اس کا فون کاٹا تھا، اس کے بعد پھر اس نے ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔ اسے گلاب نگر آئے تین دن ہو گئے تھے اور اس نے نور پور کا چکر بھی نہیں لگایا تھا۔ چلیں، اس سے نہیں تو کم از کم اپنے تایا ہی سے ملنے آجاتا۔ اس نے ایسا بھی نہیں کیا تھا۔ وہ شعوری طور پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے مان تھا کہ وہ آئے گا، اسے منائے گا اور وہ اس سے بہت ساری باتیں منوا لے گی، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی جگہ گلاب نگر سے یہ پیغام آ گیا تھا کہ وہ ماہا اور بلال کی شادی کے لئے تاریخ طے کرنے آرہے ہیں۔ شام کے وقت ان لوگوں نے آجانا تھا۔ تو اب وہ کیا کرے؟ اسی سوال نے اس کے اندر شدید ترین بے چینی بھر دی تھی۔ اگر آج شام انہوں نے تاریخ طے کر دی تو پھر اسے بلال سے شادی بھی کرنا پڑے گی۔ ورنہ اس کے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے کہ ایک بیٹی ہے اور وہ بھی ان کی بات نہیں مانتی۔ وہ خود کسی کو کیا وجہ بتائے گی؟ تو پھر وہ کیا کرے؟ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جب سوچ سوچ کر اس کا دماغ دکھنے لگا تو اسے کوئی بھی سہارا نہ ملا تب اس نے نجمہ پھوپھو کو فون کر دیا۔

''پھوپھو......! آج شام گلاب نگر سے میری شادی کی تاریخ طے کرنے آرہے ہیں۔ لازمی بات ہے ان میں دادا جی بھی ہوں گے اور میں انہیں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔'' اس نے خشک سے لہجے میں کہا۔

''کاش میری بیٹی میں تمہارے پاس ہوتی لیکن تم مجھے اس وقت بتا رہی ہو جب شام ہونے میں محض چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔'' نجمہ نے یوں کہا جیسے وہ اس کا درد پوری شدت کے ساتھ سمجھ رہی ہے۔

''یہی سوچ سوچ کر تو میں ہلکان ہو رہی ہوں، صبح ہی فون آیا تھا۔ اب میں کیا کروں یہی تو مجھے سمجھ نہیں آرہا۔ وہ الجھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو ماہا......! میں تمہیں صرف ایک مشورہ دوں گی۔ تم کسی کے بارے میں بھی مت سوچو، صرف اپنے بارے میں سوچو، تمہارا دل کیا کہتا ہے۔ اپنے دل کی مانو۔ کیونکہ

تمہارے اندر کے دکھ اور کرب کا کسی دوسرے کو نہ ادراک ہے اور نہ احساس ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ تمہارے اپنے من کی بات ہے تو صرف اپنی مانو۔ سارے رشتہ ناطوں کو ایک جانب رکھ، پورے حالات کو غور سے دیکھو اور فیصلہ کرلو۔ پھر جو فیصلہ بھی کرو، اس پر ڈٹ جاؤ، یہ سوچے بغیر کہ کہاں کتنا نقصان ہوتا ہے یا کس قدر فائدہ۔'' نجمہ پھوپھو نے اسے سمجھایا تو وہ بولی۔

''تھینک یو پھوپھو، اب میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر ہی لوں گی۔'' اس نے کہا اور پھر الوداعی باتوں کے بات فون بند کر دیا۔

دوپہر کے کھانے پر وہ تینوں ہی تھے۔ احسان انور، ذکیہ بیگم اور ماہا۔ کھانے کے بعد ذکیہ بیگم نے ماہا سے کہا۔

''بیٹا......! آج شام کو گلاب نگر سے تمہارے دادا ابو، چاچا افضال اور چاچی زبیدہ خاتون آ رہی ہیں۔ ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو یہاں سے بھی چند خواتین آئیں گی۔ اس لئے تم اچھی طرح تیار ہو جانا۔ اگر چاہو تو اپنی کسی سہیلی کو بلا لو اور بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آ جانا۔''

''لیکن ماما......! میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے احسان نور کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''اور پاپا آپ سے بھی۔'' اس کا منتشر سا لہجہ ایسا تھا کہ وہ دونوں چونک گئے۔ اس پر ذکیہ بولی۔

''بات......! خیریت تو ہے ماہا، کیا بات کرنا چاہتی ہو؟''

''ایسی کیا بات ہے ماہا۔'' احسان نور نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

''میرے خیال میں اگر میں آپ تفصیل سے بتاؤں گی تو آپ کو بھی کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو گی۔'' اس نے کافی حد تک جرات سے کہا تو احسان نور بولا۔

''بولو......! تم جو بھی کہنا چاہتی ہو بلا جھجک کہو۔'' اس نے کہا تو ماہا چند لمحے سوچتے ہوئے ان کی جانب دیکھتی رہی پھر بولی

''پاپا......! میں مانتی ہوں کہ بچپن سے لیکر چند ماہ پہلے تک میرے اور بلال کے درمیان کوئی دوری نہیں تھی۔ اب ہم میں اس قدر دوری آ چکی ہے کہ ہم آئندہ مستقبل میں ایک چھت تلے نہیں رہ سکتے۔'' اس نے نہایت کہہ دیا جو اس نے اس لمحے کے لئے سوچا ہوا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ ہوش میں تو ہو؟'' ذکیہ بیگم نے یوں حیرت سے کہا جیسے اس پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، جبکہ احسان نور اس کی جانب غور سے دیکھتا رہا اور چند لمحے بعد ہولے سے بولا۔

''اچھا تو پھر......؟''

''پھر یہ کہ میں نہیں سمجھتی کہ اب ہم میں کوئی ذہنی ہم آہنگی رہ گئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ سب تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو، وہ کونسی وجہ ہے جس کے باعث اب تمہاری اس سے ذہنی ہم آہنگی نہیں رہی؟'' احسان نور تحمل کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا......! میں وہی آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہوں کہ......''

''یہ کیا فضول بکواس ہے۔ اب جبکہ شادی میں چند دن رہ گئے ہیں، میرے خیال میں ایک ہفتہ بھی نہیں......تو یہ......ہم خیالی، ذہنی ہم آہنگی...... یہ کیا احمق پن ہے......'' ذکیہ بیگم نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''بیگم......! پلیز، مجھے ماہا کی بات سن لینے دو۔'' احسان نور نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو ذکیہ بیگم نے نخوت سے منہ پھیر لیا جبکہ ماہا کہنے لگی۔

''پاپا......! میں نے جس ماحول میں تربیت پائی، اس کے اپنے تقاضے ہیں۔ ہمارا اپنا ایک لائف سٹائل ہے۔ میں نے بھی اپنے مستقبل کے چند خواب دیکھے ہیں۔ میں بھی اپنے گھر کو جنت جیسا پرسکون بنانا چاہتی ہوں لیکن......! بلال اب وہ نہیں رہا جو چند مہینے پہلے تھا۔ وہ اب ایک کٹڑ مذہبی بندہ ہو گیا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا'' احسان نور نے پوچھا تو اس نے ساری روداد سنا دی۔ پھر بولی۔

''یوں......! میں ایک ایسے بندے کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو مجھے میرے ہی گھر میں بند کر دے اور پھر اس کا بھی کوئی پتہ نہیں، کب اور کس وقت کسی تنظیم کے ساتھ چلا جائے۔ اسے مجھ سے زیادہ اپنا مقصد عزیز ہو گا۔ میں کیوں اس کی گھٹن زدہ دنیا میں چلی جاؤں، ہاں......! اگر یہ سب بعد میں پتہ چلتا تو شاید میں اپنے بڑوں کی عزت کی خاطر خاموش ہو جاتی، کسی بھی طرح کا سمجھوتہ کر لیتی، لیکن اب...... فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔'' ماہا نے بہت اطمینان سے اپنا مقدمہ اپنے باپ کے سامنے رکھ دیا، جو بظاہر پرسکون تھا لیکن اندر سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ یہ عجیب قسم کی افتاد آن پڑی تھی، جس پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم بلال سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہو؟''

''جی، کیونکہ بلال اب وہ نہیں رہا، جس کے ساتھ میں خوش رہ سکوں۔'' وہ بولی تو احسان نور چند لمحوں کے لئے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''تم نے یہ بات ایسے وقت کہی ہے کہ اگر اب انکار کیا گیا تو بہت ساری توڑ پھوڑ ہو جائے گی۔ میں زبان دے چکا ہوں شاید میں......'' اس نے کہنا چاہا لیکن ذکیہ بیگم نے انتہائی غصے سے کہا۔

"کوئی شاید نہیں، کوئی لیکن ویکن نہیں...... سیدھے شادی کی بات ہو گی اور بس۔ اس لڑکی نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کیا یہ نہیں جانتی کہ خاندان میں کتنا بڑا طوفان اٹھ جائے گا۔ کتنے رشتے چھوٹ جائیں گے ہم سے۔ لاڈ پیار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمیں دنیا کے سامنے بے عزت تو کرو ہی کرو، خاندان کے بڑوں کے سامنے بھی شرمندہ اور ذلیل کر دو۔ آپ اسے سمجھائیں کہ یہ کوئی گڈے گڈی کا کھیل نہیں ہے۔" اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماہا...... ! تم اگر چند دن پہلے یہ بات بتاتی تو شاید میں کچھ کر سکتا۔ تمہاری ماما کی بات بالکل ٹھیک ہے، ہم لوگوں سے اور اپنے خاندان سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ کیا ہم لوگوں کو یہ وجہ بتائیں گے کہ بلال چونکہ بہت زیادہ مذہبی ہو گیا ہے، اس لئے شادی نہیں کی؟" احسان نور نے تحمل سے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ تو سمجھ رہے ہیں نا کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ میرا موقف غلط نہیں ہے۔" ماہا نے احتجاجاً کہا۔

"جب تمہاری منگنی کی گئی تھی، تب میں نے تم سے پوچھا تھا۔ اس وقت ہم اپنی مرضی کر سکتے تھے، لیکن نہیں، تمہاری رائے، تمہارا مشورہ لیا گیا تھا۔ اس وقت تم راضی تھی۔ آج نہیں ہو، پھر کل اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو پھر ہم کیا کریں گے؟" ذکیہ بیگم نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا تو احسان نور نے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

"ماہا...... ! میں سمجھتا ہوں کہ محض سامنے کی بات کو نہیں دیکھا جاتا، جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو تو اس کے پس منظر کو بھی دیکھ لینا چاہئے۔ تم نے جو یہ اچانک فیصلہ کیا ہے، ضروری نہیں کہ وہ غلط ہے اور نہ ہی میں اسے درست مان رہا ہوں۔ یہ تو فقط تمہارا موقف ہے۔ اگر تم پہلے بتاتی تو میں بذات خود بلال کو جانچتا، پرکھتا اور تمہارے موقف کی تصدیق کرتا، پھر فیصلہ کرتا، لیکن...... ! وہ وقت گزر چکا۔" احسان نور نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز پاپا...... ! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" ماہا روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

"عین اس موقعے پر جب وہ گلاب نگر سے نکل چکے ہوں گے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"چلو...... ! میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔" اچانک احسان نور نے کہا

"آپ بتائیں...... ! ماہا لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کوئی بات نہیں، کوئی وعدہ نہیں۔" ذکیہ بیگم نے پھر کہا لیکن احسان نور نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں ابا جی کے سامنے تمہارا موقف رکھوں گا، میں پوری کوشش کروں گا کہ فی الحال یہ شادی رک جائے۔ لیکن...... ! اگر میں بے بس ہوا تو پھر تمہیں خاندان کے بزرگوں کی بات ماننا پڑے گی، کیا تم یہ وعدہ کرتی ہو۔"

"میں...... کیا...... کہہ سکتی ہوں پاپا۔" بہت مشکل سے یہ کہتے ہوئے ماہا اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ دونوں اس کی طرف دیکھتے چلے گئے۔ اچانک ہی احسان نور خود پر بہت بوجھ محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔

❀......❀......❀

میں گلاب نگر کی خوبصورت مسجد میں مغرب پڑھ کر باہر نکلا تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں دھیرے قدموں سے چلتا ہوا حویلی کی جانب بڑھتا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دادا جی، امی اور ابا جی میری شادی کی تاریخ طے کرنے نور پور چلے گئے ہیں اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ماہا کی ضد کیا ہو گی، اگرچہ اس وقت مجھے ہاں اور ناں کے درمیان والی اذیت سے دوچار ہونا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ اب میرے لئے ماہا کے وجود کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی، جو چند ماہ پہلے تھی۔ ماہا کی محبت میرے دل میں ویسے ہی اس طرح پوری شدت سے تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت بدل گئی تھی۔ انہی خیالات میں کھویا میں حویلی کے ڈرائنگ روم میں چلا گیا، جہاں سناٹا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی رقیہ آ گئی۔ شاید وہ میرے انتظار میں تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بھائی...... ! آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ تاریخ دے دیں گے؟" اس کے لہجے میں تشویش سے زیادہ میری محبت بول رہی تھی۔ میں ہنس دیا اور بڑے پیار سے بولا۔

"تم فکر نہ کرو، جو اللہ کو منظور ہے، وہی ہو گا اور ہمیں اس کی رضا میں راضی رہنا ہے۔"

"مجھے بہت فکر ہو رہی ہے، امی بہت پریشان تھیں۔ ماہا کی ہاں یا ناں میں اب خاندان کی عزت......" رقیہ نے کہنا چاہا، مگر میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"عزت، ذلت، حکومت، رزق، زندگی اور موت یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے، یہ اس نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ زیادتی اور کمی کا ہونا آزمائش ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہے۔ تم بھی کوئی فکر مت کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر بولی۔ "آپ کھانا کھائیں تو لگاؤں؟"

"ہاں...... لگاؤ۔" میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔

میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سب کے ذہنوں میں تشویش تھی۔ لیکن میرے

ذہن میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ کیا ہوگا؟ جو بھی ہوگا، وہ ٹھیک ہوگا۔ میں نے سارے حالات کا پوری ایمان داری سے تجزیہ کیا تھا۔ ماہا کا اعتراض بالکل درست تھا کہ میں اب وہ پہلے والا بلال بالکل نہیں رہا تھا۔ اسے اعتراض کے پس منظر میں اس کے سامنے کیا کیا خدشات آ رہے تھے، وہ کس نہج پر سوچ رہی تھی یا وہ کس قسم کے احساسات رکھتی تھی؟ میں ان سے قطعاً واقف نہیں تھا۔ اس موضوع پر ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں شاید واپس اسی دنیا میں پلٹ جاتا جو ماہا کو پسند تھی، کوئی اور غلط فہمی ہوتی تو میں خود جا کر اسے مناتا، اس کے سارے خدشات دور کر دیتا، اگر......! بنکاک ائیر پورٹ پر پی اون مجھ سے عبادت کے بارے میں سوال نہ کرتی۔ وہ ایک ایسا تازیانہ تھا، جس نے میری روح تک کو جھنجوڑ دیا۔ پاکستان کی سرزمین تک پہنچتے ہوئے میرے اندر کی دنیا بدل چکی تھی۔ تبدیلی کہاں پر آئی تھی، میں نے اس پر بہت سوچا اور اس حقیقت کو پا بھی گیا۔

ماہا......! جو میرا عشق تھی۔ جس کے سوا کبھی میں نے کسی اور کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کی ساری سمجھ آنے لگی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا عشق ایک ایسے جنگل کی مانند تھا، جس میں جھاڑ جھنکاڑ ہی اگتا ہے۔ تاریک اور ڈراؤنا، جس کی حفاظت و پرورش موسمی حالات ہی کرتے ہیں۔ بارش ہوگئی تو سبزہ، ورنہ تشنگی، بے ترتیب درخت جو اپنے طور ہی پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا جنگل جس میں زہریلے جانوروں کے ہونے کا پورا پورا امکان موجود تھا۔ بے ثمر جنگل میں کوئی رستہ بھی سیدھا نہیں تھا۔ لیکن......! اب میں سمجھتا تھا کہ عشق کی صورت یہ تو نہیں ہوا کرتی، یہ تو ایسے نخلستان کی مانند ہوا کرتا ہے، جہاں فقط سکون سانس لیتا ہے اور خوف نام کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو امرت بھرے شیریں چشمے پھوٹتے ہیں، بڑے سیدھے اور منزل تک رسائی دینے والے راستے ہوتے ہیں۔ ہر درخت ثمر آور ہوتا ہے اور ہر پودہ تہذیب یافتہ۔ ایسا نخلستان جو محبت بھرے جذبوں سے خالی دنیا کے صحرا میں سکون و کیف و آگہی کا مقام ہوتا ہے۔ اصل میں ہر کردار کی بنیاد میں ایک بنیادی تصور ہوتا ہے۔ جیسے ہی تصور بدلتا ہے، اس کے ساتھ ہی کردار بھی بدل جاتا ہے۔ اگر ہمیں اپنا کردار سمجھنا ہے تو ہمیں اپنے تصورات کا جائزہ لینا ہوگا۔ تب ہم پر اپنا آپ عیاں ہو جاتا ہے اور ہم خود سے بڑی آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ماہا کے بارے میں میرے من میں موجود تصور بدل رہا ہے۔ یہ آگے جا کر کیا صورت اختیار کرے گا۔ میں اس کے بارے میں ذرا سا بھی نہیں جانتا تھا۔

میرے اردگرد جو حالات بن چکے تھے، میں انہیں بھی سمجھ رہا تھا۔ میں ان سے

گھبرانے والا نہیں تھا، مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہوگیا تھا کہ ان حالات کا سامنا کر سکوں۔ اب میرے سامنے بالکل ہی نئی دنیا تھی۔ پہلے اگر میں نے مطالعہ کیا تھا تو فقط پی اون کو متاثر کرنے کے لئے، اس کے زہریلے سوالوں کا جواب دینے کے لئے، میں ایسا بھنورا بنا رہا جو اپنے مطلب کے پھول سے اپنے نکتہ نگاہ کے مطابق ہی رس چوستا ہے، لیکن اب میرا من چونکہ وہ نہیں رہا تھا، اس لئے نکتہ نظر بھی وہ نہیں رہا۔ بعض اوقات میرے سامنے ایسے مقامات آجاتے، جن کی میں تفہیم شدت سے چاہتا، سوچنے کے لئے میرے پاس بڑا وقت ہوتا۔ عشق کا تصور بدلا تو حقیقت عشق واضح ہونا شروع ہوگئی۔ مجھے یہ سب ایسے معلوم ہوتا، جیسے میں کسی پہاڑی پر کھڑا ہوں اور نیچے آباد پورا شہر موجود تو ہے مگر اس پر گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ میں شہر عشق کو دیکھ تو رہا تھا لیکن وہ کیسا تھا، یہ سب ابھی دھندلا تھا۔

"بھائی......! کھانا لگ گیا ہے۔" رقیہ نے کہا تو میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ وہ یہ کہہ کر واپس مڑ گئی تو میں کھانے کی میز جانب بڑھ گیا۔

کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیڈ پر لیٹا تو میرے سامنے ماہا کا تصور تھا۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہو کر اس مقام تک آ گئی تھی جہاں ہماری راہیں جدا ہو سکتی تھیں۔ مجھے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ اب وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بلاشبہ اس نے اپنے والدین کو بھی اعتماد میں لیا ہوگا اور وہ ساری دلیلیں ان کے سامنے رکھ دی ہوں گی، جو ایک دہشت گرد کے بارے میں ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں دادا جی اور میرے والدین یونہی اتمام حجت کے لئے ہی وہاں گئے ہیں ورنہ ماہا کے خیالات بارے انہیں بھی معلوم ہو چکا تھا۔ اس سارے معاملے کی بنیاد پر میرا تھائی لینڈ جانا ہی تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس کے بعد میرا پی اون سے رابطہ رہتا تھا۔ اس نے ہوٹل والی نوکری چھوڑ دی تھی اور اس کا سارا دھیان اپنی پڑھائی کی جانب ہو گیا تھا۔ میرے لئے سب سے خوشگوار بات یہ تھی کہ اس سے چاہے جتنی مرضی طویل گفتگو ہو جاتی، اس میں ایک بھی ایسا سوال نہیں ہوتا تھا، جس سے مسلمانوں کے بارے میں اس کی نفرت ظاہر ہوتی۔ مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ ایسا سوال کرنا ہی بھول گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ شاید وہ میری وجہ سے اب ایسا نہیں کرتی، میرا دل رکھنے کے لئے یا پھر یونہی بحث نہ چھیڑنے کی غرض سے۔ بہر حال جو کچھ تھا، اس کا رویہ اس معاملے میں بدل چکا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہی میری کامیابی ہے۔ دوسرا میں خود اس کا احسان مند ہوں تھا۔ اس نے بنکاک ائیر پورٹ پر جس نیت سے بھی سوال کیا تھا، لیکن میری دنیا تبدیل ہو گئی اور میں اس دنیا میں بہت سکون محسوس کر رہا ہوں۔ اب اگر ماہا میری اس دنیا سے نفرت

کرتی ہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے فقط اپنی سوچوں پر ہی فیصلے اخذ کر لئے تھے، ورنہ اگر وہ مجھ سے بات کرتی، میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی تو شاید اسے اپنے خیالات پر نظر ثانی کا موقع مل جاتا۔ وہ جیسی بھی تھی، بہر حال میرا عشق تھا اور میں نے اس کے لئے ہمیشہ اچھا ہی سوچنا تھا۔

میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ عشاء کی اذان ہوگئی۔ میں اٹھا اور مسجد جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں حویلی سے باہر نکلا تو قدرے ٹھنڈ کا احساس ہو۔ ہوا تیز تھی، میں نے چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور مسجد کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ میں نے سکون سے نماز ادا کی اور واپس حویلی آ گیا۔ پورچ میں کار کھڑی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ دادا جی اور میرے والدین واپس آ چکے ہیں۔ میں آہستہ قدموں سے اندر گیا تو ڈرائنگ روم میں سبھی موجود تھے۔ ان کے دمکتے ہوئے چہرے دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ تبھی رقیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔

''مبارک ہو بھائی، تاریخ طے ہوگئی ہے۔''

چاہئے تو یہ تھا کہ میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ جاتی، میں خوشگوار جذبات سے نہال ہو جاتا اور دل میں اُتھل پتھل ہوتی، مگر ایسا کوئی بھی احساس میرے اندر نہیں جاگا، بلکہ میرے تن میں ایسی لہر سرایت کرگئی، جس سے میں نے خوف کی پرچھائیوں کو اپنی جانب امنڈتے ہوئے محسوس کیا۔ میں امی کے ساتھ جا بیٹھا تو انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''بلال پتر......! کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔''

ان کے اس طرح کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میرے تاثرات ایسے ہیں، جس سے انہوں نے اندازہ لگایا۔ میں نے سب کی جانب دیکھا، وہ میری جانب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں، آپ سب کی خوشی میں میری خوشی ہے۔'' میں نے کہا تو دادا جی پوری سنجیدگی سے بولے۔

''اصل میں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ماہا اور بلال کے درمیان کوئی ایسی بات ہے جو دونوں میں بتانا نہیں چاہتے۔ کوئی ضد، کوئی انا کا مسئلہ......؟'' یہ کہہ کر انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور میری جانب دیکھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے دادا جی۔'' میں نے کہا۔

''خیر......! جو بھی ہے، ٹھیک ایک ہفتے کے بعد جمعہ ہے اور اس دن تمہاری بارات نور پور جائے گی۔'' دادا جی نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو ابا جی بولے۔

''لگتا ہے تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟'' یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف سے کوئی جواب سنے بغیر کہا۔ ''خیر......! طے یہ پایا ہے کہ مختصر سی بارات جائے گی لیکن ولیمہ بہر حال اپنی حیثیت کے مطابق ہوگا، جن دوستوں کو بھی بلانا ہے، اسی دن بلا لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔ ممکن ہے کوئی بات ہوتی لیکن اس وقت اندر سے ملازمہ چائے لیکر آ گئی۔ اس کے ساتھ مٹھائی تھی۔ اس تنے ہوئے ماحول میں مٹھائی کھائی گئی۔ چائے پی کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے ایک کتاب کے ابھی چند ورق ہی پڑھے تھے کہ امی میرے کمرے میں آ گئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ میرے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔ پھر میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کیا واقعی تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''امی......! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ممکن ہے مجھے خوشی ہوتی لیکن نجانے کیوں میرے اندر سے کوئی خوشی نہیں اٹھی۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ معاملہ رضامندی سے نہیں بلکہ دباؤ کے تحت ہو'' میں نے کہا۔

''تم پر کس نے دباؤ ڈالا؟'' امی نے پوچھا۔

''نہیں، میں تو ماہا کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ اس کے انکار سے متعلق تو سبھی جانتے ہیں ہیں نا۔'' میں نے پھر کہا۔ ''ہاں......! اس نے آج احسان بھائی کو اپنے انکار کے بارے میں بتایا تھا لیکن انہوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ ذکیہ تو بہت غصے میں تھی کہ اس کا دماغ کیوں خراب ہے۔ خیر......! یہ جو بھی ہوا اور جیسے بھی ہوا، تمہاری شادی اب اس سے طے ہوگئی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ عورت کے دل میں جب ایک بار شک کا بیج پڑ جائے تو وہ کونپل ضرور نکالتا ہے، بھلے اس میں عورت کو اپنی زندگی تباہ ہو جائے۔''

''پھر امی......!'' میں نے کہنا چاہا تو انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔

''میں سمجھتی ہوں بیٹا کہ یہ تمہارے لئے ایک بہت بڑی آزمائش ہے، مگر تمہیں اس میں سرخرو ہونا ہے۔ تمہارے تایا خود پریشان تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ انہوں نے مستقبل کے بہت سارے خدشات، تمہارے دادا کے سامنے رکھے ہیں اور تمہارے دادا فقط تیری وکالت کرتے رہے ہیں کہ جو کچھ بھی تمہارے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ غلط ہے اور اب میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ غلط تم نے ثابت کرنا ہے۔'' امی نے آخر اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"امی......! ماہا کے دل میں جو بھی خدشات ہیں، وہ اب بھی غلط ہیں۔ اسے ثابت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر......! میں اپنے بزرگوں کا مان رکھوں گا۔ اس میں کوتاہی نہیں ہوگی۔" میں نے امی کو یقین دلایا۔

"شاباش میرے بیٹے، مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب خاندان کو نفرت سے تم ہی بچا سکتے ہو۔" امی نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور پھر مجھے وہاں کی روداد بتانے لگی کہ کس طرح کی باتیں ہوئیں اور پھر بالآخر تاریخ طے ہوگئی۔ میں سنتا رہا اور پھر امی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ تب امنڈتی ہوئی سوچوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ سو میں نے ان سے نگاہیں چرائیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ اپنے دماغ کو فضول سوچوں کی آماجگاہ بنالوں۔ کچھ دیر بعد میں سوگیا۔

❁......❁......❁

رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ الطاف انور، فہد اور نجمہ انتہائی افسردگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت ان تینوں کی سوچیں مختلف تھیں۔

الطاف انور کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹا اپنی تمام تر توانائیاں اس مقصد کے لئے لگائے ہوئے تھے کہ ماہا اس گھر کی بہو بن جائے، مگر اسے کامیابی کی امید نہیں تھی۔ وہ ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماہا جس ماحول میں رہتی ہے، وہ ابھی اتنا ایڈوانس نہیں ہوا کہ والدین کی مرضی کو اہمیت نہ دی جائے۔ وہاں سب سے زیادہ نور الٰہی کے اثرات تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان کی اولاد سعادت مند ہے، اس لئے فیصلے سے انحراف نہیں کریں گے۔ ناامید ہونے کے باوجود اس نے کبھی اپنی بیوی یا بیٹے کو نہیں روکا تھا اور نہ ہی اس معاملے میں کوئی بحث کی تھی۔ اگر وہ ناکام ہو جاتے تو پھر وہ اپنی بات بہت آسانی سے منوا سکتا تھا، کیونکہ پھر ان دونوں کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ کامیابی کی صورت میں سونے کی چڑیا خود ان کے پنجرے میں آ جاتی، پھر کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سو جیسے اس نے سوچا تھا ویسے ہی ہوا۔ وہ دونوں ماں، بیٹا اپنے مقصد اور کوشش میں ناکام ہو چکے تھے اور اب شکست خوردہ حالت میں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے فقط یہی اطمینان تھا کہ اس ساری کوشش میں ان کی نیت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ یہی سوچ رہا تھا کہ شادی کی تقریب میں افضال نور کی بیٹی رقیہ کو نہ صرف مانگ لیا جائے بلکہ منگنی کی رسم بھی ادا کر دی جائے۔ اس طرح فہد کو گلاب نگر کے حلقے سے ایک سیاست دان کے طور پر بڑی آسانی سے ابھارا جا سکتا ہے۔ اب تک انہوں نے جو نیک نامی کمائی تھی، اسے وہ بڑی آسانی سے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ یہ بات انہیں پھر سے سمجھانا

چاہتا تھا، لیکن یہ موقعہ نہیں تھا۔ مگر وہ پوری طرح پلان کر چکا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

نجمہ کو دوسری بار اپنے خواب چکنا چور ہو جانے کا دکھ تھا۔ ماہا کی صورت میں کروڑوں کی جائیداد اس کے ہاتھ آ جانے والی تھی۔ لیکن بلال کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ پہلی بار جب اس نے سوچا اور کوشش کی تو اسے علم ہوا ماہا اور بلال ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوڑ توڑ کرتی، انہی دنوں ان کی منگنی ہوگئی۔ تب اسے اپنی ساری حسرتیں سمیٹنا پڑی تھیں۔ دوسری بار فہد کے کہنے پر اس کے خواب پھر سے زندہ ہو گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ فہد بھی ماہا کو چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر بھرپور کوشش بھی کر ڈالی تھی، لیکن اس بار اس کے باپ نور الٰہی نے معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے کر پھر اس کے خواب توڑ دیئے تھے۔ اس وقت وہ ان خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے میں لہولہان ہو رہی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس حقیقت کو مانے لیکن حالات گواہی دے رہے تھے کہ جو وہ چاہتی ہے، اب ویسا نہیں ہوسکتا۔ جس ماہا پر انہوں نے محنت کی تھی اور اسے بلال سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ اب وہ بے بس تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وقت اور حالات اس کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں، انہیں اگر اپنی دسترس میں کرنے کی کوشش کی تو منہ کے بل گرے گی۔ اس لئے وہ اس دکھ کو برداشت کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ مستقبل کے بارے میں جو اس کے شوہر نے منصوبہ بندی کی ہے، وہی ٹھیک ہے۔ بہت کچھ کے بجائے اب تھوڑے بہت پر ہی اکتفا کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ماہا نے جب تاریخ طے ہو جانے کے بارے میں اسے بتایا تو اسے زبردست شاک لگا اور اب تک وہ اسی حصار میں تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس حقیقت کو مانے لیکن دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ اب کوئی بھی کوشش بے کار ہوگی۔ اب اسے ساری توجہ رقیہ پر دینا ہوگی، ورنہ وہ اپنے خاندان ہی سے نہیں، بہت ساری جائیداد سے بھی محروم ہو جائے گی۔ وہ اپنے اندر ہونے والی اس جنگ میں دھواں دھواں سی بیٹھی ہوئی تھی۔

فہد......! اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسی بری طرح سے بے عزت کر کے رکھ دیا ہو۔ اگرچہ اس کی نیت بارے کسی اور کو معلوم نہیں تھا، لیکن پچھلے چند دنوں کی کوشش میں جو اسے چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ملی تھیں، ان کی بنیاد پر اس نے نجانے کتنے سنہری خواب دیکھ لئے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان سنہری خوابوں کے درد بھی گہرے ہوتے ہیں۔ وہ بہت دیر سے ماہا کی چاہت میں سلگ رہا تھا۔ پھر اچانک اس وقت شعلہ بھڑک اٹھا جب بلال کے جانے سے وہ ماہا کے قریب ہوا۔ گھنٹوں طویل ملاقاتوں کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو کچھ دیر

باتوں میں ہمیشہ تکلف رکھتی تھی، اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔ سنہری خوابوں میں اس قدر رنگینی آ گئی تھی کہ اس نے اپنا سارا مستقبل سنہری کر لیا تھا۔ اس کے لئے کروڑوں کی جائیداد میں کشش تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ ماہا کے ساتھ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا اور اس نے کیا۔ وہ تلوار کی دھار پر چلا تھا۔ اگر اس کی نیت بارے ذرا سی بھی بھنک مل جاتی تو پورے خاندان میں رسوا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل بھی تباہ کر لیتا، جس کے بارے میں اس کے باپ نے اسے بتایا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اب ماہا کو بلال کی ہو جانا ہے، اسے نہ اس کا دل قبول کر رہا تھا اور نہ دماغ۔ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اب سارا کچھ بھول کر اپنے بارے میں کچھ نیا سوچتا، لیکن کوئی نئی سوچ وہاں کیا پیدا ہو سکتی ہے، جہاں محبت کی کسک، انتقام کے جذبے میں ڈھل گئی ہو، وہ مسلسل ہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اگر ماہا میری نہیں ہوتی تو بلال کی بھی نہیں ہو سکتی۔ میں یوں بازی نہیں ہار سکتا، وہ جو میری دسترس میں آجانے والی تھی، وقت اور حالات نے مجھ سے چھین لی، کیا میری محبت اتنی ہی تھی کہ میں اسے بلال کا ہوتا ہوا دیکھوں؟ کیا میں وقت اور حالات کے ہاتھوں ہار جاؤں گا؟ کیا یہ ہار مجھے مار نہیں ڈالے گی؟ اب مستقبل کے حوالے سے میرے والدین میرے بارے میں جو سوچ رہے ہیں، پھر مجھے بھی انہی کے درمیان میں رہنا ہوگا۔ کیا میں ماہا کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں بلال کی دیکھ سکوں گا؟ اس کے اندر کی آگ بدلتی چلی جا رہی تھی۔ پہلے یہ آگ ماہا کے حصول کے لئے تھی اب یہ انتقام میں بدل رہی تھی۔ جب سے اس نے یہ خبر سنی تھی کہ ماہا کی شادی بارے تاریخ طے ہو گئی ہے۔ اس کی سوچوں میں طوفان اٹھ گیا تھا۔ وہ قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ ماہا اب اسے حاصل نہیں ہو سکے گی۔ اسے ساری دنیا پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سی وقت اٹھے اور ماہا کو اپنی دسترس میں کر لے۔ اس کی اس خواہش میں ماہا کے وہ آنسو بھی شامل تھے جو بلال کے بارے میں اس نے بہائے تھے۔

''تم لوگ اس قدر افسردہ کیوں ہو گئے ہو۔'' الطاف انور نے تنی ہوئی خاموشی کو توڑا تو نجمہ نے چونک کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا اور پھر فہد کی طرف جو ایک ٹک نامعلوم نکتے کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر بولی۔

''افسردگی کی بات تو ہے نا، میں نے ماہا کو بہو بنانا چاہ تھا اور......''

''اور وہ نہیں بن سکی۔'' الطاف انور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ''اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس بات کو لے کر بیٹھ جائیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اسے چھوڑیں اور دوسری بات پر سوچیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں؟ اب ہمیں اس شادی پر رقیہ کی منگنی فہد سے کرنا ہوگی۔'' نجمہ نے کہا۔

''ہاں......! اس کے لئے تم پوری تیاری سے جانا اور جاتے ہی ماحول بنانا، میں آجاؤں گا تو حتمی بات کر لوں گا۔'' الطاف نے کہا تو فہد نے ان کی جانب دیکھا اور اٹھ گیا۔ اس نے باہر جانے کے لئے چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ الطاف نے کہا۔ ''فہد......!''

''جی پاپا......'' اس نے مڑے بغیر رک کر کہا۔

''کیا تمہیں ہماری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟'' وہ ذرا گہرے لہجے میں بولا۔

''سمجھ آ رہی ہے پاپا، لیکن مجھے تھوڑا سا وقت دیا جائے، اس وقت میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا تو نجمہ نے الطاف کو اشارہ کیا، جس کا مقصد یہی تھا کہ ابھی اسے جانے دو، تب وہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، لیکن تم نے اپنی ماما کے ساتھ ہی گلاب نگر جانا ہے۔''

اس کے یوں کہنے پر فہد نے سنی ان سنی کی اور باہر نکلتا چلا گیا۔

''ابھی آپ اسے کچھ نہ کہیں، وہ......'' نجمہ نے کہنا چاہا لیکن الطاف نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں اسے مجنوں قسم کی چیز نہیں دیکھنا چاہتا، زندگی میں بہت سارے آپشن ہونے چاہئیں۔ یوں دل پر لگانے والے زندگی میں کامیاب نہیں ہوتے اور میں فہد کو ایک کامیاب انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھاؤں گی اسے، آپ فکر نہ کریں، وہ سمجھ جائے گا، یہ تو وقتی ردعمل ہے۔'' نجمہ نے تیز تیز انداز میں کہا تو الطاف نے فقط سر ہلا دیا اور پھر دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں کھو گئے۔ یہاں تک کہ الطاف اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

❁......❁......❁

ماہا سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اب اسے ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنی ہو گی، جس کا انداز زندگی وہ نہیں رہا، جسے وہ پسند کرتی ہے۔ وہ کس طرح زندگی گزارے گی؟ اس نے سوچا تھا کہ شادی کے فوراً بعد وہ ہنی مون کے لئے یورپ جائے گی۔ وہ خواب پورا کرے گی جو وہ بہت عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب اسے امید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔ وہ جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ لمبی لمبی باتیں کرتی رہتی تھی، اپنے آنے والے دنوں کے بارے میں، وہ تو اب کچھ بھی نہیں ہوگا؟ ان سہیلیوں کو کیا خبر تھی کہ اب تو دنیا ہی تبدیل ہو چکی ہے۔ زیور، اعلیٰ ملبوسات،

بینک بیلنس، اچھا معیار زندگی اور بہترین سماجی حیثیت اس کی تمنا تھی، لیکن شاید اب وہ نہیں رہے گا، حویلی کے در و دیوار کا ایک مخصوص حصہ اس کا مقدر ہوگا، جہاں وہ بلال کی منتظر رہا کرے گی۔ اپنے مستقبل کی یہی تصویر اسے دکھائی دیتی تھی جو مایوس کر دینے والی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری سوچ بھی ابھرتی جو اسے ایک ایسے دوراہے پر لے جاتی جہاں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی اور ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ کیا وہ بلال سے محبت نہیں کرتی ہے؟ جس کا جواب اسے یہی ملتا کہ ہاں وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔''

''تو پھر تم کیوں پریشان ہو؟ محبت میں تو اپنا آپ وار دیا جاتا ہے۔ یہ تو پھر دنیا کے بارے میں چند خواب ہیں۔''

''نہیں......! میں تو اس بلال کو چاہتی ہوں جو میرا تھا، پورے کا پورا میرا، وہ میرے ساتھ ہنستا، میرے ساتھ پریشان ہوتا، میرے ہر دکھ درد کا درماں تھا، لیکن یہ تو وہ بلال نہیں ہے، اتنا بدل گیا ہے کہ اس نے مجھ سے پوچھا تک نہیں کہ میں اس قدر ناراض کیوں ہوں۔''

''تم نے بھی تو کونسا اس کی بات سنی ہے، تم نے تو خود اسے دور کیا ہے۔''

''لیکن پھر بھی، اسے اگر مجھ سے محبت ہوتی نا تو وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بات ضرور کرتا، کیا محبت میں قربانی میں نے ہی دینی ہے، اسے ذرا احساس نہیں؟''

''احساس ہے تو وہ اب تک خاموش ہے، ورنہ تمہاری طرح وہ بھی احتجاج کا حق رکھتا تھا، کیا اسے رشتوں کی کمی تھی۔''

''مجھے کونسا کمی ہے، میرے لئے قطار لگ سکتی ہے، لیکن کیا کروں، اس کے علاوہ میں نے آج تک کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے، وہی بیگانہ ہو گیا ہے۔''

''وہ بیگانہ نہیں ہوا، تم سوچو، کہیں تم ہی تو غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہو گئی ہو؟''

''نہیں......! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں، بلکہ بلال بدل گیا ہے، اس نے مجھے اپنے خیالات اور رویے کے بارے میں ذرا بھی بھنک نہیں پڑنے دی، مجھ سے جھوٹ بولا اور مجھے نظر انداز کر دیا، کیا یہ بے وفائی کے مترادف نہیں ہے؟ اور بندہ بے وفائی اسی وقت کرتا ہے، جب اس کے دل میں محبت نہ رہے۔''

''تم تو اس کے ساتھ محبت کرتی ہو نا؟''

''میری محبت کا کیا ہے، میں اپنا آپ اس پر وار بھی دوں تو یہ بیوی کا فرض گردانا جائے گا اور پھر میں ایسے شخص کے لئے قربان ہو جاؤں جس کے دل میں میرے لئے محبت نہیں رہی۔''

''تو پھر کیا کرو گی تم؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آتا، مجھے بزرگوں کے فیصلے پر سر تو جھکانا ہی تھا، کیا یہ ظلم نہیں ہے۔''

''تم ایک نئی بحث میں پڑ رہی ہو۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

یہی سوال اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا، جس کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔

وہ ایک روشن صبح تھی۔ وہ رات دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے دیر سے اٹھی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشے میں سے دھوپ اس کے کمرے میں آ گئی تھی، جس سے کمرہ روشن ہو گیا تھا۔ وہ کسلمندی سے اپنے بیڈ پر ہی پڑی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ مخصوص دستک سے پہچان چکی تھی کہ ملازمہ ہے۔

''ٹھیک ہے، میں جاگ رہی ہوں۔''

''بڑی بی بی جی آپ کو نیچے بلا رہی ہیں۔''

''ان سے کہہ دو میں آتی ہوں۔''

''اچھا'' ملازمہ نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر آہستہ قدموں سے نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ جہاں ذکیہ بیگم اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھی تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

''دو دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں اور تمہارا حال دیکھا ہے کیا ہے؟''

''تو کیا کروں ماما؟'' اس نے کہا۔

''تم ایک بار بھی پارلر نہیں گئی ہو، آج شام سے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہاری پھوپھو نجمہ آنے والی ہے۔ کم از کم رقیہ ہی کو گلاب نگر سے منگوا لو یا پھر تمہاری کوئی سہیلی بلوا لو۔'' ذکیہ بیگم نے کہا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی

''میں ٹھیک ہوں، میں کسی کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی، جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''کتنا وقت ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولی، پھر اگلے ہی لمحے خود پر قابو پا کر تحمل سے کہا ''میری بیٹی......! تم وہ کچھ نہیں سمجھتی ہو، جو بزرگ سمجھتے ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں، لیکن وقت بتائے گا کہ درست کیا ہے؟''

''تب تک شاید میری زندگی نہ رہے۔'' ماہا نے کہا تو اس کی ماما تڑپ گئی۔

''نہیں میری بیٹی......! ایسے مت کہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، چلو اٹھو، میں نے تمہارے انتظار میں ناشتہ نہیں کیا۔ پھر اور بہت سارے کام ہیں کرنے کو۔'' ذکیہ بیگم نے اٹھتے

ہوئے کہا تو ماہا بادل نخواستہ اٹھ گئی۔

دوپہر سے ذرا پہلے نجمہ پھوپھو آ گئی۔ اس کے ساتھ فہد تھا۔ سفر کی تھکان ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ فہد ان کے پاس کچھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا اور آرام کرنے کے لئے چلا گیا۔ جبکہ وہ تینوں شادی کے حوالے سے ہی سے باتیں کرنے لگیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب احسان نور بھی آ گیا تو یہی باتوں ہی باتوں شادی کا ذکر چل پڑا تو نجمہ پھوپھو نے فوراً اپنے مطلب کی بات کہہ دی۔

''احسان بھائی......! آپ کو یاد ہے، میں نے آپ سے ایک کام کہا تھا، رقیہ کے معاملے میں؟''

''ہاں......! مجھے یاد ہے، اس کا ذکر میں نے اباجی سے کر دیا تھا، لیکن الطاف بھائی نے یا تم نے کوئی حتمی بات تو کی نہیں تھی۔'' احسان نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیں......! اب اس میں حتمی بات کہنے کی کیا ضرورت ہے، ماشاء اللہ ماہا اب بلال کے گھر کی ہوگی تو رقیہ کے لئے خاندان میں بھلا اور کون لڑکا ہے۔'' نجمہ نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن فیصلہ تو افضال بھائی نے کرنا ہے نا، ہم سب مل کر اس سے بات کرتے ہیں، احسان نے کہا۔

''میں نے تو یہ ساری بات آپ پر چھوڑی ہے۔ آپ جو کریں۔ رقیہ بھی مجھے ماہا کی طرح پیاری ہے۔'' نجمہ نے ماہا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلیں الطاف بھائی آ جائیں تو پھر ہم اباجی سے بات کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں خوشی ہوگی، میں نے تو یہی محسوس کیا تھا۔'' احسان نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''بات تو ہم شادی کے بعد ہی کر سکیں گے نا؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''ہاں......! اس وقت سکون ہو جائے گا۔'' احسان نور نے کہا۔

''یہ ٹھیک رہے گا، کیونکہ میں تو ادھر ہی رہوں گی، یہاں بھی تو کسی کو ہونا چاہئے، وہاں حویلی میں تو بہت سارے لوگ ہوں گے۔ فہد چلا جائے گا، وہاں۔'' نجمہ نے دلار سے کہا تو ذکیہ مسکرا دی اور پھر بولی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، میں اکیلی گھبرا رہی تھی کہ کس کس معاملے کو دیکھوں۔''

''میں آ گئی ہوں نا، کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے احسان کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''باہر کے سارے معاملات آپ نے دیکھ لئے ہیں۔''

''ہاں......! اس کی فکر نہ کرو، میرے دوست ہیں، ان سب نے اپنے اپنے ذمے

کام لے لئے ہیں۔'' احسان نے اطمینان سے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے۔ اب میں اور ذکیہ گھر کے سارے معاملات سنبھال لیں گی۔'' نجمہ نے کہا تو احسان اٹھتے ہوئے بولا ''میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔''

وہ چلا گیا تو نجمہ اور ذکیہ اپنی باتوں میں کھو گئیں۔ ماہا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ماہا کو اپنے کمرے میں گئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ نجمہ پھوپھو اس کے پاس چلی گئی۔ ''ماہا......! یہ تم نے اپنا کیا حال بنایا ہوا ہے؟''

''یہ سارے چونچلے خوشی میں کئے جاتے ہیں پھوپھو، آپ تو جانتی ہیں، یہ سب میری مرضی سے نہیں ہو رہا ہے۔'' ماہا نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''اب جبکہ فیصلہ ہو چکا ہے، تم نے مان بھی لیا ہے، اس کی صورت چاہے کوئی بھی ہے۔ اب اسے نبھانا تو ہے نا۔'' نجمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! بس نبھانا ہی ہے۔ بڑوں کے کہے کی لاج رکھنی ہے۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''اب اس طرح نہیں سوچنا، کیونکہ مزاحمت کا وقت تم خود اپنے ہاتھوں گنوا چکی ہو۔'' نجمہ نے کہا۔

''پھوپھو......! یہی تو بات ہے، میری مرضی کے خلاف فیصلہ تو ہو گیا ہے، لیکن میں یہ سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ آگے میں کس طرح نبھا پاؤں گی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔

''اصل میں تم خود پہ اعتماد ہی نہیں رکھتی ہو۔ اگر تمہیں خود پر اعتماد ہوتا تو یہ فیصلہ اس طرح ہونا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ تم اپنے دل کی آواز نہیں سنتی ہو اور نہ ہی اسے سمجھ سکتی ہو۔ تم خود اپنے آپ میں الجھن کا شکار ہو۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہی نہیں آتا کہ تم نے کرنا کیا ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو سمجھ سکو اور اپنے دل کی آواز پر عمل کر سکو تو کوئی مشکل نہیں ہے کہ آئندہ تم نے بلال کے گھر جا کر کس طرح نبھا کرنا ہے۔'' نجمہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے پھوپھو، یہ میرے اندر کی آواز ہے، جس سے مجھے یہ فیصلہ اچھا نہیں لگ رہا۔'' وہ بولی۔

''نہیں......! ایسا نہیں ہے، اگر تمہیں یہ فیصلہ اچھا نہیں لگ رہا تھا تو پھر تم بھرپور مزاحمت کرتی، تمہارا ردعمل شدید ہوتا، زندگی کے معاملات میں خودغرض ہونا پڑتا ہے، ورنہ حالات اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔'' نجمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو وہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

"تو پھر میں کیا کروں پھوپھو......! بزرگوں کا کہنا نہ مانتی۔"

"وہی تو کہہ رہی ہوں، اب اگر تم نے یہ سب مان لیا ہے تو پھر وہی کرو جو وہ چاہتے ہیں اور بس۔ اپنا آپ، اپنی خواہشیں سب ان کے لئے تج دو۔" اس نے بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا۔

"مطلب......! میں اپنی ذات میں ختم ہو جاؤں......؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"دیکھو......! یہ بحث ختم نہیں ہو گی، ہم چاہے جتنا مرضی اس پر بات کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ جو تم نے کرنا ہے، اس کے لئے فیصلہ بھی تم ہی نے کرنا ہے۔ میری مانو......! آج شام تک اکیلے بیٹھ کر سوچ لو، جو تم نے کرنا ہے، پھر جو فیصلہ بھی کرو، اس میں کوئی الجھن نہیں ہونی چاہئے، ورنہ تم اپنے آپ میں ختم ہو جاؤ گی۔ اپنی جان کو روگ لگا لو گی۔" نجمہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور پھر اٹھ گئی۔ "میں چلتی ہوں، ہم اس معاملے پر شام کے وقت بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے پھوپھو......" اس نے زیر لب کہا اور پھر نجمہ کے چلے جانے کے بعد اپنے بیڈ پر لیٹ گئی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے اپنے آپ کے ساتھ حتمی فیصلہ کر لینا چاہئے۔ یہی اس کے لئے بہتر ہے۔

***

وہ ایک چمکتا ہوا دن تھا جب میری بارات نور پور جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ اگرچہ تیز چمکتے ہوئے سورج نے ہر شے کو واضح کر دیا تھا، لیکن شمال سے چلنے والی ہواؤں نے خنکی میں کافی زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ بارات اتنی زیادہ نہیں تھی۔ بس سات آٹھ کاریں تھیں، جن میں دو خواتین کے لئے اور ایک میں میرے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ ذیشان اور فہد کی گاڑی میرے پیچھے تھی۔ ہمیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ رات کا ہلا گلا تھا۔ لڑکیاں مہندی لے کر نور پور گئی تھیں وہ بہت دیر سے آئیں، اس کے بعد دوستوں نے کافی دیر تک ہنگامہ کیا۔ میں نے کسی کو نہیں روکا۔ اگرچہ میرے حساب سے یہ سب غلط تھا، لیکن پرکھوں سے چلی رسوم و رواج کو میں اکیلا ختم نہیں کر سکتا تھا۔ سیدھی سی بات ہے جو معاملات انفرادی ہوتے ہیں، ان میں تبدیلی انفرادی طور پر ہی لائی جا سکتی ہے، مگر جو اجتماعی ہوں وہ اجتماعی طور پر کوشش سے تبدیل ہو پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انفرادی آواز بلند نہ کی جائے۔ ہوتا یوں ہے کہ وہ انفرادی آواز دبا جاتی ہے۔ بارات چلی تو دوپہر ہو جانے والی تھی۔

تایا جی نے بارات کے لئے اپنے بنگلے ہی میں بہت شاندار انتظام کیا ہوا تھا۔

ہماری طرف سے آئے ہوئے مہمانوں کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اصل میں تایا جی نے بہت قریبی لوگوں کو بلوایا تھا۔ پھر اس کے بعد جو حلقہ احباب تھا انہیں گلاب نگر مدعو کیا تھا۔ یہ [illegible] نے کس سوچ کے تحت کیا تھا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہلکی پھلکی تواضع [illegible] کے بعد نکاح کے لئے کہا گیا۔ انہی لمحات میں میری نگاہ داخلی دروازے پر پڑی جہاں انتہائی سادہ لباس میں جو شخص اندر داخل ہوا میں اسے پہچان گیا۔ یہ وہی عبدالعزیز تھے جو مجھے ایک بار مغرب کے وقت چھوٹی سی مسجد میں ملے تھے۔

"آیئے مولانا......! ادھر تشریف لائیے۔" تایا جی کے ایک دوست نے ان سے کہا تو وہ میرے پاس آئے، ہاتھ ملایا اور میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ تبھی ایک ہلچل سی میرے اندر ہونے لگی، جس کی مجھے قطعاً سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تبھی انہوں نے اپنا نرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تو میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔

"بسم اللہ کیجئے مولانا صاحب۔" انہی دوست کی آواز آئی تو انہوں نے بہت رسان سے نکاح پڑھایا۔ لمبی دعا کے بعد جب مبارک سلامت کا شور اٹھا تو وہ میرے پہلو سے اٹھ گئے۔ دوست میرے گلے ملنے لگے تو مجھے پتہ نہ چلا اور وہ چلے گئے۔ پھر رجسٹر وغیرہ کی تکمیل کے بعد میری نگاہیں انہیں تلاش کرتی رہیں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دیئے۔ میں ان کا لمس، اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات کسی انسان کے پاس کسی بھی معاملے کی اہمیت بارے کوئی دلیل نہیں ہوتی، مگر اس معاملے کے اہم ہونے کا احساس پوری شدت سے ہوتا ہے۔ ان کا اس طرح ملنے کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا لیکن کیا تھا، اسے میں نہیں جان پایا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس وقت اس چھوٹی سی مسجد میں جاؤں اور ان سے ملوں، مگر یہ کوئی ایسا موقعہ نہیں تھا کہ میں ان سب کے درمیان سے نکل سکتا۔ دعوت کا اہتمام بھی شاندار تھا۔ اس کے بعد ہی ظہر پڑھنے کا موقع ملا۔ جو میں نے ذیشان کے ساتھ جا کر پڑھی۔ واپسی پر اس نے یونہی [illegible] سے انداز میں پوچھا۔

"کیا تم نے محسوس کیا؟ یہ فہد کچھ مرجھایا ہوا سا ہے، خاموش خاموش سا ہے، کہیں تم [illegible] کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں تو......! تم پوچھ...۔" میں نے بھی عام سے انداز میں کہا۔

"میں نے بس محسوس کیا۔ خیر......! میں پوچھتا ہوں اس سے۔" اس نے کہا تو [illegible] گئی ہو گئی۔

مغرب سے تھوڑی دیر قبل ہم واپس حویلی پہنچ گئے تو یوں لگا جیسے گلاب نگر وہاں امنڈ

آیا ہے۔ ماہا کا استقبال بہت اچھے انداز سے کیا گیا۔ وہ کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھی رہی، لیکن جونہی اذان ہوئی میں اٹھ گیا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر عروسی شیروانی اتاری اور سادہ لباس میں مسجد میں پہنچ گیا۔ تب تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے سکون سے نماز پڑھی اور جب دعا مانگنے لگا تو نجانے کیوں میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ آج میری زندگی ایک نئی طرز میں آ گئی ہے۔ اے اللہ اسے نبھانے میں استقامت عطا فرما۔ تاکہ میں اپنے اردگرد کے لوگوں کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔ میں سب سے آخر میں مسجد سے نکلا اور حویلی آ گیا، جہاں ہنگامے اپنے عروج پر تھے۔ ذیشان اور فہد ہی میرے قریبی دوست تھے، جنہیں حویلی کے مردانے میں ٹھہرایا گیا تھا، حالانکہ فہد میرا کزن تھا، لیکن وہ ذیشان کے باعث مردانے میں ٹھہرا، میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد فہد اٹھ کر چلا گیا اور ہم یونہی دوسری باتوں میں کھو گئے۔ عشاء کے بعد یہ ہنگامے ختم ہو کر رہ گئے تو حویلی میں سکون ہو گیا۔ دادا جی اور ابا جی، باہر مردانے میں تھے۔ وہ کل کی دعوت بارے نگرانی کر رہے تھے۔ حویلی کے اندر سناٹا چھا گیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کمروں میں تھا۔ میں جب آیا تو امی کے ساتھ دو اور خواتین میری منتظر تھیں۔

''ادھر آؤ......!'' امی نے کہا تو میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ تب وہ بولیں۔'' یہ لو بیٹا حق مہر کی رقم، بہو کو دے دینا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے خاصے نوٹ میری جانب بڑھا دیئے۔ پھر زیور کا ایک ڈبہ میری جانب بڑھایا۔''اس میں وہ کنگن ہیں، جو مجھے پہنائے گئے تھے۔ اب یہ بہو کے حوالے۔''

''امی آپ......!'' میں نے کہنا چاہا۔

''نہیں......! یہ تم ہی اسے دو۔ تم لوگوں کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے، تحفہ دینے سے محبت بڑھتی ہے اور یہ کنگن تو حویلی کی جانب سے اس پر اعتماد کی علامت ہیں۔ اسے پہلے ہی دن یہ احساس ہونا چاہئے کہ اس کی اہمیت یہاں پر کیا ہے۔'' امی نے بہت پیار سے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ پڑی ایک انگوٹھی کی طرف دیکھا تو امی نے کہا۔ ''یہ ہیرے کی ہے، تمہاری طرف سے، اب جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔''

یہ سنتے ہی میں تھوڑا جھجک گیا۔ وہ سب خواتین میری جانب ہی متوجہ تھیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں ماہا تھی۔

حجلہ عروسی کے لئے میرا کمرہ منتخب نہیں کیا گیا تھا، جہاں پر کتابیں وغیرہ تھیں، بلکہ حویلی کے اس حصے میں ایک دوسرا کمرہ سجایا گیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو پھولوں سے سجی

ٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ میں نرم قدموں سے چلتا ہوا سیج تک چلا گیا اور اس کے پاس بیڈ پر ماہا بیٹھ گیا۔ کئی ماہ بعد میں یوں اس کے قریب بیٹھا تھا۔ میں چند لمحے اس کے پاس بیٹھا رہا پھر نے وہ کہا جو میں نے پہلے سوچا ہوا تھا۔

''ماہا......! آج ہماری زندگی کی نئی طرح سے شروعات ہو رہی ہیں۔ ہم نے بچپن ساتھ گزارا، ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ درمیان غلط فہمی کی پرچھائیں آ گئی تھیں۔ اس لئے ہمیں سب کچھ بھول کر نئی طرح سے، انداز میں چلنا ہے، تاکہ ہم سب کی توقع پر پورے اتر سکیں۔ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا بلکہ تم خود سمجھدار ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا اور اس کے سامنے وہ رقم رکھتے ہوئے کہا۔''یہ تمہارا حق مہر......!''

''میں معاف کرتی ہوں'' اس نے آہستہ سے کہا تو میں نے رقم اٹھا کر دراز میں رکھ دی اور اس کے سامنے کنگن کر دیئے۔

''یہ پہن لو......! اور یہ انگوٹھی میری جانب سے تمہارے......'' لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے اپنا گھونگٹ الٹ دیا اور بڑے نرم سے انداز میں بولی۔

''بلال......! تم نے جو کہنا تھا سو کہہ چکے، اب میری سنو۔'' اس کے یوں کہنے سے میں ایک دم سے ٹھٹک گیا، اس کے لفظوں سے کوئی خوشگوار مہک نہیں آ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا تو وہ بولی۔''اس شادی سے پہلے میں نے بزرگوں سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی، لیکن انہوں نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بہت سوچا ہے بلال، زندگی فقط ایک بار ملتی ہے، اس لئے میں اسے اپنی مرضی سے گزاروں گی، تم چاہو تو، جو مرضی فیصلہ کرو۔''

''کیا مطلب......! تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔'' میں نے بہت کچھ سمجھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''میں نے بزرگوں کا کہا مان لیا اور اب میں اپنے انداز سے زندگی گزاروں گی۔ یہ فیصلہ کر چکی ہوں، اس پر تم اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔''

''ماہا......! میں نے کہا نا کہ ہم میں جو......''

''بلال......! یہ تو وقت بتائے گا کہ آئندہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، فی الحال یہ کنگن اس دراز میں رکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ تاکہ میں ایزی ہو کر سکون سے سو سکوں۔''

''ماہا......! تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میرے باہر جانے سے کیا ہو گا...... باہر

وہ......" میں نے اسے سمجھانا چاہا، لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے انتہائی خود غرضی سے بولی۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

"دیکھو......! میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا چاہتی ہو۔ میں تمہاری خواہش کا احترام کرتا ہوں، مگر......! یوں بات باہر نکلے گی تو ظاہر ہے اچھا نہیں ہوگا......اور"

"میں نے کہا نا، یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم نہیں مانو گے تو مجھے کوئی اور کمرہ دینا پڑے گا۔" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ میں چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اٹھا اور باہر چلا گیا۔ شاید یہ میری قسمت مجھ پر مہربان تھی کہ مجھے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کوئی نہیں ملا۔ کمرہ بھی تو چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں جب اپنے کمرے میں آیا تو میرا دماغ سلگ رہا تھا اور دھوئیں سے میرا پورا وجود بھر گیا۔ کتنی ہی دیر تک مجھے کچھ بھی سمجھائی نہ دیا کہ آخر ماہا نے ایسا رویہ کیوں اپنایا؟

یہ زندگی مجھے کس مقام پر لے آئی تھی؟ جہاں امتحان لینا مقصود تھا یا میری کوئی آزمائش تھی۔ میں چاہتا تو زور زبردستی کر سکتا تھا۔ لیکن میں سمجھنا چاہتا تھا کہ جب اس نے شادی کے لئے ہاں کر دی تھی، بزرگوں کی بات مان لی تھی اور اب یہ وطیرہ کیوں؟ میں اب محض بلال نہیں رہا تھا، اس کا شوہر بھی تھا۔ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے ساتھ یہ ہتک آمیز رویہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اس فیصلے پر ناخوش ہے۔ وہ مجھے زچ کرنا چاہتی تھی یا پھر یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ میں اب اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے لئے سختی کرنا بہت آسان تھا۔ میں اس کا غرور توڑنے کے لئے حدود سے پار اتر سکتا تھا، لیکن......! میں نے ایسا چاہا ہی نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ماہا کیا سوچ رہی ہے وہ مجھے ایک جابر، سخت اور پتھر دل شخص ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس راہ میں تو بہتیرے مقام آنے والے تھے اور مجھے چاہئے یہ تھا کہ میں ان مقامات سے گزر جاتا جو کسی بھی ریاضت سے کم نہیں تھے۔ ضروری نہیں کہ انسان ریاضتوں کے لئے جنگلوں، ویرانوں اور صحراؤں کا رخ کرے بلکہ میرے نزدیک یہ دنیا سب سے بڑی ریاضت گاہ ہے جہاں قدم قدم پر آزمائش درپیش ہوتی ہے۔

میری سوچ ایک خاص نہج پر پھیلتی چلی گئی اور میرے اندر سے دھواں چھٹنے لگا۔ میرا جو دماغ سلگ رہا تھا وہاں ایک ذرا سی بھی حدت نہیں رہی۔ میں نے سوچ لیا کہ اس کا رویہ اس کے ساتھ، لیکن میں نے وہ کرنا ہے کہ عشق جو چاہتا ہے۔ اس رات سے پہلے میں نے کبھی تہجد نہیں پڑھا تھا، اس رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں تہجد ادا کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہی سوچ کر میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ ساری سوچوں کو ذہن سے یوں نکالا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور نیند کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

❁......❁......❁

ماہا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بلال کا رویہ اس قدر نرم ہوگا۔ اسے تو یہ توقع تھی کہ بلال اس پر سختی کرے گا یا پھر اپنے رویے پر معافی مانگے گا۔ اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو کم از کم اس سے بحث ضرور کرتا، کوئی گلے شکوے، اعتراضات یا ایسا ہی کچھ، جس سے کم از کم بات بڑھنے کی امید ہوتی۔ اس نے بہت سوچ کر یہ رویہ اپنایا تھا۔ اگر بلال اپنی پہلی روش پر آ جاتا تو سب کچھ ٹھیک تھا اور یہ اسی وقت ہوتا جب اسے تھوڑا بہت دھچکہ لگتا یا پھر بلال اپنی اسی زندگی میں خوش تھا اور اس پر مضبوطی سے قائم تھا جو ماہا کو پسند نہیں تھی تو پھر ایک چھت تلے علیحدہ علیحدہ رہنا ہی بہتر تھا۔ اس کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلتا۔ اس نے اس معاملے میں بہت سوچا تھا اور جس کی شروعات اسی رات سے ہونا تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ زندگی کے بارے میں اسی رات فیصلہ ہو جانا تھا۔ وہ حیران تھی کہ بلال نے کوئی بھی ایسا ردعمل ظاہر نہیں کیا، جس کی بنیاد پر وہ کوئی فیصلہ کر سکتی۔ اس کے من میں تھا کہ بلال اس سے الجھتا، اس سے بحث کرتا، اپنے شوہر ہونے کا حق جتاتا، اس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے تجدید تعلق کی بات کرتا، وہ اس سے گلے شکوے کرتی، اور وہ زندگی جو اس نے اپنائی تھی اس سے دستبرداری کا وعدہ لیتی مگر......ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ جو پھر سے اس کی زندگی میں آیا تھا، آسانی سے نکل گیا۔

ماہا کو پوری طرح احساس تھا کہ اس نے کتنا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے اثرات ان دونوں کی زندگی پر ہی نہیں، خاندان کے دیگر افراد بھی متاثر ہوں گے لیکن اس کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ میں نے جب منع کیا تھا تو آپ مان جاتے اور میری شادی بلال کے ساتھ نہ کرتے۔ اب اگر میں نے آپ سب بزرگوں کی بات مان لی ہے تو مجھے میری مرضی کے مطابق جینے کا حق دیا جائے۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ تو آئی تھی لیکن یہ سب سوچتے ہوئے وہ ایک بار کانپ گئی تھی مگر نجمہ پھوپھو نے اس کی سوچ کو تقویت دی۔ یہاں تک کہ اس نے خود کو مضبوط کر لیا۔ وہ کون سا بیگانہ تھی، اپنی ہی تو تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بلال کو بدل کر رہے گی یا پھر اس کی زندگی سے نکل جائے گی۔ بات اب ذاتی پسند و ناپسند سے ضد پر آ گئی تھی۔ کیا وہ چابی کی گڑیا ہے کہ جب چاہا چابی دے کر جس سمت میں چلایا چاہا چلا دیا۔ میں بھی گوشت پوست کی انسان ہوں، میری بھی خواہشات، پسند و ناپسند اور ذاتی انا ہے۔ کیا میری زندگی پر میرا اپنا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی سلگتی سوچوں نے اسے اندر تک سے تبدیل کر دیا تھا۔

ماہا کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی یہ رات بہت اہم ہے جس کے بارے میں

چند خواتین بہت متجسس ہوں گی۔ وہ انہیں یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ اس کا رویہ بلال کے ساتھ کیسا رہا ہے؟ اسے اب یہ بالکل خوف نہیں رہا تھا کہ یہ بات اپنا کیا اثر رکھتی ہے اور کہاں تک جاتی ہے۔ ایسا اظہار وہ خالصتاً اپنے لئے چاہتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ کافی دیر تک یونہی بیڈ پر بیٹھی رہی۔ پھر اٹھی اور بھاری کامدار لباس اتار کر سادہ سے جوڑے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا جو رستہ میں نے چنا ہے وہ کامیابی کی جانب جا رہا ہے یا ناکامی کی طرف؟ یہ سوال پھر سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو اس نے پھر سے کامیابی اور ناکامی کی جمع تفرق کئے بغیر اسے ذہن سے نکال دیا۔ وہ سونا چاہتی تھی، سارے دن کی تھکاوٹ سے اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یوں جیسے ان آنکھوں سے نیند کی شناسائی ہی نہیں ہے۔ تبھی اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی، سرخ ڈبیا پر پڑی، جس میں کنگن تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈبیہ اٹھالی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ بہت خوبصورت کنگن تھے۔ یہ کنگن بہت عرصہ تک زبیدہ خاتون کی کلائیوں میں رہے تھے۔ اب وہ بالکل نئے جیسے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہیرے کی وہ انگوٹھی پڑی تھی۔ اس نے ویسے ہی پڑے رہنے دی اور کنگن پہن لئے اور پھر سے سونے کے لئے آنکھیں موند لیں۔ بہت دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند نہ آئی۔ نہ جانے کیا کچھ وہ سوچتی رہی۔ اسے حیرت اس وقت ہوئی جب گلاب نگر کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ پھر دستک سے اس کی ساری توجہ باہر کی جانب چلی گئی۔ وہ اٹھی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ باہر زبیدہ خاتون کے ساتھ ایک اور خاتون تھی۔ اس نے جب ماہا کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئیں۔

''ماہا تم......'' انہوں نے کہا تو وہ پلٹ کر بیڈ کے دراز تک آئی، اس دوران وہ دونوں خواتین کمرے میں آ چکی تھیں۔ ماہا نے دراز کھولا، وہ سرخ ڈبیہ اور رقم اٹھائی اور زبیدہ خاتون کی جانب بڑھا کر بولی ''یہ لیں......!''

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے انتہائی نقوش سے پوچھا

''میں نے حق مہر معاف کر دیا ہے اور یہ انگوٹھی قبول نہیں کی۔ میں چونکہ اب اس حویلی کی بہو ہوں سو میں نے کنگن پہن لئے ہیں''۔ وہ بولی۔

''بلال کہاں ہے؟'' انہوں نے ماہا کی بات پر توجہ دیئے بغیر پوچھا

''پتہ نہیں۔ میرے ہی کہنے پر وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ یا دس منٹ یہاں ٹھہرا ہوگا''۔ اس نے اپنی اس بات میں بہت کچھ سمجھا دینا چاہا۔

''مطلب...... بلال رات یہاں اس کمرے میں نہیں تھا؟'' زبیدہ خاتون نے

انتہائی حیرت سے پوچھا

''نہیں......'' ماہا نے کہا اور بیڈ کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ کیا کیا ماہا تم نے......! تمہارا تو بلال کے ساتھ بچپن کا ساتھ تھا۔ تم نے اسے یوں دھتکار دیا کہ جیسے......''

''بس چاچی جی، آپ جو سمجھیں۔ اب میں سونا چاہتی ہوں''۔ ماہا نے کہا اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں اس نے کہہ دیا کہ اب آپ جا سکتی ہیں۔ زبیدہ خاتون چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر انتہائی دکھی کیفیت میں وہاں سے چلی گئیں۔

ماہا زیادہ دیر تک نہ سو سکی۔ مہمانوں سے بھری ہوئی حویلی میں خاصی لڑکیاں تھیں۔ ان سب نے دلہن کے کمرے کا رخ کیا۔ انہیں ماہا میں پہلی رات کی دلہن والے اطوار دکھائی نہ دیئے تو انہیں مایوسی کے ساتھ خاصی حیرت بھی ہوئی۔ اس پر سوالات کی بھرمار ہو گئی لیکن اس نے کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ یونہی ٹال مٹول میں وہ اظہار نہ کیا جو اس نے زبیدہ خاتون کے سامنے کیا تھا اور نہ ایسی بات کو تو ویسے ہی پر لگ جاتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں یہ بات حویلی سے باہر نکلنے کے لئے پر تول رہی ہوتی۔ ماہا نے ان لڑکیوں کے سامنے بات کو چھپا لیا۔

❁......❁......❁

اس وقت سورج نکل آیا تھا جب میں حویلی واپس آیا۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا ہی تھا کہ نجانے امی مجھے کہاں سے دیکھ رہی تھیں، سیدھی میرے پاس آئیں اور مجھے لیتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''امی خیریت تو ہے آپ یوں......''

''تم بے وقوف ہو یا بنا دیئے گئے ہو؟'' امی نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو میں نے کہا۔

''آپ ماہا کے رویے کی بات کر رہی ہیں''۔

''ہاں......! یہ کیا تماشا ہے؟'' انہوں نے دبے لفظوں میں پوچھا

''امی......! اس وقت وہ ضد میں آئی ہوئی ہے اور جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے۔ مہمانوں سے حویلی بھری پڑی ہے۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے تو میں سب سنبھال لوں گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ میں نے انہیں ڈھارس دی۔

''بلال......! اصل بات یہ ہے کہ ماہا نے اپنا دل صاف نہیں کیا۔ زور زبردستی سے شادی تو ہو گئی ہے لیکن اس کا یہ رویہ ناقابل برداشت ہے''۔ انہوں نے دبے غصے میں کہا۔

”کب تک امی، وہ کب تک ایسا کر پائے گی۔ میں نے کہا نا، آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ چند ہی دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے“۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا تاکہ وہ آزردہ نہ ہوں۔

”بیٹے.....! نجانے مجھے کیوں لگتا ہے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی“۔ امی نے بے خیالی میں یوں کہا جیسے وہ مستقبل میں جھانک رہی ہوں۔

”اللہ کرم کرے گا۔ دیکھتے ہی حالات ہمارے لئے کیا لیکر آتے ہیں“۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے.....“ امی نے یوں کہا جیسے وہ اپنے آپ کو حوصلہ دے رہی ہوں۔ میں نے پھر مزید بات نہیں کی اور ان کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔

عصر ہو جانے تک دعوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور چند مہمانوں کے سوا سب چلے گئے۔ یہاں تک کہ ذیشان بھی واپس لوٹ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یورپ یا ہنی مون کے لئے کہیں جانا ہے تو بتاؤ تاکہ میں بندوبست کر دوں۔ میں نے اسے بعد میں بتانے کا کہا تو وہ چلا گیا۔ پتایا جانے سے پہلے میں نے یہ سارا پروگرام بنایا تھا۔ پھر میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں سارا وقت حویلی سے باہر رہا تھا اور مہمانوں سے ملتا رہا۔ مہندی میں بھی میرے ساتھ رہا اور لوگوں سے ملتا رہا۔ میں عصر کے لئے مسجد جانا چاہتا تھا لیکن مجھے حویلی میں بلوا لیا گیا جہاں ڈرائنگ روم میں امی، تائی ذکیہ، نجمہ پھوپھو کے پاس ماہا بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری جانب ابا جی، تایا اور دادا جی تھے جن کے پاس رقیہ اور الطاف انور تھے۔ فہد وہاں نہیں تھا۔

”آؤ بھئی بلال آؤ.....! میرے پاس بیٹھو“ تایا نے کہا تو میں ان کے پاس جا بیٹھا تو وہ بولے۔ ”اصل میں یار وہ رسم کے مطابق تم نے اب اپنے سسرال جانا ہے تو.....“ ان کے یوں کہنے پر سبھی مسکرا دیئے مگر انہوں نے اپنی بات جاری رکھی“ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر جبکہ سارے موجود ہیں ایک بات کہہ دوں؟“

”ایسی کیا بات ہے بھائی“۔ امی نے قدرے جوش سے کہا۔

”بات یہ ہے کہ نجمہ نے دو چار بار مجھے کہا ہے کہ یہ رقیہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے“۔ انہوں نے بہت سنبھل کر کہا تو سب نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تو ابا جی نے کہا

”ہم سوچتے ہیں اس بات پر مشورہ کرتے ہیں؟ پھر کوئی جواب دیں گے“۔

”ہاں.....! یہ مناسب رہے گا“۔ نجمہ پھوپھو نے جلدی سے یوں کہا جیسے وہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہ رہی ہیں۔

”پھر بھی.....اگر ایسا ہو جائے، کیوں ابا جی“۔ تایا جی نے ابا جی کی جانب دیکھ کر کہا لیکن اس سے پہلے ہی نجمہ پھوپھو فوراً بولی۔

”جب افضال بھائی نے کہہ دیا کہ سوچ کر بتائیں گے تو ٹھیک ہے“۔

”مگر میرے خیال میں تو تم منگنی کے موڈ میں آئی تھی؟“ تایا جی نے حیرت سے پوچھا

”وہ..... بات ہی اس طرح کی..... میں..... زور زبردستی کی قائل نہیں ہوں؟“ نجمہ پھوپھو نے اکھڑتے ہوئے کہا اور پھر اپنے شوہر کی جانب دیکھ کر بولی“ آپ بھی کہیں نہ کچھ“۔

”بات تو ہو گئی ہے۔ فہد بھی انہی کا بیٹا ہے، میرے خیال میں یہ اس کے لئے اچھا ہی سوچیں گے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ابا جی ہی اس کی سرپرستی کریں۔ اسے کوئی مقصد دیں۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ وہ کیا چاہتا ہے“۔ الطاف انور نے دھیرے دھیرے کہا۔

”فہد.....! یہ باتیں تو چلتی رہیں گی“۔ دادا نور الٰہی نے کہا، پھر میری جانب دیکھ کر بولے، ”اب تمہیں سسرال جانا ہے۔ ماہا تیار ہے، تم بھی تیار ہو جاؤ“۔

”بس پانچ منٹ بعد.....“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں اپنے کمرے میں گیا اور وضو کر کے نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ بڑے سکون سے نماز پڑھی اور پھر باہر آ گیا۔ اسی راہداری کے سرے پر ماہا میرے انتظار میں تھی۔ اس کے قریب بیگ دھرا ہوا تھا۔

”ملازم سے کہیں یہ بیگ گاڑی میں رکھ دے“۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا اور اس کے پاس رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سامنے ہی سے ملازمہ آ رہی تھی۔ میں نے اسے بیگ لانے کو کہا اور پھر سیدھا پورچ میں چلا گیا جہاں سبھی کھڑے تھے۔ فہد اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا نجمہ پھوپھو بھی جا رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا تو امی نے کہا

”میں نے تو بہت کہا کہ اتنے عرصے بعد الطاف بھائی آئے ہیں۔ ایک دو دن مزید رہ جائے مگر یہ فوراً ہی تیار ہو گئے ہیں جانے کے لئے“۔

”زبیدہ بہن.....! میں رہتا، لیکن ملازموں پر گھر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں انشاء اللہ بہت جلد آؤں گا اور پھر کافی دن یہاں رہوں گا“۔ اس نے کہا تو اتنے میں ملازمہ نے بیگ گاڑی میں رکھ دیا۔ میں اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تو ماہا پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ تایا جی تھے۔ تائی ذکیہ بھی پیچھے بیٹھ گئی اور ہم وہاں سے نکل پڑے۔ مغرب ہونے کو تھی جب ہم نور پور پہنچ گئے۔

میں جب مغرب کی نماز پڑھ کر ڈرائنگ روم میں آیا تو الطاف انور، فہد اور تایا جی باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو میرے وہاں آنے سے موضوع ہی بدل گیا۔ الطاف انور نے کہا

''اب بلال دیکھیں، ماشاء اللہ بہت اچھا افسر ثابت ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں بہت ترقی کرے گا اور پھر میرا اتنا تجربہ ہے۔ یہ اگر میرے تجربے سے فائدہ اٹھائے تو بہت سارے ذرائع ہیں جن سے یہ ڈھیروں دولت کما سکتا ہے لیکن ابھی یہ میرے تجربے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔

''کیوں نہیں......! یہ آپ سے بہت کچھ سیکھے گا۔ ابھی چونکہ معاملات آسان ہوں گے، اس لئے مشکل نہیں آتی ہوگی'' ۔تایا جی نے درمیانی سی بات کہہ دی۔

''ہاں جب تھوڑا سا وقت گزر جاتا ہے نا تو پھر پتہ چلتا ہے جیسے کہ اس کا تبادلہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر ہو جائے یا او ایس ڈی......'' انہوں نے مستقبل کے بارے میں مجھے خوف زدہ کرنا چاہا۔ میں اس بات کے پیچھے مقصد کو سمجھ رہا تھا۔ میں چاہتا تو بحث کر کے اس بات کو بے وزن کر دیتا لیکن اس وقت میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میرے اس طرز عمل کا انہوں نے پتہ نہیں کیا احساس لیا کہ مزید گفتگو نہ کی تو ہم میں خاموشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فہد سے کہا ''بھئی اپنی ماما کو بلاؤ......! چلیں''۔

''ارے ایسی کیا بات ہے، ڈنر کر کے ہی جائیں''۔

''نہیں......! ایک تو ویسے بھی ضرورت نہیں ہے، دوسرا گھر پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی''۔ الطاف انور نے عام سے لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے مزید کوئی بات ہوتی، تائی ذکیہ اور ماہا کے ساتھ نجمہ پھوپھو آگئیں، وہ آتے ہی بولیں ''چلیں''۔

''ہاں......! چلیں''۔ یہ کہتے ہوئے الطاف انور اٹھ گیا، اس کے ساتھ ہی فہد بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ ہم پورچ میں گئے اور پھر وہ چلے گئے تو ہم واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ماہا مجھ سے دور بیٹھی ہوئی تھی اور خاموش تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، تبھی تایا جی نے کہا۔

''ذکیہ......! تم نے محسوس نہیں کیا جیسے نجمہ اور الطاف کی کوئی سوچ تبدیل ہو گئی ہو، مطلب جو وہ کہنا یا کرنا چاہتے ہوں وہ نہ کر پائے''۔

''میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' وہ پرخیال لہجے میں بولیں۔

''یہی......! پہلے تو انہوں نے بہت شور مچایا ہوا تھا کہ رقیہ کی منگنی کے بارے میں،

لیکن انہوں نے کوئی بات ہی آگے نہیں بڑھائی، میرے خیال میں انہیں بحث کرنی چاہیے تھی''۔

''بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، افضال بھائی نے جب سوچ کر بتانے کو کہا تو......'' انہوں نے کہا پھر خود ہی کسی خیال کے تحت بولیں، ''کیا اباجی سے بات ہوگئی ہوئی تھی''۔

''ہاں ہاں، میں نے بات کر لی تھی اور انہوں نے افضال سے بھی پوچھ لیا تھا، بس یہ ذرا سا زور دے دیتے تو منگنی تک ہو جاتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں......'' وہ یہ کہتے ہوئے خاموش ہوگئے۔

''خیر......! چھوڑیں آپ، خود بخود پتہ چل جائے گا۔ ویسے نجمہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی''۔ تائی ذکیہ نے بتایا تو تایا جی بولے۔ ان کا روئے سخن میری جانب تھا۔

''اچھا بھئی......! میں تو بہت تھک گیا ہوں، کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا ہے، مجھے اجازت......''

''آپ آرام کریں'' میں نے کہا تو وہ اٹھ گئے، تب تائی بولیں۔

''اچھا بھئی بچو......! تم لوگوں کا کمرہ اوپر ہے۔ آؤ کچھ کھانے پینے کا موڈ ہے تو میں اوپر ہی بھجوا دیتی ہوں''۔

''ضرورت ہوئی تو میں خود لے لوں گی، آپ آرام کریں، بہت تھک گئی ہوں گی''۔ ماہا نے کہا اور اٹھ گئی۔

میں جب اوپری حصے میں گیا تو ماہا صوفے پر بیٹھی اپنا زیور اتار رہی تھی۔ میں بھی ایک طرف جا کر بیٹھ گیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے اطمینان سے سارا زیور اتارا، اسے ڈبے میں بند کر کے سیف میں رکھ دیا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔

''آپ کچھ کھائیں پئیں گے''۔

''ابھی تو بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''چلیں، جب بھوک محسوس ہو تو بتا دیجئے گا''۔ اس نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تمہیں بھوک نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا

''تھوڑی بہت ہے، مجھے ضرورت ہوئی تو کھا لوں گی''۔ اس نے پھر ویسے ہی جواب دیا۔ تب ہم میں خاموشی طاری ہوگئی، میرے ذہن میں بہت کچھ تھا کہنے کے لئے، لیکن میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر یونہی گزری تو وہ بولی، ''دیکھیں بلال......! آپ میرے رویے سے سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ [illegible] ہم ایک چھت کے تلے ہی رہیں گے لیکن میں نہیں چاہوں گی کہ آپ مجھ سے کسی اچھی بیوی کی توقعات رکھیں۔ میں اپنی مرضی

سے جینا چاہوں گی۔ اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہوگا''۔ اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ پہلی بار وہ میرے لئے ''آپ'' کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ تب میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تم مجھے اتنے تکلف کے ساتھ آپ کیوں کہہ رہی ہو''۔

''اس لئے کہ آپ میرے شوہر ہیں اور اس لئے بھی کہ اب ہم میں پہلے والا تکلف نہیں ہے۔ حیثیت بدل گئی ہے''۔

''مگر میں یہ چاہتا ہوں ماہا کہ اب جبکہ تم میری بیوی بن چکی ہو، ہمیں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہیے''۔

''آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوگا۔ مجھے اپنے چاہنے سے غرض ہے۔ میں جو چاہوں گی، اسی کے مطابق اپنی زندگی گزاروں گی''۔ وہ بولی۔

''تم آخر اس طرح کیوں سوچنے لگی ہو؟'' میں نے بہت تحمل سے پوچھا

''مجھے آپ کا لائف سٹائل پسند نہیں۔ ٹھیک ہے، آپ ایک کٹر مسلمان بننا چاہتے ہیں، آپ بنیاد پرست بنیں یا دہشت پسند، آپ کو حق ہے، اسی طرح آپ مجھے حق کیوں نہیں دیتے کہ میں اپنی پسند سے زندگی گزاروں''۔ وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''میں دہشت پسند مسلمان نہیں ہوں اور نہ بننا چاہتا ہوں۔ اسلام کا مطلب ہی سلامتی ہے۔ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں یہ قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے، ماہا......! تم میری محبت ہو، میرا عشق ہو، میں خود کو تمہارے بنا ادھورا سمجھتا ہوں، اب جبکہ ہم مل گئے ہیں، تمہارا ساتھ ایک بیوی کی حیثیت سے میرے ساتھ ہے تو میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کو بہت خوبصورت بنانا چاہتا ہوں، وہ سارے خواب پورے کرنا چاہتا ہوں جو میں نے دیکھے تھے۔ وہ ساری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں لیکن......! اگر تم یہ چاہو کہ میں یہ لائف سٹائل چھوڑ دوں تو ایسا نہیں ہے ماہا، میں ایسا نہیں کر سکوں گا''۔

''دوسرے لفظوں میں آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے سارے خوابوں، خواہشوں اور امیدوں سے دستبردار ہو کر آنکھیں بند کر کے، آپ کے ہر حکم کی بجا آوری کرتی چلی جاؤں، جیسے میں انسان نہیں، بلال صاحب......! میں ایسا کوئی سمجھوتہ نہیں کر پاؤں گی''۔ وہ دبے دبے غصے میں بولی۔

''چلو......! ہم کچھ ایسے معاملات پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں کہ......''

''میں نے کہا نا، میں آدھی ادھوری نہیں ہونا چاہتی''۔ اس نے نخوت سے کہا۔

''دیکھو......! میں نے تمہارے لئے لاہور میں بہت خوبصورت گھر بنوایا ہے، تمہاری پسند کا، ہمیں وہیں ایک چھت تلے رہنا ہے اور......''

''نہیں، میں حویلی میں رہوں گی یا پھر اس بنگلے میں جو پاپا میرے نام کر چکے ہیں۔ یہ میرے لئے زیادہ قیمتی ہے جہاں میرے بچپن سے لے کر اب تک کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ میں آپ سے کبھی کسی شے کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ بس اس کے عوض مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے''۔ یہ کہتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

''ماہا......! مجھے بتاؤ، یورپ کے کن ممالک میں جانا چاہتی ہو، میں ہنی مون......'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے ٹوک دیا

''نہیں......! میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ اس نے کہا۔

''لیکن میں تمہیں اتنا ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ ضد، انا اور خود غرضی کوئی اچھے رویے نہیں ہیں۔ یہ زندگی کو تلخ بنا دیتے ہیں۔ اپنے رویے پر غور کرو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ تاکہ ہم ایک خوشگوار اور پرسکون زندگی گزار سکیں''۔ میں نے اسے سمجھایا تو وہ کچھ نہ بولی، جیسے وہ میری کسی بات کو اہمیت ہی نہ دینا چاہتی ہو۔ شاید ہم میں کوئی مزید بات ہوتی۔ اس وقت میرا فون آ گیا جو میرے دوست کا تھا، وہ مبارک باد دے رہا تھا، چند لمحوں بعد فون بند ہو گیا۔ ماہا، وہاں سے اٹھ چکی تھی۔ اتنے میں عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا۔ میں جب نماز سے فارغ ہوا تو ماہا اپنا بستر بیڈ سے نیچے لگا چکی تھی۔ میں مسکرا دیا اور بیڈ پر جا لیٹا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ماہا مجھ سے دور ہو چکی ہے۔ اس تک پہنچنا اگرچہ مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس وقت مجھے عشق کی قوت کا احساس ہوا۔ شدت پیاس میں چاہے بندہ کنوئیں کے پاس بھی آ جائے لیکن عشق چاہے تو پیاس بھلا دیتا ہے۔ فرات چاہے بہہ رہا ہو لیکن پیاس اور فرات کے درمیان کیا شے تھی، اس کا مجھے ادراک ہو رہا تھا۔

* * *

انہیں نور پور سے چلے کافی وقت ہو گیا ہوا تھا۔ فہد ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر الطاف انور تھا۔ نجمہ پچھلی نشست پر تھی۔ وہ یوں ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے اسے لاہور پہنچنے کی اتنی جلدی نہ ہو۔ کار کی اندرونی فضا میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی کو نجمہ نے توڑا۔

''ہمیں نور پور سے چلے کافی وقت ہو گیا ہے اور تقریباً آدھا سفر طے کر چکے ہیں''۔

''ہوں......!'' الطاف نے ہنکارا بھرا

"لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اتنے خاموش کیوں ہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ شکوہ تھا۔

"آں...... ہاں...... بس یونہی سفر جو کر رہے ہیں"۔ الطاف نے چونکتے ہوئے کہا۔

"سفر کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کوئی بھی بات نہ کریں۔ آپ بھی میری طرح کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ ہم نے کوئی گڑبڑ کر دی ہے"۔ نجمہ نے تشویش گھلے لہجے میں کہا تو الطاف نے چند لمحے بعد جواب دیا۔

"یہ اچھا ہے کہ اس وقت فہد بھی ہمارے ساتھ ہے۔ میری سمجھ میں جو بات آ رہی ہے کہ تم ماں بیٹے کی سوچ درست سمت میں نہیں ہے۔ تم دونوں یا تو سب کچھ پا لو گے یا پھر سب کچھ کھو دو گے...... کھو دینے کے چانس کہیں زیادہ ہیں"۔

"میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں لیکن امید ہوئی تو......" نجمہ نے کہنا چاہا مگر الطاف نے ٹوک دیا۔

"نہیں......! بات یہ نہیں ہے بیگم، اصل میں تم دونوں ڈانواں ڈول ہو اور دونوں ہی جذباتی ہو"۔ یہ کہتے ہوئے وہ چند منٹ خاموش رہا پھر بولا...... "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم دونوں کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ماہا نے بلال کو قبول نہیں کیا۔ مان لیتے ہیں کہ ان کے درمیان زیادہ دیر تک یہ بندھن بھی نہیں رہ سکتا لیکن کب تک انتظار کریں گے۔ اگر اس وقت تک رقیہ ہی کی منگنی ہو گئی تو پھر کیا پھر نئے سرے سے یہ سب کوشش رقیہ کے لئے ہو گی۔ ایک طرف محض امید ہے، اگر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے درمیان یہ بندھن زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تو یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے نا کہ ان کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے یا ایک دوسرے کے ہم خیال ہو جائیں اور میرے خیال میں یہ بندھن اتنی جلدی ٹوٹنے والا نہیں ہے کیونکہ اس میں خاندان کے بزرگوں کی مرضی شامل ہے۔ یعنی تین چوتھائی سے بھی کم امید ہے لیکن...... دوسری جانب ایک اچھا مستقبل بنانے کے لئے منزل سامنے کھڑی ہے۔ اتنی قریب کہ تم دونوں اس سے منہ موڑ رہے ہو"۔ اس نے نرمی سے اپنی بات کہہ دی۔

"تو کیا آپ یہی سب کچھ سوچتے چلے جا رہے ہیں؟" نجمہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

"بھئی......! مجھے بھی فہد کا مستقبل پیارا ہے، میں بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں لیکن ٹھوس حقائق پرانہ کہ محض ہوا میں بات کرتا ہوں"۔ وہ بولا۔

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں کہ بعض دل کے معاملات بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ ان کا ہر حال میں آخری امید تک انتظار کیا جاتا ہے"۔ وہ پرجوش لہجے میں بولی۔

"میں اگر تمہاری بات ٹھیک مان بھی لوں تو اصل حقیقت کا ادراک تم اب بھی نہیں کر پا رہی ہو۔ دولت اور محبت دونوں بہت زیادہ قسمت والوں کو اکٹھے ملتی ہیں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ محض جذبات سے یوں دولت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان دونوں میں سے کسی ایک شے کو چننا ہو گا"۔

"اگر دونوں ساتھ ہی آ رہی ہوں اور اس کے لئے تھوڑا انتظار کر لیا جائے تو کیا برائی ہے"۔ نجمہ نے پرسوچ انداز میں کہا "میں کہہ رہا ہوں نا کہ تم دونوں ڈانواں ڈول ہو۔ ایسی حالت میں کشتی کنارے نہیں لگا کرتی۔ عین ساحل پہ بھی اس کے ڈوب جانے کا امکان ہوتا ہے"۔ منطقی انداز میں بولا

"آپ اس قدر خوفناک انداز میں کیوں سوچ رہے ہیں۔ میں نے کوئی امید دیکھی ہے تو اپنا ارادہ بدلا ہے ورنہ میں بھی کل شام یہ سوچ چکی تھی کہ اب ماہا کے بارے میں سوچنا فضول ہے لیکن آج صبح جب مجھے اس نے بتایا تو میں نے اسے غیب ہی سے اشارہ سمجھا، میں کیوں نا اس......"

"بیگم......! یہ غیب کے اشارے نہیں، ٹامک ٹوئیاں ہیں۔ میں نے کہا نا کہ تم ابھی بھنور میں پھنسی ہوئی ہو"۔ اس نے کہا تو نجمہ تنک کر بولی۔

"تو چلو آپ مجھے کوئی عقل دے دیتے۔ میں نے جب آپ سے کہا تو آپ فوراً مان گئے۔ ذرا سی بھی بحث نہیں کی۔ اب آپ ساری "منطقیں" بیان کر رہے ہیں"۔

"نہیں بیگم......! میں نہیں چاہتا کہ کل تم لوگ جب پچھتا رہے ہو تو مجھے الزام دو۔ شادی فہد نے کرنی ہے اور فیصلہ بھی اسی نے کرنا ہے کہ یہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے تو اپنا پلان بتا دیا ہوا ہے۔ اب اس پر عمل تو اس نے کرنا ہے اب جبکہ یہ تمہارے ساتھ مل کر دوسرے ٹریک پر جا رہا ہے تو میں کیوں دخل اندازی کروں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ اسے میرا پلان پسند نہیں"۔ الطاف انور نے خاصے جوش سے کہا تو نجمہ نے قدرے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بات پھر وہی پسند اور ناپسند کی آ جاتی ہے۔ ماہا اسے پسند ہے"۔

"میں یہ دلیل نہیں مانتا، ایسا حق تو بلال بھی رکھتا ہے۔ تو اسے اس کا حق دو، کیوں چھینتے ہو"۔ وہ بولا

"اس میں چھین لینے والی کیا بات ہوئی"۔ نجمہ پھر تنک کر بولی

"ایسی ہی بات ہے۔ للچائی ہوئی نظر سے کسی کی پلیٹ پر نگاہ رکھنا جبکہ ذرا سی سمجھ بوجھ کیساتھ آپ اپنا حق لے لو، یہ چھین لینا نہیں ہے"۔ الطاف نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب تو ہم نے وقت کھو دیا ہے۔ میں کم از کم ماہا کا انتظار ضرور کروں گی"۔ نجمہ نے اپنی بات پر اڑتے ہوئے کہا۔

"میں منع نہیں کروں گا۔تم اگر کامیاب ہو جاتی تو میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرلوں گا اور اعتراف کرلوں گا کہ میرا پلان درست نہیں تھا"۔ اس نے واضح انداز میں کہا تو پھر ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کی بحث میں فہد ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کے مستقبل کے بارے میں بحث کر رہے تھے تو اسے بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے یہ ادراک ہو گیا تھا کہ بالآخر فیصلہ تو اسی نے کرنا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر رکھی اور پہلے سے بھی زیادہ رفتار بڑھا دی۔

میری آنکھ کھلی تو تہجد کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا ماہا قالین پر بستر بچھائے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں سکون سے اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ وضو کر کے نکلا تو وہ اسی پہلو سو رہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے جائے نماز تلاش کی اور ایک کونے میں بچھا دی۔ کمرے میں باہر کی لائٹ سے ہلکا ہلکا اجالا تھا۔ میں نے لائٹ جلا کر اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ تہجد کے بعد بڑے خشوع وخضوع سے دعائیں مانگیں جس میں زیادہ دعائیں ماہا کے لئے مانگیں تاکہ اسے حقیقت کا ادراک ہو جائے۔ ان لمحات میں نجانے کیوں مجھے پی لون یاد آ گئی تھی۔ وہ پتایا کے شاہانہ ہوٹل میں اسی طرح لیٹی ہوئی سو رہی تھی۔ میں نے اس کے لئے بھی ڈھیر ساری دعائیں مانگیں کہ اے اللہ اس پر بھی حقیقت کھول دے اور اس کے حال پر رحم فرمانا۔ دیر تک دعائیں مانگتے رہنے کے بعد میں اٹھا تو میرا جی نہیں کر رہا تھا کہ میں دوبارہ بستر پر لیٹوں۔ میں اٹھا اور باہر انیکسی میں چلا گیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ اوپر تاروں بھرا آسمان، رات کے پچھلے پہر کی مدھم ہوا، ہر جانب گہرا سناٹا۔ میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر جب اذانیں ہونے لگیں تو میں واپس کمرے میں آ گیا۔ وہیں میرے سامان میں کار کی چابی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ اٹھائی اور نیچے آ گیا۔

میرا رخ نور پور سے باہر جانے والی سڑک کی جانب تھا جہاں راستے میں وہ مسجد آتی تھی جس میں مجھے وہ بزرگ ملے تھے۔ اچانک میرے دل میں ان سے ملاقات کی خواہش بھڑک اٹھی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ ان سے ملوں، ان سے باتیں کروں، چند سوال میرے ذہن میں تھے میں ان سے تفہیم چاہوں۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنے من کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ میں جب مسجد میں پہنچا تو جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے

سنتیں ادا کیں اور پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کر کے بیٹھ گیا۔ وہ بزرگ ایک طرف سیاہ کمبل اوڑھے، سر جھکائے پوری محویت سے تسبیح کر رہے تھے۔ میں منتظر ہو گیا کہ جب وہ اٹھنے لگیں گے تو میں ان سے بات کروں گا۔ کافی وقت گزر گیا اور ہم دونوں ہی مسجد کے اندر رہ گئے۔ تب انہوں نے سر اٹھایا اور میری جانب دیکھا۔ انہوں نے پہلی نگاہ میں مجھے پہچان لیا، میری جانب دیکھ کر مسکرائے، پھر اٹھ کر میری جانب قدم بڑھانا ہی چاہتے تھے کہ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ سلام ودعا کے بعد ہم وہیں بیٹھ گئے۔

"آج آپ کو اتنی صبح وقت مل گیا"۔ وہ بڑے دھیمے لہجے میں بولے۔

"بس میرا جی چاہا آپ سے ملنے کے لئے تو میں آ گیا"۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں......! آپ کی شادی جو یہاں پر ہوئی ہے۔ اس دن مجھے آپ کے بارے میں تفصیلی تعارف ہوا کہ آپ نور الٰہی صاحب کے پوتے ہیں۔ خیر......! اگر کوئی ذہن میں بات ہو تو بتائیں"۔ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میاں صاحب......! اصل میں جب انسان اپنا ٹریک چھوڑ کر دوسرے ٹریک پر آتا ہے تو اسے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں فقط حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے اور بس"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوشی سے بولے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دنیا داری میں رہتے ہوئے بہت سارے معاملات مشکل ہو جاتے ہیں جو پہلے بہت آسان ہوتے ہیں لیکن آپ نے غور کیا بلال میاں کہ مشکل کیوں لگ رہے ہوتے ہیں"۔ انہوں نے میری جانب دیکھ کر کہا

"جی آپ فرمائیں"

"اصل میں یہ ساری تصور کی کارفرمائیاں ہیں۔ تصور، یعنی خیال، جو ہمارے اندر سے اٹھتا ہے۔ اگر تو وہ واضح ہے، نہایت واضح تو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ اگر ہم بہت ساری چیزوں کے بارے میں تصور رکھتے ہیں تو کوئی دھندلا ہوتا ہے، کوئی واضح اور کوئی نہایت واضح، تصور کی پختگی کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ ہم نے تمام معاملات پر سوچا اور پھر اٹل فیصلہ کر لیا اور اس پر ڈٹ گئے، جیسے طوفان میں کوئی پہاڑ، یہ سب پریشانیاں اور مشکلات تو زندگی کا حصہ ہیں"۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ماحول تو اثر انداز ہوتا ہے نا"۔ میں نے کہا

"ہاں......! اثر انداز ہوتا ہے لیکن پھر بات وہی ہے کہ بندہ اندر سے کتنا مضبوط ہے۔ وہ جس طرح تقویٰ کے بارے میں بتایا جاتا ہے تاکہ وہ ایسے ہے جیسے خاردار جھ

میں سے خود کو، اپنے کپڑوں کو بچا کر گزرنا، بالکل درست ہے اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر ہم اپنے آپ کو اپنے کپڑوں پر توجہ دینے کی بجائے، دوسروں کو دیکھیں اور انہیں ڈانٹتے رہیں کہ اپنے کپڑے بچاؤ تو ان خاص حالات میں درست رویہ نہیں ہے۔ آپ یہاں اپنے آپ کو بچانے کی فکر کریں''۔ انہوں نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔

''فی الحال تو میری خاصی چھٹیاں ہیں۔ اس کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔ اتنے دنوں میں اگر آپ مجھے تھوڑا وقت دیتے رہیں تو......''

''کیوں نہیں...... آپ جب بھی آؤ۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھیں گے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہم سوال کرنے میں بھی آزاد نہیں رہے۔ ہم نے اپنے اردگرد حد درجہ بندیاں بنالی ہیں کہ اس دائرے سے باہر نہ سوچنا ہے اور نہ کچھ کہنا ہے۔ سکوت نہیں اور نہ سکون ہے۔ زندگی تو ہر دم رواں دواں ہے۔ اس کے ساتھ چلنا ہے یا پھر اسے ساتھ چلانا ہے۔ کچھ تو کرنا ہے ورنہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ شیطانی اعمال شاید اسی لئے بڑھ گئے ہیں کہ ہم نے وقت کا ساتھ نہیں دیا۔ وقت تو دریا کا بہتا ہوا پانی ہے جو واپس نہیں لوٹتا، ہم اگر کنارے پر کھڑے وقت کو دیکھتے رہے تو کیا ہوگا، وقت نکل چکا ہوگا اور جو وقت کے ساتھ چلا وہ آگے بڑھ گیا وہ جو کوئی بھی ہو''۔ وہ بہت نرم خوئی سے بولے۔

''لیکن انسان تو اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے''۔ میں نے کہا۔

''آپ اپنے بارے میں سوچیں کہ آپ اپنے آپ کو کتنا تباہ کر رہے ہیں یا اپنی تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں انسان کے بہت سارے اختیارات ہیں۔ وہ چاہے تو اپنے آپ کو کھنڈر کی دنیا میں واپس لے جائے یا پھر موت پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ انسان اور وہ بھی آج کا انسان، عصر حاضر کا انسان بہت اہم ہے۔ یہ ماضی سے حال تک کا سفر کر چکا ہے اور اب اسی نے مستقبل میں جانا ہے اور خود انسان ہی نے اپنی درجہ بندی کی ہوئی ہے جبکہ سوچ لامحدود ہے۔ یہ نہ وقت کی پابند ہے اور نہ کسی خاصی مقام کی۔ جہاں آپ کسی کے بارے میں سوچتے ہیں وہاں پہلے یہ دیکھیں کہ جو کسی کے بارے میں آپ سوچ رہے ہیں، کیا آپ خود پر حاوی ہو چکے ہیں اس معاملے میں۔ مثال کے طور پر آپ چاہ رہے ہیں کہ دوسرا کوئی سگریٹ نہ پیئے، تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کہیں میں تو نہیں پی رہا'' پھر اس سے آگے چلیں۔ برائی ختم کرنے کا آغاز خود اپنی ذات سے کریں''۔

اس سے پہلے میں کوئی بات کرتا، ایک شخص کیتلی کے ساتھ دو پیالیاں رکھ گیا۔

جن میں گرم گرم دودھ تھا۔ دونوں پیالیوں میں ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے پینے کے لئے کہا۔ کافی دیر خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

''آپ اس دن عشق کے بارے میں بتا رہے تھے کہ تصوف بھی اس کا مرہون منت ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عشق کے بارے میں میرا بھی تصور بدلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے بارے میں خوب جان لوں''۔

میرے یوں کہنے پر وہ مسکرا دیئے۔ پھر بولے۔

''عشق کو کون سمجھ سکا ہے۔ یہ تو اپنی سمجھ خود عطا کرتا ہے۔ میں تو خود طالب علم ہوں، اس کی تفسیر کیا کر پاؤں گا، بہرحال عشق کے بارے میں چند باتیں بتا دیتا ہوں، اس سے شاید آپ کی کوئی راہ آسان ہو جائے''۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر بولے ''پہلی بات تو یہ ہے کہ جو عیاں ہو جائے۔ وہ راز نہیں ہوتا، عشق بھی راز ہے اور فتح وہی شے ہوتی ہے جو دسترس میں آ جائے۔ عشق کی فطرت نہیں ہے کہ وہ خود فتح ہو جائے، یہ تو فاتح ہے، کائنات کا وہ راز ہے جو فقط فتح کرنا ہی جانتا ہے۔ حاکم ہے، محکومیت اس کی سرشت ہی میں نہیں ہے۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ بندہ عاشق بھی ہو اور وہ ناکام ہو جائے۔ عشق میں لاحاصل رہنا ممکن نہیں ہے۔ وہ عاشق نہیں، کچھ اور ہو سکتا ہے جسے ناکامی دیکھنا پڑے کیونکہ عشق تو ہے ہی ولایت سے ماورا...... اور عشق کوئی معمولی شے نہیں ہے کہ وہ فانی چیزوں تک محدود ہے جس طرح عشق لافانی ہے۔ اسی طرح اس کا مقام بھی لافانیت تک جا پہنچتا ہے۔ عاشقی میں مادی کوئی حیثیت نہیں رکھتا''۔

''اور دوسری بات......!'' میں نے پوچھا

''جب تک صورت سامنے نہیں ہوتی، عشق کی لذت سے آشنائی بھی ممکن نہیں ہے۔ کائنات میں ہر طرف اشیاء بکھری پڑی ہیں۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''تم میری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ سبھی کسی نہ کسی طرح صورت رکھتی ہیں۔ اب عاشق کا معیارِ عشق کیا ہے؟ محض صورت تک محدود ہو جانا یا پھر محض مشاہدہ حق...... نہیں...... اصل مقصد اس حقیقت تک رسائی جس نے یہ صورت تخلیق کر دی۔ اور جان لو کہ حقیقت تک رسائی دینے والی فقط ایک ہی شے ہے اور وہ ہے عشق۔ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی بھی صورت سے رازِ حقیقت تک رسائی ایک راستہ ہی تو ہے۔ اگرچہ کٹھن ہے، قربانی در قربانی سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن یہی فطرت کے قریب ترین ہے۔ میرے کہنے کا مقصد ہے عمل، محض خیال نہیں۔'' وہ دھیرے دھیرے کہتے چلے گئے تو میں نے پوچھا

''ان ساری کیفیات کا عام بندے کو کیسے ادراک ہوتا ہے۔قوت کا ادراک ہوتو کیسے عمل میں لائی جا سکتی ہے''۔

''یہی بات ہے، عشق تو من میں آتا ہے اور ہماری نگاہ مظاہر پر ہوتی ہے۔ بلکہ کیفیات مظاہر میں نہیں ہوتی بلکہ اپنے من میں تلاش کی جاتی ہے، جہاں یہ موجود ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ کو تلاش کرتے ہیں تو ہمارے اندر کی کائنات ہمارے سامنے واہو جاتی ہے۔ اب ہمیں یہ تو دیکھنا چاہیے نا کہ ہم پر کس کا رنگ غالب آ رہا ہے۔کہیں ہماری نفسانی خواہشات بھیس بدل کر ہمیں گمراہ تو نہیں کر رہی ہیں۔کیا ہم نہیں چاہیں گے کہ عشق کی خالص کیفیات کا ادراک کریں۔انہیں سمجھیں اور ان کے اثرات کا جائزہ لیں۔عشق کی سمجھ اس وقت آتی ہے جب ہم اپنے آپ سے ملتے ہیں''۔

''تو وہ صورت جس کے ذریعے سے حقیقت تک رسائی کا راستہ ہوتا ہے، کیا اس کی کوئی حیثیت نہیں، کیا وہ مظاہر کا درجہ رکھتا ہے'' میں نے پوچھا

''پہلی بات تو یہ بیٹا کہ اس کائنات میں ہر شے کی حیثیت ہے لیکن ان میں درجات بھی ہیں جس طرح انسان نے مختلف مظاہر کی پوجا کی، آگ، سورج، ستارے، چاند، پانی...... اور نہ جانے کیا کیا کچھ لیکن پھر ان کی حیثیت کیا ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب درجات دے کون رہا ہے، انسان، یہ انسان کے اختیارات ہیں کہ وہ سورج کو دیوتا مان لے یا پھر محض روشنی دینے والا منبع جو اللہ کے حکم سے چمکتا ہے اور خدمت انسانی پر مامور ہے، تو اصل اور حقیقی شے کیا ہوئی، ہمارا تصور، ہمارا خیال یا ہماری سوچ، اس شے کو اگر محدویت میں جکڑ دیں گے تو سوچ کی فطرت نہیں بدلے گی۔سوچ تو لامحدود ہے، دائرہ بھی ہم خود بناتے ہیں اور اسے آزادی بھی ہم نے دینی ہے۔سمجھنے والی بات یہ ہے کہ لامحدویت تک پرواز کی قوت کیا ہے؟ یہ عشق ہی تو ہے اور رہی صورت کی بات......!'' وہ سانس لینے کے لئے رکے تو میں فوراً بولا

''جی، میں یہی سمجھنا چاہ رہا ہوں......''

''اب سرکار دو عالم، نبی آخر الزماں، رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰؐ نے یہ درس دیا کہ مجھ سے محبت کرو، انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ میری عبادت کرو؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔

''اب عشق رسولؐ کا تقاضا کیا ہے، یہی نا کہ انہوں نے جو کچھ کیا اور کہا وہ سب ہمارے لئے باعث مشعل راہ ہے۔زندگی گزارنے کا لائحہ عمل، یہ ایک صورت ہمیں اللہ پاک نے دے دی، اور اس کی اہمیت اس قدر بیان کی جو نبی برحق دیں وہ لے لو، اور جس سے منع فرمائیں اس سے رک جاؤ، قرآن مجید اسی کی گواہی دیتا ہے۔اللہ پاک نے بنی نوع انسان کے لئے کامل نمونہ دے دیا اور وہ کردار پسند کیا۔اب نبیؐ کے فرمودات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کونسی قوت کارفرما ہوگی، وہی جو اللہ پاک نے فرما دی، ''شدید محبت'' مطلب عشق، جس سے ہونا کیا ہے، بندہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔صبغت اللہ، اللہ کی رضا کا بھی یہی راستہ ہے''۔وہ بہت جذب میں کہتے چلے گئے۔

''کیا دوسرے مظاہر......'' میں نے کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''دوسرے مظاہر آپ کو کیا دے رہے ہیں۔سورج کو لے لیں، وہ روشنی دے رہا ہے، حدت دے رہا ہے اور اتنا بے بس ہے کہ اپنا نام تک خود نہیں رکھ سکتا۔علم الاسماء تو انسان کو ملے ہیں نا، اسے تو نام انسان دیتا ہے۔یہ اس کا درجہ ہے۔اب ہم انسانوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہر انسان اپنے درجے میں ہے۔ ماں، باپ، بہن، بیٹی، بیوی اور دوست وغیرہ، ہم اپنے درجات بناتے ہیں نا، ان کے رویے...... ان سے جب سکھ ملتا ہے تو ان کا شکر گزاروں کے ساتھ ہم کس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ہمارا ردعمل بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم انہیں سکھ دیں اور جب کوئی دکھ دیتا ہے تو...... اب یہ رشتے، ناطے، رویے سب ایک راستہ ہے جس کی منزل قرب الٰہی ہے اور زادِ راہ عشق رسولؐ، اب میرا خیال ہے تم سمجھ چکے ہو گے کہ دوسروں کے رویے کو اپنی ذات اور نفس کے مطابق ردعمل کا اظہار کریں گے تو یہ فقط اپنا عمل ہے، لیکن اگر ردعمل اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے احکام و فرمودات کے مطابق ہوگا تو عشق کے درجات بلند ہوتے ہیں۔قوت پرواز میں اضافہ ہوتا ہے تو حقیقی منزل تک راستہ آسان ہو جاتا ہے''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بہت حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔اسی لئے میں نے اتنے پر ہی اکتفا کرنے کا سوچا اور پھر کہا۔

''بہت بہت شکریہ میاں صاحب......! میں انشاء اللہ کسی نئے نکتے کی تفہیم کے لئے دوبارہ حاضر ہوں گا''۔

''اب یہی فقرہ ذہن میں رکھنا میاں......! ہم اس پر بات کریں گے''۔انہوں نے کہا تو میں چونک گیا۔کیا اس طرح کے بے ضرر اور رسمی جملے میں بھی کوئی راز پنہاں ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا تو وہ نرمی سے بولے۔''اپنے ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو، وہ جیسے مولانا روم نے فرمایا ہے نا، ہر کسے را خدمتے دادہ قضا، درخور آں گوہرش در ابتلا...... مطلب، اللہ نے ہر فرد کو ایک خدمت عطا کی ہے، جو اس کی استعداد کے مطابق ہے اور آزمائش کے لئے ہے۔سو

بیٹا……! یہ سارے معاملات، وقت کے ساتھ دھیرے دھیرے سمجھ میں آ جائیں گے‘‘۔ انہوں نے کہا اور اٹھ گئے، میں بھی اٹھ گیا۔ باہر مسجد کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اجازت لی اور وہاں سے آ گیا۔

ماہا کی آنکھ کھلی تو چند لمحے اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے ذہن صاف ہوا تو اس نے خود کو قالین پر پڑے پایا۔ تبھی لمحوں میں وہ سمجھ گئی۔ اس نے جلدی سے وہ بستر ہٹایا اور کھڑکی میں آ کر باہر دیکھا۔ دھوپ نے ہر شے کو واضح کر دیا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑکی میں سے دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھتی رہی پھر پلٹ کر صوفے پر آن بیٹھی۔ اپنے گیسو سمیٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ بلال کہاں ہوگا۔ اگر تو نیچے ڈرائنگ روم میں ہے تو یقیناً پاپا بھی وہیں ہوں گے۔ نجانے ناشتہ کر لیا ہے یا ابھی نہیں، کہیں وہ میرا انتظار ہی نہ کر رہے ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے یونہی اٹھ کر باہر جانا چاہا تو اگلے ہی خیال نے اس کے قدم باندھ لئے۔ تم اب شادی شدہ ہو، پہلی ماہا نہیں ہو جو یونہی جا کر ناشتے کی میز پر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اگر کوئی اور فرد وہاں ہوا اور اس کو اس حالات میں دیکھا تو سو باتیں بن جائیں گی۔ وہ واپس آ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اب اسے یونہی دلہنوں کی طرح بن سنور کے رہنا پڑے گا۔ یہ سوچتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اٹھی اور باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے ذرا سی حیرت ہوئی۔ وہ صوفے پر بیٹھی تو اسے ملازمہ دکھائی دی، اس نے اشارے سے بلایا اور پوچھا۔

’’یہ بلال کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ صبح سویرے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ اب تک واپس نہیں آئے‘‘۔ ملازمہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

’’صبح سویرے مطلب؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔

’’چوکیدار نے بتایا ہے بڑی بی بی کو، اس وقت اذانیں ہو رہی تھیں‘‘۔ ملازمہ نے واضح کیا۔

’’اور ماما پاپا‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہیں‘‘۔ ملازمہ نے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ‘‘۔ اس نے کہا اور پھر اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔

باہر لان میں اچھی خاصی دھوپ تھی۔ اس کے ماما اور پاپا بید کی کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ وہ بھی وہیں چلی گئی۔ سلام دعا کے بعد وہ بیٹھی تو افضال نور نے پوچھا

’’ماہا……! یہ بلال صبح صبح کدھر چلا گیا ہے، تمہیں بتایا‘‘۔

’’نہیں، پاپا یہی تو اس کی پر اسرار سرگرمیاں ہیں۔ چلیں مان لیا کہ وہ اذان کے بعد نماز کے لئے گیا ہوگا، تو اسے بہت پہلے واپس آ جانا چاہیے تھا‘‘۔ اس نے اکھڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ گیٹ پر ہارن کی آواز آئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بلال پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے ان کی جانب آنے لگا تھا۔ اتنی دیر تک ان میں خاموشی رہی تھی۔ وہ بھی سلام ودعا کے بعد وہاں بیٹھا تو ذکیہ نے پوچھا

’’بلال بیٹے……! کہاں چلے گئے تھے‘‘

’’تائی جی……! میں نماز پڑھنے گیا تھا اور پھر مسجد میں ہی کچھ وقت گزارا……‘‘ اس نے کہا اور ایک نظر ماہا کو دیکھا جو تنتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

’’اچھا چلو آؤ، ناشتہ کرتے ہیں‘‘۔ افضال نور نے کہا اور اٹھ کر اندر چل دیا۔

ناشتے کے دوران افضال نور نے اپنے دائیں جانب بیٹھے بلال کی جانب دیکھا اور پھر بڑے نرم سے لہجے میں پوچھا

’’بلال……! یہ جو تم نے پابندی سے نماز پڑھنے کی عادت اپنا لی ہے نا یہ بہت اچھی بات ہے‘‘۔

’’جی……! نماز تو ہم پر فرض ہے، اسے ادا کرنا ہی چاہیے‘‘۔ اس نے کہا

’’ویسے پہلے تم میں یہ عادت نہیں تھی، کون سا ایسا محرک ہے جو تمہیں اس طرف لے آیا؟‘‘ انہوں نے پھر نرم لہجے میں پوچھا

’’بس حالات واقعات نے، کچھ اپنے آپ……‘‘ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا، پھر ہنستے ہوئے بولا ’’لیکن……! تایا جی، یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ کیا بحیثیت مسلمان ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے‘‘۔

’’نہیں……نہیں……اب میں بھی تو پڑھتا ہوں……لیکن تم نے جو ایک خاص طرح سے وضع قطع بنا لی ہے نا، میرا مطلب ہے بہت سادہ ہو گئے ہو۔ اپنا زیادہ خیال نہیں رکھتے ہو۔ تمہارا اپنا ایک مقام ہے……‘‘

’’نہیں……! میں اس مقام کو کبھی نہیں بھولا، بلکہ اب اس پر زیادہ سوچتا ہوں۔ میری یہ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو……ابھی تو میں اپنے گھر میں ہوں‘‘۔ میں نے کہا۔

''خیر......! میں جو کہنا چاہ رہا ہوں وہ تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ بس تم اپنا خیال رکھنا''۔

یہ کہتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور ذکیہ بیگم کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''بیگم......! میں نکل رہا ہوں تا کہ جو بھی بل وغیرہ رہ گئے ہیں وہ ادا کر دوں، دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوتی ہے''۔

اس پر کوئی کچھ نہ بولا تو وہ اٹھ کر باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ماہا بھی اٹھ گئی تو ذکیہ بیگم نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور بولیں۔

''ماہا، خیریت تو ہے، تم یوں خاموش خاموش سی ہو؟''

''اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے اگرچہ دھیمے لہجے میں کہا تھا لیکن اس کے لہجے میں انتہائی درجے کی کاٹ تھی جس پر ذکیہ بیگم چونکے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں ماہا نے کہا۔ ''ماما......! ابھی تھوڑی دیر بعد میری کچھ سہیلیاں آنے والی ہیں۔ وہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گی۔ خانساماں سے کہہ دیجئے گا''۔

''وہ تو آئیں، کوئی بات نہیں لیکن رسم کے مطابق حویلی سے بہت سارے لوگ آئیں گے۔ تمہیں ان کو وقت دینا ہے، سہیلیوں کو پھر کسی وقت بلوا لیتیں''۔ ذکیہ بیگم نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''میں انہیں وقت دے چکی ہوں، اب تو وہ آنے والی ہوں گی''۔ آپ حویلی والوں سے کہہ دیں کہ وہ شام کے وقت آجائیں''۔ ماہا نے بلال کو بری طرح نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو ذکیہ بیگم چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ جیسے انہیں ماہا کی بات کا سخت صدمہ ہوا ہو۔ تب ماہا بھی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

❀......❀......❀

حویلی میں دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور ڈرائنگ روم میں اچھی خاصی رونق تھی۔ مٹھائی کی ٹوکریاں میز پر دھری ہوئی تھیں۔ یہ ایک رسم تھی کہ دلہا کے والدین جاتے ہیں اور دلہا دلہن کو خوشی اور شادمانی کے ساتھ وہاں دلہن کے والدین کے گھر سے لاتے ہیں۔ ان میں جہاں افراد خانہ شامل ہوتے تھے ہاں دیگر عزیز اور انتہائی قریبی تعلق والے بھی ہوتے جن سے قرابت داری رہتی تھی۔ اس رسم کا مقصد دلہن کے گھر والوں کو مان دینا اور ان کی عزت افزائی کرنا سمجھا جاتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں خواتین تھیں لیکن نور الٰہی کے کمرے میں افضال نور بہت سنجیدہ سا بیٹھا ہوا تھا۔ نور الٰہی کے چہرے پر بھی تفکر کے آثار تھے اور رنجیدہ سی زبیدہ خاتون ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ ان کے درمیان

خاموشی کو آخر افضال نے توڑا۔

''تو پھر کیا سوچا اباجی آپ نے؟''

''سوچنا کیا ہے یار، ہم تو آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ اب ان لوگوں سے کیا کہیں کہ تم سب شام کو آجانا، ابھی ہماری بہو رانی کی سہیلیوں کا وقت ہے......'' نور الٰہی نے انتہائی دکھ سے کہا۔

''اگر بلال فون کر کے ہمیں نہ بتاتا تو......'' زبیدہ خاتون رو دینے والی تھی۔

''بات یہ نہیں بہو کہ ماہا کا رویہ ٹھیک نہیں ہے، بات یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے۔ میں آنے والے دنوں کی بابت سوچ رہا ہوں کہ کہیں ہم نے شدید غلطی تو نہیں کر لی۔ بجائے اس کے ہم اپنی عزت بچانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ سب الٹ ہو جائے''۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولے تھے۔

''تو پھر اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' افضال نور نے تحمل سے پوچھا

''کرنا کیا ہے، تم لوگ جاؤ تمہیں ذکیہ نے احسان نے تو نہیں روکا، اب کچھ ان کی ذمے داری بھی تو بنتی ہے نا، واپس آجاؤ تو پھر اس معاملے پر سوچتے ہیں کیونکہ اب بلال کی رائے بہت ضروری ہے؟'' نور الٰہی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر ہم چلتے ہیں''۔ افضال نے کہا

''لیکن ایک بات ذہن میں رہے، بہت تحمل سے''۔ نور الٰہی نے کہا تو افضال نے سر ہلا دیا اور اٹھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی زبیدہ خاتون بھی اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد تینوں گاڑیاں پورچ سے نور پور کے لئے روانہ ہو گئیں۔

تینوں گاڑیاں جب نور پور میں احسان نور کے بنگلے میں پہنچیں تو وہاں اور بہت سی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ وہ سب ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئے جہاں ذکیہ بیگم کے ساتھ احسان نور انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہی بلال بہترین سوٹ زیب تن کئے چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ فطری سی بات ہے کہ ان سب نے ماہا کے بارے میں پوچھا۔

''اس کی کچھ سہیلیاں آگئیں ہیں۔ آپ تشریف رکھیں، میں اسے بلواتی ہوں''۔ ذکیہ بیگم نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں ماہا ان کے سامنے تھی، سادہ سا لباس، ہلکا سا زیور اور میک اپ وغیرہ سے بے نیاز چہرہ، وہ کسی طرح سے بھی نئی دہلی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے بہت اچھے انداز میں سب کو خوش آمدید کہا، خواتین سے ملی اور پھر کچھ دیر بعد

آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی۔ اس رویے کو سبھی نے محسوس کیا لیکن کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ خاطر تواضع اور باتوں میں وقت کتنا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا جس کا اہتمام پائیں باغ میں کیا گیا تھا۔ جب وہ سارے وہاں گئے تو ماہا اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ وہ اگرچہ سب کو مسکراہٹ کے ساتھ ملی لیکن زیادہ تر اس کا رجحان اپنی سہیلیوں کی جانب ہی رہا۔ یہی وہ موقع تھا جب گلاب نگر سے آئیں خواتین میں سرگوشیاں پھیلتی چلی گئیں جو کچھ دیر بعد باقاعدہ تبصروں میں بدلنے لگیں۔ زبیدہ خاتون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کسے کہے یا فوراً یہاں سے چلی جائے۔ وہ صبر کئے کبھی ماہا کو اور کبھی ذکیہ بیگم کو دیکھ لیتی اور پھر خون کے گھونٹ پی جاتی۔ مردوں کے لئے چونکہ علیحدہ اہتمام تھا، اس لئے وہ بلال سے بھی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔

کھانے کے فوراً بعد ماہا کی سہیلیاں ایک ایک کر کے جانے لگیں۔ وہ پورچ میں انہیں الوداع کہتی رہیں۔ سب کے چلے جانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں جانے کی بجائے سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تو زبیدہ خاتون سے رہا نہیں گیا۔ اس نے ذکیہ بیگم کو بلایا اور باہر کاریڈور میں لا کر پوچھا

”یہ ماہا کیا تماشے کر رہی ہے؟“

”خدا کے لئے زبیدہ میری لاج رکھ لو، میں نہیں جانتی وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس وقت کو کسی طرح ٹالو، ہم دونوں اس معاملے کو بعد میں دیکھتی ہیں......“ ذکیہ جو ہمیشہ خوش رہنے والی تھی، اس وقت رو دینے کو تھی۔ زبیدہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ اس کا دماغ سلگ رہا تھا کہ ماہا کے سامنے اس کی ماں بھی بے بس ہو گئی ہے؟

تھوڑی دیر بعد وہ قافلہ واپس گلاب نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس میں چوتھی کار کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جس میں ماہا اور بلال تھے۔ ان کے ساتھ افضال نور اور زبیدہ خاتون تھی۔ سارا راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔

❁......❁......❁

میں عصر پڑھ کر واپس آیا تو ملازمہ نے مجھے اطلاع دی کہ امی یاد کر رہی ہیں۔ میں سیدھا ان کے کمرے میں چلا گیا۔ امی اکیلی ہی تھیں اور بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں کرسی لے کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے پوچھا۔

”جی امی......! فرمائیں“۔

”ٹھہرو......! ذرا ماہا کو آ لینے دو“۔ انہوں نے دبے دبے غصے میں کہا تو مجھے معاملے

کی نزاکت کا احساس ہوا۔ تب میں نے بڑے ہی تحمل سے کہا۔

”امی......! کیا آپ ماہا سے کوئی باز پرس کرنا چاہتی ہیں؟“

”تو اور کیا کروں......کم از کم اسے اس کے رویے پر اسے بتانا چاہیے کہ دوسروں کو کس قدر تکلیف ہوئی ہے“۔ امی نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”امی......! کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اب جو ایک بار آپ اسے کہہ دیں گی۔ اسے احساس دلا دیں گی تو پھر آئندہ کے لئے ایسا کچھ نہیں ہوگا؟ وہ ایسا رویہ نہیں رکھے گی؟“ میں نے کہا تو انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر حیرت سے بولیں۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ آپ اسے جس قدر سمجھائیں گی، وہ اپنے رویے میں شدت اختیار کرتی چلی جائے گی کیونکہ وہ چاہتی ہی یہی ہے کہ ہم غصے میں آ کر کچھ بھی اسے کہہ دیں“۔ میں نے امی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی توہین کر دے۔ ٹھیک ہے وہ ہماری بیٹی ہے اور ایک خاص ماحول میں اس کی شادی ہو گئی ہے لیکن اب......اب ہماری بہو، بیٹیوں کا وطیرہ یہ نہیں ہے کہ وہ......“ امی نے جوش جذبات میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مگر ہم نے اسے کچھ نہیں کہنا، اس کے کسی بھی عمل پر ردعمل کا اظہار نہیں کرنا“۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو امی پھٹ پڑیں۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ یہ تو اسے شہہ دینے والی بات ہو گی نا...... میں ایسی کسی الجھن کی اجازت نہیں دے سکتی جس میں کسی کی عزت کا احساس ہی نہ ہو، وہ کیا سمجھتی ہے کہ وہ ہمیں ڈرائے گی، دھمکانا چاہتی ہے۔ اس کا بندوبست ابھی کرنا ہو گا ورنہ یہ بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھے گی۔“

”نہیں امی......! آپ یہ کیوں نہیں سوچتی ہو کہ وہ اپنا ردعمل دکھانا چاہتی ہے۔ دکھائے، جہاں تک وہ دکھانا چاہتی ہے وہ تو اپنی سطح سے نیچے گرتی چلی جا رہی ہے تو کیا آپ بھی اپنے مقام سے نیچے آ جانا چاہتی ہیں“۔ میں نے کہا تو امی نے انتہائی حیرت سے میری جانب دیکھا اور بولیں۔

”تو پھر میں کیا کروں کیا بڑے یہ حق نہیں رکھتے کہ چھوٹوں کو سمجھائیں“۔

”یہی میں چاہتا ہوں، آپ کا سارا حق ہے“۔ میں نے کہا پھر چند لمحے ٹھہر کر کہا۔

”امی......! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں نہیں دیکھ پاؤں گا کہ ماہا آپ کے لئے کوئی

ایسا لفظ بھی کہے جو آپ کے مقام کے خلاف ہو۔ میں آپ کا بیٹا ہوں، میرے لئے آپ سب سے اہم ہیں۔اس کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں‘‘۔

’’کیا اس کا تعلق فقط تمہارے ساتھ ہے؟‘‘ امی نے پوچھا

’’نہیں سب کے ساتھ ہے لیکن آپ یہ سمجھیں، وہ بیمار ہے، نفسیاتی بیمار، جب میں سمجھوں گا کہ وہ لاعلاج ہے تو......‘‘ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’نہیں۔! ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا کہ وہ کوئی غیر تو نہیں ہے؟‘‘ امی ایک دم سے پگھل گئیں۔

’’تو پھر امی...... کیا ہم کوئی نزاعی کیفیت پیدا کر لیں جس سے کشمکش پیدا ہو جائے اور وہ پورے خاندان کا سکون برباد کر دے۔نہیں میں دیکھوں گا اسے آخری حد تک دیکھوں گا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے‘‘۔ میں نے بڑے عزم سے کہا

’’بیٹا......! میں تو کہتی ہوں کہ ایسا کچھ نہ ہو اور اسے عقل آ جائے مگر......شاید تم عورت ذات کو نہیں جانتے ہو، وہ جب انتقام پر اتر آتی ہے نا تو پھر اس کے سامنے سارے رشتے ناتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔تم کوشش کر کے دیکھو، میں تمہیں منع نہیں کروں گی اور ......‘‘ لفظ امی کے منہ ہی میں تھے کہ ماہا کمرے میں داخل ہوئی۔اس نے بڑے اطمینان سے ہم دونوں کو دیکھا پھر سلام کرنے کے بعد میرے برابر پڑے صوفے پر بیٹھ گئی اور پھر بغیر کسی جذبے کے بولی

’’جی چاچی اماں......آپ نے مجھے بلایا‘‘۔

’’ہاں......! میں یہ پوچھنا نہیں بلکہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ جب حویلی سے......‘‘

’’میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ یہی نا کہ جب حویلی والوں نے آنا تھا، مجھے وقت کا بھی علم تھا تو پھر یہ وقت میں نے اپنی سہیلیوں کو کیوں دیا‘‘۔ وہ جوش سے بولی۔

’’ہاں......!‘‘ امی نے ہنکارہ بھرا۔

’’اصل میں چاچی اماں۔ بات یہ ہے کہ میں نے شادی تو کر لی ہے، آپ سب کے کہنے پر لیکن میں اپنی مرضی سے جینے کا حق خود لوں گی۔نہیں دیں گے تو میں چھین لوں گی‘‘۔ اس کا لہجہ انتہائی اجنبی تھا جیسے اس پر کوئی آسیب آ گیا ہو۔

’’تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ امی نے غصے میں کہا۔

’’جی......! مجھے معلوم ہے۔آپ کے بیٹے یہ چاہیں گے کہ میں برقعے یا پردے میں رہوں، تو میں ایسا نہیں کرنے والی، یہ میری مرضی ہے......‘‘ وہ بڑے سکون سے اسی لہجے میں بولی۔

’’اور میرا خیال ہے کہ بلال نے ابھی تم سے ایسا نہیں کہا‘‘۔ امی تیز لہجے میں بولیں۔

’’نہیں کہا تو اچھی بات ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی نہیں کہیں گے۔ اور ایسے ہی میری زندگی کے دوسرے فیصلے ہیں جو میں کرنے جا رہی ہوں۔ میں نے اپنی سہیلیوں کو بھی اسی مقصد کے لئے بلایا تھا۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں ایک این جی او بناؤں۔ میں نے ایک بار بلال سے پوچھا بھی تھا، اس نے منع کر دیا تھا۔ سب کچھ تیار تھا، سو......! اب میں وہی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ وہ سب میرے ساتھ ہیں۔ اسی لئے انہیں بلایا تھا‘‘۔ ماہا بڑے سکون سے کہتی چلی گئی جبکہ امی کی حیرت سے آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

’’یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟‘‘ بالآخر امی کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

’’میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، میں آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ یہ سارا معاملہ نور پور تک ہی محدود ہو گا، میری کوئی سہیلی یہاں قدم نہیں رکھے گی۔ میں اپنے سارے معاملے وہیں تک رکھوں گی‘‘۔ اس نے پھر اسی سکون سے کہا تو امی نے میری جانب دیکھا۔ میں مسکرا دیا اور بولا۔

’’ٹھیک ہے، اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو تم اپنا شوق پورا کرو‘‘۔

’’یہ کیا کہہ رہے ہو تم......‘‘ امی نے حیرت سے کہا۔

’’ماہا فیصلہ کر چکی ہے، بلکہ اس پر عمل بھی......اب ہمیں روکنا نہیں چاہیے‘‘۔ میں نے کہا۔

’’لیکن بلال...... یہاں گلاب نگر کے لوگ کیا سوچیں گے، تم یہاں رہو، یہ وہاں رہے......اپنے معاملات وہاں تک محدود ایسے ہی رکھے جا سکتے ہیں؟ امی نے کہا۔

’’میں شام ہوتے ہی آ جایا کروں گی، اور پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ روزانہ جاؤں۔ باقی رہی گلاب نگر والوں کی بات، مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے، کیا لوگ ملازمت نہیں کرتے۔ عورت کو کمانے یا خدمت کرنے کا کوئی حق نہیں، کیا اسلام اس پر پابندی لگاتا ہے؟‘‘ وہ کہتی چلی گئی، اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

’’بالکل نہیں، اسلام ایسی کوئی پابندی نہیں لگاتا، لیکن اسلام یہ تقاضا ضرور کرتا ہے کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، ضروری نہیں کہ پسندیدہ باتوں تو عمل کر لیا جائے اور جس کو آپ کا نفس نہ چاہے، اسے چھوڑ دیں۔ اس راہ میں جو اسلام تقاضا کرتا ہے، وہ بھی نبھانا ہوں گے‘‘۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

’’مجھے اپنا کردار سب سے زیادہ عزیز ہے بلال، میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا

ہے‘‘۔ وہ بڑے سکون سے بولی۔

’’تو پھر ہمارے درمیان کوئی بحث نہیں ہے۔ تم جو چاہو سو کر سکتی ہو‘‘۔ میں نے کہا تو مجھے دیکھ کر یوں مسکرا دی جیسے میں یہ سب بے بسی میں کہہ رہا ہوں۔ وہ چند لمحے بعد بولی، اس کا رخ امی کی جانب تھا۔

’’تو کیا اب میں جاؤں۔ مجھے اپنا پیپر ورک کرنا ہے‘‘۔

’’جاؤ......!‘‘ امی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ گئی۔ تب امی بولیں۔ ’’جاؤ......! بلال، اب تم بھی چلے جاؤں اور مجھے اکیلا چھوڑ دو‘‘۔

’’امی، آپ پلیز پریشان نہ ہوں، یہ چند دن......‘‘

’’جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو‘‘۔ امی نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو میں دکھے دل سے اٹھ گیا۔ اب امی نجانے کیا کچھ سوچتی رہیں گی اور خواہ مخواہ میں اپنا جی جلاتی رہیں گی۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ میں سکون سے تھا، میرے اندر سے غصے کا شعلہ بلند ہو چکا تھا۔ اگر عام حالات میں ماہا میرے سامنے یا میری والدہ کے سامنے اس انداز میں بات کرتی تو شاید میرا رویہ کچھ اور ہوتا لیکن اس وقت سوائے صبر کے میں کچھ اور کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ زندگی کے یہی مقام ہوتے ہیں جب بظاہر اپنی انا، عزت اور وقار داؤ پر لگ جاتا ہے۔ وہ جو این جی او بنانے جا رہی تھی بلاشبہ وہ نہ صرف مجھے بلکہ پورے خاندان کو دوراہے پر کھڑا کر دینے والی تھی۔ دوسرے تو سب اپنی عزت، انا اور وقار کے لئے ایسا کرتے لیکن میں کچھ اور چاہ رہا تھا۔ جہاں میں اپنے ظرف اور صبر کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا، وہاں پر میں ماہا کے بارے میں اپنے عشق کو آزمانا چاہتا تھا۔ میں جو ماہا سے عشق کرنے کا دعویدار تھا، کیا اس کی ہٹ دھرمی پر سب کچھ بدل جاتا، وہ کسی اور سے شادی کر لیتی تو معاملہ دوسرا تھا اب تو وہ میری منکوحہ تھی، میرے قرب اور عیال میں سے تھی۔ مجھے اس کا بھلا چاہنا تھا۔

انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ یہ سفر اوپر کی طرف آسمانوں کی جانب ہوتا ہے اور اس سفر کو طے کرانے والی فقط ایک قوت ہے جسے عشق کہا جاتا ہے۔ نیکی بے لوث عمل کا نام ہے جس میں محبت پائی جاتی ہے۔ اس میں جتنی شدید محبت ہوگی اتنی ہی بے لوثی سے حاصل ہوگا۔ اوپر کی جانب بلند ہونے والے درجات جب عشق طے کراتا ہے تو اس وقت عشق کی حیثیت ایک سیڑھی کی سی ہوتی ہے جس پر انسان درجہ بدرجہ، زینہ بہ زینہ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ اب یہ انسان کا مقدر ہے کہ اسے سیڑھی کس طرح کی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا

کہ جیسے میں نے اگر اس سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے تو میرے پاؤں کے نیچے کانچ آ گیا ہے، جہاں میں نے اپنا پورا وزن بھی نہیں ڈالنا اور لہولہان ہوتے ہوئے قدموں کا بھی خیال نہیں کرنا، میرے لئے تو یہ عشق سیڑھی کانچ کی ثابت ہونے جا رہا تھا؟ کیا مجھ میں حوصلہ ہے کہ میں اس کانچ کی سیڑھی پر قدم رکھ کر اپنے درجات کی بلندی چاہوں؟ یہ طے ہے کہ نیکی ہی درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہے، جس میں خالص پن ہو جو خالص ہو جائے پھر نیکی نہیں رہتی اور پھر یہ بھی طے ہے کہ درجات اسی کے بلند ہوتے ہیں، جس کے بارے میں اللہ چاہے۔ ورنہ انسان کی کیا بساط ہے۔ اس کے بس میں تو فقط عشق ہے اور میرے مقدر میں عشق کی سیڑھی کانچ کی تھی جس پر پاؤں لہولہان ہو جانے والے تھے۔ کیا میں خود میں ایسا حوصلہ رکھوں؟ یہ سوال میرے ذہن میں دیر تک گونجتا رہا۔ بلاشبہ جس کا جواب میں چاہ رہا تھا۔ میرا سوال میرے اپنے من سے تھا۔ تبھی، انہی لمحات میں اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ راستہ کوئی بھی ہو، مقصد تو قرب الٰہی ہے نا، اور یہ راستہ انسان ہی سے ہو کر گزرتا ہے اور شاید میری آزمائش ہی یہی ہے۔ میں جو پی اون کے سامنے اسلام اور اللہ کے بارے میں بڑی باتیں کرتا رہا ہوں۔ ماہا سے عشق کا دعویٰ ہے، اب میدان لگا ہے، دین بھی ہے دنیا بھی ہے، عشق بھی ہے انسان بھی ہے، درجات کے لئے کانچ کی سیڑھی بھی ہے۔ قدم لہولہان کروانے ہیں تو آؤ......! یہیں سے واپس پلٹ جانے پر شاید ماہا تو مل جائے گی تو پھر میرے عشق کی اوقات کیا رہے گی، کیا اسلام کا نظریہ، لائحہ عمل میرے لئے فقط کتابی ہوگا؟ یہ سوال میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں یہ احساس کر سکتا تھا کہ این جی او بنانے کے بعد ماہا ایک گھریلو عورت نہیں رہے گی، خود کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لئے وہ بہت ساری کوششیں کرے گی۔ میرے تصورات ایک سے بڑھ کر ایک تصویریں مجھے دکھا رہے تھے۔ جو مجھے نہ صرف الجھا رہی تھیں بلکہ میری آزمائش بن رہی تھیں۔ سوچ کی لہریں شعلہ بن رہی تھیں اور بلاشبہ وہی میری بے بسی کے لمحات تھے۔ تبھی میرے اللہ نے میری مدد کی اور نجانے کہاں پڑھا ہوا فقرہ میرے ذہن میں گونج گیا کہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں اچھا گمان کرو، یہ بات ذہن میں آتے ہی میں نے غور کیا، یہ آیت تھی، میرے اللہ کا فرمان، میں ماہا کے بارے میں بدگمان کیوں ہو رہا ہوں۔ مجھے تو اس کے بارے میں خوش گمان ہونا چاہیے۔ میری خوش گمانی ہی اس میں تبدیلی کا باعث بن جائے۔ دین میں تو جبر ہے ہی نہیں اور نہ ہی میں اسے ہدایت دینے پر قادر ہوں۔ میرے بس میں تو یہ ہے کہ میں اپنے کردار، اپنے رویے اور اپنے عمل سے اسے پیغام دیتا رہوں۔

میری سوچیں پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ میاں صاحب کی کہی ہوئی بہت ساری باتیں

مختلف پہلوؤں سے میرے سامنے آتی چلی جا رہی تھیں۔ تفہیم کے نئے در وا ہو رہے تھے۔ زندگی کے نئے رخ واضح ہو رہے تھے۔ میرے اندر اٹھنے والے شعلے دھیرے دھیرے ماند پڑتے چلے جا رہے تھے۔ دھواں صاف ہونے لگا تو مجھے بڑے واضح دکھائی دینے لگی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سارا معاملہ نفس کا ہے۔ نفس کی کارگریاں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ اصل بات ہے انسان کا تصور بدلنے کی، تصور بدلتے ہی ہر شے کے بارے میں زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سخت گیری یہاں تک تھی کہ تلوار اٹھالی اور ارادہ کیا تھا؟ جونہی تصور بدلا تو کیا ہوا، غلامی میں جا پہنچے، میں پرامید ہو گیا۔

❀......❀......❀

ماہا نے اپنی این جی او کا آفس اپنے بنگلے کے گیسٹ ہاؤس میں بنا لیا تھا۔ ہفتہ بھر وہ اسی کوشش میں رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک خاتون رکن اسمبلی سے اس کا افتتاح بھی کروا لیا گیا۔ اس دن وہاں بہت رونق رہی تھی، نور پور کی اور گرد و نواح کی خواتین مدعو تھیں جو کسی نہ کسی حوالے سے اہمیت رکھتی تھیں۔ ''اسوہ'' کے نام سے این جی او کا افتتاح ہو گیا اور اس نے اپنے مقاصد بھی بیان کر دیئے جن میں خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد ہی کو اس کی روح قرار دیا جا سکتا تھا۔ بہت خوبصورت اور دیدہ زیب بروشر تقسیم کیا گیا۔ ایک پرتکلف پارٹی کے بعد ماہا بری طرح تھک چکی تھی۔ نجانے کیوں اس کے اندر وہ جوش نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ بڑی مشکل سے سہ پہر تک یہ ہنگامہ ختم ہوا اور وہ اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گئی۔ یہاں تک کہ اسے پھر ہوش ہی نہیں رہا کہ وہ کہاں پڑی ہے۔

سورج غروب ہو گیا تو ذکیہ بیگم اس کے کمرے میں گئی تو ماہا بے خبر سو رہی تھی۔ ذکیہ بیگم نے اسے بیدار کیا تو وہ اٹھ گئی۔

''اوہ......! شام ہو گئی ہے''۔ یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اترنے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' ذکیہ نے پوچھا۔

''حویلی......!'' اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''تم اس وقت نہیں جاؤ گی، میں ادھر فون کر دیتی ہوں۔ تم آج رات ادھر ہی رہو''۔ ذکیہ نے نرم لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر ایک دم سے ڈھیلی ہو کر سکون سے بیٹھ گئی''۔ تم فریش ہو کر نیچے آؤ، میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں''۔

''جی ماما''۔ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور پھر اٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ماں بیٹی آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ان

کے علاوہ کوئی نہیں تھا، آتش دان جل رہا تھا اور باہر سرد فضاؤں نے اپنا ڈیرا جمایا ہوا تھا۔

''پاپا گھر پر نہیں ہیں کیا؟'' ماہا نے پوچھا

''نہیں......! وہ تھوڑی دیر بعد آئیں گے''۔ ذکیہ بیگم نے جواب دیا۔

''کہیں کام گئے ہیں؟'' وہ پھر بولی، مقصد صرف بات بڑھانا تھا۔

''یہی کہہ کر گئے ہیں''۔ ذکیہ نے کہا پھر اچانک اس کی جانب دیکھ کر بولی ''تم نے یہ کیا تماشہ لگا لیا ہے این جی او کا''۔

''یہ تماشہ نہیں ہے، میری خواہش ہے اور آپ کو اس کا احترام کرنا چاہیے، میں کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہوں''۔ ماہا نے یوں کہا جیسے وہ اپنی ماں کی بات سن کر حیران ہو گئی ہو، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

''یہ کیسی خواہش ہے جس سے تم اپنا گھر خود ہی برباد کر رہی ہو''۔ وہ بولی۔

''میں گھر برباد کر رہی ہوں؟'' اس نے پھر حیرت سے کہا ''اس نے برباد کیا ہونا ہے جو گھر ہی نہیں ہے؟'' ماہا نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''ماہا......! تمہاری یہ سوچ تمہیں برباد کر دے گی، بزرگوں کا فیصلہ ماننے کے بعد تم انہیں یہ سزا دے رہی ہو۔ ماہا یہ ٹھیک نہیں ہے''۔

''کیا غلط ہے ماما......! میں دنیا کا انوکھا کام تو نہیں کر رہی ہوں''۔ وہ بولی۔

''کیا تمہارے شوہر کو، حویلی والوں کو یہ سب پسند ہے، یہ تم نے سوچا؟'' ذکیہ بیگم نے کہا۔

''میرے شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو حویلی والوں کی مجھے کوئی پرواہ نہیں''۔ وہ بے رخی سے بولی۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا وہ تمہارے کچھ نہیں لگتے اور پھر تم نے بلال کو اب تک اپنا شوہر ہی تسلیم نہیں کیا، آخر تم چاہتی کیا ہو'' ذکیہ بیگم دبے دبے غصے میں بولیں۔

''ماما......! میں کیا چاہتی ہوں، مجھے خود نہیں معلوم۔ بس جو دل میں آتا ہے میں وہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں یہ سمجھ گئی ہوں کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ اپنا تو وہ ہوتا ہے نا جو کسی بندے کے جذبات کا، اس کی خواہشات کا اس کی انا کا خیال رکھے۔ میرے اپنے ہیں جنہوں نے یہ سب کچھ کچل دیا۔ ماما......! آپ بھی سوال جواب کریں گی، اس کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے''۔

''کیوں......! کیوں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے، تیری وجہ سے سارے

ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ تمہارے دادا یا افضال بھائی، کچھ نہیں کہتے تو اس کا مطلب ہے تم جو چاہو کرو، بلال کا کس قدر حوصلہ ہے کہ وہ اب تک تمہیں برداشت کر رہا ہے"۔

"یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ مجھے برداشت کر رہا ہے ورنہ آپ ایسی بات ہی نہ کرتیں۔ جب میرے شوہر کو کوئی شکایت نہیں ہے تو دوسروں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ اپنے گھر میں یہ آفس برداشت نہیں کر رہی ہیں تو میں اپنا آفس کہیں اور بنا لیتی ہوں لیکن اب میں پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں"۔ ماہا نے اس بارے جذبات میں آ کر کہا۔

"کیا تمہارا کوئی بھی نہیں ہے؟" ذکیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے احساس تو یہی دلایا جا رہا ہے" اس نے کہا۔

"تم غلط سوچ رہی......"

"غلط، غلط......غلط......بس میں ہی غلط ہوں، ساری دنیا ٹھیک ہے۔ ماما......! آپ مجھ سے کیا منوانا چاہ رہی ہیں......" اچانک وہ پھٹ پڑی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ذکیہ بیگم آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھتی رہی کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ انہی لمحات میں ماما کا سیل فون بج اٹھا۔ چند لمحے اس نے فون کو نظر انداز کر دیا۔ بیل خاموش ہو گئی تو پھر سے بجنے لگی۔ تب ماہا نے خود کو سنبھالتے ہوئے فون سکرین پر نگاہ ڈالی تو چونک گئی۔ وہ بلال کا فون تھا۔ اس نے اگرچہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پایا تھا لیکن پھر بھی احساس باقی رہ گیا۔

"ہیلو......!" وہ بولی۔

"خیریت تو ہے نا ماہا، سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" بلال نے نرم سے لہجے میں پوچھا۔

"جی، سب ٹھیک ہے؟" وہ اسی طرح بولی۔

"تم اب تک آئی نہیں ہو نا، تو میں نے سوچا تمہاری خیریت دریافت کر لوں، ویسے کیا آج تم ادھر ہی رہنا چاہتی ہو یا پھر میں تمہیں لینے کے لئے آ جاؤں"۔

"آپ نے یہ کس طرح اندازہ لگا لیا کہ میں آج ادھر ہی رہنا چاہ رہی ہوں"۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ذرا سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ تم نے فون کر کے بتایا نہیں تھا نا؟" بلال بولا۔

"یعنی اب مجھے یہ آپ کو بتانا ہو گا کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں"۔ اس کے لہجے میں طنز گہرا ہو گیا۔

"نہیں ماہا ایسی بات نہیں۔ میں نے یہ فون کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں کیا ہے بلکہ تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لئے کیا ہے۔" بلال نے اس قدر تحمل سے کہا کہ اس کے لہجے

یں کسی بھی دوسرے جذبے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ایسا جذبہ جسے منفی کہا جا سکتا ہو۔ اس پر وہ بولی۔

"میں آج ادھر ہی ہوں۔ کل آ جاؤں گی"۔

"او کے......!" بلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی ماہا نے فون سکرین پر دیکھا اور مہری سانس لی، پھر اپنی ماما کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے اٹھنے لگی تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

"جب تک تم اپنے ذہن سے یہ تصور ختم نہیں کرو گی نا کہ تمہارے ساتھ خدانخواستہ کوئی ظلم ہو گیا ہے تب تک نہ تم چین سے رہو گی اور نہ دوسروں کی پریشانی ختم ہو گی۔ میں نہاری ماں ہوں، میں اپنی بیٹی کا بھلا ہی سوچوں گی"۔ اس کا لہجہ پر درد تھا۔

"جب تک دوسرے میرے معاملات میں دلچسپی لیں گے، انہیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہڑے گا نا، وہ نہ دلچسپی لیں اور نہ بقول آپ کے پریشان ہوں۔ بلال جب تک میرا ہمخیال نا، وہ میرے دل کے انتہائی قریب تھا، لیکن اب وہ بلال نہیں رہا تو میں کیسے......؟" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، تم اپنی دنیا میں خوش رہو، ہماری کسی پریشانی، دکھ یا تکلیف کا احساس ت کرو، ہم نے تمہارا بھلا سوچا ہے جسے تم نے ہماری غلطی گردان دیا۔ ہم ہار مان لیتے ہیں۔ لیکن اگر کل تم پچھتائی تو پھر تمہیں رونے کے لئے کوئی کندھا نہیں ملے گا، یہ یاد رکھنا"۔ ذکیہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ماما......! آپ چھوڑیں ان باتوں کو جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ پتہ نہیں پچھتانے سے پہلے ہی زندگی ختم ہو جائے"۔ اس نے کہا اور اٹھ گئی۔

ذکیہ بیگم بہت دکھی انداز میں اس کو جاتا ہوا دیکھتی رہی کہ وہ نرم و نازک سی گڑیا جیسی اب اندر سے کس قدر سخت ہو گئی ہے؟

❁......❁......❁

ان دنوں پی اون بہت کم آن لائن ہونے لگی تھی۔ پہلے تو وہ دوسرے تیسرے دن ن لائن ہو جاتی تھی یا پھر ای میل کے ذریعے اپنی خیر خیریت بتا دیتی تھی۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ سنے جو ہوٹل والی نوکری چھوڑ دی ہے تو شاید اب کسی نئی نوکری کی تلاش میں اسے وقت نہ ہو گا یا پھر اس کے لئے میری وہ اہمیت نہیں رہی ہو گی جو پہلے تھی۔ اگرچہ اب اس کے پاس پ ٹاپ تھا۔ وہ جب چاہے آن لائن ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے طویل گفتگو ہو۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ پھر اس دن جب میں نے اپنا کھولا تو اس کی میل آئی ہوئی تھی جس میں وہی خیر خیریت کے دو فقرے اور بس۔ تب میں

نے سوچا کہ اسے پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے وہ آن لائن نہیں ہوئی تو مجھے تشویش سی ہونے لگی۔ کیا پی اون مجھے بھول کر اپنی دنیا میں کھو گئی ہے؟ یا پھر اس کے ساتھ کوئی اور معاملہ ہو گیا ہے؟ اس کے بارے میں معلومات لینے کے ذرائع تھے۔ میں اسے فون کر سکتا تھا، ہمت سنگھ سے اس کے بارے میں پوچھ سکتا تھا اور اگر زیادہ ہی معلومات درکار ہوتی تو شعیب سے کہہ دیتا، لیکن......! کیا ایسا کرنا مناسب ہو سکتا ہے؟ فون کی حد تک تو بات ٹھیک تھی۔ اس سے گفتگو کر کے ہی مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ اب اس کا میرے بارے میں رویہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اگر مجھے اہمیت نہ دی تو میرا رویہ کیا ہو گا؟ اور اگر اس نے اہمیت دے بھی دی تو کیا میں اس سے ویسا ہی تعلق رکھ پاؤں گا جو پہلے تھا۔ مجھے یہی خیال آتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے اپنا پورا تجزیہ کر ڈالا، پی اون اب ماضی کا حصہ بن بھی گئی تو پھر کیا ہوا۔ زندگی میں بہت سارے لوگ ملتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں اور خاص طور پر وہ خاتون جو آپ کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتی ہو، میرا نہیں خیال کہ وہ شادی ہو جانے کے بعد ویسا تعلق رکھے۔ اس تعلق کی نوعیت تو بدل سکتی ہے لیکن جذبات و احساسات میں وہ پہلے والی بات نہیں رہتی۔ میں جس نیت سے پی اون کے ساتھ ملا تھا، وہ تو پوری ہو گئی تھی۔ چلتے وقت جو اس نے طنز کی تلوار سے مجھے زخم خوردہ کر دینا چاہا تھا وہ میرے لئے بہت بڑی جزا بن چکی تھی۔ پھر ہمارے درمیان ایک طویل زمینی فاصلہ تھا۔ اگرچہ ای میل، فون یا دیگر جدید ذرائع نے یہ فاصلے سمیٹ دیئے ہیں لیکن وہ معاملہ تو نہیں بن پاتا نا جو روبرو ملاقات میں ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک فطری سی بات ہے جب تک کوئی نگاہوں سے اوجھل رہے، تب تک بڑا تجسس ہوتا ہے لیکن سامنا ہو جائے پھر سارا تجسس ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جو تھوڑا بہت چارم پہلے محسوس ہوتا ہے، وہ بھی جاتا رہتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب دونوں ہم خیال نہ ہو پائیں۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ پی اون اب مجھے بھول کر اپنی دنیا میں کھو گئی ہے لیکن میرا من چاہ رہا تھا کہ میں چاہے ایک بار سہی، اس سے بات تو کر لوں۔

کمپیوٹر سکرین پر پی اون کا نام تاریک تھا۔ مگر اس نے میرے ذہن میں خواہ مخواہ کی ایک کھلبلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ بہت ساری یادیں، باتیں اور ساعتیں مجھے یاد آنے لگیں تو میں ایک دم سے چونک گیا۔ میں نے فون نکالا اور پی اون کے نمبر پش کر دیئے۔ اس وقت پاکستان میں دوپہر کے بعد کا وقت تھا اور پی اون سہ پہر کے وقت میں ہو گی۔ کافی دیر تک بیل جاتی رہی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میری تشویش بڑھتی چلی گئی۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہونے لگا کہ پی اون شاید اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ دوبارہ کوشش کروں

نہیں کہ میرے سیل پر پی اون کا فون آ گیا۔ میں نے فون ریسیو کر لیا۔

"ہیلو بلال کیسے ہو؟" اس کی وہ کھنکھتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن تم کہاں گم ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں تھوڑی مصروف تھی، اب بھی میں مصروف ہوں"۔

"کیا کوئی نئی سائنسی تھیوری پیش کرنے جا رہی ہو؟" میں نے مذاق میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی اور بولی

"بس یہی سمجھ لو، خیر......! میں تقریباً آدھے گھنٹے بعد آن لائن ہوتی ہوں۔ تمہیں وقت تو ہو گی لیکن تھوڑا صبر کرو، پھر لمبی بات ہو گی؟"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں"۔ میں نے کہا الوداعی فقروں کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

کمپیوٹر پر بیٹھے بندے کے لئے آدھا گھنٹہ کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں ہوتا لیکن جب میں نے اپنا وقت دیکھا ظہر ہو جانے والی تھی۔ میں نے کمپیوٹر بند کیا اور نماز کے لئے اٹھ گیا۔ میں جب واپس آیا تو گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ کمپیوٹر آن کیا تو پی اون آن لائن تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پیغام بھیجتا، اس کی طرف سے پیغام آ گیا۔

"بلال تم نے اتنی دیر لگا دی، میں تو انتظار کرتے ہوئے تھک گئی تھی"۔

"میں ایک ضروری کام میں مصروف ہو گیا تھا، تم سناؤ، تم کہاں گم رہی ہو؟"

"اب بات وہیں سے شروع کروں نا، جہاں سے میں نے جاب چھوڑ دی تھی۔ رہی ہوٹل والی، اب میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نئی جاب تلاش کروں۔ وہ میں نے بہرحال تلاش کر لی ہے۔ بس اسی میں مصروف رہی"۔

"اتنے دن تم نے اتنی پریشانی میں گزارے ہیں کہ میرے لئے تمہارے پاس تھوڑا سا وقت بھی نہیں تھا"۔

"ہاں......! کچھ ایسا ہی سمجھ لو، یہ سمجھ لو کہ ان دنوں میرے اپنے لئے بھی میرے پاس وقت نہیں تھا"۔

"ایسا بھی کیا تھا؟"

"میں اپنی پسند کی جاب چاہ رہی تھی۔ وہ بہرحال مل گئی ہے...... مطلب...... میں چاہ رہی تھی کہ کسی انسٹی ٹیوٹ میں مجھے جاب ملے، جہاں انگریزی سکھائی جائے، وہاں تنخواہ بھی زیادہ ہے"۔

''میرے خیال میں اتنی مصروفیت نہیں ہوتی، کتنے گھنٹے پڑھاتی ہو؟''

''وہاں اور بھی کام ہیں۔ پڑھاتی تو میں فقط چار گھنٹے ہوں۔ اس لئے شام ہو جاتی ہے۔ اب بھی میں کام سے واپس آ رہی تھی کہ تمہارا فون ملا۔ شور کی وجہ سن نہیں سکی تھی، میں نے اپنے گھر آ کر تمہیں کال کی تھی''۔

''واہ......! بہت مصروف ہو گئی ہو''۔

''ہاں......! میں ایسی ہی جاب چاہ رہی تھی، وہاں بھلے کام زیادہ ہو، لیکن وہ ہوٹل والی بات نہ ہو، یہاں عزت بھی ہے اور احترام بھی ملتا ہے''۔

''اچھی بات ہے، ویسے بھی تم ان لڑکیوں جیسا مزاج نہیں رکھتی ہو جو ہوٹل میں کام کرتی ہیں''۔

''ہاں......! اسی وجہ سے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں تمہاری بہت زیادہ مدد رہی ہے۔ اگر تم میرے ساتھ بات نہ کر رہے ہوتے تو شاید میں اس زبان میں اتنی مہارت اور اتنا اعتماد حاصل نہ کر پاتی۔ اب جا کر مجھے پتہ چلا ہے کہ تم نے مجھے کتنا فائدہ دیا ہے''۔

''اب اس میں میرا تو کوئی کمال نہیں ہے، تمہاری سیکھنے کی صلاحیت تھی اور پھر تم نے ایسی نیت رکھی ہوئی تھی، تم نے اس ارادے سے بات کرنا شروع کی تھی''۔

''ہاں......! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بہرحال اب میرے لئے یہاں ترقی کے بہت چانس ہو گئے ہیں۔ محکمہ سیاحت یا پھر اسی طرح کے دوسرے اداروں میں اس مہارت کے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے''۔

''میری خواہش ہے کہ تم بہت زیادہ ترقی کرو''۔

''اوہ......! میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تمہاری بیوی کیسی ہے، کیسا ماحول چل رہا ہے؟ کیا تم نے اپنی زندگی میں کوئی نیا پن محسوس کیا؟''

''تم نے یکدم اتنے سوال کر دیئے۔ خیر......! میری بیوی ٹھیک ہے، اچھا ماحول ہے اور زندگی میں نیا پن بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں''۔ یہ لکھتے ہوئے میری نیت اگرچہ جھوٹ بولنے کی نہیں تھی لیکن جس طرح اس نے سوال کیا تھا اسی طرح میں نے ابہام میں جواب دے دیا۔

''اب تم کب آ رہے ہو؟''

''شاید اب کبھی نہ آ سکوں، میں نے تمہیں بتایا تو تھا''۔

''ہنی مون منانے کہاں گئے تھے''۔

''کہیں بھی نہیں؟''

''یہاں آ جاؤ، میں کم از کم دو تین ہفتے تو افورڈ کر سکتی ہوں تم دونوں کو''۔

''نہیں......! میری بیوی نہیں مانے گی، ویسے اب تمہاری باری ہے پاکستان آنے کی، تم آ جاؤ نا''۔

''میں اب آنا بھی چاہوں تو نہ آ سکوں گی، ہاں اگر قسمت میں ہوا تو میں ضرور آؤں گی، میرے دل میں بہت خواہش ہے کہ تمہارا ملک، تمہارا گھر اور تمہاری بیوی کو دیکھوں''۔

''تمہارے لئے کیا مجبوری ہے، بس ٹکٹ لو اور آ جاؤ، اگر رقم کم پڑتی ہے تو مجھے بتاؤ، میں بھیج دیتا ہوں، بلکہ ٹکٹ بھیج دیتا ہوں''۔

''نہیں......! یہ بات نہیں، میں دو مہینے کے بعد اس قابل ہو جاؤں گی کہ ٹکٹ خرید سکوں لیکن پرابلم دوسرا ہے''۔

''وہ کیا؟''

''یہ میں جب کبھی تمہیں ملی تو بتاؤں گی، تب تم خود کہو گے کہ میں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی آج کل کام بہت زیادہ ہے''۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی''۔

''ویسے بھی جب بھی کبھی آئی تو تمہیں سرپرائز دوں گی''۔

''ظاہر ہے میری طرح کرو گی، کوئی بات نہیں اب میں تمہیں پہچان لوں گا''۔

''چلو ٹھیک ہے''۔

''او ہاں......! تم بھی ہمت سنگھ کی طرف گئی ہو''۔

''ہاں......! دو چار بار گئی تھی، میں نے کہا نا، وقت ہی نہیں مل رہا، میں چاہتی ہوں اب تھوڑا جو وقت ملا ہے میں اس میں زیادہ سے زیادہ کما لوں، یہ کوئی بری بات تو نہیں ہے نا''۔

''تم بہتر جانتی ہو''۔

''ایسے جند کور بہت اچھی اور پیار کرنے والی خاتون ہے۔ میں اب کسی چھٹی والے دن جاؤں گی''۔

''اب اس پر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم بہتر سمجھتی ہو''۔

''لگتا ہے اب تمہارے پاس باتیں ختم ہو گئی ہیں جو میری بات کا جواب نہیں دے رہے ہو''۔

''اب تم خود ہی بتاؤ، میں کیا جواب دوں''۔

''ہاں......! ویسے آج ہم نے معمول سے زیادہ باتیں کر لی ہیں۔ لگتا ہے تمہاری

بیوی گھر پر نہیں ہے“۔

”یہ بات تو سچ ہے، وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی ہے“۔

”سچ بتاؤں، میں اس لئے بھی آن لائن نہیں ہوتی تھی کہ ممکن ہے تمہاری بیوی اسے اچھا محسوس نہ کرے کیونکہ یہ بات عورت کی فطرت میں شامل ہے، میں اسے بہتر سمجھتی ہوں کیونکہ میں عورت ہوں“۔

”میں مان لیتا ہوں، مگر تم اس کی فکر نہ کرو“۔

”فکر کرنی چاہیے اور احتیاط بھی۔ٹھیک ہے، اب پھر کسی دن بات ہوگی“۔

”اوکے......! میں منتظر رہوں گا“۔

اس طرح کی چند باتوں کے بعد وہ آف لائن ہوگئی تو میں نے بھی کمپیوٹر بند کردیا۔ جو تشویش میرے ذہن میں ابھری تھی وہ ختم ہوتی چلی گئی۔ میں اس کی ایک ایک بات پر سوچ رہا تھا۔اس سے مجھے یہی لگا کہ اس میں آگے بڑھنے کی، زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش موجود ہے، اور اس خواہش کے تحت وہ اب اچھی نوکری حاصل کر چکی ہے۔اب اس کی نگاہ مزید اچھی نوکری پر ہوگی۔اس میں پی اون کا قصور نہیں تھا، اس کا ماحول ہی ایسا تھا جہاں ہر کسی پر زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی ہوس سوار رہتی ہے۔وہ مادہ پرست معاشرہ، جو چند دہائیاں پہلے ایک چھوٹی سی بستی پر مشتمل تھا، اب بین الاقوامی اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا۔کسی بھی معاشرے کے لوگ ہی ترقی کی راہ پر چلیں تو بحیثیت مجموعی معاشرہ ترقی کرتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ ترقی منفی ہے یا مثبت۔یہ تو ہر ایک کا اپنا زاویہ نگاہ ہے۔ہم جو پاکستان میں بہت سارے مسائل کا شکار چلے آرہے ہیں۔ہم جانتے بھی ہیں کہ فساد کی جڑ کہاں ہے، مسائل پیدا کرنے والا منبع بھی جانتے ہیں لیکن اسے ختم نہیں کر سکتے۔اصل میں اجتماعی روح ہم میں موجود نہیں ہے۔مثال کے طور پر تعلیم ہی ہمارے ہاں بہت بڑا مسئلہ ہے۔قومی تعلیمی پالیسیاں آتی ہیں لیکن ان پر عملدرآمد نہیں ہوتا، شرح خواندگی کا تناسب اگر پچیس سے تیس فیصد کے درمیان ہے تو ایسا کون نہیں چاہتا؟ جاگیرداری فضا میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔جاگیرداری نظام کی بقا اس میں ہے کہ لوگ جاہل رہیں حالانکہ قومی ترقی کا راز ہی تعلیم یافتہ معاشرے میں ہے۔سو ہم نے بحیثیت قوم جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد ہی نہیں کی۔یہ جدوجہد مثبت ترقی کی راہ پر لے جانے والی ہے، لیکن کتنوں کو اس کا شعور ہے کہ اعلیٰ ترین قومی پالیسی بھی جاگیردار حاکموں کے باعث ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہے۔دوسرے فروعی معاملات کی طرح بھی ہم نے فروغ تعلیم کے لئے نبی رحمتِ عالمؐ کے فرمان کو سامنے رکھا۔اس پر اتنی شد و مد سے

جدوجہد کی، یہاں بھی ہم اختلافات کا شکار ہیں اور وہ جو تعلیم نہیں چاہتا، وہ بیٹھا تماشا کر رہا ہے۔ہماری قوم کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ علم جو ہر مسلمان عورت اور مسلمان مرد پر فرض کر دیا گیا ہے۔علم جو مومن کی گم شدہ میراث ہے۔اس کے لئے ہم تگ و دو نہیں کرتے، کوئی جدوجہد نہیں ہے۔زریں خیالات اسمبلیوں میں جا کر تحلیل ہو جاتے ہیں کیوں؟ کبھی ہم نے اس پر تفکر کیا؟

میں یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اذانِ عصر نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، میں اٹھا اور نمازِ عصر ادا کرنے کے لئے حویلی سے چل دیا۔ایک خیال میرے ذہن میں سرایت کر گیا تھا جسے میں نے سوچنے کے لئے اپنے ذہن ہی میں محفوظ کر لیا۔

❀......❀......❀

ماہا کی شادی کو تین ہفتے سے زیادہ ہوگئے تھے اور دیکھنے والوں نے اس میں نئی نویلی دلہنوں والی کوئی بات نہیں دیکھی تھی۔اس کا معمول بن گیا تھا کہ صبح سویرے اٹھتی اور تیار ہو کر نور پور کے لئے روانہ ہو جاتی۔اس کی واپسی شام ڈھلے ہوتی۔اس کی مانند سوچ رکھنے والی کچھ دوسری عورتیں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی تھیں جو آفس میں آتیں اور نت نئے منصوبے پیش کئے جاتے۔ان پر مشورے ہوتے اور پھر یونہی شام ڈھل جاتی۔وہ صحیح معنوں میں اپنے کام کا آغاز نہیں کر پائی تھی لیکن آفس باقاعدگی سے چل رہا تھا۔سبھی اسے دیکھ رہے تھے اور اپنے من میں خاموشی سے تماشا کئے چلے جا رہے تھے کہ یہ کر کیا رہی ہے۔کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ کیسے درست کیا جائے۔ان دنوں میں کسی نے بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ہماری سماجی فطرت یہ ہے کہ جب ایسا کوئی معمول سے ہٹا ہوا معاملہ سامنے آجائے تو پہلے چہ میگوئیاں ہوتی ہیں اور پھر باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بلال اور ماہا کے درمیان تعلق کے بارے میں ایسی ہی باتیں ہونا شروع ہوگئی تھیں۔زبیدہ خاتون کب تک ایسی باتوں کو چھپا کر رکھتی۔جن لوگوں کے بارے باتیں ہو رہی تھیں وہی چھپانا نہیں چاہ رہے تھے۔دادا نور الٰہی کو ماہا کے رویے کے بارے میں احساس تھا لیکن وہ کس حد تک چلی جائے گی، اس کے بارے میں جب پتہ چلا تو وہ بہت دکھی ہوا۔

کبھی ماہا کو اپنے دادا نور الٰہی پر بہت اعتماد تھا، وہ ان سے بہت پیار کرتی تھی لیکن شادی کے بعد سے وہ ایک بار بھی ان کے پاس نہیں بیٹھی تھی۔بس اپنی دنیا میں کھو کر رہ گئی تھی۔ ن کا جو من کرتا وہ کرتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ دن میں ایک آدھ بار ملاقات ہو جاتی لیکن ماہا کی کوشش ہوتی کہ زیادہ بات نہ ہو اور فوراً وہاں سے ہٹ جائے۔دادا نے تو یہی سوچا تھا کہ شادی ہو جانے کے بعد دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن ٹھیک کیسے ہوتا؟ ماہا نے تو

اپنی مصروفیات حویلی سے باہر ڈھونڈ لی تھیں۔ اس کا رویہ سب سے اجنبیوں والا ہو گیا تھا۔ جیسے حویلی میں بسنے والے لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ دادا نور الٰہی یہ سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ ماہا کے معاملے میں فیصلہ کر کے انہوں نے شدید غلطی کی ہے؟ مگر جس معاملے پر ماہا نے ضد پکڑی ہوئی تھی، ویسا کچھ تھا ہی نہیں تو پھر ماہا اتنی ضدی کیوں ہو گئی ہے؟ کیا اس کے علاوہ بھی اس کے ذہن میں کوئی بات ہے جس کا وہ اظہار نہیں کرنا چاہتی یا اظہار کر نہیں سکتی؟ گزرے دنوں کے ساتھ وہ بھی یہی سوچتا رہتا کہ ایسا کب تک چلے گا۔ اس کا انجام وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا، ٹوٹ پھوٹ کا یہ سلسلہ بہت دور تک جانے والا تھا۔

اس دن نور الٰہی کو معلوم ہوا کہ ماہا حویلی ہی میں ہے۔ نور پور نہیں گئی، تب وہ اس سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے ماہا کو بلوایا تو وہ کچھ دیر بعد ان کے پاس کمرے ہی میں آ گئی۔ ست الوجود، بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں جیسے خوشی کے سارے سوتے اس کے اندر خشک ہو گئے ہوں۔ وہ تازگی کا احساس نہیں تھا۔ سلام کرنے کے بعد جب وہ دادا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا۔

''کیسی ہو ماہا؟''

''بس زندہ ہوں دادا جی''۔ اس نے نگاہیں نیچی کئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی بیٹا......! تم تو یوں کہہ رہی ہو کہ جیسے تمہیں زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ کیوں مایوس ہو اتنی؟'' وہ دبے دبے غصے میں بولے، اسے ماہا کا یہ انداز بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''دادا جی......! یہ بات آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں''۔ ماہا نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

''اگر یہی بات ٹھیک ہے بیٹا تو پھر تمہارا رویہ ایسا کیوں ہے، جس میں تم نے بلال ہی کو نہیں حویلی کے بھی لوگوں کو نظر انداز کیا ہوا ہے؟'' دادا نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''دادا جی......! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں بلال سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آپ کے فیصلوں کی ریشمی ڈور سے مجھے باندھ کر اس حویلی سے لا پھینکا گیا۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے زندگی بھی نہ گزاروں'' وہ قدرے تلخ لہجے میں بولی۔

''بنیادی سوال یہ ہے ماہا بیٹی کہ آخر تم بلال سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھی جبکہ پہلے......''

''میری اس سے منگنی تھی، ہم دونوں ہم خیال تھے۔ ہمارے تعلق میں جو باتیں تھیں

وہ نہ رہیں تو پھر تعلق کس بنیاد پر دادا جی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا، وہ میرے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہا ہے، اور میں اس کے مطابق زندگی نہیں جی سکتی''۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا جو وہ دلیل سب کو دیتی چلی آ رہی تھی۔

''میں یہ بات نہیں مانتا ماہا، کیا اس نے تم پر کوئی قدغن لگائی، کسی کام سے روکا، کیا کوئی کام جبراً کرنے کو کہا؟'' دادا نور الٰہی نے بہت تحمل سے پوچھا۔

''نہیں......! لیکن میں نے بھی تو اسے نہیں کہا کہ وہ میری پسند سے اپنی زندگی جیے۔ اسے اپنے طور پر زندگی جینے کا حق ہے''۔ ماہا نے اپنی طرف سے بھرپور دلیل دی۔

''وہ کوئی غیر معمولی زندگی بسر نہیں کر رہا ہے جس طرح ایک مسلمان کو جینا چاہیے، وہ ویسے جی رہا ہے، تمہیں بھی ایک اچھی مسلمان ہونا چاہیے''۔ دادا نے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن میں ایسی مسلمان بننا پسند نہیں کروں گی، جو جبر کرنے والی ہو، دہشت گرد ہو، جس کے ذہن میں ایک خاص طرح کا لائحہ عمل ہو اور اس کے مطابق جو نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں۔ خیر......! بہت ساری باتیں ہیں، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی''۔ ماہا نے پہلے قدرے جوش اور پھر دھیمے لہجے سے کہا۔

''بلال نہ کوئی دہشت گرد ہے اور نہ ہی وہ جبراً تم پر کوئی حکم لاگو کر رہا ہے۔ اب دیکھو......! تم نے این جی او بنا لی ہے، کیا اس نے تمہیں روکا؟''

''وہ کیسے روک سکتا ہے، میں کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے خدمت خلق کے لئے ادارہ بنایا ہے، جیسے آپ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایک بڑے زمیندار کی حیثیت سے سیاست دان کی حیثیت سے......''

''لیکن بیٹی......! ہماری روایت یہ نہیں کہ حویلی کی بہو، بیٹیاں یوں باہر نکل کر خدمت کرتی پھریں۔ ابھی ہم ہیں''۔

''ہاں یہ کہیں کہ آپ کو اپنی حویلی، اپنے اثر و رسوخ کا خیال ہے۔ اگر یہی وجہ ہے تو کل سے نہیں جاؤں گی، نور پور۔ مگر میرا نہیں خیال کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے''۔ ماہا نے اطمینان سے کہہ دیا۔

''بیٹی......! تم نے خواہ مخواہ ایک ضد پکڑ لی ہوئی ہے۔ ہم سب تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ ہم اگر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ہمارا فیصلہ غلط تھا تو پھر بھی تم اپنے رویے میں تبدیلی نہ لاؤ گی؟'' دادا نے ایک دوسرے پہلو سے اس کے ساتھ بات کرنا چاہی۔

’’یہ تو مجبور کرنے والی بات ہے نا، جیسے آپ نے پہلے مجبور کیا۔ آپ جو حکم دیں، میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن آپ میرے موقف کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ میں ساری زندگی آپ لوگوں کے لئے قربانیاں دینے کا جذبہ ہی نہیں حوصلہ بھی رکھتی ہوں مگر جہاں میں غلط ہوں، وہاں مجھے غلط کہا جائے۔ ورنہ مجھے میری زندگی جینے کا حق دیا جائے‘‘۔ ماہا نے جذباتی لہجے میں کہا تو اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ تب نور الٰہی بھی کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

’’نہیں......! ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ تم جو چاہو کرو، لیکن اپنے شوہر کی اجازت سے، تم دونوں نے اب اک نئے خاندان کی بنیاد رکھنی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم دونوں پہلے کی طرح ہو جاؤ، حویلی میں پھر سے خوشیاں لوٹ آئیں۔ تمہیں یہ تو ضرور احساس ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں اپنے گھر کو بچانے کے لئے عورت ہی قربانی دیتی چلی آئی ہے۔ بیٹی، تم بھی کوشش کرو‘‘۔

’’مطلب، آپ چاہتے ہیں کہ میں ہی قربانی دوں اور دوسری جانب آپ مان گئے ہیں کہ میں غلط نہیں ہوں۔ آپ حکم دیں اس بارے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا‘‘۔

’’بیٹی......! یہ کوئی حتمی یا ایک دو باتیں نہیں ہوتیں۔ تم خوب اچھی طرح سمجھتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے‘‘۔ دادا نے بہت ہی پیار سے کہا۔

’’میں این جی او نہ چلاؤں، حویلی سے باہر نہ جاؤں......‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ جو سب کچھ بیٹا......! جو تمہارے اور بلال کے درمیان خوشگوار تعلق میں بنیاد بن جائے‘‘۔ نور الٰہی نے پھر پیار سے کہا۔

’’ٹھیک ہے، میں بلال سے بات کر لوں گی‘‘۔ اس نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد بولی۔ ’’اب مجھے اجازت......‘‘

’’ہاں بیٹی......! اللہ تمہاری عمر دراز کرے اور تم سب کے لئے خوشیوں کا باعث بن جاؤ‘‘۔ دادا نے کہا تو وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے ذہن میں دادا کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ بھی اس سے خوشگوار تعلق بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے، میں ہی سب غلط کر رہی ہوں۔ میری وجہ ہی سے حویلی میں خوشیاں نہیں رہیں اور میں وہ سب کر رہی ہوں جو حویلی کی روایات کے خلاف ہے حالانکہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کیا میں انسان نہیں ہوں...... مجھے کوئی حق نہیں ہے جینے کا...... اس کی سوچیں پھر وہیں پر آن ٹکیں تو دماغ میں غبار

بڑھنے لگا۔ اسے لامحالہ بلال کی بات ماننا ہی ہوگی...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے...... یہ غبار جب زیادہ بڑھنے لگا تو اس نے نجمہ پھوپھو کے نمبر پش کر دیئے۔

’’بیٹی خیرت تو ہے تمہارا لہجہ بڑا منتشر سا لگ رہا ہے۔ کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟‘‘

نجمہ پھوپھو نے چند تمہیدی باتوں کے بعد پوچھا تو ماہا نے دادا نور الٰہی سے ہونے والی ساری باتیں دہرا دیں۔ نجمہ پھوپھو بڑی سنجیدگی سے وہ باتیں سنتی رہیں اور پھر کہا‘‘۔ بات تو پھر وہی ہے ماہا کہ تم ہی سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرو۔ بلال کو بھی درست کہہ رہے ہیں‘‘۔

’’لیکن یہ بات تو کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے نا‘‘۔

’’سب سمجھتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے، اب دیکھو انہوں نے ابا جی کو آگے کر دیا کہ وہ تم سے بات کریں تا کہ تم ان کی بات نہ ٹال سکو۔ اب یہی باتیں تو ہوں گی۔ دھیرے دھیرے وہ تمہیں مجبور کر دیں گے کہ تم ان کی بات مان لو‘‘۔ نجمہ نے کہا، اس کے لہجے میں تشویش گھلی ہوئی تھی۔

’’لیکن مجھے کسی اور نے تو کوئی بات نہیں کی، یہاں تک کہ بلال نے بھی۔‘‘ وہ بولی۔

’’ابھی تو وہ تمہیں باتوں ہی سے سمجھائیں گے نا، پھر لازمی بات ہے کہ وہ سختی کریں گے۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ہوگی، انہیں یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی ہوگی کہ تم پورے علاقے میں جانی پہچانی شخصیت بن جاؤ اور بلال اگر اسی ڈگر پر چلتا رہا تو وہ کبھی اتنی دولت نہیں کما سکے گا جس سے تم ایک شاندار زندگی گزار سکو‘‘۔ نجمہ نے اسے مستقبل کی ایک جھلک دکھائی۔

’’یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں‘‘۔ ماہا اس سے متفق ہوتے ہوئے بولی۔

’’پہلے وہ تمہیں حویلی تک محدود کریں گے، پھر اس کے بعد سب کچھ ہوگا۔ اب کسی اور میں تو اتنی صلاحیت ہے نہیں۔ زبیدہ خاتون ہو یا پھر رقیہ......! کیا وہ تم عقل سمجھ تک پہنچ سکتی ہیں۔ انہیں تو شاید سماجی مرتبے کے بارے میں پتہ بھی نہ ہو۔ اب اگر تم میں اتنی عقل سمجھ اور سوجھ بوجھ ہے تو پھر وہ تمہاری صلاحیتوں کا قتل کیوں کرتے ہیں‘‘۔

’’اب دیکھیں پھوپھو......! اتنے دن ہو گئے ہماری شادی کو بلال نے مجھے بری طرح نظر انداز کر دیا ہوا ہے، میں اگر غلط ہوں تو کم از کم وہ مجھے غلط ثابت کرے اور کچھ نہیں تو اپنی ہی بات منوانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کا رویہ تو ایسا ہے جیسے میں ہوں یا نہیں ہوں۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑا‘‘۔ ماہا نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

’’یہی تو بات ہے، اسے پتہ نہیں کس شے کا زعم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حویلی میں اس کی مانی جائے گی، وہ سب تم پر دباؤ ڈالیں گے تو پھر تم مجبور ہو جاؤ گی۔ اسی لئے وہ تمہیں نظر

انداز کر رہا ہے۔ اب دیکھ لینا جو رویہ تم نے اس سے اپنایا ہے، چاہے تم ٹھیک ہی ہو، وہ انتقام کی صورت میں بدلہ ضرور لے گا۔ یہاں تک کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ....'' نجمہ پھوپھو نے بھرپور انداز میں کہا۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے......''

''وہی جو تمہارا دل چاہے، تمہیں اپنی زندگی جینا ہے۔ اب دیکھو......! انصاف کا تقاضا ہے ناکہ جیسے بلال ہے، ویسی ہی تم ہو۔ ابا جی کو ایک ہی نگاہ سے تم دونوں کو دیکھنا چاہیے۔ لیکن حقیقت تم خود دیکھ رہی ہو۔ بات تو یہ ہے نا، وہ سامنے آ کر بات تو کریں۔ تم سے کوئی بات اس لئے نہیں کر سکتا کہ تم ٹھیک ہو، اب زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ ان کی مان کر جھک جاؤ وہی کرو جو وہ کہتے ہیں یا پھر اپنی بات پر ڈٹی رہو کہ وہ سب تمہارے سامنے جھک جائیں''۔ نجمہ پھوپھو نے انتہائی جذباتی انداز میں تقریر کر ڈالی۔

''ٹھیک ہے پھوپھو......! میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا''۔ ماہا نے حتمی سے انداز میں اکتاتے ہوئے کہا، جیسے اسے یہ سب کچھ نہ لگ رہا ہو۔ پھر چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ اس کے من میں پھیلا ہوا غبار نکلا تو وہ پرسکون ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک یونہی خالی ذہن بیٹھی رہی پھر اس کی دماغی رُو این جی او کی جانب چلی گئی۔ اس نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ دادا کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے کچھ دن نور پور نہیں جانا چاہیے۔ ماہا نے اپنی سہیلی کو فون کر دیا کہ وہ وہاں کے معاملات سنبھال لے تاہم فون پر رابطہ رہے گا۔ سہیلی نے تفصیلی پوچھنا چاہی تو اس نے ٹال دیا۔ اس وقت ماہا سب کچھ اپنے ذہن سے نکال کر فقط اپنے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

❁......❁......❁

دسمبر کے ابتدائی دنوں کی نرم دھوپ بڑا سکون دے رہی تھی۔ میں سب کے ساتھ ناشتہ کر کے لان میں آ بیٹھا۔ میری چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور میں نے دوپہر کے بعد حویلی سے چلے جانا تھا۔ اس دن فجر کے بعد میں نے سوچا تھا کہ مجھے ماہا سے بات کرنی چاہیے۔ ممکن ہے اس کی سوچ میں تبدیلی آ چکی ہو اور اگر ایسا نہیں بھی ہے تو کم از کم مجھے بات تو کرنی چاہیے۔ میں نے ملازمہ کے ذریعے اسے لان ہی میں بلوا لیا تھا۔ میں وہیں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شمال کی جانب سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا اور نرم دھوپ کا امتزاج بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماہا کاریڈور میں دکھائی دی۔ اس نے میری جانب دیکھا اور پھر دھیرے قدموں سے میری جانب بڑھتی چلی آئی۔ اس نے ہلکے بادامی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا آنچل دائیں

کاندھے پر تھا، شانوں تک کٹے بال ہلکی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کا لباس اس قدر تنگ تھا کہ جسم کا ہر عضو ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ بے نیازی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ لئے وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر طنزیہ انداز میں بولی۔

''میرے خیال میں دادا جی کے سامنے حاضر ہوئے اتنے دن تو نہیں ہوئے جو تم نے مجھے اپنے حضور طلب کر لیا ہے''۔ اس کے یوں کہنے پر میں نے ماہا کے چہرے پر دیکھا جہاں ہونٹوں پر نفرت بھری مسکان اور آنکھوں میں سے طنز جھانک رہا تھا۔ تب میں نے تحمل سے کہا۔

''ماہا......! یہ تم ہی ایسا سوچ رہی ہو ورنہ میں نے تو کچھ دوسری باتیں کرنے کے لئے تمہیں بلایا ہے''۔

''جس طرح انہوں نے باتوں ہی باتوں میں احکام صادر فرما دیئے ہیں۔ تم بھی حکم دے سکتے ہو۔ بہو یا بیوی کے نام پر ایک باندی جو اس حویلی میں آ گئی ہے''۔ وہ اسی طنزیہ انداز میں بولی۔

''یہ سنے بغیر کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں، تم نے اپنے طور پر فرض بھی کر لیا اور فیصلہ بھی دے دیا''۔ میں نے کہا۔

''چلو کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ یوں بولی، جیسے بحث وغیرہ کے موڈ میں نہ ہو اور جان چھڑانا چاہتی ہو۔

''میں تم سے آج بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہاری ان چند باتوں کے بعد میرا خیال ہے کہ وہ ساری باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔ تمہاری ذہنی کیفیت اب بھی وہی ہے جو ایک ماہ پہلے تھی''۔ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

''کیا مطلب......! تمہارا کیا خیال ہے، میں ابنارمل ہوں......؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نہیں ماہا......! تمہارا رویہ...... مگر چھوڑو ان باتوں کو''۔ میں نے پہلو تہی چاہی۔

''نہیں......! پہلے یہ بات کلیئر کرو......'' وہ ضد پر اتر آئی۔

''ذرا سی مثال ہے...... پہلے تم مجھے، تم کہتی تھی...... پھر خود ہی آپ کہنے لگی...... اب پھر تم کہنے لگی ہو...... میں نہیں جانتا تم کیا سوچتی رہتی ہو لیکن خود اپنے بارے میں اندازہ لگا گئی ہو''۔ میں نے تحمل سے کہا تو وہ ایک ٹک میری جانب دیکھنے لگی۔ تب میں نے کہا۔ ''جب انسان بہت زیادہ الجھن کا شکار ہو جائے تو اس کی سوچیں تک گرد آلود ہو جاتی ہیں۔ اسے احساس

ہی نہیں ہوتا کہ کون سی سوچ درست ہے اور کون سی غلط...... میں نے سوچا تھا کہ اتنے دنوں میں تم اپنے رویے میں تبدیلی لے آؤ گی لیکن تم نے ایسا نہیں کیا؟''

''میں کیوں لے آتی اپنے رویے میں تبدیلی......'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لئے کہ جس بنیاد پر تم نے رویہ اپنایا ہے، تم نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ میں ویسا ہوں یا نہیں، میں چاہتا تو اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے چلا جاتا، ادھر اس لئے رہا ہوں کہ تم جس طرح چاہو اپنی بدگمانی، شک اور وہم دور کر سکو لیکن تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بات کرنے کے لئے آج تمہیں خود بلانا پڑا......'' میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''میں مانتی ہوں کہ میرا رویہ سخت رہا ہے لیکن میں نے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔ میں اپنے آپ میں سمٹ گئی ہوں۔ میں نے کسی سے کوئی امید نہیں رکھی۔ بلال......! میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری اور تمہاری رفاقت سب سے زیادہ رہی ہے، میں نے کبھی تمہیں خود سے جدا سمجھا ہی نہیں تھا مگر تم یہ مانو کہ تمہی نے اپنا تاثر میرے سامنے خراب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میں بھی دکھ محسوس کر رہی ہوں۔ تم کیا جانو ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں کتنے زخم دیتی ہیں اور ان زخموں کی ٹیس کتنی گہری ہوتی ہے۔ خاص طور پر وہ زخم جو کسی اپنے بہت اپنے نے دیئے ہوئے ہوں''۔ وہ جذباتی انداز میں بولی۔

''ماہا......!'' میں نے پیار سے کہا۔ ''جس طرح تم کہہ رہی ہو کہ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا، میں نے تم پر کوئی قدغن لگائی......؟'' میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''جب بندے کی راہیں جدا ہو جائیں تو پھر مان نہیں رہتا۔ بس سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور میں سمجھوتے کر چکی ہوں۔ تمہاری بیوی اور اس حویلی کی بہو ہوں...... اور بس۔ جس طرح میں نہیں چاہتی کہ تمہاری زندگی میں دخل اندازی کروں، اس طرح یہ بھی چاہوں گی کہ کوئی میری زندگی کو ڈسٹرب نہ کرے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس طرح ساری زندگی گزار لوں گی''۔ اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''تم کیوں گزار لینا چاہتی ہو ایسی زندگی۔ تمہیں خود پر جبر کر کے کیا ملے گا اور پھر میں تمہیں ایسی زندگی گزارنے کیوں دوں گا؟ تم ایسا کیوں نہیں سوچ لیتی ہو کہ زندگی میں خوشیاں بھر جائیں''۔ میں نے بہت پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ریل کی پٹڑی بھی تو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ بے جان ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ میں کسی کی زندگی ڈسٹرب نہ کروں اور کوئی میری......''

''ماہا......! تم اتنا سختی سے کیوں سوچ رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں جو خدشات ہیں، تحفظات ہیں، مجھے بتاؤ ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے، دیکھو......! حل دو طرح کے ہوتے ہیں ایک منصفانہ حل اور دوسرا ممکن حل...... میں مانتا ہوں کہ منصفانہ حل کیا ہے۔ تم مجھ سے متنفر ہو، میرے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی ہو، اس لئے ہماری راہیں جدا جدا ہو جانی چاہئیں۔ لیکن اگر ہم منصفانہ حل نہیں کر سکتے تو ممکن حل کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ وہ بہرحال ہم دونوں ہی کو سوچنا ہوگا''۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ ہمیں اب کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کوئی بھی کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر تم مجھ سے الگ ہو جانا چاہتی ہو تو میں آگے بڑھتا ہوں...... میں سب کو قائل کر لوں گا کہ تمہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے دی جائے۔ اس میں تم جو چاہو، میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ممکن حل چاہو تو ہم وہ بھی سوچ سکتے ہیں''۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''پہلے والے حل کا نتیجہ تو صاف ظاہر ہے، لیکن کیا تمہارے ذہن میں کوئی دوسرا حل بھی ہے''۔ اس نے نجانے کس سوچ کے تحت میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہے......!'' میں نے سکون سے کہا۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے کہ اس کے لئے پہلے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا ہوگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کہیں کوئی ایسا مقام ہے جہاں ہماری سوچیں، خیال، خواہش اور ارادے ملتے ہوں۔ ایسا کرنے میں اگرچہ ہمیں کچھ وقت لگے گا لیکن ہم کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے''۔

''اس کے علاوہ کوئی اور بات......؟'' اس نے ستے ہوئے چہرے سے میری جانب دیکھا۔

''یا پھر ہم سب کچھ بھول جائیں، جو سامنے ہے اس حقیقت کو قبول کر لیں اور اک نئے سرے سے زندگی کی ابتداء کریں''۔ میں نے کہا تو وہ ہنس دی اور پھر بولی۔

''تم اپنے نکتہ نظر سے سوچ رہے ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ جہاں سے ہماری

درمیان بداعتمادی، بدگمانی اور جھوٹ ہماری زندگی میں شامل ہوا تھا۔ اس سارے دورانیے کو بھول جائیں، وہ خواب جو ہم نے مل کر دیکھے تھے جس زندگی کی ہم دونوں نے تمنا کی تھی اور جن خواہشوں پر ہم نے اپنے جیون کی بنیاد رکھی تھی۔ انہی پر کیوں نا ہم اپنی زندگی کو سجائیں سنواریں اور رنگ بھریں۔ تم وہی پہلے والے بلال بن جاؤ اور میں وہی ماہا...... پھر ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہوگا......'' وہ نہایت حسرت سے بولی تو مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔

''زندگی میں صرف خواب، خواہشیں اور تمنائیں نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان اس لئے ہیں کہ ہم دین اسلام کے پیروکار ہیں۔ ہمارے دین کا بھی ہم سے تقاضا ہے جو بہرحال ہماری زندگی ہماری جان اور ہمارے مال پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جس دور کی تم بات کر رہی ہو، میں چاہوں بھی تو اس وقت میں واپس نہیں جا سکتا۔ میں اپنا شعور کہاں لے جاؤں۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ آؤ، دیکھو، یہ دنیا کیا ہے، دین کے مطابق زندگی گزارنے میں کیا لطف اور سکون ہے''۔ میں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''تمہارے خیال میں...... اچھے مسلمان تم ہی ہو، میں مسلمان ہی نہیں ہوں...... اور جو تم کہہ رہے ہو، اس کا سیدھا سادھا مطلب تو یہی ہے کہ میں تمہارے مطابق زندگی گزاروں، وہی کرو جو تم کہو گے، جو تم حکم دو گے...... میں وہی کروں جو تمہارا ایک مخصوص نکتہ نظر ہے۔ دین کے نام پر ایک خاص لائف سٹائل تم نے اپنا لیا ہے۔ پھر تو ہم دونوں میں اختلاف ہی ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں تم مجھے اپنی بات ماننے پر مجبور کر رہے ہو''۔ ماہا ایک دم سے تیز تیز بولنے لگی جیسے ہتھے سے اکھڑ گئی ہو۔

''چلو......! تم بتاؤ، ممکن حل کے لئے تمہارے پاس کیا راستے ہیں......'' میں نے کہا۔

''جیسے میں نے پہلے کہا، ریل کی پٹڑی کی مانند دونوں زندگی گزار دیں اور بس۔ تم اپنی زندگی میں آزاد ہو، جو چاہو سو کرو۔ میں منع نہیں کروں گی، اور ایسا ہی میں اپنے لئے چاہوں گی......'' وہ جذباتی انداز میں کہتی گئی تو میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا۔

''چلو......! ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ایسی زندگی میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میاں بیوی کی حیثیت سے یا...... دوست کی حیثیت سے......''

''میں یہ بات مان لیتی ہوں...... لیکن کب تک...... ساری زندگی ہم قائل نہ ہوتے تو......'' وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولی۔

''لیکن میرا من کہتا ہے کہ ہم یقیناً ایک دوسرے کو قائل کر لیں گے''۔ میں نے کہا۔

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم......'' وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''آج میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ میں آج لاہور جا رہا ہوں...... میں نے تمہیں بتایا تھا کے وہاں میں نے تمہاری پسند کا ایک گھر بنایا ہے، آؤ......! وہاں چل کر رہتے ہیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ اس سے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ بلاشبہ ہم وہاں دوستوں کی طرح رہیں گے؟'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اور پھر بولی۔

''نہیں بلال......! میں اپنی آزادی سلب نہیں کر سکتی اور وہ بھی اپنے ہاتھوں، میں تمہارے ساتھ اس حویلی کے بزرگوں کے باعث جڑی ہوئی ہوں تو میری جگہ یہ حویلی ہے...... یہیں میری دنیا ہے...... مجھے میری دنیا میں خوش رہنے دو...... ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے میرا خیال ہے فاصلے حائل نہیں ہوتے۔ بہت سارے ذرائع ہیں''۔ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا ابھی وہ ایسا نہیں سوچ رہی جس سے کوئی نئی راہ نکل سکے۔ وہ ابھی تک اپنی ضد اور انا کے حصار میں گھری ہوئی تھی۔ سو میں نے مزید بحث نہیں کی۔ اس لئے بات کو دوسری جانب موڑتے ہوئے میں اپنی جیب میں سے چیک نکالا اور پوچھا۔

''میں تمہارے نان ونفقہ کا ذمے دار ہوں...... بولو، ایک ماہ کے لئے تمہیں کتنی رقم درکار ہو گی''۔

''میرے پاس اتنا سرمایہ ہے اور میں اتنا کما سکتی ہوں، مجھے تمہاری رقم کی کوئی ضرورت نہیں'' اس نے تنک کر کہا۔

''پھر بھی...... میں ذمے دار ہوں نا......'' میں نے اصرار کیا۔

''میں تمہیں اس ذمے داری سے مبرا کرتی ہوں''۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔ میں خاموش رہا تو وہ کہنے لگی ''یہی باتیں تھیں یا اور کچھ......؟''

''نہیں...... یہی باتیں ہیں...... تم اگر کچھ کہنا چاہو تو......''

''نہیں...... مجھے کچھ نہیں کہنا......'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے...... تم جا سکتی ہو''۔ میں نے کہا تو میری جانب دیکھتے ہوئے اٹھ گئی اور میں وہاں اکیلا رہ گیا۔

اس دن ماہا کے چلے جانے کے بعد میں پریشان ہو گیا۔ وہ اپنے موقف میں بلاشبہ بہت سخت ہو چکی تھی۔ میں نے اب تک یہی جانا تھا کہ وہ خواہ مخواہ بچوں جیسی ضد کر رہی ہے جو وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اک ذرا سی لچک بھی نہیں دکھائی

تھی۔ اگر اس کا یہی حال رہا تو پھر امی کی بات درست ہی ہو سکتی تھی کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی مگر میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں ماہا کے لئے زیادہ ذمے داری محسوس کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ فقط میرا عشق ہی تھی۔ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ ہم نے زندگی ساتھ گزارنے کے بڑے خواب دیکھے تھے۔ یہ ایک حقیقت تھی، میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اب جبکہ میری زندگی میں تبدیلی آ چکی تھی، میں اس اس مقام تک نہیں جا سکتا تھا۔ اب ماہا ایک بیوی کی حیثیت بھی اختیار کر چکی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ سوچنا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر میری ذمے داری یہ تھی کہ اسے دین فطرت کی جانب لے کر آؤں۔ اسے بتاؤں، سمجھاؤں اور اس مقام تک لے آؤں جہاں سے دین کے روشن جزیرے واضح ہوتے ہیں اور دراصل یہی میری کامیابی تھی۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ جس طرح کے خواب جزیرے میں وہ موجود تھی، وہ ہم نے مل کر دیکھے تھے۔ میں بھی ویسا ہی تھا مگر وقت اور حالات مجھے کہاں لے آیا اور وہ کہاں کھڑی تھی۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس وقت لان میں بیٹھے بیٹھے میں خود پر ایک بہت بڑا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ سو، اس شام میں اکیلا ہی وہ بوجھ لئے وہاں سے چل دیا۔ اس نے مجھے الوداع بھی نہیں کہا۔ ایک کسک لئے میں لاہور کی جانب گامزن ہو گیا۔ ماہا اب میرے لئے محبت بھری ذمے داری تھی۔

دسمبر کی طویل راتوں میں خنکی اپنا آپ منوا رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں حویلی کے سبھی مکین اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ پوری حویلی پر سناٹا چھایا ہوا تھا جبکہ زبیدہ خاتون اور افضال نور اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی ٹھہری ہوئی تھی۔ تبھی افضال نور نے اسے توڑا۔

''چائے اچھی بنائی ہے تم نے'' اس کا لہجہ یوں تھا جیسے وہ چائے پر تبصرہ نہیں کر رہا بلکہ محض کمرے میں موجود سناٹا ختم کرنا چاہ رہا ہو، اس پر زبیدہ خاتون نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''ہاں......! میرا دھیان تو نہیں تھا لیکن بس اچھی بن گئی''۔

''کیوں دھیان نہیں تھا تمہارا؟'' افضال نے یونہی بات بڑھائی تو زبیدہ جیسے پھٹ پڑی، وہ کہتی چلی گئی۔

''میں نہیں سمجھتی تھی کہ ماہا اچانک اس طرح کا رویہ اپنائے گی۔ میں حیران ہوں۔ مجھے لگتا ہے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے، ورنہ وہ تو بہت اچھی اور پیاری بیٹی تھی۔ میرے خیال

میں اسے بلال کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تو معاملہ سدھرنے کی امید تھی لیکن اس نے جانے کیلئے صاف انکار کر دیا۔ مجھے ماہا کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ وہ ایسی کیوں ہو گئی ہے''۔

''کیا ہم نے اسے سمجھنے کی کوشش کی؟'' افضال نور نے کہا اور چائے کی چسکی لی۔

''تو اب تک کیا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ بلال پہلے والا کھلنڈرا سا لڑکا بن جائے۔ جسے دین و دنیا کی کوئی پروانہ ہو۔ اب اللہ پاک نے اسے ہدایت دی ہے۔ وہ پانچ وقت کا نمازی ہو گیا ہے۔ تہجد گزار بن گیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اب وہ رشوت یا کرپشن کے کسی معاملے میں آئے گا۔ سیدھی تنخواہ پر گزارہ کرے گا یا پھر یہ نوکری چھوڑ دے گا۔ وہ اپنی زندگی کو سادہ سے سادہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں ہی نہیں، سبھی اسے اچھی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں سوائے ماہا کے''۔ زبیدہ خاتون نے حیرت ملے لہجے میں کہا۔

''اور شاید ماہا مذہبی نہیں بننا چاہتی......؟'' افضال نے پوچھا۔

''ظاہر ہے......! اب بلال نے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں رکھی۔ وہ اس پر بھی اپنی آزادی چھن جانے کی بات کرے تو یہ رویہ درست نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس کی یہی ضد ہے، معاملہ کچھ اور ہو سکتا ہے''۔ زبیدہ خاتون نے بہت سوچ کر اپنی رائے دی۔

''اور کیا ہو سکتا ہے۔ بھائی اور بھابھی ایسا نہیں چاہتے۔ وہ تو خود بلال کی تبدیلی پر خوش ہیں۔ ان کی جانب سے تو ایسا نہیں ہو سکتا، پھر کیا بات ہے؟'' افضال نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''اب یہ ماہا جانتی ہے یا اللہ جانتا ہے...... میں کیسے بتا سکتی ہوں''۔ زبیدہ خاتون نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر معلوم کرو، وہ کیا بات ہے، بلال کے لئے لڑکیاں بہت، ماہا سے کہیں زیادہ اچھی لڑکیاں مل جائیں گی؟'' افضال نے ایک دم سے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''یہی تو مصیبت ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ابا جی، احسان بھائی، ذکیہ...... کیا ہم ان کا خیال نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں ابا جی نے اسے حویلی تک محدود کر کے اچھا نہیں کیا۔ پتہ تو چلے وہ کرنا کیا چاہتی ہے پھر ہمیں بات کرنے میں آسانی ہوگی۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم ان دنوں میں کوئی ایسا معاملہ نہیں چھیڑیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابھی ہماری بیٹی موجود ہے۔ جب تک اس کو نہ بیاہ لیں۔ اس وقت تک ہمیں صبر کرنا ہوگا''۔ زبیدہ خاتون سمجھانے والے انداز میں کہتی چلی گئی۔

''ہاں......! تب تک تو صبر کرنا ہوگا......لیکن مجھے تو نجمہ کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ سارا معاملہ طے ہو جانے کے بعد بھی اس نے منگنی نہیں کی۔ کون سی بات ایسی تھی جس کی وجہ سے وہ رک گئی''۔ افضال نے حیرت ملے لہجے میں کہا۔

''مجھے خود سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ممکن ہے فہد کی رائے نہ ہو''۔ زبیدہ خاتون نے احتیاط سے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' افضال نے پوچھا۔

''نہیں......! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کیونکہ شادی پر وہ بہت خاموش خاموش سا تھا۔ ممکن ہے نجمہ یا الطاف بھائی اس کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ کر رہے ہوں'' وہ بولی۔

''خیر......! جو بھی ہو، رقیہ کے لئے کون سی سا رشتوں کی کمی ہے۔ آج میں تم سے یہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ آج چوہدری سرفراز مجھے ملے تھے۔ بہت ساری باتوں کے علاوہ وہی پرانی خواہش پھر دہرائی ہے کہ وہ رقیہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں اور میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا''۔ افضال نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''افضال......! یقین جانیں مجھے نہ صرف وہ خاندان بہت پسند ہے بلکہ لڑکا بھی ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ زمین جائیداد تو ہے ہی لیکن اس لڑکے نے اپنے بل بوتے پر، اپنی محنت سے کتنا بڑا کاروبار پھیلایا ہوا ہے۔ وہ چاہیں تو کسی کاروباری گھرانے میں اپنا بیٹا بیاہ سکتے ہیں''۔ زبیدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''یہی تو ان کی بات اچھی ہے، ان کے ہاں شرافت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ ہم دونوں کے خاندان ایک دوسرے کے دیکھے بھالے ہیں۔ میں بھی ایسے لوگوں کو ترجیح دوں گا لیکن......'' افضال کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''لیکن یہ نجمہ بات کو کسی ٹھکانے نہیں لگا رہی ہے۔ اب ایسے رشتے آ رہے ہیں، کل یہ بھی نہیں آئیں گے......'' وہ تشویش سے بولی۔

''بیٹی کا فرض جس قدر جلد ادا ہو جائے، وہی اچھا ہے۔ اب دیکھو اگر ہم چوہدری سرفراز کے ساتھ تعلق جوڑ لیتے ہیں تو اس فرض کی ادائیگی میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ زندگی کا کیا اعتبار''۔ افضال نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر نجمہ سے پوچھ لیا جائے یا پھر ہم اپنی مرضی کریں......اس نے کون سی حتمی بات کی ہے......'' زبیدہ نے کہا۔

''اگر اس نے ابا جی کے توسط سے بات نہ کی ہوتی، احسان بھائی نے بھی یہ بات کی

ہے تو میں نجمہ کے اس رویے کو بالکل اہمیت نہ دیتا۔ اپنی مرضی کرتا، لیکن اب کم از کم ابا جی کا تو خیال کرنا ہوگا''۔ افضال نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ بات کریں بھی ابا جی سے۔ انہیں بتائیں کہ چوہدری سرفراز کیا چاہتا ہے۔ وہ خود ہی نجمہ سے بات کر لیں گے۔ اگر اب بھی انہوں نے کوئی حتمی بات نہ کی تو پھر ہم نے تو اپنی بیٹی کا فرض ادا کرنا ہے، اس کے انتظار میں تو نہیں بیٹھے رہیں گے''۔ زبیدہ خاتون نے صلاح دی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو بیگم......! مجھے ابا جی سے ہی بات کرنا چاہیے''۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا، ''چوہدری سرفراز کا خاندان پورے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سے اچھا رشتہ میرے خیال میں کوئی اور نہیں ہو سکتا''۔ افضال نے پرسوچ لہجے میں کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ زبیدہ خاتون نے اس کے ہاتھ سے خالی کپ لیا اور ایک جانب رکھ دیا اور بولی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں''۔

''میں صبح ہی ابا جی سے بات کرتا ہوں۔ میرے خیال میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ رقیہ کو رخصت کرنے کے بعد پھر ماہا کے بارے میں سوچیں گے''۔ افضال نے حتمی انداز میں یوں کہا جیسے اس کے ذہن سے بہت سارا بوجھ اتر گیا ہو۔

اس شام مجھے لاہور آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ آفس میں اور میرے اردگرد لوگوں نے بھی میرے اندر تبدیلی کو بڑی حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سب کا ردعمل ایک جیسا نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر کہ کس نے کس طرح کے ردعمل کا اظہار کیا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں کیسے معاشرے میں جی رہا ہوں۔ کیا اس ماحول میں دینی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے سے انسان کسی دوسری دنیا کی مخلوق بن جاتا ہے۔ کیا وہ اس ماحول اور معاشرے کا نہیں رہتا؟ اسے بہت مشکل پیش آتی ہے۔ میرے ذہن میں وہ خیال بھی آتے چلے گئے جن پر میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا اور دوسرا مجھے یہ احساس بہرحال ضرور ہو گیا تھا کہ آگے کی راہیں بہت مشکل ہیں۔ ایسی کانچ راہیں جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی پوری قوت سے آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن رستے اور پاؤں کے زخمی ہو جانے کے باعث رک جاتا ہے۔ لاہور آتے ہوئے جب میں نور پور میں میاں صاحب سے ملا تھا تو انہوں نے استقامت اور حوصلے کی بات ہی کی تھی۔ تب مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر کیوں

بات کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا، سہ پہر ڈھل کر شام میں بدل ہی تھی۔ ماحول میں اداسی بھر گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی اجنبی شہر میں تنہائی سے بھری شام کے ساتھ بالکل اکیلا ہو جاتا ہے۔ ذیشان نے شام کے بعد کہیں آنا تھا اور فہد نے آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اسے کوئی مصروفیت تھی۔ میں آج سارا دفتر میں گزارنے کے بعد مزید دفتر کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں اٹھا اور اپنے کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔

حسب معمول پی اون اس وقت دستیاب نہیں تھی۔ نجانے وہ کہاں کھو گئی تھی۔ میں نے میل بکس کھولا تا کہ آتی ہوئی ای میلز کو ایک نگاہ دیکھ لوں۔ تب مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان میں سے ایک میل پی اون کی تھی۔ میں نے اسے کھولا واں ایک تھائی نظم کا انگریزی ترجمہ تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ اس کے ملک کے ایک شاعر کی نظم ہے جو اسے بہت پسند آئی لہٰذا مجھ سے شیئر کر رہی ہے۔ وہ نظم کچھ یوں تھی۔

ایک شاعر کا عہد
(انگ کھارن کالا یانا پھونگ)

بھلا آسمانوں اور سمندروں کی سوداگری کون کر سکتا ہے
ہماری دنیا بھی ایک عجیب تخلیق ہے
آخر کار یہ جسم کے اعضاء رکھ دیئے جائیں گے
زمین اور آسمان کے درمیان
ہم بادلوں کے یا ہوا کے مالک تو نہیں ہیں
یا آسمانوں کے یا اس میں موجود کسی ایک عنصر کے بھی
سورج اور چاند، انسان کی تخلیق نہیں ہیں
نہ ایک ذرہ ہی ریت کے ذروں میں سے
انسان دھوکہ دیتا ہے، قتل کرتا کہ سلطنتوں پر قابض ہو جائے
حرص میں پوری طرح لتھڑ کر یہ سانس لیتی لاش
نیکی پر ٹھوکر مارتی ہے اور اپنی قبر بھول جاتی ہے

....

اس دنیا کے عناصر اور اجزائے ترکیبی
آسمانی خزانوں کے برابر قیمتی ہیں
مٹی، پانی اور آسمان کے ہمیشہ مزے لو

اور دنیا کو جنت سے زیادہ دلکش بنا دو
کھیت، جنگل اور ناقابل عبور صحرا
وہ بلند پہاڑ جو بادلوں سے مقابلہ کرتے ہیں
لنگور بھینسے، شیر اور ہاتھی
چیونٹیاں اور تمام حشرات الارض
انسان کے محبوب دوستوں کی مانند ہیں
وہ ساتھی کہ جو انسانی پیدائش کے دائرے کی تکمیل میں مددگار ہیں
بے بہا وجود ہیں وقت کے دائمی میدان میں
ایسے جگمگاتے خزانے جن کی قیمت کا تعین ہو نہیں سکتا
اور چاند تاروں کو ان کے قوسی راستوں پر چلنے دو
لیکن میرا دل تو اس دنیا کا متوالا ہے
اور اس زمین کے ساتھ موت اور زندگی کے تعلق سے وابستہ ہے
میں تو نروان کو بھی ٹھکرا دوں
اور آواگون کی سختیاں برداشت کر سکتا ہوں
صرف اس لئے کہ زمین کے عجائبات کی ترجمانی کر سکوں
یہاں تک کہ امن ایک سنہرے دور کی مانند چمک جائے
اور پھر میری خاک اس زمین سے مل کر یک جان ہو جائے
اور میں کسی پتھر کے بُت کی مانند نگران رہوں
اگر انسانی سماعت پر موسیقی بے اثر ہو جائے
تب کون سا خزانہ اس نقصان کی تلافی کر پائے گا
بلکہ مٹی اور زمین کو بھی اس بدبخت جسم سے نفرت آئے گی
اگر شاعری اس دنیا سے معدوم ہو جائے
تو پھر میں انسانیت سے مایوس ہو جاؤں گا
تب میں اپنے خیال کی الگ سلطنت بسا کر
اس کو خوبصورت شاعری کے جواہرات سے سجا کر۔
آسمانی دنیا کو میں مسحور کر لوں گا
شاعری کی بے بہا دولت سے

اور من کے وسیلے سے میرا روحانی جوہر
وقت کی بے پایانی کو پیچھے چھوڑ دے گا

میں کافی دیر تک اس نظم کو پڑھتا رہا۔ اس میں درج خیالات اپنی جگہ جیسے بھی تھے لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ پی اون نے آخر یہ نظم ہی مجھے کیوں بھیجی ہے۔ وہ اس نظم کے ذریعے مجھے کیا پیغام دینا چاہتی تھی۔ جب مجھے کوئی سمجھ نہ آئی تو میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ بھی اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ شاید قربت کا احساس، کشش زائل کر دیتا ہے۔ کافی دیر تک یونہی بیٹھے رہنے کے بعد میں نے وقت دیکھا۔ مغرب ہو جانے میں ابھی تھوڑا وقت تھا، میں نے پی اون کو فون کر دیا۔ کچھ لمحے بیل جاتی رہی پھر اس کی شوخ آواز سنائی دی۔

”کیسے ہو بلال......!“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کہاں غائب ہوگئی ہو“۔

”ہاں تم سچ کہتے ہو، پی اون غائب ہی ہوگئی ہے۔ اس پر میں خود حیران ہوں۔ ویسے تم بھی تو اب اتنی باقاعدگی سے نیٹ استعمال نہیں کرتے ہو۔ یہ شادی کا اثر ہے نا؟“

”تم کہہ سکتی ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ کیا کر رہی ہو؟“

”یہ لمبی کہانی ہے......“ اس نے کہا۔

”میں اس وقت لاگ آن ہو۔ آجاؤ کمپیوٹر پر......“ میں نے کہا۔

”تھوڑی دیر کے بعد......“ اس نے کہا اور پھر میں نے الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے کمپیوٹر بھی بند کیا اور اٹھ کر مسجد کی جانب چل دیا۔

مغرب کے بعد میں نے کمپیوٹر آن کیا تو پی اون آن لائن تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پیغام بھیجتا، اس کی جانب سے پیغام آ گیا۔

”میں بہت مصروف ہوگئی ہوں۔ اس لئے مجھے وقت نہیں ملتا اور پھر مجھے تمہارا ابھی خیال رہتا ہے۔ ان دنوں تم اپنی بیوی کے ساتھ مصروف ہوگے......“

”تم اپنی بات کرو، میرے لئے تو وقت کے حساب سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں یہاں لاہور میں اکیلا ہی ہوں۔ میری بیوی، میرے آبائی گاؤں ہی میں ہے......“

”میں کیسے مان لوں کیونکہ تم نے کبھی ای میل مجھے نہیں بھیجی۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے نا کہ تم مصروف ہو“۔

”خیر......! بتاؤ کیا ہو رہا ہے آج کل......“

”میں ایک زبان دانی کے ادارہ میں پڑھا رہی ہوں...... اس میں شفٹ ہوتی ہے۔

میں دوشفٹوں میں پڑھا رہی ہوں۔ مجھے محکمہ سیاحت کی طرف سے نوکری کی آفر ہوئی تھی۔ میں کرنا بھی چاہتی تھی لیکن اب ارادہ بدل دیا ہے“

”وہ کیوں؟ تم تو بہت زیادہ پیسہ کمانا چاہ رہی تھی“۔

”وہ تو اب بھی چاہتی ہوں لیکن پہلے میں مزید اعلیٰ تعلیم چاہوں گی۔ اس کے لئے کسی دوسرے ملک کی یونیورسٹی میں جاؤں گی۔ ظاہر ہے سرمایہ کاری تو کرنا پڑتی ہے......“

”تم ٹھیک کہتی ہو پی اون...... تعلیم میں خرچ کرنا بھی ایک طرح سے سرمایہ کاری ہے۔ اس سے مادی اور روحانی دونوں طرح کا فائدہ لیا جاسکتا ہے۔ خیر......! کس ملک جانے کا ارادہ ہے؟“

”کسی بھی ملک میں جہاں مجھے زیادہ مواقع ملے......“

”پی اون......! اسے کسی بھی دوسرے پہلو کی صورت میں نہ دیکھنا، میں تمہیں آفر کرتا ہوں کہ اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور کہنا“۔

”بالکل......! اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں ضرور کہوں گی۔ وہ اس لئے کہ میں سمجھتی ہوں، یہاں پتایا میں اور پوری دنیا میں سے تم میرے سب سے اچھے دوست ہو“۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ تم مجھے اچھا دوست تصور کرتی ہو“۔

”اس کی کئی ساری وجوہات ہیں، کبھی ملاقات ہوئی تو ضرور بتاؤں گی۔ اگر قسمت میں ملاقات ہوئی تو......“

”اتنی حسرت سے کیوں کہہ رہی ہو۔ اگر تم چاہو تو صبح ہی ارادہ کر لو۔ تمام خرچ میں دے دیتا ہوں......“

”نہیں...... ایسی بھی کوئی بات نہیں...... میں اب بھی اتنا کما لیتی ہوں کہ ٹکٹ لے سکوں۔ لیکن ابھی وقت نہیں......“

”جیسے تمہاری مرضی......“

”ہاں......! اگر تمہیں وقت ملے تو آجاؤ، بلکہ اپنی بیوی کو بھی لے آؤ“۔

”ہاں......! وقت ملا تو ضرور آؤں گا“۔

”یہ بات یونہی مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہو یا واقعی ہی ایسا کوئی ارادہ ہے؟“

”اگر تم کہو کہ چند دنوں یا چند ہفتوں میں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہاں مگر چند مہینوں بعد اگر کوئی پروگرام بن گیا تو......“

”اوکے......! تم جب بھی آؤ، میں تمہیں خوش آمدید کہوں گی“۔

"کیا تم نہیں آسکتی ہو؟"

"ممکن ہے آجاؤں، لیکن میں نے کہا ہے نا کہ ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ فی الحال تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی"۔

اس پیغام کے ساتھ ہی اس نے الوداعی انداز میں پیغامات بھیجے اور پھر لاگ آف ہوگئی۔ بہت مختصر بات کی تھی اس نے۔ میں نے محسوس یہی کیا کہ جیسے وہ لمبی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ ہمیشہ اس نے خواہ مخواہ بات کو طول دیا تھا۔ آپس میں کسی بات پر گفتگو شروع ہوتی تو پھر عالمی تناظر میں بحث پر جا کر ختم ہوتی لیکن اب وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا جیسے بھاگتے ہوئے بات کر رہی ہو۔ نہ کوئی طویل گفتگو اور نہ کوئی بحث۔ مجھے یہی احساس ہونے لگا کہ اب تعلقات میں وہ بات نہیں رہی۔ ممکن ہے میں اس کے معیار پر پورا نہ اترا ہوں اور اب وہ تعلق سے یا پھر مروت میں کبھی کبھار بات کر لیتی ہے۔ میں نے کمپیوٹر بند کر دیا۔ ان لمحات میں مجھ پر اداسی پھر سے چھانے لگی۔ یہ نہایت مختصر سے لمحات تھے کیونکہ انہی لمحات کے بعد میرے ذہن میں ایک خیال یوں آیا جیسے کوئی مجھ سے گفتگو کر رہا ہو کہ فانی چیزوں سے تعلق بھی تو فانی ہوتا ہے۔ اس میں پائیداری کہاں، ہاں...... جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، اس سے تعلق بھی لافانیت والا ہوتا ہے، اس سے تعلق جڑ جانے کے بعد پھر نہ اداسی رہتی ہے اور یاسیت، زندگی سے سارے منفی رجحان، منفی ہو جاتے ہیں۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اللہ اپنے بندوں کو راستہ ضرور دکھاتا ہے۔

❁......❁......❁

ماہا حویلی کی یکسانیت سے اکتا گئی تھی۔ شاید اسے یکسانیت محسوس نہ ہوتی اگر وہ سب کے ساتھ گھل مل کر رہتی مگر اس نے خود کو بہت محدود کر لیا تھا۔ وہ ناشتہ سب کے ساتھ کرتی مگر پھر سارا دن وہ حویلی کے اس حصے میں رہتی جو اس کے لئے مختص کر دیا گیا ہوا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت فون پر باتیں کرتے گزر جاتا۔ رسالے، کتابیں، ٹی وی میں اس نے اپنی بوریت دور کرنا چاہی، تھوڑی بہت ملازماؤں سے بات کر لیتی اور بس۔ اس نے حویلی میں اپنے لئے تنہائی خود پیدا کر لی تھی جو پہلے پہل تو بے حد پرسکون تھی لیکن دھیرے دھیرے یہی سکون، ایک طویل سناٹے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ تنہائی کا احساس دن بدن بڑھنے لگا تو وہ بہت حد تک گھبرانے لگی۔ پہلے تو وہ جب چاہا نور پور چلی جاتی مگر داداجی کے کہنے پر اس نے خود کو حویلی تک محدود کر لیا تھا۔ اسے اپنا یہ فیصلہ احمقانہ لگا، کب تک ایسا چلے گا۔ اس نے اپنی آزادی خود سلب کر لی ہے، وہ جو حقوق نسواں کی علمبردار بننے جا رہی تھی۔ اپنے حقوق خود ہی اس نے

غضب کر لئے تھے۔ شاید وہ حویلی والوں کے ساتھ گھل مل جاتی، رقیہ کے ساتھ دوستی بڑھا لیتی، زبیدہ خاتون کے ساتھ وقت گزارتی اس کا دھیان بٹ جاتا، سوچوں کی یلغار میں وہ گھبراتی نہ مگر اس کا رابطہ فون کے ذریعے ایک تو نجمہ پھوپھو سے رہتا، دن میں ایک آدھ بار وہ انہیں ضرور فون کر لیتی، دوسرا اس کی این جی اوز کی ساتھی لڑکیوں اور خواتین سے رابطہ رہتا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس میں حویلی سے باہر کی دنیا بہت زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر ردعمل بڑھتا چلا گیا۔ این جی او والی تو اس کی ضرورت محسوس کرتی تھیں اور کب تک یونہی بہانے بناتی رہتی۔ نجمہ پھوپھو اسے یہ باور کراتی رہتی تھیں کہ جب تک وہ کچھ نہیں کرے گی، دوسرے اسے دباتے چلے جائیں گے۔ اسے ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ ماہا تیار بھی ہو جاتی کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں لیکن پھر خود ہی میں سمٹ کر رہ جاتی۔ اسے خود سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اپنے ہی خیالات میں بہت دور تک نکل جایا کرتی، جہاں خوش کن آزاد فضائیں اس کے اردگرد ہوتیں۔ بس ایک کسک سی دل میں رہتی کہ اس میں کہیں بلال نہیں ہے۔ بلال کے کھو جانے کا احساس اس قدر جان لیوا ہوتا کہ ساری سوچیں ایک چھناکے سے بکھر جاتیں۔

اس صبح اسے نجمہ پھوپھو کا فون ملا کہ وہ نور پور آچکی ہیں۔ اس لئے تم بھی آجاؤ تاکہ تم سے بہت ضروری باتیں کی جا سکیں۔ ماہا کے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ اتنے دنوں بعد وہ نور پور جا رہی ہے۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر اہم ترین بات کرنا بھی ہے تو وہ یہاں گلاب نگر نہیں آئے گی، یہاں بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ خود جانا چاہ رہی تھی، اس لئے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی جہاں زبیدہ خاتون موجود تھی۔ ماہا نے اس سے اجازت نہیں لی بلکہ اسے بتایا کہ وہ نور پور جا رہی ہے اور خود ہی گاڑی سے نکل گئی۔

وہ نجمہ پھوپھو سے بہت ہی محبت کے ساتھ ملی۔ اتنے دنوں بعد آنے پر ذکیہ بیگم بھی خوش تھی۔ وہ تینوں کافی دیر تک یونہی گپ شپ لگاتی رہیں۔ پھر ماہا اپنے آفس کی جانب چلی گئی۔ وہاں وہ کافی دیر تک مصروف رہی تو نجمہ پھوپھو وہیں چلی گئیں۔

"میں دیکھوں تو سہی تمہارا آفس کیسا ہے؟" وہ ماہا کے آفس میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو پھر کیسا لگا آپ کو"۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ماشاءاللہ تم بہت اچھی لگتی ہو"۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئی، پھر گہری سنجیدگی سے بولی"۔ میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے دو بہت ہی اہم

نوعیت کی باتیں کرسکوں''۔

''وہ کون سی پھوپھو''۔اس نے تجسس اور خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''ایک تو یہ ہے الطاف کو جب پتہ چلا کہ تم نے این جی او بنائی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے ہیں اور......''

''واقعی پھوپھو......!''اس نے مزید حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اور کیا، وہ تو، اس پر انہوں نے کہا کہ وہ تمہاری بہت ساری مدد کرسکتے ہیں۔ نہ صرف ہماری حکومت بلکہ دوسرے ملکوں کے بہت سارے ادارے بھی مالی لحاظ سے تعاون کرتے ہیں اور یہ فنڈ بہت بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔تم اگر ان سے مل لو تو وہ بہت ساری باتیں بتا رہے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے ماہا۔ مجھے ان باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔تم اگر دلچسپی رکھتی ہو تو ضرور ان سے ملو''۔

''اوہ۔! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔اگر ہمارے اپنے سرمایے کے ساتھ ایسا تعاون مل جائے تو ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔اس علاقے میں بہت سارے پراجیکٹ چلا سکتے ہیں''۔ ماہا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بھئی وہ تم جانو اور تمہارا کام،تم لاہور آؤ اور ان سے ملو، وہ بہت......''

''لیکن پھوپھو......! شاید ایسا نہ ہوسکے''۔اس نے ایک دم سے گہری مایوسی میں بولی۔

''کیا مطلب......!''نجمہ پھوپھو نے حیرت سے کہا۔

''حویلی والے......! وہ نہیں چاہتے کہ میں ایسا سب کچھ کروں، انہیں اپنی عزت......'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگ گیا۔تب نجمہ نے جذباتی انداز میں کہا۔

''بات یہ نہیں جو وہ کر رہے ہیں بلکہ وہ کسی لڑکی کو آگے بڑھتا نہیں دیکھنا چاہتے۔ باپ تو وہ میرے بھی ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نے وہاں زندگی کیسے گھٹ گھٹ کے گزاری ہے۔اگر آپ اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔آگے بڑھنے کا شعور دیتے ہیں تو پھر ان پر اس طرح کی قدغن لگا دینا میری سمجھ سے باہر ہے۔اگر تم خدمت خلق کے ذریعے عوام میں ان سے زیادہ عزت پا لو تو کیا جاتا ہے۔تم ان میں سے کسی کا حق تو نہیں مار رہی ہو۔اب زبیدہ خاتون جیسی عورت کیسے چاہے گی کہ پورا علاقہ اس کی پڑھی لکھی بہو کی زیادہ عزت کرے۔تم تو ابھی بچہ ہو، تمہیں ابھی کیا سمجھ''۔

''پھوپھو......! بہو بنتے ہی ان کا رویہ تبدیل ہوگیا ہے......'' ماہا نے کہا۔

''اس رشتے میں بنیادی طور پر ہی غلط فیصلہ ہوا۔ یہ رشتہ انہوں نے محبت میں نہیں

لیا۔ان کی ضد تھی کہ تم نے انکار کیا ہے تو اب بیاہ لیں گے۔اس پر انہوں نے ابا جی کو پوری طرح استعمال کیا۔ وہ ان کی باتوں میں آگئے۔ خیر جو بھی ہوا۔اب وہ تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزارنے دیں گے''۔ نجمہ پھوپھو نے شدت جذبات سے کہا۔

''میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔اب دیکھیں بلال مجھے حکم دے سکتا تھا کہ میرے ساتھ لاہور چلو، مگر اس نے تو بس یونہی رسم پوری کی۔ میں نے انکار کر دیا تو وہ چلا گیا''۔ ماہا نے کسی خیال کے تحت بہت مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''یہی تو......!تم پاگل ہو کہ اس کی محبت میں مری جا رہی تھی۔اس کا پیار وغیرہ تو ختم ہو چکا۔اس حقیقت سے تم بھی واقف ہو''۔ نجمہ نے صاف انداز میں کہا۔

''ہاں یہ تو ہے پھوپھو، اب وہ پہلے والی بات ہی نہیں رہی''۔ ماہا نے تصدیق کر دی۔

''تو پھر یونہی حویلی میں پڑی رہو گی۔شاید تم میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اب تم کچھ بھی نہیں سوچ پاؤ گی''۔وہ قدرے ناصحانہ انداز میں بولی۔

''تو پھوپھو، میں کیا کروں، اب میرے لئے رستہ بھی تو نہیں ہے''۔ ماہا نے پھر مایوسی سے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم......!میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن جب تک تم کچھ نہیں کرو گی، میں بھی کیا کرسکتی ہوں'' نجمہ بولی۔

''وہ ہی تو......!اب کیا ہوسکتا ہے؟'' ماہا نے اصرار کرنے والے انداز میں کہا۔

''دیکھو......! میں نے جو دوسری بات تم سے کرنا تھی نا، میں وہی کہہ رہی ہوں۔اگر تم اپنی زندگی اپنے انداز میں جینا چاہتی ہو اور حویلی کی گھٹن سے نکلنا چاہتی ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں''۔ نجمہ نے بہت احتیاط سے کہا۔

''وہ کیسے پھوپھو......!وہ سنجیدگی سے بولی''

''تم بلال کو چھوڑ دو''۔ نجمہ نے ایک دم سے دھماکہ کر دیا۔ ماہا کتنی دیر تک خاموشی سے اس کا منہ تکتی رہی تو نجمہ نے کہا ''اور میں تمہیں اپنی بہو بنا لوں گی، تم چاہے یہاں رہو، لاہور میں رہو، جو چاہے کرو، تم نہد کو اچھی طرح جانتی ہو۔اس کا مزاج بھی سمجھتی ہو۔ سچ پوچھو تو وہ تمہیں پسند بھی بہت کرتا ہے''۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' ماہا نے حیرت سے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور یہی وقت ہے تم سے بات کرنے کا، پھر شاید یہ موقع نہ آئے''۔ نجمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں...... ایسا کیا ہو گیا ہے......" ماہا ابھی تک اس بات کے سحر سے نہیں نکلی تھی۔

"وہ یہ میری بیٹی کہ اباجی نے مجھے بلایا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ رقیہ کے بارے میں بات کریں گے اور وہ چاہیں گے کہ میں ہاں یا ناں میں انہیں جواب دوں۔ اس بار مجھے کوئی نہ کوئی حتمی جواب دینا ہوگا۔ اگر تم اپنا عندیہ دو تو میں صاف انکار کر کے چلی جاؤں گی"۔ نجمہ نے تیز انداز میں بتایا۔

"وہ جو آپ نے...... وہ سب......" ماہا ابھی تک حیرت میں تھی۔

"بیٹی، شاید تم نہیں جانتی ہو کہ تم سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی بنانا چاہا لیکن بس ایسا نہ ہو سکا۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ فہد تو میرا ایک ہی بیٹا ہے نا، اب اگر میں تمہیں ایک پر آسائش اور محبت بھری زندگی دے سکتی ہوں تو میں کیوں نہ کوشش کروں۔ میرے لئے رقیہ وہ اہمیت نہیں رکھتی جو تمہاری ہے۔ شادی کی پہلی صبح ہی میں سمجھ گئی تھی کہ میں ہی ماہا کی زندگی خوشگوار بنا سکتی ہوں۔ اس لئے میں نے تب منگنی نہیں کی اور اب وقت آ گیا ہے۔ میں نے یہاں تمہیں اسی لئے بلایا ہے کہ یہ بات تم سے کر سکوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ایک جانب حویلی کی زندگی جہاں تم اپنا آپ کھو دو گی اور دوسری جانب ایک خوشگوار ترین زندگی......" نجمہ پھوپھو نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا تو ماہا سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اچانک فیصلہ کرنا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے تذبذب میں بولی۔

"پھوپھو......؟ یہ سب کیسے"

"وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر ڈر کس بات کا۔ وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بات فقط تمہارے فیصلے کی ہے"۔ یہ کہہ کر نجمہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئی پھر کہتی چلی گئی۔ "اب دیکھو......! وہ اپنی بیٹی کو فقط فہد کے ساتھ بیاہنے پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں۔ انہیں تمہاری شادی پر ہمارے رویے کے باعث سمجھ جانا چاہیے تھا۔ ایسا اس لئے ہے کہ انہیں فہد سے بڑھ کر اچھا رشتہ کہاں سے ملے گا۔ اب دیکھو، یہ کیسی منافقت ہے خود کی بیٹی اس بندے کو دے رہے ہیں جو ایک روشن خیال بندہ ہے۔ اسے تو وہ ساری آزادی ملے لیکن تم وہی حویلی کی ہو کر رہ جاؤ"۔

"دادا جی بھی......؟" ماہا منمنائی۔

"نہیں......! وہ تو بے چارے وہی کریں گے جو وہ لوگ کہیں گے۔ بھائی میرا؟ لیکن جب کوئی غلط بات کرے گا تو کم از کم میں تو اس کا ساتھ نہیں دوں گی۔ اب تم اپنی طرف دیکھو، چند ہفتے یا دو مہینے ہی ہوئے ہیں نا تمہاری شادی کو اور تمہارے ساتھ رویہ کیا ہے؟

فہد......! تم مجھے سوچ کر بتا دو تمہارا کیا فیصلہ ہے۔ تمہارے انکار پر مجھے رقیہ کے لئے ہاں کرنا پڑے گی اور تمہاری ہاں، تمہاری زندگی خوشگوار بنا دے گی۔ نجمہ نے بہت احتیاط سے معاملہ ماہا پر ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے پھوپھو......! میں آپ کی سوچ کر بتا دوں گی"۔ ماہا نے بالآخر کہا۔

"لیکن اباجی کے ساتھ بات کرنے سے پہلے، تاکہ میں تمہارے بارے میں بھی ان سے لڑ سکوں"۔ نجمہ نے کہا۔

"ٹھیک، میں کل تک آپ کو بتا دوں گی"۔ ماہا نے ایک عزم سے کہا تو نجمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ بہت حد تک کامیاب رہی ہے جبکہ ماہا سوچوں میں کھو گئی تھی۔

❁......❁......❁

اس دوپہر میں اپنے دفتر ہی میں تھا۔ میری توقع کے عین مطابق مجھے کوئی کام نہیں دیا جا رہا تھا۔ کیونکہ اب میں نے ہر غلط کام پر اعتراض لگانا شروع کر دیا تھا۔ میرے آفیسرز نے مجھے سمجھایا بھی اس سسٹم میں کوئی بہتری یا تبدیلی نہیں آنے والی، سو میں اکیلا جتنی مرضی کوشش کرتا رہوں کچھ نہیں ہونے والا۔ مگر میرا انہیں یہی جواب تھا کہ میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنا ہے۔ میں اگر سسٹم پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو نہ سہی، میرا جسم تو میرا اپنا ہے۔ میں اس پر تو اثر انداز ہو سکتا ہوں جہاں تک میرا بس چلتا ہے میں درست کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس لئے چند ہفتوں کے بعد مجھے ایسی جگہ تعینات کر دیا گیا جہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اپنی طرف سے انہوں نے مجھے اس سسٹم سے نکالنے کی ابتدا کر دی تھی اور میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اصل میں یہ بات یقینی تھی کہ رشوت، سفارش اور کرپشن کے زور پر آگے آ جانے والے آفیسر بنیادی طور پر نا اہل ہوتے ہیں۔ ان کے دماغ اور اہلیت وہ لوگ ہوتے ہیں جو گریڈ میں تو ان سے کم ہوتے ہیں مگر اپنی قابلیت کو روپے میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہی ان کے دست و بازو بن کر استحصالی قوتوں کی مدد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ استحصالی قوت کون کون سی ہے۔ دراصل جاگیرداروں نے اس ملک کو بھی اپنی ذاتی جاگیر تصور کر لیا ہوا ہے۔ پہلے صرف وہ جاگیردار ہی تھے۔ لیکن وقت اور حالات کے ساتھ انہوں نے بھی خود کو بدلا، انہیں محسوس ہوا کہ ان کی بقا اس میں ہے کہ وہ بھی سرمایہ دار بن کر اس ملک کی دولت پر قابض ہو سکتے ہیں، یوں انڈسٹری ابھی تک وہیں ہے۔ وقت اور حالات کی ضرورت کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کا احساس کیا گیا۔ ان کی نگاہ اسٹیبلشمنٹ پر پڑی۔ یہی وہ جگہ ہے

جہاں سے سارے راستے نکلتے ہیں یا دریا کا پانی انہی پلوں کے نیچے سے ہو کر گزرتا ہے۔ دھیرے دھیرے جاگیرداروں کی اگلی نسل اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن کر قومی دولت کے ضیاع کا سبب بن رہی ہے۔ مثلاً تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جو جاگیرداری تسلط کو ختم کر سکتا ہے لیکن آزادی کے بعد سے اب تک اسی شعبے کو بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ مجھے بھی ایسا پراجیکٹ دے دیا گیا تھا جو محض وقت کا ضیاع تھا۔ اس دوپہر میں ایسی ہی فائل پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا نوکری کرنا ہی میرا مطمع نظر ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس سے زیادہ میں گلاب نگر میں کما سکتا ہوں۔ کیوں نا میں ایسا کروں جس سے عوام کو فائدہ ملے۔ یہ فائدہ مادی صورت میں نہ سہی، ایک شعور تو انہیں دیا جا سکتا ہے کہ اگر جاگیردار اس ملک کے وسائل پر قابض ہونے کے لئے ہر طرح کے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کر کے اپنی قوت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں تو عوام اپنے استحصال، حقوق اور عزت کے لئے جدوجہد کیوں نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی جاگیردار یہ کہتا ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔ یہ قطعاً اسلامی تعلیمات نہیں ہیں کہ وسائل پر قابض ہوا جائے۔ زمین تو اللہ کی ہے اور اس کے وسائل سے مخلوق خدا استفادہ کرتی ہے اور جو اس پر قابض ہو جاتا ہے وہ ظالم ہے۔ جاگیردار اسی لئے تعلیم کو عام کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے کہ شعور اس کے لئے موت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کوشش کرنی چاہیے جہاں تک میں کر سکتا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کو تلاش کرنا چاہیے جو میری طرح استحصال اور کرپشن کا حصہ نہیں ہیں۔ انہی لمحات میں میرا سیل فون بج اٹھا، میں نمبر دیکھ کر چونک گیا۔ وہ نمبر ہمسایہ ملک بھارت کا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ بلاشبہ یہ میرا انیٹ دوست ارون ورما ہوگا جو برطانیہ سے امرتسر آیا ہوگا۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری جانب بڑے بے تکلف انداز میں ہمت سنگھ بول رہا۔

''کیا حال ہے بھاء جی، ٹھیک ہو نا آپ...... ست سری اکال......'' وہ ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ گیا۔ اس کے لہجے میں سرمستی اور خوشی جھلک رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں ہمت سنگھ، تم سناؤ، بھارت کب آئے ہو''۔ میں نے پوچھا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں بھارت میں ہوں......'' اس نے حیرت سے کہا، پتہ نہیں، حیرت مصنوعی تھی یا حقیقی۔

''تمہارے فون نمبر سے......'' میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''ہم کل آ رہے ہیں پاکستان......'' اس نے جوش بھرے انداز میں کہا۔

''جی آیاں نوں...... خوش آمدید......'' میں نے کہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''کل شام کے وقت ہم واہگہ پر ہوں گے۔ آپ لاہور ہی میں ہو نا یا ادھر گاؤں میں......'' اس نے پوچھا۔

''میں لاہور میں ہوں، اور تم لوگوں کو واہگہ سے لے لوں گا۔ جند کور اور جیت سنگھ بھی نا ساتھ؟......'' میں نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، ہیں میرے ساتھ، انہیں بھلا میں کہاں چھوڑ کے آتا۔ لے بات کر جند کور سے......'' اس نے کہا اور چند لمحوں بعد جند کور کی آواز سنائی دی۔ اس کا لہجہ بھرپور تھا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ ''ویر جی......! بڑی باتیں کرنی ہیں۔ کل آ کر کریں گے۔ یہاں سے فون کرنے پر تو بڑے ہی پیسے لگتے ہیں''۔

''چل ٹھیک ہے، کل شام ملاقات ہوگی......'' میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ جانے وہ کہاں سے فون کر رہے تھے۔

میں نے اپنا سیل فون میز پر رکھا تو فطری طور پر میرا دھیان پتایا میں گزارے ہوئے دنوں کی جانب چلا گیا۔ پی اون کی رفاقت میں لمبی لمبی بحثیں، جند کور کے پکائے ہوئے کھانے اور ہمت سنگھ کی باتیں اور پھر سب سے بڑھ کر ان کا جذباتی پن جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میں کتنی دیر تک انہی خیالوں میں کھویا رہا، تب اچانک مجھے خیال آیا کہ ان سے تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ وہ کتنے دنوں کے لئے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے اگر وہ ایک دو دن کے لئے آئیں گے تو اپنے مقدس مقامات ہی دیکھ پائیں گے اور اگر زیادہ دن ہوئے تو پھر وہ حویلی بھی جائیں گے۔ لازمی بات ہے یہاں آتے ہوئے انہوں نے میری نئی نویلی دلہن کے بارے میں پوچھنا تھا اور میں انہیں کیا بتا پاؤں گا؟ کیا ماہا کو لاہور بلوا لوں......؟ کیا وہ میرے کہنے پر آ جائے گی؟ یہ سوچتے ہوئے میں تکلیف دہ بے بسی محسوس کرنے لگا کہ میں اپنی بیوی کو اتنا بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ میری بات مان بھی جائے گی یا نہیں؟ اچانک ہی بہت سارے خیالات نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ ان میں منفی جذبات زیادہ تھے۔ تب میں نے سوچا، اسے فون کر کے دیکھوں وہ کیا کہتی ہے۔ میں نے میز پر سے فون اٹھایا اور ماہا کے نمبر پش کر دیئے۔ چند لمحوں بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔ میں نے اسے ہمت سنگھ کے بارے میں بتایا اور کہا۔

''وہ اپنی بیوی اور بچے سمیت آ رہا ہے۔ میرے خیال میں تم یہاں آ جاؤ''۔

''میں کیوں آ جاؤں ان کے لئے، میں بس گلاب نگر میں ہوں۔ یہاں اگر وہ آتے ہیں تو ٹھیک ہے''۔ اس نے جذبات سے عاری لہجے میں انتہائی خودغرضی سے کہا۔

''دیکھو وہ لوگ چند دنوں کے لئے آئیں گے۔ انہیں ہمارے بارے میں اچھا تاثر

ملنا چاہیے''۔ میں نے اسے سمجھایا۔

''وہ تمہارے جاننے والے ہیں، تم جانو اور وہ مجھے اپنے بہت کام ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، میں نے این جی او کا کام دوبارہ شروع کر دیا ہے''۔

''ماہا جب میں کہہ رہا ہوں کہ تم آ جاؤ تو تمہیں آ جانا چاہیے......'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر تمہارا حکم ہے تو میں آ جاتی ہوں۔ ورنہ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ پھر لاپرواہی سے بولی تو میں نے محسوس کیا کہ اس طرح کے رویے سے تو اچھا ہے کہ وہ نہ ہی آئے۔ تب میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تمہارے پاس وقت نہیں ہے تو تم نہ آؤ، میں سب سنبھال لوں گا''۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے ماہا کے رویے پر بہت دکھ ہو رہا تھا۔ کیا وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں کہ ہم دونوں اب لائف پارٹنر ہیں۔ اس کا انداز تو ایسا تھا کہ جیسے وہ مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتی۔ یہی سوچتے ہوئے میں ایسے احساسات میں گھر گیا جس سے میرے جذبات اور میرا نفس مجھے ایسے خیالات سوچنے پر مجبور کرنے لگا کہ میرے اندر غصہ بڑھنے لگا۔ اک یہی خیال تقویت پکڑتا گیا کہ میرا نرم رویہ ہی اسے منہ زور اور بدتمیز کرتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا غصہ میرا دماغ گرم کر رہا ہے۔ میرے دماغ میں یہی سوال گونجنے لگا کہ اگر ماہا کو میرا احساس ہی نہیں ہے تو پھر مجھے بھی اس کا احساس نہیں کرنا چاہیے۔ شاید اس کے لئے نرم رویہ مضر ثابت ہو رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ اور سوچ رہی ہو، مجھے اس کے بارے میں ضرور معلوم کرنا چاہیے۔ یہی سوچتے ہوئے میرے اندر سے آواز آئی۔

''تمہارا خود سے کیا ہوا وعدہ کدھر گیا؟ تم تو اسے پیار سمجھ کر دھیرے دھیرے سمجھانا چاہتے تھے......وہ عزم کدھر گیا......؟''

تب مجھے احساس ہوا کہ میری اپنی کیفیت بدلتی جا رہی ہے۔ میں نے ذرا سا غور کیا تو مجھے لگا۔ یہ سب اس دُکھ کے باعث ہے جو میں ماہا کی وجہ سے محسوس کر رہا تھا۔ دنیا میں میری مرکز نگاہ تھی تو اس نے ہی اس طرح کا رویہ بنا لیا کہ اس کی طرف سے بے بسی، دکھ کے علاوہ اور یاسیت کے کچھ نہیں ملا۔ مجھے لگا کہ ایک میرے بدل جانے سے پوری دنیا ہی مجھ سے نگاہیں پھیر گئی ہے۔ میں غلط نہیں ہو سکتا، یہ مجھے پورا یقین تھا لیکن کیا اسے حقیقت دکھائی نہیں دیتی؟ تب دھیرے دھیرے میں اپنے اندر ابھرتے ہوئے غصے پر قابو پانا شروع کر دیا۔ اب ماہا کے لئے مجھے کچھ اور سوچنا تھا، وہ کیا تھا، یہ کم از کم ہمت سنگھ کے ٹور کے بعد ہی کوئی حتمی

فیصلہ مجھے کر لینا چاہیے تھا۔ میں نے ماہا کی طرف سے اپنا دھیان ہٹایا اور امی کو بتایا کہ ممکن ہے میرے مہمان گلاب نگر بھی آئیں۔ پھر میں سوچنے لگا کہ ان کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ماہا اس شام ذہنی طور پر بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کی کیفیت یوں تھی کہ جیسے اندھیرے میں چلتے چلتے اچانک بہت سارے منظر اس کے سامنے روشن ہو جائیں۔ سوچنے کے لئے بہت ساری باتیں اس کے دماغ میں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں جیسے پٹاری میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے کلبلاتے سانپ ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی اور کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ حویلی میں اتری ہوئی شام، خزاں رسیدہ پتے، سبزہ لان، خاموش اداس درخت اور دور حویلی کی پرانی باؤنڈری وال، جو بارشوں کے باعث کہیں کہیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے پورے ماحول میں تنہا تھی لیکن ذہنی طور پر بہت شور محسوس کر رہی تھی۔ بلاشبہ یہ شور پھوپھو نجمہ کے باعث پیدا ہوا تھا، اس نے ایک نئی دنیا اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ دونوں نور پور سے گلاب نگر آئیں تو پھوپھو نجمہ اس سے یہ عندیہ لے چکی تھی وہ بلال سے علیحدہ ہو جائے گی۔ اس وقت تو اس نے پھوپھو کو یہ عندیہ دے دیا تھا لیکن اس نے اپنے من سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ پانی میں کاغذ کی ناؤ ہے، کسی وقت بھی وہ ڈوب سکتی ہے۔ ہوا کے تھپیڑے اسے جس سمت چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ نجمہ پھوپھو نے جب دادا جی سے بات کرنی ہے تو وہ رقیہ کے معاملے میں صاف کہہ دے گی کہ وہ منگنی نہیں کرنا چاہتی، تو پھر کیا وہ فہد کی ہو جانے کے لئے حویلی سے چلی جائے گی؟ نہیں وہ تو یہیں رہے گی......نہیں اسے جانا ہو گا؟

''تم اپنے آپ کو الزام کیوں دے رہی ہو۔ اگر حویلی والوں نے تمہاری بات نہیں مانی ہے تو تم بھی اپنی بات منوانے کا حق رکھتی ہو۔ اس میں اتنا ڈسٹرب ہو جانے کی کیا بات ہے''۔ اس کے اندر سے آواز ابھری۔

''ٹھیک ہے، میں حق رکھتی ہوں لیکن کیا فہد مجھے قبول کر لے گا جس طرح میں زندگی چاہتی ہوں کیا وہ ویسی زندگی مجھے دے پائے گا؟''

''کیا تمہیں احساس نہیں ہے......تم اس سے ملی نہیں ہو، اس کے خیالات نہیں جانتی ہو۔ وہ بلال سے کہیں زیادہ زندگی کو سمجھتا ہے اور پھوپھو کہہ رہی تھی کہ وہ تمہیں پسند بھی کرتا ہے......''

''میں نے تو آج تک اسے ایک دوست کی حیثیت سے دیکھا ہے، میں نے تو کبھی

یہ نہیں سوچا کہ وہ میری زندگی کا ساتھی بھی بن سکتا ہے۔ میں نے اسے......''

''بلال سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اگر تمہاری کہیں نہ کہیں تو شادی ہونا ہی ہے۔ یا پھر ساری زندگی تم نے ایسے ہی رہنا ہے۔ نجمہ پھوپھو نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تمہیں سمجھایا ہے، بلال کے جھوٹ تم پر واضح کئے ہیں۔ وہ تمہیں زیادہ عزت اور مان دیں گے......''

''کیا میں بلال کو چھوڑ پاؤں گی......؟'' یہ خیال آتے ہی وہ پوری جان سے لرز گئی۔

''تو پھر اب تک یہ سب کچھ کیا تھا۔ خود کو اذیت دے رہی ہو یا بلال کو...... ٹھیک ہے تم بلال سے محبت کرتی رہی ہو اور اب بھی تمہارے دل میں اس کے لئے محبت ہوگی، مگر کس بلال کے لئے؟ جو بلال تم چاہتی ہو وہ اب تمہیں کبھی نہیں مل سکے گا۔ وہ کسی اور دنیا کا باسی ہو چکا ہے...... اب یہی دیکھ لو...... اس کے تعلقات کس حد تک پھیل رہے ہیں۔ اب کوئی سنگھ فیملی اس سے ملنے کے لئے آ رہی ہے۔ کیا وہ پہلے ایسا تھا...... یہ نیٹ ورک ہے...... یہ لوگ دنیا کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں، ان کی اصل زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے...... کچھ بعید نہیں کہ وہ چند ماہ بعد ہی کسی تاریک راہ میں مر جائے۔ تو پھر تم کیا کرو گی...... کیا ایک شہید کی بیوہ بن کر زندگی گزارو گی......''

''موت تو برحق ہے...... کسی وقت بھی آ سکتی ہے...... اور......''

''تو پھر اس نے تمہیں خود سے کیوں باندھا...... انکار کر دیتا...... اصل میں بلال کو تم سے وہ محبت ہی نہیں رہی، ورنہ وہ اپنی کوئی نہ کوئی توجیہہ تو بیان کرتا...... اگر تم غلط ہو، تمہیں روکتا ٹوکتا، یا پھر اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے تمہاری توجہ حاصل کرتا......''

''یہ میں بہت سوچ چکی ہوں...... میرا دماغ پک گیا ہے یہ سب سوچ کر...... یہ کوئی نئی بات نہیں......''

''نئی بات تو پھر فہد کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز ہے......''

''لیکن...... لیکن...... کیا بلال مجھے چھوڑ دے گا......؟''

''یہ تو تم چاہو گی نا......! تمہارے فیصلے پر اس کا ردعمل کیا ہوگا...... اگر وہ تمہیں آرام سے چھوڑ دیتا ہے تو پھر سمجھ لو کہ اس کے دل میں محبت نہیں ہے...... اور اگر کوشش کرتا ہے کہ تم اسی کی ہو کر رہو تو پھر اسے اپنے مطابق جینے کی شرط پر لے آؤ، وہ اگر ایسا نہیں کرتا تو محض تمہیں باندھ کر رکھنا چاہتا ہے...... پھر آزاد ہونا تمہارا حق ہے......''

''ہاں......! یہ میرا حق ہے...... لیکن پھر رہی خاندان...... ماما...... پاپا...... دادا جی...... یہ سب میرے فیصلے پر مجھے اچھا نہیں تصور کریں گے......''

''تو پھر اس حویلی کے در و دیوار میں سسکتی رہو...... یہی تمہاری قسمت ہے...... اور یہ قسمت تم نے خود اپنے لئے چنی ہے، اس میں پھر کسی کا دوش نہیں ہوگا......''

''میں بھی کتنی بدقسمت ہوں...... کس قدر تنہائی محسوس کر رہی ہوں...... میرا کوئی بھی اپنا نہیں جس سے میں اپنا دکھ شیئر کر سکوں۔ کوئی مشورہ ہی کر سکوں۔ کوئی میرا دکھ نہیں سمجھ سکتا......'' یہ سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی بھر گئی۔ اس کے سامنے کا منظر دھندلا ہو گیا۔ یوں جیسے سارا منظر ہی پانی میں ڈوب گیا ہو۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بے خیال سی کھڑی رہی، پھر آنکھیں صاف کرتی ہوئی وہ کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر آن بیٹھی اور اک نئے خیال پر سوچنے لگی۔ ''کہیں میں بذات خود تو اتنی سخت نہیں ہو گئی کہ ٹوٹ جانے کے قریب پہنچ گئی ہوں...... میں نے کبھی بلال کو سننے کی کوشش ہی نہیں کی، مجھے چاہیے تھا کہ میں اس کی سنتی...... ممکن ہے وہ ویسا نہ ہو جیسا میں سوچتی چلی جا رہی ہوں...... اب جو اس نے لاہور آنے کے لئے کہا ہے تو مجھے چلے جانا چاہیے تھا...... پتہ نہیں اس نے مجھے کس مان سے وہاں بلایا تھا۔''

''صرف اپنے مطلب کے لئے......! اپنی عزت رکھنے کی خاطر، ورنہ اسے میرا اتنا خیال ہوتا تو روزانہ فون کرتا، مجھے اس سے پہلے بلاتا...... میں مانتی ہوں کہ میں نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے ردعمل کے طور پر ایک کونے میں سمٹ گئی ہوں، حویلی میں کوئی تو ایسا ہوتا جو میرے ساتھ ہوتا...... میرے دلائل کو جھٹلایا جاتا......''

''میرے حقیقی والدین جب میری بات نہیں مان رہے ہیں تو نجمہ پھوپھو میرے لئے اتنا پریشان کیوں ہے......''

''تم خود ہی بتاؤ، کیا مطلب ہو سکتا ہے انہیں...... یہ تو تم خدا کی طرف سے نعمت تصور کرو کہ وہ ایک عورت ہونے کے ناطے تمہارا دکھ درد سمجھ رہی ہے، وہ کوئی غیر تو نہیں ہے......''

''پھر یہ سوچو......! کیا تم فہد کے خیالات سے واقف نہیں ہو......'' یہ خیال آتے ہی اسے فہد سے ہونے والی بہت ساری ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ ایک بار جب وہ نور پور میں بہت خوشگوار موڈ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تب ماہا نے اس سے پوچھا تھا۔

''فہد......! تم میاں بیوی کے اس بندھن کے بارے میں کیا سوچتے ہو، کیا خیال ہے تمہارا؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ والدین پرورش کرتے ہیں، تربیت دیتے اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو انہیں اپنے بچے کی محبت میں کرنا چاہیے لیکن وہ حقیقت بھی تو اپنی جگہ موجود ہے کہ پھر ایک عورت کی ذمے داری اس پر ڈال دی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس تعلق کی بنیاد میں

جہاں محبت بہت ضروری ہے وہاں ایک دوسرے کو سمجھنا اور ہم خیالی بہت ضروری ہوتی ہے کیونکہ پھر ایک لمبی زندگی ان دونوں نے مل کر گزارنی ہے۔ ہر روز انہیں نت نئے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے خیال میں سمجھوتے دونوں کو دور لے جاتے ہیں اور زندگی تلخ ہو جانے کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے دونوں کو خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے ہم خیال ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے کی عزت ہی سے یہ سب ہوتا ہے، ورنہ پھر ایک طویل زندگی، ایک ہی چھت تلے اجنبیوں جیسی ہوتی ہے''۔

''اچھا چلو یہ بتاؤ......! تم کیسی بیوی چاہتے ہو؟'' ماہا نے ترنگ میں آ کر پوچھا تھا۔

''سچ پوچھو تو تمہارے جیسی۔ زندگی سے بھرپور، روشن خیال جو زندگی کے ہر لمحے سے خوشی کشید کر لینے کا فن جانتی ہو...... دراصل ایک لائف پارٹنر اگر زندگی سے بھرپور ہو تو خوشیاں خود چل کر ان کے قریب آ جاتی ہیں۔ ورنہ پھر ساری زندگی گلے شکوے اور شکایات کا انبار ہی رہتا ہے......'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، کیا میں ایک اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہوں......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''کیوں نہیں...... تم پڑھی لکھی، سمجھدار ہو، زندگی کی حقیقتوں سے واقف ہو۔ جانتی ہو کہ زندگی میں کس کے ساتھ کیسا رویہ اپنایا جاتا ہے...... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہو تاہم شرط یہ ہے کہ......'' وہ کہتے ہوئے رک گیا۔

''مطلب کیا شرط...... تم کہنا کیا چاہ رہے ہو......'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''یہی کہ اگر ردعمل ہو تو تم بہت سخت ردعمل دکھا سکتی ہو...... اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتی ہو، مگر اس کی نوبت ہی کیوں آئے، جب ایک محبت کرنے والا شوہر ہو تو پھر ساری دنیا سے لڑا جا سکتا ہے......'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے اچھی بیوی ہونے کے لئے شوہر کی محبت از حد ضروری ہے......'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ظاہر ہے، اعتماد تو شوہر ہی نے دینا ہوتا ہے نا، شوہر کی محبت ہی تو بیوی کا مان ہوتا ہے......'' فہد نے صاف الفاظ میں کہا تھا۔

پھر ان کے درمیان موضوع بدل گیا تھا۔ ماہا سوچوں سے نکل آئی۔

''کس قدر خوبصورت خیال ہیں فہد کے...... بلال نے کبھی اس طرح کی باتیں نہیں کیں تھیں...... ویسے کیا مجھے واقعی بلال سے محبت ہے...... یا اسے مجھ سے محبت ہے...... یہ محبت

کیا ہے...... بچپن سے لیکر جوانی تک ایک دوسرے کا خیال رکھنا، کیا یہی محبت ہے...... اسے محبت کہتے ہیں...... نہیں...... محبت تو ہم خیال ہونا ہوتا ہے......'' ماہا سوچتی چلی گئی۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے...... کیا فہد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر زندگی کی رعنائیوں میں کھو جانا چاہیے یا پھر بلال کا نام اپنے ماتھے پر سجا کے یونہی ان در و دیوار تک خود کو محدود کر لے...... فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے...... وہ کیا چاہتی ہے...... زندگی تو فقط ایک بار ملتی ہے...... اگر اسے ہی اچھی طرح گزارا جائے تو پھر کیا ہے...... محبت تو زندگی دیتی ہے...... اور یہ کیسی محبت ہے جو اسے بند کمروں میں سسکا رہی ہے...... نہیں اسے اپنی جنگ خود لڑنا ہوگی...... اگر فہد کے ساتھ میں اسے زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے تو پھر اسے یہاں سے چلے جانے کی جدوجہد کرنا چاہیے ورنہ وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی...... یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے فہد کے لئے اپنی کوشش کرنا ہے، بلکہ اسے خود اپنی زندگی کے لئے یہ جدوجہد کرنی ہے۔ کیا وہ اتنی بھی باہمت نہیں ہے کہ اکیلے زندگی گزار سکے۔ وہ اپنے فیصلے خود کرنے کی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسے اپنی زندگی خود بنانا ہوگی۔ یہاں سے چھٹکارا لے لینا چاہیے۔ یہ سب کیسے ہوگا کہ اس پر الزام بھی نہ آئے، یہ ابھی سوچنا ہے، وہ سوچ لے گی......'' ماہا نے یہ فیصلہ کیا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔

میں واہگہ پر کھڑا تھا اور میری نگاہ سامنے تھی جہاں سے ہمت سنگھ نے آنا تھا۔ اس وقت سورج میری پشت پر تھا۔ میں نے وہاں آنے سے پہلے وہاں کے حکام سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے گاڑی پارکنگ میں لگا دی تھی اور اس عمارت کی جانب بڑھ گیا جہاں مجھے ایک آفیسر سے ملنا تھا جس سے میرا تعارف غائبانہ ہی تھا۔ وہ بہت اچھے انداز سے ملا۔ چائے کے دوران بہت ساری باتیں چلتی رہیں۔ وہیں بیٹھے مجھے معلوم ہو جانا تھا کہ ہمت سنگھ آ گیا ہے۔ اسے مختلف مراحل سے گزرنا تھا جو ہر ملک کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ہمت سنگھ، جند کور اور جیت سنگھ میرے سامنے تھے۔ ہمت سنگھ نے میری جانب غور سے دیکھا۔

''آپ بلال بھاء جی ہونا......'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں یار میں بلال ہی ہوں، کیوں کیا ہوا......؟'' میں نے اس کی حیرت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''پہلے آپ کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی...... خیر کوئی بات نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ جند کور آگے بڑھی تو میں نے اس کے سر پر پیار دیا اور جیت سنگھ کو اٹھا

لیا۔ میں نے آفیسر کا شکریہ ادا کیا اور اس عمارت سے باہر نکل آیا۔

”کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی راستے میں......“ میں نے پوچھا۔

”نہیں......! بس دیر یہ ہوئی کہ گاؤں سے امرتسر آنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ یہاں بھی اتنی پوچھ تاچھ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے تھائی پاسپورٹ کے باعث......“ وہ بولا پھر وہاں پر موجود بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ”بلال بھاء جی......! یہ اتنے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں“۔

”پرچم اتارنے کی جو روزانہ تقریب ہوتی ہے، اسے دیکھنے کے لئے، ادھر بھارت کی طرف بھی بہت سارے لوگ آتے ہیں۔ دونوں طرف جذبہ حب الوطنی کے باعث آتے ہیں“ میں نے کہا تو وہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ وہاں بھی کافی لوگ تھے۔

”یہ تقریب کب ہوگی؟“ جند کور نے پوچھا۔ اس کا لہجہ تجسس بھرا تھا۔

”یہی اب تھوڑی دیر بعد شام ہونے سے پہلے“۔ میں نے جواب دیا۔

”کیا خیال ہے دیکھ کر چلیں“۔ ہمت سنگھ نے میری جانب دیکھا۔

”ویسے میرا بھی یہی دل چاہ رہا ہے“۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تبھی میں نے اپنے ڈرائیور کو اشارے سے بلایا۔ وہ آیا تو میں نے سامان گاڑی میں رکھنے اور ٹھنڈی بوتلیں لانے کو کہا اور ہم سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے جو اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھیں۔

پرچم اتارنے کی تقریب بہت شاندار تھی۔ رینجرز کے کڑیل جوانوں نے جس جذبے اور وقار کے ساتھ اس تقریب کو نبھایا، اس سے جذبہ حریت اور قومی وقار کے بہترین جذبات دل میں پیدا ہوئے۔ جوانوں کی چال ڈھالی، دوسرے پر رعب دکھانے کے لئے پہلوؤں پر ہاتھ رکھنا، مارچ پاسٹ کرنا، یہ سب روح پرور منظر تھا۔ میں اس میں کھو کر رہ گیا۔ میں اپنے اندر اٹھنے والے جذبات کے بارے میں تو جانتا تھا لیکن ہمت سنگھ کے کیا جذبات تھے وہ مجھے معلوم نہیں ہوئے کیونکہ وہ بہت خاموش تھا۔ میں ان سب کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر قریب ایک مسجد میں چلا گیا۔ وہاں میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور واپس آ گیا۔ سورج ڈھلے ہم وہاں سے نکلے تو کافی دیر تک وہی مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھرتے رہے اور گاڑی میں بالکل خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ ہم نہر کے ساتھ ساتھ ہو لئے۔ تب میں نے ہی حق میزبانی ادا کرتے ہوئے سمت سنگھ سے پوچھا۔

”اچھا ہمت سنگھ مجھے یہ بتاؤ، پاکستان میں کتنے دن کا ٹور لے کر آئے ہو تاکہ میں اسی حساب سے اسے ترتیب دے دوں“۔

”صرف تین دن......! یقین جانیں بھاء جی، اگر آپ کی اور بابا جی کی کشش نہ

ہوتی تو میں اپنے گاؤں سے نکلتا ہی نا، سارا بچپن وہیں گزرا ہے۔ اب آیا ہوں نا تو یوں لگتا ہے جیسے سارا گاؤں ہی میرا رشتے دار ہے۔ کسی کے گھر کھانا ہے تو کسی کے گھر جائے...... میرا تو دل چاہ رہا ہے میں ادھر ہی رہ جاؤں......“ وہ نجانے کن خوابوں میں کھو گیا تھا، تبھی جند کور بولی۔

”یہ بس انہی دنوں کے لئے ہے جب تک آپ مہمان ہو، مستقل یہاں رہنے لگے تو پھر کوئی نہیں پوچھے گا، پھر کہو گے واپس چلیں تھائی لینڈ“۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بھاگوان“۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”اب میری سنو......! کوئی تین دن نہیں، پورا ایک ہفتہ، اس کے بعد ہی میں آپ لوگوں کو جانے دوں گا“۔ میں نے کہا تو ہمت سنگھ بولا۔

”ارے نا، ایسا غضب نہ کرنا بھاء جی، ابھی تو میں نے اپنے سسرال جانا ہے“۔

”کیا پہلے نہیں گئے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ تو بس ایک دو دن کے لئے گیا تھا، اب کچھ دن وہاں گزارنے کا ارادہ ہے“۔ وہ بولا۔

”تین دن تم لے کر آئے ہو تو تین دن میری طرف سے، اب مزید نہیں بولنا“۔ میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

”جیسے واہگرو جانے......! ویسے کیا پروگرام بنایا ہے آپ نے“۔ اس نے پوچھا۔

”آج تو آپ کریں آرام......! صبح جنم استھان چلیں گے اور پھر جیسا تم چاہو...... میں نے کہا تو جند کور بولی۔

”ویر جی پنجہ صاحب ضرور جانا ہے، میں نے جیت سنگھ کی منت مانی ہوئی ہے“۔ اس کے لہجے میں تقدس تھا۔

”چلو ٹھیک ہے......“ میں نے کہا تو جند کور پھر بولی۔

”میں نے جب اپنی ماتا جی کو بتایا کہ میں لاہور جا رہی ہوں، تب انہوں نے اپنے پرانے گھر کے بارے میں بتایا تھا۔ اگر وقت ہوا تو وہاں جایا جا سکتا ہے نا......“ اس کے لہجے میں یاسیت بھری ہوئی تھی۔

”تمہیں لوکیشن کا پتہ ہے......؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل......! ایک کاغذ پر سب لکھا ہوا ہے، بیگ میں پڑا ہے......“ وہ بولی۔

”ضرور کیوں نہیں چلیں گے......“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے کھل گئی۔

”اور ساری بات چھڈو جی......! یہ بتاؤ بھاء جی، یہاں بھابھی کو ساتھ کیوں نہیں

لے کر آئے، پردہ کرتی ہے وہ......‘‘ ہمت سنگھ بے تکلفی سے بولا۔

’’نہیں......! وہ ادھر نہیں ہے، اپنے سسرال میں ہے......‘‘ میں نے کہا تو ایک لمحے کے لئے وہ سمجھ نہ سکا، پھر جب سمجھا تو کھلکھلا کر ہنس دیا۔

’’اس کا مطلب ہے ہمیں حویلی تو پھر ضرور جانا پڑے گا‘‘۔ جندکور بولی۔

’’ضرور کیا وہیں جائیں گے، لیکن پہلے جنم استھان اور پنجہ صاحب سے ہو کر......‘‘ میں نے کہا۔

’’یہ ٹھیک رہے گا‘‘ ہمت سنگھ بولا، پھر چند لمحے ٹھہر کر کہا۔ ’’ایک بندے کے بارے میں بھاء جی آپ نے ابھی تک نہیں پوچھا، جبکہ مجھے امید تھی کہ آپ سب سے پہلے پوچھیں گے‘‘۔

’’پی اون کے بارے میں......‘‘ میں نے کہا۔

’’جی ہاں......اس کے بارے میں......‘‘

’’اصل میں وہ نیٹ پر بات کرتی رہتی ہے۔ دوسرا وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس کا تاثر یہی ہے کہ وہ بے حد مصروف ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ آپ لوگوں سے بھی نہیں ملی ہو گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں......! وہ اب تک ہمارے پاس فقط چار دفعہ آئی ہے۔ ایک بار اپنا تحفہ لینے، دوسری بار وہ بہت اداس تھی۔ تب کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر چلی گئی۔ اسے رقم کی ضرورت تھی جو میں نے دے دی اور تیسری بار میں نے خود بلوایا تھا یہاں آنے سے پہلے، تب وہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی۔ چوتھی بار آئی ہے تو آپ کے لئے، آپ کی بیگم کے لئے تحفے دیئے تاکہ میں آپ تک پہنچا سکوں اور میری رقم واپس کی۔ میں حیران ہوں کہ اس نے اپنی طرف سے بھی رقم دی تاکہ ہم آسانی سے خرچ وغیرہ کریں‘‘۔

’’بہت امیر ہو گئی ہے وہ......‘‘ میں نے پوچھا۔

’’پتہ نہیں امیر ہے یا غریب لیکن بہت پراسرار ہو گئی ہے۔ مجھے تو ہر بار وہ مختلف سی لگی ہے۔ ان سے تو اس کی ایک آدھ بار ہی ملاقات ہوئی ہے......‘‘ جندکور نے بتایا۔

’’بہت خاموش خاموش اور ڈری ڈری سی تھی۔ جب وہ مجھے ملی۔ اس نے مجھے اپنا نیا ایڈریس دیا تھا، وہ کسی پڑھنے پڑھانے والی جگہ تھی...... میں تو کبھی نہیں گیا وہاں پر......‘‘

’’تمہارا کیا کام پڑھنے پڑھانے سے‘‘۔ میں نے کہا تو سبھی ایک دم ہنس دیئے۔

تب میں نے غور کیا ہم مال روڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گھر پہنچنے والے

تھے۔ وہ دونوں لاہور کی رنگینیوں میں کھو گئے اور میں پی اون کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے دولت کے حصول کے لئے خود کو کس قدر بےگانہ کر لیا تھا۔

گھر پہنچنے پر ذیشان اور اس کی بیوی فائقہ نے ان کا استقبال کیا۔ وہ دونوں میرا بڑا سا گھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں سرکاری گھر میں نہیں بلکہ اس گھر میں ٹھہرایا تھا جو میں نے خاص ماہا کے لئے بنوایا تھا۔ اسی لئے میں نے ذیشان اور فائقہ کی مدد لی تھی۔ جندکور آتے ہی پہچان گئی تھی۔ اس نے گاڑی سے اترتے ہی کہا تھا۔

’’ویر جی لگتا ہے اس گھر میں پہلے کوئی بھی نہیں رہتا تھا‘‘۔

’’ہاں......! یہ میں نے خود اپنا گھر بنوایا ہے۔ ویسے بھی میں ابھی تک سرکاری گھر میں رہ رہا ہوں۔ بہت جلد یہاں شفٹ ہونے والا ہوں‘‘۔ میں نے کہا اور پھر ذیشان کا تعارف کرایا۔ ’’یہ ہیں ذیشان، اپنے شعیب کے کزن‘‘۔ میرے یوں بتانے پر ہمت سنگھ اسے یوں ملا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

فائقہ نے پرتکلف کھانا چن دیا تھا۔ میرے اور ان کے چند ملازم وہیں آ گئے تھے۔ انہوں نے بہت اچھا اہتمام کر دیا تھا۔ ملازمین نے جب کھانا لگا دیا تو اس نے ہمیں بلا لیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ جندکور سے مخاطب ہو کر بولی۔

’’مجھے آپ لوگوں کی پسند ناپسند کے بارے میں کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ جیسا بھی قبول فرمائیں‘‘۔

’’بھابھی آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے ہمیں نہیں پتہ، آپ بھی پنجابی اور ہم بھی پنجابی......پھر لاہوریوں کے کھانے...... میں تو ابھی کہہ رہی ہوں کہ مجھے سب کچھ ہی پسند آئے گا‘‘۔ جندکور نے کہا تو پھر اسی بے تکلفی میں کھانا کھا لیا گیا۔ اس کے بعد چائے پیتے ہوئے نہ صرف گپ شپ لگاتے رہے بلکہ صبح کے لئے پروگرام بھی بن گیا۔ رات گئے ذیشان اور فائقہ چلے گئے اور مہمان سونے کے لئے اپنے کمرے میں جا پہنچے اور نجانے مجھے یہ کیوں احساس ہونے لگا کہ اب پی اون وہ نہیں رہی جو میری دوست تھی۔

❀......❀......❀

دادا جی نور الٰہی عشاء پڑھ کر آئے تو سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تبھی انہوں نے نجمہ پھوپھو کو بھی بلوا لیا۔ دادا جی کچھ دیر تک سب کا حال احوال پوچھتے رہے اور پھر انہوں نے وہ بات چھیڑ دی جس کے لئے انہوں نے نجمہ کو بلوایا تھا۔

"اچھا کیا نجمہ آ گئی ہو، ورنہ میں لاہور آنے والا تھا"۔

"آپ جب مرضی آئیں، آپ کا گھر ہے لیکن خیریت تو تھی"۔ نجمہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی خیریت ہی ہے، میں بات یہ کرنا چاہتا تھا کہ پہلے تو تم رقیہ کے بارے میں بہت گرم جوشی دکھا رہی تھی لیکن پھر کیا ہوا کہ اچانک تم خاموش ہو گئی ہو"۔

"ہاں......! یہ بات ہے ابا جی، دراصل میں اور الطاف تو چاہتے ہیں کہ رقیہ کو اپنی بیٹی بنا لیں، اس میں سب سے زیادہ کوشش میری اپنی ہی تھی لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ فہد اس رشتے پر راضی نہیں ہے"۔ نجمہ نے بہت محتاط انداز میں اپنی بات کہہ دی۔

"کیا کہتا ہے وہ؟" دادا جی نے پوچھا۔

"میں پہلے بھی آپ کے سامنے اس کا رونا روتی رہی ہوں۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار اسے بہت ملا۔ ہمیں نہیں پتہ تھا کہ وہ اس قدر بگڑ جائے گا۔ مجھے آج تک اس کے دل کی بات معلوم ہی نہیں ہوئی ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے"۔ اس نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

"بگڑ گیا ہے؟ مطلب......؟" دادا نے تشویش سے پوچھا۔

"ویسا نہیں کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی ہے، بس اپنے آپ میں گم ہے، اعلیٰ تعلیم بھی چاہتا ہے لیکن باہر نہیں جا رہا ہے پڑھنے۔ یہاں پڑھ لو، وہ بھی نہیں، نوکری کی بات پر چڑتا ہے، بزنس کا کہو تو سنتا نہیں، اب اس کا حل یہ نکالا تھا کہ اس کی شادی کر دوں۔ اسے ذمے داری کا احساس ہو، اب یہ کہتا ہے کہ شادی ہی نہیں کرنی"۔ وہ سمجھانے والے لہجے میں بولی۔

"مطلب اسے رقیہ ناپسند نہیں بلکہ وہ سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا"۔ دادا نے اپنی طرف سے کہا۔

"بالکل یہی، میں نے تو کہا تھا کہ اگر آپ اسے اپنے پاس رکھیں، اس کی تربیت کریں۔ آپ نے بھی تو میری بات نہیں سنی، میں تو اس لڑکے سے تنگ آ چکی ہوں"۔ وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"کیا تم دونوں نے مل کر اسے سمجھایا نہیں، اسے احساس نہیں دلایا کہ آخر وہ زندگی میں کیا کرے گا"۔ دادا نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں کیا کروں، میری تو وہ سنتا ہی نہیں ہے۔ باپ کی سنتا ہے لیکن عمل کوئی نہیں کرتا، وہ بھی اس سے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ اب تو انہوں نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا ہے"۔ وہ پھر مایوسی سے بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا نجمہ......! تمہاری طرف سے تو جواب ہے، اب وہ جہاں چاہیں رقیہ کی شادی کر سکتے ہیں، اب تمہارا کوئی اعتراض نہیں بنتا"۔ دادا جی نے صاف لفظوں میں پوچھ لیا۔

"ظاہر ہے، ان کی بیٹی ہے، ان کا حق ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے اگر رقیہ میری بہو بن جاتی تو بہت اچھا تھا"۔ وہ یاسیت سے بولی۔

"تم اب بھی کوئی حتمی بات نہیں کر رہی ہو، وہ کب تک انتظار کریں۔ ہاں اگر منگنی وغیرہ ہو چکی ہوتی تو پھر بھی انتظار کیا جا سکتا تھا۔ تمہاری خواہش اپنی جگہ درست ہے لیکن جب تم اپنے ہی بیٹے کو نہیں سمجھا پا رہی ہو تو پھر دوسرے کو باندھ کر رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے"۔ دادا جی نے قدرے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"ابا جی......! زندگی میرے بیٹے نے گزارنی ہے، میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، اور نہ ہی میں کوئی زبردستی کر سکتی ہوں ورنہ ان کا حال ماہا اور بلال جیسا ہی ہوتا جو شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں" نجمہ نے تنک کر کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ بولے۔

"یہی کہ آپ زبردستی کر کے کسی پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتے، خاص طور پر معاملہ جب زندگی بھر ساتھ نبھانے کا ہو۔ آپ بتائیں کیا ماہا نے بلال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ آپ نے اس کی نہیں سنی جس کا نتیجہ دیکھ لیا آپ نے، بلال اکیلا لاہور میں ہے اور ماہا یہاں پڑی ہے اور شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟" نجمہ نے بات کا رخ ہی بدل دیا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ فیصلہ غلط تھا، ان دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ دور ہو جائیں گی......" دادا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ حقیقت سے نگاہیں چرا رہے ہیں ابا جی......! یہ تصویر کا ایک رخ ہے کہ ان میں مفاہمت ہو جائے گی، دوسرا رخ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان میں علیحدگی ہو جائے" نجمہ نے کہا تو دادا جی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

"تم یہ بات اتنے یقین سے کیوں کہہ رہی ہو"۔

"یہ حقیقت سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ آپ خود تجربے کار ہیں، جہان دیدہ ہیں، آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ مفاہمت کا چانس وہاں ہوتا ہے جہاں کسی نہ کسی بات پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے، ان کے درمیان تو بات تک نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کو سمجھا نہیں، مفاہمت کہاں سے ہوگی؟" یہ تو حقیقت سے نگاہیں چرانے والی بات ہے۔ نجمہ نے پرجوش انداز میں کہا تو نور الٰہی

اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھنا چاہ رہا تھا کہ آخر نجمہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ تب انہوں نے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں یہ رشتہ قائم رہ سکے گا یا نہیں؟''

''قطعاً نہیں......! جہاں تک میں نے دیکھا ہے، حویلی والوں نے اسے بیٹی نہیں بہو سمجھا ہے اور اس کے ساتھ اجنبیوں والا سلوک کر رہے ہیں۔ بہت معذرت کے ساتھ ابا جی، میں یہ کہوں گی کہ آپ کو رقیہ کی شادی بارے تو فکر ہے لیکن ماہا آپ کی پوتی ہے، ایسی ہی جیسے رقیہ لیکن ماہا کے معاملے میں آپ نے جبر کیا اور اس کے معاملات کی آپ کو کوئی فکر نہیں ہے''۔

''نجمہ......! کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس میں ماہا کا اپنا رویہ مفاہمانہ نہیں ہے، وہ خود تنہائی پسند ہو گئی ہے۔ تب دوسرا کوئی کیا کر سکتا ہے''۔ دادا جی نے کہا۔

''وہی میں کہہ رہی ہوں، جب آپ نے اس کی بات نہیں مانی، اس پر جبر کر کے زبردستی اس کی شادی بلال سے کر دی ہے تو پھر اب آپ اس کا رویہ بھی درست چاہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہو، آپ کا یہ رویہ کس زمرے میں آئے گا؟'' نجمہ نے تیز لہجے میں اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ماہا میں اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ اس کے سارے بزرگ جب ایک بات اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں تو اس کے فائدے کی ہوگی''۔

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے ابا جی، مجھے ایک چیز پسند نہیں ہے، دوسرے سب کو پسند ہے، مجھے زبردستی یہ مجبور کیا جائے کہ میں اسے استعمال کروں، آپ مانیں کہ آپ سب سے بنیادی غلطی ہوئی اور اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلنے والا''۔

''کیا مطلب......! ماہا نے تم سے کوئی بات کی؟'' دادا نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ماہا کوئی بات کرے یا نہ کرے، وہ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں جذباتی پن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہے اور آپ اسے مسلسل نظر انداز کئے جا رہے ہیں اور پھر دوسری بات کیا ماہا ہی غلط ہے، اسے عقل نہیں ہے تو آپ کا بس بلال پر تو چلتا ہوگا، اسے سمجھائیں۔ آپ بلال کو تو سمجھا نہیں سکتے، ماہا سے عقل کی توقع کرتے ہیں''۔ نجمہ نے شدت سے کہا۔

''تمہارے خیال میں اس مسئلے کا حل کیا ہونا چاہیے؟'' دادا جی نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

''یہی کہ ماہا کیا چاہتی ہے۔ آپ سب نے اس سے تو اپنی بات منوالی ہے، اور اب آپ سب کو اس کی بات ماننا ہوگی، تب اسے احساس ہوگا کہ آپ سب اس کے اپنے ہیں۔ ممکن ہے کوئی مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ گاڑی ایک پہیے سے تو نہیں چلتی، یہاں تو دونوں

ہی الگ الگ سمت رکھتے ہیں''۔ وہ دلیل دیتے ہوئے جوش سے بولی۔

''مطلب......! ماہا یہاں تک سوچ سکتی ہے کہ وہ بلال سے علیحدگی اختیار کر لے......'' دادا نے بڑے مایوسانہ لہجے میں پوچھا۔

''کیوں نہیں چاہے گی وہ......؟ وہ تو سرے سے ہی اس شادی کے خلاف تھی''۔ نجمہ نے تنک کر کہا۔

''نجمہ......! اگر ایسا ہو گیا تو بہت گڑ بڑ ہو جائے گی۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی......'' دادا جی نے مایوس لہجے میں کہا۔

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں، پہلے تو یہ تسلیم کیا جائے کہ غلطی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بہت کھلے دل سے فیصلہ کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے......'' نجمہ نے محتاط انداز میں کہا۔

''مطلب......؟'' دادا نے غور سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ بہت کچھ کھو دینے کی بجائے اگر تھوڑا بہت نقصان برداشت کر لیا جائے تو میرے خیال میں یہی بہتر ہوگا، گھوم پھر کر بات ماہا پر آئے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے اب اس کی بھی ماننا پڑے گی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی بات ماننے کے قابل ہے تو ماننا ہوگی ورنہ پھر اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے''۔ نجمہ نے پھر محتاط انداز میں کہا۔

''نجمہ......! یہ اچھی بات ہے کہ وہ تم سے اپنے دل کی بات کہہ دیتی ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ ہم سے غلطی ہوئی لیکن اب بجائے دنیا کو تماشا دکھانے کے، ہم آپس میں بیٹھ کر اس مسئلے کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے نا؟'' دادا جی نے نجمہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! یہی تو میں کہہ رہی ہوں اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں کہ سب مل کر بیٹھیں اور اس مسئلے کا حل تلاش کر لیں۔ اس سے میرے خیال میں کوئی گڑ بڑ بھی نہیں ہوگی اور سب ایک دوسرے کے ساتھ راضی خوشی رہیں گے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس مسئلے کے حل ہو جانے کے بعد ہی پھر رقیہ کے بارے میں سوچا جائے تو بہتر ہے''۔ اس نے اپنی رائے دے دی۔

''نجمہ بیٹی......! اس مسئلے کے دو ہی ممکنہ حل ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماہا اور بلال سب کچھ بھول کر اپنی خوشگوار زندگی کی ابتداء کریں اور دوسرا یہ کہ ان میں خدانخواستہ علیحدگی ہو جائے۔ اس صورت میں پھر ماہا کا کیا ہوگا؟ دوسری شادی کے لئے پھر کون راضی ہوگا۔ کیا اس طرح پھر خاندان سے باہر نہیں دیکھنا پڑے گا؟'' دادا جی نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''ممکن ہے نہ دیکھنا پڑے''۔ نجمہ اپنی رو میں کہہ گئی تو دادا نور الٰہی چونک گیا۔

"تمہاری مراد فہد سے ہے، وہ بھی گھر کا بیٹا ہے، لیکن سوال یہ ہے نجمہ، جس طرح وہ رقیہ کے لئے نہیں مان رہا ہے یا سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تو کیا وہ ماہا کے لئے مان جائے گا؟" دادا نے بہت محتاط لہجے میں پوچھا۔

"ہو سکتا ہے......اور نہیں بھی ہو سکتا......آپ بڑے ہیں اور ہم آپ کے ساتھ مل کر ایسی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن میں جبر کی قائل نہیں ہوں...... دونوں طرف سے اگر رضامندی ہوگی، تب اس بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔ یہ کوشش بھی اگر ناکام ہو جاتی تو پھر ہماری قسمت......" نجمہ نے پھر الجھی ہوئی بات کہہ دی۔

"نجمہ بیٹی......! تم کون سا غیر ہو، میں یہ ذمے داری تمہی پر ڈالتا ہوں کہ تم فہد اور ماہا سے ان کا عندیہ لو۔ پھر یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ بلال کی شادی اس کی کسی ہم مزاج سے ہو سکتی ہے اور رقیہ کے لئے بھی رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ مجھے خود ماہا کے مستقبل کی بہت فکر ہے"۔

"ابا جی اگر آپ یہ ذمے داری مجھ پر ڈال رہے ہیں تو میں اسے نبھاؤں گی۔ بہت جلد آپ کو بتا دوں گی۔ آپ بھی دوسروں کے ذہن میں ڈال دیں"۔ نجمہ نے کہا۔

"ہاں......! میں ایسا ہی کروں گا۔ اب تم آرام کرو، ہم اس موضوع پر پھر بات کر لیں گے"۔ دادا جی نے کہا تو نجمہ پھوپھو اٹھ گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد دادا نور الٰہی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے سامنے بہت سارے پہلو ایسے آتے چلے گئے جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ مسئلہ کا حل کہیں باہر نہیں ہے بلکہ اندر ہی ہے۔ کوئی بھی شے چاہے سامنے پڑی ہوئی ہو مگر تاریکی میں ہو تو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا، روشن شے اگر دور بھی ہو تو اس کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے۔ دادا نور الٰہی بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

❀......❀......❀

دوپہر ہونے کے قریب تھی جب ہم بابا گرونانک کے جنم استھان پر پہنچے۔ میں نے بڑے سارے گیٹ کے اندر جھانکا، دور فوارے کے قریب میرا دوست خالد ارمان کھڑا تھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ وہ اسی شہر میں آفیسر تھا۔ گیٹ کھول دیا گیا اور میں گاڑی سمیت اس کے پاس جا رکا۔ میں اس سے ملا تو ہمت سنگھ، جند کور اور جیت سنگھ گاڑی سے نیچے آ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک جانب پارک کر دی۔ میں نے ان کا تعارف کرایا، وہ بڑے تپاک سے ملے مگر ان کی آنکھوں میں تجسس کے ساتھ ساتھ تقدس بھی تھا جو اس وسیع پیلی عمارت کو دیکھ کر

ابھر رہا تھا۔ ہم بلا تاخیر اس جانب بڑھ گئے۔ ان تینوں نے اپنے سر کو ڈھانپ لیا تھا جبکہ میں سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔

"بلال آؤ، تم بھی آ جاؤ"۔ خالد نے کہا تو میں جھجک گیا۔ تب اس نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے یہاں مسلم بھی آتے ہیں، آؤ......"

وہ تینوں آگے تھے اور ہم دونوں پیچھے۔ صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب جنم استھان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی اور بائیں جانب تصویریں تھیں۔ ذرا آگے بڑھے تو ہمیں بھی سر ڈھانپنے کے لئے ٹوپیاں دے دی گئیں۔ جیسے ہی ہم ڈیوڑھی پار کر کے کنویں کے قریب گئے۔ دو سکھ نوجوان آ گئے۔ وہ خالد کی وجہ سے آئے تھے اور وہیں رہائش پذیر تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہمارے میزبان تھے۔ ذرا سے فاصلے تک انہوں نے ہماری رہنمائی کی۔ ان سب سکھ حضرات نے وہاں پر ماتھا ٹیکا کیونکہ اندر چھوٹے سے کمرے میں گرنتھ صاحب پڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اس چھوٹے سے کمرے کے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ہم بمشکل پار آئے، سامنے سرخ کپڑے کے نیچے گرنتھ صاحب پڑی ہوئی تھی۔ وہاں ایک ضعیف العمر سکھ بابا بیٹھا ہوا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ بس ایک لفظ "سچ" کی مجھے سمجھ آئی۔ ہم وہاں سے باہر آئے تو ایک ببول کے درخت کے پاس چلے گئے۔ وہ میزبان ہمیں بتا رہے تھے کہ یہاں کسی اکالی کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ یہ درخت تب سے ویسے ہے، ہم وہاں کافی دیر تک رہے۔ وہیں پر لنگر کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے بعد اصرار ہمیں لنگر کھلایا۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی جب ہم سب اس حوض کے قریب گئے جسے وہ "سرور" کہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق اس حوض میں نہانے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ وہ تینوں اس میں اتر گئے، پانی خاصا ٹھنڈا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے نکل آئے۔ انہیں خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ کپڑے بدلنے کے لئے صرف جند کور کا مسئلہ تھا، وہ بھی حل ہو گیا۔ تقریباً سہ پہر کے وقت ہم خالد کے گھر جا پہنچے۔

بھابھی نے شام کی چائے پر اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ اس وقت گرم گرم چائے نے بہت لطف دیا۔ جند کور اور بھابھی جیت سنگھ کے ساتھ اندر چلے گئے تو خالد نے ہمت سنگھ کی بالا کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یار بات یہ ہے، تمہارے متعلق میں نے سنا تھا کہ تم کٹر قسم کے مسلمان بن چکے ہو اب دیکھ بھی لیا ہے پھر ایک سکھ فیملی کے ساتھ تم یہاں ہو۔ یہ ساری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم نے ایک ہی وقت میں کئی ساری باتیں کہہ دی ہیں، ایک ایک کر کے بتاؤ، تمہیں کس کس بات کی سمجھ نہیں آ رہی''۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میں یہ اچانک اتنی تبدیلی کیسے آ گئی۔ میرا خیال ہے چند مہینے پہلے تم ایسے نہ تھے۔ اتنی اچانک تبدیلی پر حیران ہونا کوئی غیر فطری تو نہیں''۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میرے دوست......! میرے خیال میں تبدیلی اچانک نہیں آتی، ہمارے من میں بہت پہلے ہی سے اس تبدیلی کو قبول کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تبدیلی کے لئے فیصلہ کن مرحلہ بھی آتا ہے لیکن ہم حوصلہ نہیں کر پاتے۔ یہ جو اچانک تبدیلی دکھائی دیتی ہے نا، یہ دراصل بڑے حوصلے کے ساتھ اس تبدیلی کے لئے فیصلہ کر لینے کا نام ہے''۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مطلب، تم پہلے ہی مذہبی رجحان رکھتے تھے......'' اس نے مجھے کریدنا چاہا تو میں ہنس دیا۔

''اصل میں ہمارے طبقے کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے مذہب یا دین کو بھی ایک ایسی الگ سی شے تصور کیا ہے کہ جسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ میری جان یہ ایک لائف سٹائل ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وے آف لائف بھی ہے۔ کیا انسان کی فقط مادی ضرورتیں ہی ہیں، اس کی روحانی ضرورت نہیں ہے جس طرح برائی ہمیشہ اس تاک میں رہتی ہے کہ اسے اپنا لیا جائے۔ اسی طرح اچھائی اور نیکی بھی انسان ہی اپناتا ہے کیوں ایسا کرتا ہے؟ جس من میں سچائی کی تلاش رہتی ہے یا پھر اس کے من میں سچائی پنپ رہی ہوتی ہے، وہ ضرور سچائی کو قبول کرتا ہے''۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کہہ دی۔

''تم تو بالکل فلسفیانہ انداز میں بات کر رہے ہو، میں نے صرف تمہاری تبدیلی کے بارے میں پوچھا ہے''۔ اس نے میری بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں ایک سوال تھا کہ اتنے مسلمان ہونے کے باوجود بحیثیت قوم یا امت کے پوری دنیا میں مزاحمت کر رہے ہیں، ان کا لہجہ مدافعانہ ہے، کیوں، جب ان کے پاس ازلی سچائی موجود ہے تو پھر ایسا کیوں؟ تم کیا سوچتے ہو؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''اس لئے کہ وہ سیاسی طور پر یا پھر جدید دنیا کے مطابق نہیں چل پا رہے''۔ وہ بولا۔

''کیوں نہیں چل پا رہے، خدانخواستہ اسلام آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے، نہیں، ایسا نہیں ہے، اسلام ہر دور میں جدید ہے اور رہتی دنیا تک جدید رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

قرآن پاک ہمارے پاس وہ معجزہ رسولؐ ہے کہ جس نے بتایا جدیدیت ہوتی کیا ہے۔ پھر میں بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ قرآن حکیم کن پر نازل ہوا، یہ فقط مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، پوری انسانیت کے لئے مخصوص ہے جو بھی اس سے ہدایت پائے گا، کامیاب ہو جائے گا۔ اور یہ ذمہ داری فقط انسان کی ہے۔ وہ انسان جس کی جانب قرآن جلیل کا روئے سخن ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے کلام کی جانب رجوع کم کر دیا ہے۔ سو بے عمل ہو گئے۔ مسلمان تو ہر دور میں رہے ہیں، جس دور میں قرآن مجید کو رہنما بنایا، وہ کامیابی کا دور کہلایا۔ اسی طرح انفرادی طور پر بھی۔ سیاسی کامیابی یہ نہیں کہ ہم دیگر اقوام کے ساتھ انہی کی مانند چالیں چلیں، بلکہ ہم قرآنی تعلیمات پر کس قدر کاربند ہیں''۔ میں نے اسے بتایا۔

''فی زمانہ تو بہت مشکل ہو جاتی ہے، مسلمانوں کو جہادی، دہشت گرد......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''اگر کوئی تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر میں داخل ہو کر مارنا شروع کر دے تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تم قصور وار ہو یا پھر دوسرا جارحانہ اقدام کا مرتکب ہوا ہے۔ کیا تم مزاحمت نہیں کرو گے اگر تم بے گناہ ہو۔ اسلام وقار سکھاتا ہے، پروقار قوم اپنے اصول وضوابط پر بات کرتی ہے۔ میرے بھائی......! ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ نہ ہم علم سیکھتے ہیں اور نہ تحقیق کرتے ہیں، بے عمل ہیں۔ اسی لئے غیروں کے لگائے گئے الزامات پر منہ کھول کر ہونقوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں اور جہاد تو زندگی ہے، کوئی جہاد کی غلط تشریح لے کر آ جائے تو ہم آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں گے، قطعاً نہیں، ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ غلط تشریح کے بارے میں اس وقت معلوم ہوگا جب ہمیں اس کے بارے میں علم ہوگا''۔ اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''اب میں تمہاری اس بات کا جواب بھی دے دوں تو تم دوسروں پر الزام تراشی کرنے لگو گے کہ فلاں وہ ہے، فلاں وہ کر رہا ہے، اسے کٹ حجتی کہتے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو دیکھنا ہے، ہم کیا ہیں اور کہاں کھڑے ہیں؟ وجہِ تخلیقِ کائنات، سرکار دو عالمؐ سے محبت وعشق کے بارے میں ہمارا! کیا حال ہے؟'' میں نے غیر ضروری بحث میں الجھنا مناسب خیال نہیں کیا۔

''اب جو ملائیت، ہے اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو......'' وہ بولا۔

''میں نے تمہاری بات کا جواب پہلے ہی دے دیا ہے کہ تم دوسروں کی بات کرو گے، کون کیا کر رہا ہے، اس سے قطع نظر پہلے اپنے اندر تو دیکھو، کیا دین سکھاتا ہے کہ کرپشن کرو، دین آپ کو اخلاقی طور پر پابند کرتا ہے کہ رشوت حرام ہے۔ اب اگر تم لے رہے

ہو تو دین کے سسٹم میں تو نہیں آئے نا، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم دین کے سسٹم میں ہیں بھی یا نہیں، اگر ہیں تو کہاں پر ہیں۔ ہمیں اپنی مسلمانی دکھائی دے جائے گی‘‘۔ میں نے پھر اپنی بات دہرادی۔

’’چلو، تم بتاؤ، کیا تبدیلی محسوس کی ہے تم نے؟‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

’’الحمدللہ......! بہت اچھا، بہت پرسکون ہوں، مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی دے سکوں۔ پہلے میں بھی تمہاری طرح سوچتا تھا اور مجھے دین کی راہ پر چلنے والوں کی زندگی بہت کٹھن دکھائی دیتی تھی لیکن اب میں نے اس زندگی میں آکر دیکھا ہے، مجھے بہت اللہ والے ملتے ہیں۔ ان کی زندگیاں دیکھ کر رشک آتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ دین اسلام، دین فطرت ہے، اسے جس سطح پر بھی دیکھا جائے‘‘۔ میں نے کہا تو ہمت سنگھ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

’’بلال بھاء جی، یہ میں نے آپ کی زندگی کا نیا پہلو دیکھا ہے۔ آپ نے اب تک جو بات کی ہے، اس کی کوئی مثال دے سکتے ہیں آپ......؟‘‘

’’میں اگر ہمت سنگھ تم سے دین کی بات کروں گا تو ممکن ہے تم اچھا محسوس نہ کرو اور میں دل آزاری نہیں چاہتا، لیکن میں ایک اور طرح سے بات کرتا ہوں، اس سے تم خود اندازہ لگا لینا اور خالد تم بھی......‘‘ یہ کہہ کر میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر کہتا چلا گیا۔

’’مذہب چاہے الہامی ہو یا غیر الہامی، کوئی بھی مذہب ہے اس کی تمام تر تعلیمات کا نچوڑ یہی ہوتا ہے کہ فساد پیدا کرنے والے طبقے کو ختم کر کے مخلوق خدا کو پرسکون زندگی گزارنے کا حق دیا جائے۔ انسان کے ساتھ شیطانی روپ میں فسادی پیدا ہوتے چلے آئے اور ان کا خاتمہ کرنے والا طبقہ پیدا ہوتا رہا۔ انسانی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ یہی کشمکش ہمیں آج کے دور تک لے آئی ہے۔ ہم اسی برصغیر کی بات کرتے ہیں۔ جب محمد بن قاسم یہاں آیا تو یہاں پر بھگتی تحریک اپنے آغاز میں تھی۔ اس کا بانی شنکر اچاریہ تھا۔ پھر اس خیال کو لے کر رامانج، رامانند، چتینیہ، بھگت کبیر اور گرونانک لے کر آگے بڑھے۔ اصل میں یہ تحریک کیا تھی۔ برہمن مت کے خلاف ردعمل تھا۔ مطلب چند انسانوں کی بہت سارے انسانوں پر حکومت کے خلاف آواز تھی۔ پہلی صدا بدھ مت نے لگائی تھی۔ پھر کیا ہوا ان حالات میں اسلام یہاں آیا تو وہ پھیلتا چلا گیا۔ اس کی وجوہات آپ جانتے ہیں کہ اسلام مساوات اور برابری کا قائل ہے، اس میں نہ چھوت چھات ہے اور نہ ذات کا نظام۔ یعنی فطرت کے قریب تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کن کے ذریعے پھیلا، مسلمان بادشاہوں کے باعث یا صوفیائے کرام کے باعث......! تاریخ بتاتی ہے

کہ صوفیا ہی وہ لوگ تھے جن پر پروانہ وار لوگ فدا ہوتے تھے۔ وہ اس لئے وہ عین فطرت کے مطابق زندگی گزارتے تھے جبکہ بادشاہ دل کی بجائے جسم فتح کرتے رہے۔ مثلاً آخری مغل شہنشاہوں کا وطیرہ کیا تھا، ہندوستان سے باہر کے لوگوں کو نوازتے رہے، ان پر اعتماد کرتے رہے اور یہاں کے لوگوں کو نظرانداز کرنے کے علاوہ انہیں ذلیل کرتے رہے۔ جو فطرت کے قریب نہیں تھا، آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اسی برصغیر کی تاریخ میں جن لوگوں نے فطرت کے مطابق زندگی گزار دی اور اس کے مطابق تعلیم دی، وہ آج بھی آباد ہیں۔ اور جنہوں نے ظلم اور ناانصافی کی، اپنی جانوں پر ظلم کیا، وہ بھی تاریخ بتا رہی ہے کیونکہ دین اسلام میں یہی اصول ہیں، مسلمان ہوتے ہوئے بھی جو ان اصولوں پر نہ چلا تو وہ نام کا مسلمان ہو سکتا ہے، دین فطرت پر نہیں چل رہا ہوتا‘‘۔ میں نے لمبی بات ختم کی تو ہمارے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی۔

’’میرے خیال میں اب اگر دوسرے گرودوارے آپ دیکھنا چاہیں تو چلیں......‘‘ خالد نے گہرے لہجے میں کہا۔

’’ہاں......! میں چاہتا ہوں کہ ہم مغرب کے بعد نکلیں اور رات پنڈی میں رکیں تا کہ......‘‘

’’زیادہ سمارٹ مت بنو، رات ادھر ہی ہو، صبح یہاں سے نکلنا، رات اور بہت ساری باتیں کرنی ہیں‘‘۔

خالد نے کہا اور پھر اپنی بیگم کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئیں تو ہم سب دو گاڑیوں میں نکل کھڑے ہوئے تا کہ ہمت سنگھ کو دوسرے گرودوارے بھی دکھائے جا سکیں۔

* * *

نجمہ پھوپھو نے ناشتہ ہی ماہا کے کمرے میں کیا تھا۔ رات ان کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی، وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ناشتے کے بعد جب ملازمہ برتن اٹھا کر لے گئی تو نجمہ پھوپھو نے کہا۔

’’ماہا......! میں آج واپس لاہور جا رہی ہوں، تھوڑی دیر کے لئے نور پور رکوں گی، تم چلنا چاہو تو چلو‘‘۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ اس کی آواز دھیمی تھی تا کہ کوئی سن نہ لے۔ ’’راستے میں تمہیں تفصیل بتا دوں گی جو میری ابا جی سے بات ہوئی ہے‘‘۔

ماہا نے ایک نگاہ نجمہ پھوپھو کے چہرے پر ڈالی اور پھر بولی۔

’’نہیں......! میں آج اگر آپ کے ساتھ گئی تو انہیں شک ہو سکتا ہے۔ آپ بات کریں، میں سن رہی ہوں اور کوئی دوسرا نہیں سنے گا‘‘۔

''میں نہیں چاہتی کہ کوئی سنے اور یونہی بات کا بتنگڑ بن جائے''۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئی، پھر وہ کہتی چلی گئی۔ ''میں نے رات ان سے کھل کر بات کرلی ہے کہ جس طرح کا جبر آپ لوگوں نے ماہا کے ساتھ کیا ہے، اس طرح کا جبر میں رقیہ اور فہد کے ساتھ نہیں کرسکتی''۔

''آپ نے انکار کردیا''۔ وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''صاف انکار نہیں کیا، لیکن انہیں بتا دیا ہے کہ ماہا خوش نہیں اور کہیں ان میں علیحدگی ہوتی بھی ہے تو پھر میں حاضر ہوں۔ یعنی فہد سے پوچھ لیا جائے گا۔ اب یہ سب تم پر ہے کہ تم کیا چاہتی ہو''۔ نجمہ پھوپھو نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پھوپھو، میں سمجھتی ہوں کہ ساری بات مجھی پر ہے لیکن دادا جی نے اس پر کیا ردعمل کیا''۔ وہ تشویش سے بولی تو حیرت سے بولی۔

''ارے ماہا......! میں تو خود حیران رہ گئی، ابا جی تو بہت پشیمان ہیں اپنے فیصلے پر، اور وہ تم پر ہونے والے ظلم کی بابت بڑے حساس ہیں۔ اصل میں تمہیں احساس ہے کہ نہیں، وہ تم دونوں کی شادی صرف اس لئے کرنا چاہ رہے تھے کہ گھر کی جائیداد گھر ہی میں رہے۔ اب اس میں سراسر فائدہ تو بلال کو ہوا، وہ کیوں چاہے گا کہ تمہیں چھوڑے وہ تو جائیداد کے لئے تمہیں اپنے ساتھ ہر طرح سے باندھے رکھے گا''۔

''ہاں......! یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں۔ اسی لئے تو اتنا زور لگایا گیا کہ میری شادی بلال ہی سے ہو۔ اب بلال آجائے گا تو میں اس سے حتمی بات کرلوں گی''۔

''اب دیکھو، اوپر سے وہ کتنا پارسا بن رہا ہے اور اندر سے......وہی لالچ، جائیداد کی خاطر کسی کی زندگی تباہ ہو جائے، اسے کیا پرواہ، اور اس پلان میں میرا بھائی اور بھابھی دونوں شامل ہیں۔ ابا جی بیچارے تو ان کی باتوں میں آگئے اور رہے احسان بھائی، انہوں نے اپنی بیٹی کہیں نہ کہیں تو بیاہنی تھی، بلال کی صورت میں ان بے چاروں کو اپنا دکھائی دیا تو انہوں نے ہاں کر دی، مگر افسوس ہے، بیٹی......اس سارے فیصلے میں تمہارے جذبات کا خیال قطعاً نہیں کیا گیا''۔

''اب آپ کے سامنے ہی تھا پھوپھو، میں نے کتنا کہا تھا کہ میری شادی بلال سے نہ ہو، لیکن میں کیا کرسکی، مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کیا گیا'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

''خیر......! تم دل چھوٹا مت کرو، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں سب کچھ سنبھال لوں گی''۔ وہ بولی۔

''خیر......! جو قسمت میں ہوگا'' وہ حسرت سے بولی۔

''نہیں......! میری بیٹی کی قسمت بہت اچھی ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے سرگوشی والے انداز میں کہا، ''اب تم سے کیا چھپانا تم گھر کی بیٹی ہو، الطاف اب ریٹائرمنٹ کا سوچ رہے ہیں اور یہ جلدی ہو جائے گا، انہوں نے اب تک جو کمایا ہے وہ ایک سوئس بینک میں پڑا ہے۔ وہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ وہ فہد کو اپنے ساتھ باہر لے کر جائیں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہیں کاروبار کیا جائے یا پھر فہد کو وہاں سیٹ کر کے خود یہاں کوئی بزنس شروع کریں۔ جو ظاہر ہے امپورٹ ایکسپورٹ کا ہوگا۔ اب کسی کو کیا بتائیں کہ فہد کیوں نہیں کچھ کر رہا ہے۔ تم دونوں کا اگر ساتھ ہو جائے گا تو ایک خوشحال زندگی تم لوگوں کی منتظر ہوگی۔ تمہاری قسمت بہت اچھی ہوگی میری بیٹی''۔ نجمہ پھوپھو نے اسے مستقبل کے بارے میں اپنا خیال بتایا تو ماہا چند لمحے اپنی پھوپھو کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ پھر بولی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب وہ سرمایہ سامنے تو نہیں لایا جا سکتا۔ خیر......! اور بہت ساری باتیں ہیں جو ہم بعد میں کریں گے، تم اس بات کو اپنے تک محدود رکھنا۔ بعد میں جب فہد باہر چلا جائے گا تو سب دیکھ لیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس دولت پر کوئی بیگانی آ کر عیش کرے۔ یہاں تک کہ الطاف کی رشتے دار بھی نہیں۔ بہت محنت سے کمائی ہے یہ دولت، یہاں تک کہ ہم نے اپنا گھر تک نہیں بنایا، ساری زندگی سرکاری گھروں میں رہے۔ اب تو زندگی سکھ میں گزرنی چاہیے''۔ نجمہ پھوپھو نے یوں کہا جیسے وہ بہت مظلوم ہیں۔

''نہیں پھوپھو......! یہ بات میں خود تک ہی محدود رکھوں گی کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دوں گی''۔ اس نے یقین دلایا۔

''ٹھیک ہے، اب ابا جی کا رویہ تمہارے ساتھ بہت حد تک تبدیل ہو جائے گا، اور تم نے کیا کرنا ہے یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں بہر حال تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گی، فکر مند نہیں ہونا، حوصلے سے رہنا۔ بلال آئے تو اس سے حتمی بات کر لینا''۔ پھوپھو نے اسے ہدایات دیں۔

''ان دنوں میں تو شاید اس سے بات نہ ہو سکے۔ اس کے کوئی فارن سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر دادا جی نے کوئی بات کی تو میں انہیں صاف بتا دوں گی کہ میں بلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی''۔ ماہا نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے، جس طرح تم بہتر سمجھو، میں تو بیٹی تمہارے لئے ہر طرح سے حاضر ہوں''۔ نجمہ پھوپھو نے کہا۔ پھر اٹھ کر چلتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تو ماہا......! میں اب چلتی ہوں۔

بڑا لمبا سفر ہے۔ میں جاتے ہی فون کروں گی، تم اپنا بہت سارا خیال رکھنا‘‘۔

’’چلیں......! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں باہر تک......‘‘ ماہا نے کہا تو دونوں کمرے سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

ہم حسن ابدال کے لئے صبح سویرے نکلے تھے اور تقریباً دوپہر کے وقت حسن ابدال پہنچ گئے۔ جی ٹی روڈ سے مشرق کی طرف شہر میں داخل ہو کر ٹیڑھے میڑھے راستے سے گرودوارہ پنجہ صاحب تک جا پہنچے۔ وہ تنگ سی گلی میں واقع ہے لیکن اندر سے خاصی کھلی عمارت ہے۔ ہمت سنگھ اور جند کور کے چہرے پر وہی تقدس اتر آیا۔ ڈرائیور گاڑی میں رہا اور ہم چاروں اندر چلے گئے۔ گرودوارے میں ایک بڑا سارا تالاب ہے جس کے ایک جانب سے پانی گر رہا ہے، وہیں پر ایک پتھر میں انگلیوں سمیت پوری ہتھیلی کندہ ہے، جس کے بارے میں روایت ہے کہ اس پتھر کو بابا گرونانک نے اپنے ہاتھ سے روک دیا تھا۔ وہاں پر اور چند لوگ بھی تھے جو اپنے عقیدے کے مطابق اس جگہ کو تقدس دے رہے تھے۔ وہاں ایک چیز میں نے ایسی دیکھی جس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا، وہ تھی زمین اور تالاب کے اردگرد لگی ٹائلوں پر عطیہ دینے والوں کے نام اور دی گئی رقم کندہ تھی۔ وہ تینوں تو وہیں گھومنے پھرنے لگے، لیکن وہیں پر ایک آدمی ایسا آ گیا جسے میرے بارے میں بتایا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک دفتر نما کمرے میں جا بیٹھا۔ ان کا کیرتن شام کے وقت تھا۔ بہرحال اس دوران اس بندے نے ہماری خود آؤ بھگت کی۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب ہم وہاں سے نکلے۔ ایک جگہ جی ٹی روڈ پر ہی چائے پینے کے لئے رکے، وہیں میں نے نماز ادا کی اور پھر پنڈی کے لئے روانہ ہو گئے۔

’’سر جی......! اگر آپ لاہور تک چلنا چاہیں تو میں فریش ہوں‘‘ ڈرائیور نے کہا تو میں نے ہمت سنگھ کی جانب دیکھا تب وہ بولا۔

’’اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہم گھر جا کر آرام کریں۔ یہی ہے نا دیر ہو جائے گی‘‘۔

’’تقریباً پانچ گھنٹے کا رستہ بنتا ہے‘‘۔ میں نے اسے بتایا۔

’’کوئی بات نہیں، اب تو پنڈی سے لاہور تک سڑک بھی موٹروے بن چکی ہے، گھر ہی چلتے ہیں‘‘۔ ہمت سنگھ نے کہا تو میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ وہ لاہور ہی چلے۔ پھر راستے میں کھاتے پیتے، نماز پڑھتے اور تھوڑی دیر رک کر چلتے ہم آدھی رات کے بعد گھر پہنچے لیکن یہ سکون ہو گیا کہ ہم گھر پہنچ چکے ہیں۔

اگلے دن جب میں دفتر سے واپس آیا تو وہ تینوں فریش تھے اور حویلی جانے کے لئے بالکل تیار تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، میں نے نماز پڑھی اور گلاب نگر کے لئے نکل پڑے۔ وہی مغرب کا وقت ہو رہا تھا جب ہم نور پور کے نواح میں پہنچ گئے۔ میں خود پر چاہتا تھا کہ نماز میاں صاحب والی مسجد میں ادا کروں۔ نماز کے بعد پتہ چلا کہ وہ یہاں شہر میں نہیں ہیں۔ چند دن کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ سو وہاں سے چل پڑے۔

حویلی کے پورچ میں گاڑی رُکی تو جند کور نے سرگوشی میں کہا۔ ’’ویر جی......! میں بہر حال آپ کو اتنا امیر نہیں سمجھتی تھی لیکن یہ حویلی دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ آپ تو......‘‘ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’یہ نہ میری کمائی ہے اور نہ میرے باپ کی، بلکہ میرے دادا کی محنت ہے، ان پر اللہ کا کرم ہے۔ انہوں نے اس علاقے کی آبادکاری میں خود محنت کی ہے، وہ علاقے کی خدمت کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں‘‘۔ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

’’آپ تو چاہے نوکری نہ کریں، پھر بھی آپ ٹھیک ٹھاک ہیں‘‘۔ جند کور دوبارہ بولی۔

’’اُو میری بہن......! بندے کو ہر وقت، ہر طرح کے حالات کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ خیر، آؤ اترو، باقی باتیں اندر چل کر ہوتی رہیں گی‘‘۔ میں نے کہا اور پھر گاڑی سے اتر کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ جہاں دادا نور الٰہی کے ساتھ، ابا جی، امی، رقیہ اور ملازمین موجود تھے۔ میں ان سب کا تعارف کرایا تو فطری طور پر جند کور نے کہا۔

’’ویر جی، آپ کی وہٹی......؟‘‘

’’بیٹی......! وہ ابھی اپنے کمرے میں ہے......آتی ہو گی‘‘۔ امی نے کہا پھر صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی، ’’آؤ بیٹھو......آپ بھی بیٹا بیٹھو‘‘۔

’’ہاں جی......! کیسی رہی آپ لوگوں کی یاترا؟‘‘ دادا جی نے بہت خوشگوار انداز میں پوچھا تو ہمت سنگھ نے کہا۔

’’جی بہت ہی اچھی، بلال بھاء جی نہ ہوتے تو اب تک ہم دھکے ہی کھا رہے ہوتے۔ اتنی اچھی گاڑی میں نہایت سکون سے سفر کیا، ان کے تعلق کی وجہ سے بہت احترام ملا......‘‘ وہ رطب اللسان ہو گیا تو ان کے درمیان باتیں چل نکلیں۔ میں نے امی کی طرف دیکھا اور پھر باہر کی سمت چل دیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ بھی وہیں آ گئیں۔

’’امی......وہ ماہا ادھر ہی ہے یا نور پور میں......‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ادھر ہی ہے، اسے معلوم ہو گیا ہے لیکن ابھی تک آئی نہیں......‘‘ امی نے تذبذب

میں کہا۔

''اسے......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولیں۔

''میں نے بلوایا ہے اسے، آتی ہوگی''۔ یہ کہہ کر امی کچن کی جانب چل دیں اور میں ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں کے ماحول میں اجنبیت نہیں رہی تھی۔

کچھ دیر بعد فریش ہو کر ہم سب کھانے کی میز پر تھے۔ تب وہاں ماہا موجود تھی۔ میں نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے ذرا بھی اہتمام نہیں کیا تھا۔ وہی تنگ سے بے ہودہ کپڑے، گلے میں دوپٹہ، بنا میک اپ کئے تنا ہوا چہرہ، یوں جیسے وہ بھی وہیں پر مہمان ہی ہو۔ جندکور اسے بڑے چاؤ سے ملی تھی اور مجھے اس کے رویے سے یوں لگا کہ وہ بس وقت نبھا رہی ہے۔ جندکور اس کے ساتھ بیٹی تو جتنی بھی باتیں ہوئیں وہ جندکور ہی کرتی رہی۔ کھانے کے بعد دادا جی نے سب کو آرام کا مشورہ دیا اور باتیں کل پر چھوڑ دیں۔ مجھے بہرحال افسوس ہو رہا تھا کہ ماہا کا رویہ تبدیل نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے بھی سخت ہو گیا ہے۔ اس نے مجھ سے سوائے علیک سلیک کے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔

اگلے دن ہم سب مرد ناشتے کے بعد لان میں آ بیٹھے، نرم دھوپ تھی اور موسم بھی بڑا خوشگوار تھا۔ ہمت سنگھ اور ابا جی اور دادا جی کے درمیان قیام پاکستان، مشرقی اور مغربی پنجاب کے معاشرے، تمدن اور تاریخ کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہمت سنگھ اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ تبھی امی نے چائے بھجوا دی اور پھر خود بھی جندکور کے ساتھ وہیں آ گئیں۔ جندکور کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ تھوڑی سی دیر بعد بے نیازی سی ماہا بھی وہیں آ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی جندکور نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں نے پہلے بھی بلال ویر سے کہا ہے کہ مجھے نہیں احساس تھا کہ آپ اس قدر امیر ہوں گے، ویر جی کے رویے سے اس کی سادگی سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ ہماری طرح ہی مزدور لوگ ہوں گے۔ خیر......! میں نے آتے وقت اپنے ساتھ تھوڑے سے تحفے رکھ لئے تھے۔ جیسے بھی ہیں بہرحال قبول فرمایئے گا۔ اس نے آدھی پنجابی اور آدھی انگریزی میں اپنی بات مکمل کی تو دادا جی نے کہا۔

''بیٹی......! تم آ گئی ہو، اتنی بڑی بات ہے۔ تحفہ کوئی بھی معمولی نہیں ہوتا، بہت قیمتی ہوتا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ جذبات ہوتے ہیں اور وہ انمول ہوتے ہیں بیٹی۔''

''بہت شکریہ......!'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیگ کھولا اور اپنی سمجھ کے مطابق سب کو کپڑے ہی پیش کرتی رہی، پھر آخر میں اس نے دو پیکٹ نکالے اور بولی ''اور یہ ہے بلال ویر

کی ووہٹی اور میری بھابی کے لئے'' یہ کہہ کر اس نے ایک پیکٹ بڑھایا اور بولی۔ ''یہ میری طرف سے اور یہ دوسرا پیکٹ پی اون کی طرف سے۔''

میں نے ماہا کی جانب دیکھا، اس کا چہرہ تن گیا تھا، پھر اس نے سب کی جانب ایک نگاہ سے دیکھا اور ڈھیلے سے ہاتھوں کے ساتھ وہ دونوں پیکٹ پکڑ لئے۔ تب جندکور پھر بولی۔

'مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کس طرح کے کپڑے پہنتی ہو اور پھر سائز کا بھی مسئلہ تھا۔ اس لئے میں یونہی خالص سلک لے آئی ہوں، لیکن پی اون نے آپ کے لئے سلا سلایا سوٹ بھیجا ہے، اس نے کہا تھا کہ آپ یہ پہن کر ایک تصویر انہیں بھیج دو، تاکہ وہ آپ کو دیکھ سکے۔'' جندکور کے یوں کہنے پر ماہا نے اس کی جانب دیکھا، مگر اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ ''بلال بھاء جی، آج ہم واپس جائیں گے۔ میرا خیال ہے، ہم شام تک واہگہ پہنچ جائیں گے۔'' ہمت سنگھ نے کہا تو دادا جی بولے۔

''اونہیں یار......! ابھی چند دن رہو، پھر جانا۔''

انہوں نے کہا تو ہمت سنگھ اپنی مجبوریاں بتانے لگا۔

''اچھا ٹھیک ہے، آج شام ہی کو واپس جائیں گے، کل میں لاہور دکھاؤں گا اور شام تک واہگہ چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا تو پھر ہمت سنگھ نے کوئی بات نہیں کی۔ انہی لمحات کے دوران ماہا اور جندکور اٹھ کر اندر چلی گئیں اور ہم اپنی باتوں میں مگن رہے۔

❁......❁......❁

ماہا اپنے کمرے میں جندکور کو لے گئی۔ سہولت سے بیٹھ جانے کے بعد ماہا نے بڑے نرم انداز میں پوچھا۔

''آپ کے تحفے کا بہت شکریہ، مگر یہ پی اون کا تحفہ؟ اس کی مجھے سمجھ نہیں آئی، یہ پی اون کون ہے؟''

''کیا آپ کو بلال ویر نے نہیں بتایا؟'' جندکور نے حیرت سے کہا۔

''میں نے کبھی اس موضوع پر ان سے بات نہیں کی۔ ہاں سنا ضرور ہے وہ پٹایا میں رہتی ہے اور ان کی نیٹ پر دوست بنی تھی......؟'' ماہا نے کہا۔

''ویسے عجیب بات ہے انہوں نے نہیں بتایا، بہت اچھی لڑکی ہے وہ، میرے پاس بھی آتی رہتی ہے، میرے ساتھ تعارف بلال ویر کی ہی وجہ سے ہوا تھا'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بہت محتاط انداز سے بولی۔

''جندکور......! آپ نے شاید اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میرے اور بلال کے درمیان کوئی

اتنا اچھا تعلق نہیں ہے، میں نہیں سمجھتی کہ یہ بات چھپی رہ سکتی ہے، اس کی وجہ وہی پی اون ہے۔ یہ جب یہاں سے گئے تھے تو اتنے مذہبی نہیں تھے لیکن جب واپس آئے ہیں تو بہت مذہبی ہو گئے ہیں یہ ایک پہلو ہے، اور دوسری بات میں سمجھتی ہوں کہ لوگ پتایا کیوں جاتے ہیں، سیر و تفریح کے لئے۔ میں بھی اس دنیا میں رہتی ہوں۔ ٹیلی فون، انٹرنیٹ، میگزین یعنی ایسی ساری چیزوں تک میری بھی رسائی ہے کہ میں دنیا کے بارے میں جان سکوں۔ پتایا کیسا شہر ہے، میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی، میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ پی اون نے ان پر ایسا کیا کر دیا ہے کہ یہ پہلے جیسے رہے ہی نہیں؟“ ماہا نے تفصیل کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”ماہا بھابی......! ایک عورت ہونے کے ناطے میں آپ کی بات بہت گہرائی تک سمجھ رہی ہوں۔ جہاں تک پی اون اور بلال ویر کی بات ہے۔ ان کے درمیان تعلق کا مجھے یہی احساس ملا ہے کہ وہ دونوں فقط دوست رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔“ جند کور نے صاف گوئی سے کہا۔

”آپ ایسا کس طرح کہہ سکتی ہو۔“ ماہا نے پوچھا۔

”وہ رہے ہیں میرے پاس اور ایک عورت دوسری عورت کے بارے میں سمجھ سکتی ہے کہ وہ کیسی ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ ہم ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں، جس کا تصور بھی ہمارے پنجاب میں نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے یہ بڑی بھیانک اور شرم کی بات ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ ان دونوں کا کوئی غلط تعلق رہا ہوگا اور جہاں تک بلال ویر کے بدل جانے کی بات تو میں اس پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ جند کور نے کہا۔

”وہ کیا بہت امیر ہے، حسین ہے، کیا ہے وہ؟“ ماہا نے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ایک عام سی لڑکی ہے جو اپنی زندگی گزارنے کے لئے جاب کرنے پر مجبور ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”میں نہیں جانتی آپ دونوں میں اتنی سرد مہری کیوں ہے، اس کی وجہ پی اون ہے یا کچھ اور لیکن......! میں اتنا بتا دوں، بلال ویر بہت اچھا انسان ہے، اس کی قدر کرو، اگر سرد مہری کی وجہ فقط پی اون ہے تو مجھے افسوس ہوگا۔“

”اصل میں بنیاد تو وہ ہے نا......“ ماہا نے اصرار سے کہا۔

”دیکھو ماہا بھابی......! مجھے دنیا کا نہیں پتہ، لیکن ایک پنجابی عورت ہونے کے ناطے میں یہ سوچتی ہوں کہ مرد تو باہر جاتا ہے وہ وہاں کچھ بھی کر سکتا ہے، عورت تو گھر میں رہتی ہے۔ مرد اگر آپ کو آپ کے بچوں کو پورا وقت دے رہا ہے اور ہر طرح سے خیال رکھتا ہے تو پھر آپ اس کے باہر کے معاملات میں دخل نہ دیں، ورنہ پھر وہ آپ سے جھوٹ بولنا شروع کر دے گا۔“

”اور یہی جھوٹ سارے فساد کی جڑ ہوتی ہے......“ ماہا نے اپنی طرف سے نکتہ نکالا، اس بات کو جند کور نہ سمجھ سکی۔

”بالکل......! پھر معاملات بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ آپ اپنے گھر میں سکون رکھنا ہے تو شوہر کی توجہ بہر حال بیوی کو حاصل کرنا پڑے گی۔“ جند کور نے کہا تو ماہا جلدی سے بولی۔

”نہیں......! وہ پی اون، جس نے میرے لئے تحفہ بھیجا ہے، وہ اب بھی آپ سے ملتی ہے؟“

”بس ایک دو بار، بلال ویر کے آنے کے بعد، میں بتاؤں، وہ اتنی اہم نہیں ہے، جتنی آپ سمجھ رہی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے معاشرے کی، وہاں کے لوگوں کی اور خصوصاً لڑکیوں کی سوچ ہی نرالی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں محبت، عشق ہوتا ہے نا، انہیں اس کا تصور تک نہیں ہے، ان کی ساری توجہ بس اسی بات پر رہتی ہے کہ دوسرے کی جیب سے زیادہ سے زیادہ پیسے نکلوالیں۔ بلال ویر نے اپنی شادی پر آنے کی دعوت دی تھی۔ ہم نہیں آسکے، سیدھی سی بات ہے ہمارے پاس اتنے پیسے ہی نہیں تھے۔ وہ ہمارے گھر میں رہے، میں نے ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جو قابل اعتراض ہو۔“

”مگر میں اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔“ ماہا نے صاف انداز میں کہا۔

”اور میں اس سے زیادہ بس اتنا جانتی ہوں کہ اب ان دونوں میں وہ تعلق بھی نہیں رہا، میرے خیال میں اس نے یہ تحفہ بھی یونہی مروت میں بھیج دیا ہے۔“ جند کور نے کہا۔

”چلیں ایسا ہی ہو۔“ ماہا نے بات ہی سمیٹ دی اور یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ دونوں کافی دیر تک کمرے میں رہیں۔

❀......❀......❀

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم گلاب نگر سے نکل پڑے، ہمیں کچھ دیر احسان تایا کے پاس بھی رکنا تھا اور پھر اس کے بعد ہم نے لاہور کے لئے نکل جانا تھا۔ ہم گلاب نگر کی حدود سے باہر نکلے ہی تھے کہ جند کور بڑے جذباتی انداز میں بولی۔

”اے کاش میرے پاس چند دن ہوتے اور میں یہاں رہ سکتی۔“ اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”تو کس نے روکا ہے جند......! ہم ابھی واپس چلے چلتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں نا......! ہم تو مزدور لوگ ہیں۔ اب پتایا میں دکان کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔

جبکہ امرتسر میں چند دن لگ جاتے ہیں۔ پھر پتہ نہیں قسمت ہمیں یہاں کبھی لاتی بھی ہے یا نہیں۔'' ہمت سنگھ نے بھی بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

''ویسے ایک بات کہوں ویر جی......! مجھے یہاں جتنا وقت گزارنے کا موقع ملا ہے نا، اس سے کہیں بڑھ کر محبت ملی ہے، نجانے کیوں مجھے یوں لگا ہے جیسے میں اپنے میکے میں آ گئی ہوں اور دادا جی......! انہوں نے تو بالکل یوں رخصت کیا ہے، جیسے بیٹیوں کو کرتے ہیں۔ میں ان کا یہ احسان کبھی نہیں چکا پاؤں گی۔'' جند کور کا بھیگا ہوا لہجہ بہت کچھ بیان کر رہا تھا، تب میں نے کہا۔

''جند......! ایک جانب تم میکہ محسوس کر رہی ہو اور دوسری جانب احسان کی بات کر رہی ہو، مجھے تمہاری سمجھ نہیں آ رہی ہے۔''

''یقین جانو ویر جی، مجھے واقعتاً سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ میں یہاں سے بہت کچھ لے کر جا رہی ہوں۔ جو بھاری بیگ میرے ساتھ انہوں نے کر دیا ہے، یہ صرف کیش، کپڑے اور دوسری چیزیں نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ انمول جذبے اور بہت ساری یادیں ہیں۔ یہاں آ کر میرا دل کیا کہ کاش میں پنجاب کے کسی گاؤں میں رہتی، خیر......! یہ تو ساری خیالی باتیں ہیں اور حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ زندگی بھی تو جینا ہے نا۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اتنا بھی اب مایوس نہ ہو، اگلے سال میں پھر تم لوگوں کو بلا لوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا......! میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں، لیکن آپ نے برا محسوس نہیں کرنا۔'' جند کور نے تذبذب میں کہا۔

''بولو'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جتنا بھی بیوی سے پیار، محبت یا پھر عشق جتاتے تھے، اتنا ہے نہیں یا پھر یہ آپ ہی کی طرف سے ہوگا۔ اس کی طرف سے تو نہیں ہے۔ معذرت کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔ وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہو پا رہی ہے۔''

''یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن جہاں تک میرے پیار، محبت یا عشق کی بات ہے، وہ مجھے اس کے ساتھ ہے، اسی لئے تو میں اسے سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ وہ اپنا رویہ درست کرے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''ویسے ویر جی آپ غور کرو، آپ سے بھی کہیں غلطی ہوئی ہے اور اس غلطی کا احساس ماہا نے اس وقت سے محسوس کیا ہے، جب آپ پٹایا گئے تھے۔ وہاں جانے سے لیکر اب تک

کے وقت کو یاد کریں اور اس پر غور کریں۔ یہیں کچھ ہے، جس کی تلاش سے آپ کے سارے معاملات درست ہو سکتے ہیں۔'' جند کور نے بہت گہرائی میں کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

میری ماہا سے بہت دیر تک بات ہوتی رہی ہے۔ وہ احمق نہیں ہے اور نہ بیوقوف ہے۔ وہ بہت عقل مند اور ذہین ہے، لیکن اس وقت اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کر رہی ہے، اپنی ذات پر بھی نہیں۔ وہ بار بار پی اون کے بارے میں بات کرتی تھی۔ ظاہر ہے اس میں آپ دونوں کے تعلق کا حوالہ ہو سکتا ہے۔ سو مجھے لگتا ہے کہ وہ گرہ جو آپ دونوں کے درمیان میں پڑ چکی ہے وہ یہیں کہیں ہے۔'' وہ بہت سوچ کر بولی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں، لیکن اسے مجھ پر یقین کرنا چاہئے اور ویسے بھی اس کے مسئلے کچھ اور ہیں۔ وقت کے ساتھ وہ سمجھ جائے گی۔'' میں نے اس موضوع سے ہٹنا چاہا۔

''نہیں......! وقت اور زیادہ گرہیں ڈالے گا۔ جب تک اس وجہ کو تلاش نہ کر لیا جائے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر بولی۔ ''عورت ہونے کے ناطے ایک بات کہہ رہی ہوں، اسے ذہن میں رکھئے گا، جب عورت کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے چاہنے والے کا رجحان کسی اور طرف ہے تو وہ اتنا شدید ردعمل ظاہر کرتی ہے جتنا اس کے دل میں پیار ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ماہا کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔'' اس نے اپنا تجزیہ بتایا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا تو میں نے پوچھا۔

''اس نے تم سے اس معاملے میں بھی کوئی بات کی ہے کہ ہمت سنگھ کسی تنظیم وغیرہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے؟''

''آں......ہاں......ایسی کوئی بات کر رہی تھی۔ لیکن میں نے اسے یہی بتایا کہ ہم تو بھارت میں نہیں رہتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چونک گئی پھر بولی۔ ''ویسے یہ کیا معاملہ ہے......''

''وہ کہیں ہمیں دہشت گرد یا خالصتان تحریک کے لوگ تو نہیں گمان کر رہی ہے۔'' ہمت سنگھ ہنستے ہوئے بولا۔

''اوہ نہیں......!'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے بات ہوا میں اڑا تو دی، لیکن دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ ماہا اب پوری [illegible] پر اتر آئی ہے۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ بولا۔

''اوہ یار......! اس نے دوسری کئی باتیں اپنے طور پر پوچھی ہوں گی۔ اصل میں وہ پی اون، تمہارے اور میرے تعلق کی کوئی بنیاد تلاش کرنا چاہتی ہوگی، یونہی بال کی کھال نکالنا اس کا

محبوب مشغلہ ہے......'' میں نے اس کا دھیان بدل دیا۔ تب ہم یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ نور پور آ گیا اور ہم تایا احسان کے بنگلے تک جا پہنچے۔

تایا احسان اور تائی ذکیہ بیگم نے خندہ پیشانی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ کافی دیر سے ہمارے انتظار میں تھے۔ سب پر نگاہ ڈال کر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''بھئی ماہا کیوں نہیں آئی؟''

''میں نے کہا تھا لیکن وہ کہہ رہی تھی میری طبیعت خراب ہے۔'' میں نے نیم دلی سے کہا تو وہ سمجھ گئے اور پھر مہمانوں کو اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ یونہی باتیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ پر تکلف چائے چن دی گئی۔ چائے کے دوران بھی باتیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ میں نے وہیں نماز پڑھی تو ہم نے اجازت چاہی، تب پھر ہم وہاں سے لاہور کے لئے نکل پڑے۔ جند کور کو ان کا رویہ بہت پسند آیا تھا، پھر ہم رات گئے لاہور پہنچ گئے۔ تھکن سے برا حال ہو رہا تھا، میں بیڈ پر لیٹتے ہی سو گیا۔

اگلے دن میں نے انہیں پر تکلف کھانا دیا اور شاپنگ کروائی۔ انہیں کوئی اتنی زیادہ چیزیں پسند تو نہ آئیں تاہم انہیں گھوم پھر کر زیادہ مزہ آیا۔ انار کلی کی جانب جاتے ہوئے جب اسمبلی ہال کے سامنے سے گزرے تو میں نے وہاں گاڑی روک کر کہا۔

''تم جانتے ہو ہمت سنگھ، یہ وہ جگہ ہے جہاں سکھ لیڈر تارا سنگھ نے اپنی تلوار لہرائی تھی۔''

''اچھا تو یہ وہ جگہ ہے جس کے باعث پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''لیکن اس تقسیم کے ساتھ کتنا خون بہا، یہ جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا اور گاڑی بڑھا دی۔

''بہت بہا......! شاید یہ اسی کی وجہ سے آزادی کے بعد سکھ قوم بھارت میں اب تک خون میں نہا رہی ہے۔ یہاں تک کہ دہلی میں تو سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ میں نہیں مانتا کہ بھارت سیکولر ملک ہے، اس پر اب بھی وہیں برہمن ازم چھایا ہوا ہے جو کسی دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''خیر......! آؤ، اب تمہیں راجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی دکھاؤں۔'' میں نے اس کی توجہ کسی اور جانب کر دی۔ پھر وہاں سے گھومتے گھماتے پی سی میں آ گئے، جہاں ہم سب کے سامنے کھانا چن دیا گیا۔ وہاں کچھ دیر گزارنے کے بعد سہ پہر کے وقت میں انہیں واہگہ کی جانب لے گیا۔ دوسری جانب ان کے کزن انہیں لینے آئے ہوئے تھے اور پھر جب کاغذی

کارروائی کے بعد وہ جانے لگے تو ہمت سنگھ نے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹور مجھے ساری زندگی یاد رہے گا، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا یہاں سے جانے کو دل نہیں کرے گا۔'' اس نے کہا تو جند کور نے میرے سامنے سر جھکا دیا تو میں نے اس کے سر پر پیار دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ویرجی......! آپ سب مجھے بہت یاد آؤ گے......'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا پھر جیت سنگھ کو اٹھا کر میں نے پیار کیا اور وہ لوگ چلے گئے۔ میں جب گھر واپس آیا تو مغرب ہو چکی تھی۔

❁......❁......❁

دادا نور الٰہی عشاء پڑھ کر واپس آئے تو افضال نور کے ساتھ زبیدہ خاتون بھی ان کے کمرے میں جا پہنچیں۔ دادا انہی کے انتظار میں تھے۔ سہولت سے بیٹھ جانے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی افضال اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے۔''

''ابا جی، میں رقیہ کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے احساس تو ہو گیا ہے نجمہ کا رجحان اب ہماری طرف نہیں رہا، اب اس کے بارے میں سوچنا بھی تو ہے نا۔'' افضال نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''ہاں کیوں نہیں......! میں تب ہی سمجھ گیا تھا جب بلال کی شادی پر انہوں نے منگنی نہیں کی تھی۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا اس کی دھندلی سی وجہ میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ میں پوری تصدیق کر لوں تو پھر ان سے بات کروں گا، اس کی طرف سے تو سمجھ اب نہ ہی ہے۔'' دادا نے بڑے دکھی لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''چلیں کوئی بات نہیں، یہ خواہش بھی تو انہوں نے کی تھی، اب خاندان میں کوئی دوسرا لڑکا تو نہیں ہے، اب ہمیں باہر ہی دیکھنا ہو گا نا، کچھ خاندانوں کی خواہش بھی ہے، ان میں چودھری سرفراز نے میرے ساتھ بات کی تھی۔'' افضال نے کہا تو دادا جی چونک گئے۔

''اس نے کب بات کی تھی؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کافی عرصے سے ہمارے درمیان ایک مشترکہ دوست بات چلا رہا تھا۔'' افضال نے بتایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اس سے اچھا خاندان اور کیا ہو سکتا ہے۔ انہیں تم چاہے صبح ہی بلوا لو۔'' دادا جی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"جی، وہ تو صبح آ جائیں گے، میں اپنے دوست سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔ میرے خیال میں اس موقعہ پر احسان کو بھی تو بلوا لیں نا، اس سے مشورہ کر لیں۔" افضال نے احترام سے کہا۔

"ہاں، اس سے مشورہ بھی کر لیں گے، ایک بار وہ اپنی خواہش کا اظہار کر جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔" دادا جی نے کہا۔

"ابا جی کی بات بالکل ٹھیک ہے۔" زبیدہ خاتون نے ہنکارا دیا۔

"صاف بات ہے ابا جی......! یہ میری بیٹی کا معاملہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اگر وہ لوگ آئیں تو کسی بھی قسم کا کوئی غلط تاثر لے کر جائیں۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو......" نور الٰہی نے پھر چونکتے ہوئے کہا۔

"چودھری سرفراز ہمارے خاندان سے تو نہیں ہے۔ اس سے تو وہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی بات کو نظر انداز کر دے، لیکن اس کے ساتھ آئی خواتین یا دوسرے لوگ اپنی رائے دے سکتے ہیں نا، میری مراد ماہا سے ہے۔" وہ بولا تو دادا ایک دم سوچ میں پڑ گیا، پھر خوش گمانی سے بولا۔

"نن......نہیں، میرا خیال ہے، وہ ایسی کوئی بات تو نہیں کرے گی کہ جس سے کوئی غلط تاثر جائے......"

"ضروری نہیں ہوتا ابا جی کہ کوئی بات ہی کی جائے۔" زبیدہ خاتون نے بڑے احترام سے کہا۔" اب وہ جند کور وغیرہ آئے تھے۔ بات تو نہیں کی انہوں نے لیکن ان کے سامنے ماہا کا رویہ کیا تھا۔ وہ تو پردیسی تھے چلے گئے۔ ان کا تعلق اگر رہے گا بھی تو بلال سے۔ وہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا لیکن......! ان مہمانوں کے سامنے اگر اس کا رویہ یہی رہا تو وہ یہاں سے کیا تاثر لے کر جائیں گے۔ ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں۔"

"بات تو معقول ہے، مگر ماہا سے کس طرح کہا جائے، وہ تو فوراً کہہ دے گی کہ آپ سب میرے بارے بدگمانی رکھتے ہیں۔ نہیں میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گی۔" دادا نے بڑے وثوق سے کہا۔

"لیکن اگر احسان اور ذکیہ آ جائیں تو میرا خیال ہے وہ......" افضال کہنے لگا تو دادا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا" ٹھیک ہے، میں انہیں بھی بلوا لوں گا، بلکہ تم خود فون کر دینا۔ انہیں اچھا بھی لگے گا اور مہمانوں کو بھی آگہی ہوگی کہ ان دونوں بھائیوں کی ایک بات ہے۔"

"اچھی بات ہے......" دادا نے اس سے رضامندی کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دیر تک اس موضوع

پر بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ طے پا گیا چودھری سرفراز کو بلوا لیا جائے۔ ان کی خواہش پر کچھ وقت مانگ لیا جائے، لیکن وہ زیادہ نہ ہو، اس میں چند دن یا ایک آدھ ہفتہ ہو اور منگنی کر دی جائے۔ پھر شادی کا بعد میں سوچ لیا جائے گا۔

تیسرے دن حویلی میں خاصی گہما گہمی ہو گئی۔ اس شام چودھری سرفراز کے ساتھ مہمانوں نے آنا تھا۔ احسان نور اور ذکیہ بیگم دوپہر ہی کے وقت پہنچ گئے تھے۔ افضال نے انہیں تفصیل سے اس بارے معاملے میں بتایا وہ لوگ خوش تو ہوئے مگر نجمہ کے بارے میں افسوس کرنے لگے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔

"افضال بھائی......! ویسے ایک بات ہے۔" ذکیہ بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ بھی نجمہ باجی کی باتیں چلتی رہی ہیں، جب شروع شروع میں اس نے بات کی تھی تو کیا اس نے فہد سے پوچھے بغیر کی تھی۔ یہ بات کم از کم میں نہیں مانتی، کیونکہ ایک بار اس نے میرے سامنے یہی بات کی تھی اور فہد اس وقت ہمارے پاس تھا، اگر اسے روکنا ہوتا تو اسی وقت یا بعد میں لاہور جا کر روک دیتا، اپنی مرضی بتاتا، لیکن وہ بدستور رقیہ کے لئے کوشش کرتی رہی، لیکن ایسا ہوا کہ اچانک اس نے انکار کر دیا۔"

"انکار تو اس نے کیا ہی نہیں بیگم۔" احسان نے اسے یاد دلایا۔

"مطلب ابا جی کے سامنے تو یہی کہہ گئی ہے نا، حتمی بات نہ کرنے والا، تذبذب میں رکھنے والا انکار ہی کر رہا ہوتا ہے۔ کیا ہمیں اس نکتے پر نہیں سوچنا چاہئے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"بات تو تمہاری سوچنے والی ہے، مگر وہ ایسا کیوں کرے گا، وہ اپنی مجبوری بتا گئی ہے کہ فہد نہیں مانا۔" احسان نے پھر سے کہا۔

"میں نہیں مانتی، کوئی دوسری بات ہو سکتی ہے۔ کم از کم یہ عذر نہیں ہے۔" وہ سر پھیرتے ہوئے بولی۔

"چلو بتاؤ، تمہارے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟" احسان نے پوچھا۔

"اب میرے ذہن میں تو نہیں ہے، اس پر سوچا ضرور جا سکتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"ویسے بھابی کی بات ہے سوچنے کے قابل۔" افضال نے کہا۔

"چلو یہ باتیں بعد میں سوچتے رہنا، پہلے ہمیں مہمانوں کو دیکھنا ہے۔ میرے خیال میں وہ آنے والے ہی ہوں گے۔" احسان نے طویل ہوتی ہوئی بحث کو سمیٹ لیا۔ تبھی اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔" یہ ماہا دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کہاں ہے وہ؟" اس کا روئے سخن

زبیدہ خاتون کی طرف تھا۔ تبھی ذکیہ بیگم بولی۔

''بھئی وہ رقیہ کے پاس ہوگی۔ بچیاں تیار ہوتی ہیں......''

''وہ میرا چشمہ ادھر اس کے کمرے میں رہ گیا ہے، وہ تو منگولو۔'' احسان نے کہا تو ذکیہ نے ملازمہ سے چشمہ لانے کو کہا اور پھر وہ اپنی باتوں مشغول ہو گئے۔ ملازمہ نے تھوڑی دیر بعد چشمہ لا کر دے دیا۔ تبھی مہمانوں کے آنے کی اطلاع ملی تو ان کی توجہ باہر کی سمت ہو گئی۔ چودھری سرفراز کے ساتھ اس کی بیگم، بیٹیاں، بہو کے ساتھ ایک قریبی خاتون بھی تھی، اس کے پیچھے دونوں کا مشترکہ دوست فدا حسین اپنی بیگم کے ہمراہ تھا۔ اچانک ہی ڈرائنگ روم بھر گیا۔ ان کے بیٹھتے ہی مشروب آ گیا۔ ساتھ میں خوشگوار ماحول میں باتیں چلتی رہیں۔ دادا نور الٰہی بھی وہیں آ گئے۔ جس کے باعث خواہ مخواہ ہی علاقے کی بات ذکر چھیڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد سرفراز چودھری کی بیوی نے کہا۔

''چودھری صاحب......! ہم یہاں سیاست کرنے نہیں آئے۔'' اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سبھی مسکرا دیئے۔

''تو پھر تمہی کہونا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ یہ کہہ کر اس نے دادا نور الٰہی کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''ہم دونوں خاندان ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں۔ میری بہت عرصہ سے خواہش تھی کہ ہم کوئی تعلق آپس میں جوڑ لیں۔ مجھے بڑی امید تھی کہ شاید آپ میری جانب رجوع کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا، سو اب میں خود آپ کے پاس آیا ہوں، تاکہ ہمارے درمیان ایک مضبوط تعلق بن جائے۔''

''یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ نے ایسا سوچا'' دادا جی نے بڑی فراخدلی سے کہا تو اس نے بڑے احترام سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں آپ میرے چھوٹے بیٹے جنید کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیں۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔''

''چودھری صاحب......! بیٹیوں کو تو اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔ آپ نے یہ خواہش کی ہے تو ہمیں تھوڑا سا وقت سوچنے کا دیں تاکہ ہم مشورہ کر سکیں۔'' دادا نے بڑے تحمل سے کہا۔

''وہ تو جی آپ کا حق ہے، لیکن میری اتنی درخواست ہے کہ آپ جس قدر جلدی یہ فیصلہ کر لیں، اس قدر ہی ہم اپنی خوشیاں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر لیں گے۔'' اس نے بڑے اچھے انداز سے کہا۔

''میرا خیال ہے ویسے ہی ہوگا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارے دونوں خاندان ایک دوسرے سے ڈھکے چھپے تو نہیں ہیں، لیکن پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو فدا حسین ہیں؟ پھر براہ راست مجھ سے پوچھیں۔'' چودھری سرفراز نے رسماً یہ بات بھی کہہ دی تو زبیدہ خاتون نے کہا۔

''آئیں باہر لان میں چلتے ہیں۔ وہاں چائے لگا دی گئی ہے۔''

سب دھیرے دھیرے اٹھ کر باہر جانے لگے تو آخر میں احسان نور نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان ماہا نہیں آئی، حالانکہ یہ بات زبیدہ خاتون کے بجائے گھر کی بہو کو کہنی چاہئے۔ اسے ہر معاملے میں پیش پیش ہونا چاہئے تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ذکیہ کھڑی تھی۔ احسان نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا تو وہ واپس آ گئی۔

''جی کہئے......!''

''یہ ماہا دکھائی نہیں دے رہی ہے۔'' احسان کے کہنے پر اچانک اسے بھی خیال آیا۔

''آپ چلیں، میں دیکھتی ہوں۔'' ذکیہ نے کہا تو افضال باہر کی جانب چلا گیا جبکہ وہ اس حویلی کے حصے کی جانب بڑھ گئی جو ماہا کے لئے مختص تھا۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ماہا بڑی سکون سے میوزک لگائے سن رہی ہے۔ اس نے وہی رف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کانوں سے ایئرفون لگائے، آنکھیں بند کئے، دنیا و مافیا سے بے نیاز تھی۔ ذکیہ بیگم حیرت زدہ رہ گئی۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ اسے کہا کہے پھر یکدم ہی اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے ماہا کے کانوں سے ایئرفون ہٹائے تو وہ چونک گئی۔ پھر سامنے ذکیہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔

''اوہ......! ماما آپ، آئیں بیٹھیں۔''

''ماہا......! تم اس قدر بے حس ہو چکی ہو، تمہیں ذرا سا بھی اپنی یا دوسروں کی عزت کا خیال نہیں ہے؟'' اس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا تو ماہا نے ایئرفون ایک طرف رکھ کر میوزک بند کیا اور بولی۔

''میں بے حس خود نہیں بنی بنا دی گئی ہے۔ سو مجھے بتایئے میں کیا کروں؟'' اس کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

''گھر میں اتنے مہمان ہیں اور یہ ساری ذمہ داری تمہاری ہے اور تم ہو کہ یہاں بڑی میوزک سن رہی ہو۔ بہت نام روشن کر رہی ہو اپنے والدین کا۔'' ذکیہ بیگم نے انتہائی غصے میں کہا۔

''ماما......! یہ سب آپ کی سوچ ہے، ورنہ جہاں جس بندے کی اہمیت ہی نہ ہو،

وہاں ایک طرف کونے میں پڑا رہنا ہی اپنی عزت بچانا ہوتا ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا ہی نہیں کہ گھر میں مہمان آنے والے ہیں تو میں ایویں تیار ہوتی پھروں۔'' وہ بولی۔ اس کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

''لیکن یہ سوچو، ہم بھی تو یہاں ہیں، مہمانوں میں سے کسی نے یہ پوچھ لیا کہ بہو کہاں ہے تو ہم کیا جواب دیں گے۔ یہی کہ وہ میوزک سن رہی ہے؟ حویلی والوں کی جو عزت ہوگی سو ہوگی، ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' ذکیہ بیگم نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا ہو جائے گا۔ یہی نا کہ مہمان غلط تاثر لے کر جائیں گے۔ تو مجھے کیا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا اور دوسری کروٹ بیٹھ گئی۔

''تو یہ ہیں تمہارے خیال......! اور ہماری قسمت دیکھو، کسی سے بہانہ بھی نہیں کر سکتی کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور اگر تمہیں دیکھنے کو کوئی آ گئی تو...... یا اللہ میں کیا کروں......'' اس نے بددل سی ہو کر کہا اور یوں دکھائی دینے لگی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ ماہا چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''آپ سب کو اپنی عزت کا خیال ہے، ٹھیک ہے...... بولیں کیا کروں۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

''میرا نہیں خیال کہ تم اتنی احمق، بے وقوف اور پاگل ہو۔'' ذکیہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر بجھے قدموں سے باہر چلی گئی، جبکہ وہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

لان میں مرد ایک طرف اور خواتین دوسری جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں جانب پرتکلف چائے کا اہتمام تھا۔ رقیہ بھی وہیں موجود تھی۔ وہ اس قدر اہتمام سے تیار نہیں ہوئی تھی کہ وہ بنی ٹھنی دکھائی دے، بس تھوڑا بہت تھا، اس کے چہرے کی معصومیت ویسے ہی بھا جاتی تھی۔ ذکیہ بیگم بھی ان کے درمیان جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے احسان کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ذکیہ کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ ضرور کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن مجبوری یہی تھی کہ وہ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔ تبھی سرفراز چودھری کی بیگم نے وہی پوچھ لیا جس کا ڈر تھا۔

''زبیدہ بہن......! آپ کی بہو دکھائی نہیں دے رہی، بہت مصروف ہے کیا؟ میں بھی اسے دیکھ لیتی۔ شادی پر تو ایک جھلک دیکھی تو اس کی۔'' اس نے خوشگوار انداز میں کہا تو ہاں زبیدہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، وہاں ذکیہ بیگم ایک دم سے ساکت ہوگئی کہ نجانے وہ کیا کہہ

دے۔ تبھی وہ جلدی سے بولی۔

''وہ بلال کے پاس لاہور گئی ہے۔ یہاں نہیں ہے۔''

تب زبیدہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔

''اچھا، چلیں، اب تو ملاقات ہوتی رہے گی، پھر اگلی بار سہی۔'' بیگم سرفراز نے کہا اور دوسری باتوں میں لگ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ مردوں میں تقریباً طے پا گیا تھا کہ وہ تعلق جوڑ لیں گے اور ایسا ہی حال خواتین کا بھی تھا۔ وہ یہی پوچھ رہی تھیں آپ بتائیں، آپ کب ہمارے ہاں آ رہے ہیں اور زبیدہ خاتون کوئی واضح جواب نہیں دے پا رہی تھی تو بیگم سرفراز نے کہا۔

''اچھا چلیں ٹھیک ہے، جب آپ کا بیٹا اور بہو آ جائیں تو مشورہ کرتے ہی ایک چکر ضرور ہمارے ہاں لگائیے گا۔ ایک بار معاملہ طے ہو گیا تو پھر ہم نے بہت جلدی کرنی ہے۔''

''انشاء اللہ......! اللہ پاک سب اچھا کرے گا۔ ان کی قسمت اچھی ہے۔'' زبیدہ خاتون نے کہا تو مردوں کی جانب سے سب اٹھ کھڑے ہوئے تو خواتین بھی اٹھ گئیں۔ انہیں ڈرائنگ روم سے ہو کر پورچ تک جانا تھا، جیسے ہی وہ کوریڈور تک گئے، سامنے سے ماہا آتی ہوئی دکھائی دی، اس نے بہت اچھا لباس پہنا ہوا تھا، ہلکا ہلکا میک اپ کئے وہ سکون سے آ رہی تھی۔ اس کا لباس ویسا نہیں تھا جیسا بہو بیٹیوں کا ہونا چاہئے تھا، انتہائی جدید فیشن والا جس میں کافی حد تک بدن دکھائی دے رہا تھا، مہین سے کپڑے کا آنچل اس کے گلے میں تھا۔ وہ ان سب کو آتا دیکھ کر رک گئی۔ ذکیہ بیگم تو یوں ہوگئی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ زبیدہ خاتون الگ شرمندہ ہو رہی تھی اور رقیہ نے سر جھکا لیا۔ کیونکہ بیگم سرفراز نے حیرت سے ماہا کی جانب دیکھ کر کہا۔

''یہ آپ کی بہو نہیں ہے اور آپ تو......''

ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ کوئی جواب ہی نہ دے سکیں تھیں۔ بیگم سرفراز نے اس پر مزید بات نہیں کی۔ وہ سب سے ملی جیسے فارمیلٹی پوری کر رہی ہو۔ وہ وہاں چند منٹ رکے اور پھر پورچ تک جا پہنچے۔ جس دل سے زبیدہ خاتون نے انہیں رخصت کیا تھا، وہی جانتی تھی۔ وہ مہمان تو چلے گئے لیکن زبیدہ خاتون اور ذکیہ بیگم ایک دوسری کی طرف دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکیں۔

گزرتی ہوئی شب کے ساتھ دکھ کی شدید لہر میرے من میں سرائیت کر گئی تھی۔ بات مجھ تک رہتی تو ٹھیک تھی، ماہا کی دشمنی، نفرت یا بغاوت میرے ساتھ تھی، اس میں میری بہن کا کیا قصور تھا، وہ بے چاری کیا سوچتی ہو گی۔ اس نے ماہا کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اس قدر بے حس ہو گئی ہے کہ اس کا بھی خیال نہیں کیا، وہ کیا اس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی؟ خاندان کے ہر فرد کو اس کے اس رویے سے کس قدر دکھ پہنچا ہو گا اور یہ سب میری بیوی ماہا کر رہی ہے، جس کے بارے میں مجھے دعویٰ ہے کہ وہ میرا عشق ہے۔

میں مسلسل اس بات پر سوچتا چلا جا رہا تھا، کچھ دیر پہلے جب میری امی سے تفصیل کے ساتھ بات ہوئی تو انہوں نے مجھے سب بتا دیا۔ ان کے من میں بھڑاس تھی وہ میرے سامنے نکال دی اور میں ان کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔ کیا میں نے اسے پیار قرار دے کر غلط کیا تھا؟ کیا میرے ہی عشق میں کہیں کھوٹ ہے؟ یا پھر ماہا ہی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے عشق کیا جا سکے؟ یہ عاشق، عشق اور معشوق کی تکون کیا ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے معشوق ہی اس قابل نہ ہو کہ اس سے عشق کیا جا سکے؟ بت کے سامنے گڑگڑانے والا کیا یہ نہیں جانتا کہ بت کی سماعت ہی نہیں ہے تو پھر وہ کیوں گڑگڑاتا ہے؟ یہ سب کچھ تو عاشق کے اپنے من میں چل رہا ہوتا ہے۔ وہ جس سے عشق کرے آزاد ہے، لیکن اپنے عشق میں بلند تو وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معشوق اعلیٰ و ارفع ہو، فنا نہ ہونے والا، بے جان بت، کسی کے زورِ عشق کا ردعمل کیا دے گا؟ ہاں......! جب دوسری طرف سے قبولِ عشق کا احساس بندے کو مل جائے تو زورِ عشق میں اپنا آپ وار دینا فنا نہیں ہوتا، وہ تو بقا کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ جب میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں، سبحان اللہ کہتا ہوں تو کیا وہ قبولیت پا لیتا ہے۔ مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میرا سبحان اللہ کہنا میرے اللہ نے قبول کر لیا تو دوسرے نے جواب دیا، ایک بار سبحان اللہ کہنے کے بعد اگر تمہیں دوسری بار سبحان اللہ کہنے کی توفیق مل جاتی ہے اور وہ تم کہہ دیتے ہو تو ایسا اس وقت ہوتا جب پہلی بار کہا گیا سبحان اللہ قبول ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف کا بھی یہی خیال ہے کہ جب بندہ اللہ کی راہ پر چل نکلتا ہے تو پھر اللہ پاک اس کی عبادتوں، ریاضتوں، ذکر اذکار کی قبولیت کے بدلے میں انعام و اکرام سے ضرور نوازتا ہے۔ پھر بندے کے درجات بلند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان درجات کی بلندی کا اظہار قبولیت دعا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ انکشاف، الہام وغیرہ ایسی بے شمار نعمتیں ملتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ بندے کا اپنا ظرف ہے کہ وہ یہیں قناعت کر کے بیٹھ گیا یا پھر درجہ بدرجہ عشق سیڑھی چڑھتا چلا گیا۔ حقیقت عشق تو یہی ہے کہ معشوق کامل ہو، اس کی راہ پر اگر چلا جائے، پاؤں لہولہان بھی ہوں تو اس کا احساس

بھی ہو، اس کا بدلہ بھی دیا جائے، تا کہ عشق کی لو اور تیز ہو جائے۔ میں اپنے خیالات میں کہیں اور نکل گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی چلی جا رہی تھی اور میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں ماہا کے بارے میں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ میں زندگی کے کس مقام پر آ پہنچا ہوں۔ اس کی یہ کیسی محبت ہے کہ جو اسٹیٹس کے ساتھ ہے، ایک خاص طرز زندگی کے ساتھ ہے، کیا وہ مجھے پسند نہیں کرتی، کیا اس کی محبت میری ذات سے نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ ٹھیک ہو جائے، لیکن کب تک، وہ میری توہین اگر کر رہی تھی تو میں برداشت کر رہا تھا لیکن اب تو وہ سارے لوگوں کو شامل کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر چل رہا تھا تو اپنے من میں لہولہو ہو رہا تھا۔ شرمندگی، دکھ، توہین کے احساس میری انا، میری ذات اور میری شخصیت کو اندر ہی اندر سے کچل رہے تھے۔ مجھے اگر اس قدر تحمل ملا تو صرف اپنے دین کے باعث لیکن دین بھی تو ایک خاص حد تک اجازت دیتا ہے۔ تند و تیز سوچوں میں اچانک خیال نے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا کہ اگر میں اسے چھوڑ دوں گا اور چھوڑ دینا بہت آسان ہے تو پھر وہ کیا کرے گی؟ وہ جو کچھ بھی کرے، لیکن جب میں اپنی زندگی سے نکال دوں گا تو مجھے اس سے کیا واسطہ......؟ یہ معاملہ اپنی جگہ مگر بحیثیت مسلمان میں اس کو یونہی چھوڑ دوں گا۔ وہ اگر ایسے راستے پر جاری ہے جو سراسر غلط ہے تو کیا مجھے اس کو بچانا نہیں چاہئے، اسے صراط مستقیم نہیں دکھانا چاہئے؟''

''کیا وہ تمہاری بات سنتی ہے، صراط مستقیم تو وہاں دکھا پاؤ گے جب وہ تمہاری سنے گی، اسے تم سے لگاؤ ہو گا، وہ تم پر اعتماد کرے گی۔ اسے یقین ہو گا کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔ نہ اسے تمہاری ذات سے نفرت ہے اور نہ کسی دیگر معاملے سے، اسے تو فقط یہ دکھ ہے کہ تم نے اپنا اعتماد کھو دیا۔''

''مگر میرا ارادہ تو فقط پی اون کے تعصب زدہ سوالوں کے جواب دینا تھا۔ اس سے ماہا کی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا، پھر مجھے اتنی بڑی سزا کیوں دی جا رہی ہے۔ میں اپنے حد تک تو سزا برداشت کر سکتا ہوں، مگر میری ماں......''

میں اس سے آگے نہیں سوچ سکا، میں اس طرح الجھن کا شکار ہو گیا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کروں، انہی کھردرے لمحوں میں مجھے میاں صاحب کی بات یاد آ گئی کہ جب بھی الجھن بڑے اور تمہاری بے بسی انتہا کو پہنچ جائے تو اس رب عظیم کو یاد کیا کرو جو ہر شے پر قادر ہے۔ اس کی ربوبیت کو یاد کرو، وہ

تمام جہانوں کا مالک ہے، اس کے خزانوں میں کمی نہیں۔ یہ بات یاد آتے ہی میں اٹھا اور میں نے وضو کیا۔ پھر سب کچھ بھول کر میں جائے نماز پر نوافل ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں اس ربِ عظیم کے حضور اپنی بات کہنے کا ارادہ رکھتا تھا، جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔

❀……❀……❀

اس سہ پہر ماہا تیار ہو رہی تھی۔ اس کا اہتمام دیکھنے لائق تھا۔ اس نے بلیک ٹائٹس کے ساتھ بلیک شرٹ اور اوپر سے بلیک کلر کا کوٹ پہنا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑا اور کانوں میں بڑے بڑے جھمکے ڈالے تیزی کے ساتھ میک اپ میں مصروف تھی۔ آخری ٹچ کے بعد اس نے جلدی سے میچنگ شوز پہنے، اپنا پرس اٹھایا اور باہر کی جانب چل دی۔ اس نے کافی دیر پہلے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ دیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی، خاصی افراتفری تھی، اس نے بعد میں آکر ٹھیک کرنے کا سوچا اور باہر کی سمت چل دی۔ وہ ڈرائنگ روم سے ہو کر جانا چاہتی تھی۔ تا کہ اتمامِ حجت ہی کے لئے سہی، زبیدہ خاتون کو بتا جائے۔ ڈرائنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ وہ خوشبو چھوڑتی ہوئی راہداری میں آئی جہاں اس نے ایک ملازمہ کو دیکھا اور اسے کہا۔

”جاؤ، آنٹی کو بتا دو، میں نور پور جا رہی ہوں۔ ممکن ہے میں رات نہ آسکوں، صبح آؤں گی۔“

یہ کہہ کر وہ واپس مڑی اور چند قدم ہی چلی تھی کہ سامنے سے زبیدہ خاتون آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے ماہا کے کہے ہوئے لفظ سن لئے تھے، لیکن پھر بھی پوچھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ زبیدہ خاتون کے لہجے میں بڑا تحمل تھا۔ ماہا نے اپنی بات دُہرا دی۔ پھر کوئی اور بات سنے بغیر سامنے کی جانب قدم بڑھا دیئے جو ڈرائنگ روم ہی کی جانب تھے۔ ”ماہا......! ذرا میری بات سنو۔“ زبیدہ خاتون نے کہا تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ تبھی وہ بھی وہاں آکر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹھو۔“

”کیا ہے آنٹی......! مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“ وہ بولی۔

”میں نے کہا نا بیٹھو......! اور اس بار زبیدہ خاتون کا لہجہ سخت تھا۔ ماہا نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ تب زبیدہ خاتون نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کیا نور پور میں بہت اہم کام ہے؟“

”جی ہاں......! وہاں میری این جی او کی سہیلیوں نے ایک زبردست پارٹی دی ہے۔ برطانیہ سے ایک خاتون آئی ہے اس کے اعزاز میں۔ چونکہ میں چیئر پرسن ہوں اس لئے

میرا جانا بہت ضروری ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی بہت اہم کام کے لئے جا رہی ہو۔

”یہ پارٹی ہو گی کہاں؟“ زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

”ظاہر ہے آنٹی، ادھر ہمارے بنگلے میں، جہاں میری این جی او کا آفس ہے۔“ اس نے حیرت سے کہا اور پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد پوچھنے لگی۔ ”مگر آپ ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ کیا میں پہلی بار وہاں پر جا رہی ہوں۔“

”ہاں......! مجھے یہی لگتا ہے کہ تم پہلی بار جا رہی ہو، ورنہ کوئی بھی بیٹی، اس قدر بیہودہ لباس میں اپنے والدین کے سامنے نہیں جاتی، جس قدر تم نے پہنا ہوا ہے۔“ زبیدہ خاتون نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

”کیا ہے میرے لباس کو۔“ ماہا ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

”پہلی تو بات ہے کہ تم یہ اپنا حلیہ درست کرو اور اس کے بعد یہ سن لو کہ یہ تمہارا این جی او والا ڈرامہ اب ختم ہے۔ میں تمہیں قطعاً اجازت نہیں دیتی ہوں کہ اب تم یہ تماشا کرو، واپس جاؤ اپنے کمرے میں۔“ زبیدہ خاتون نے یوں سرد مہری سے کہا کہ ماہا کو چند لمحے سمجھ ہی نہیں آسکا کہ اتنی نرم طبع خاتون، اتنے سخت لفظ بھی کہہ سکتی ہے۔ کتنے لمحے تک یونہی خاموشی چھائی رہی۔ جب اسے سمجھ میں آیا کہ اس کس قسم کا حکم دے دیا گیا ہے تو وہ حیرت سے بولی۔

”آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”نہ صرف پتہ ہے، بلکہ سوچ سمجھ کر تم سے کہہ رہی ہوں۔ واپس جاؤ، میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ وہ اس بار تحمل سے بولیں۔

”دیکھیں آنٹی......! میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے اور میں وہاں پر جاؤں گی۔ آپ بھی مجھے نہیں روک سکتیں اور اگر آپ نے اس موضوع پر مجھ سے بات کرنی ہی ہے تو میں کل آجاؤں گی تو ہم تفصیل سے کر لیں گے، اس وقت آپ مجھے جانے دیں۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے، آپ اسے خراب مت کریں۔“ ماہا نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارے موڈ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اب تک تم نے جو کیا وہ بہت ہے، اب تمہیں اس حویلی کی روایات کے مطابق چلنا پڑے گا۔“ زبیدہ خاتون نے پھر اسی تحمل سے کہا تو ماہا چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آج تک آپ کو اپنی روایات یاد نہیں آئیں۔ اپنی بیٹی کا معاملہ آیا ہے تو ساری روایات یاد آگئی ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آپ اپنی بہو کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں۔ تبھی“

''ذکیہ بہن سے غلطی ہوئی کہ اس نے تمہاری پردہ پوشی کرنا چاہی تھی، لیکن تم نے خود ہی اپنا آپ بتا دیا۔ بعد میں اگلے دن تمہارے والدین ہی نے جا کر انہیں تمہارے رویے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ہم تم پر کیا کیا ظلم کر رہے ہیں، وہ تمہارے والدین بتا آئے ہیں اور میں تمہیں بتا دوں کہ ہم ان کے گھر سے ہو آئے ہیں۔ انہی دو چار دنوں میں وہ رقیہ کی منگنی کے لئے آ رہے ہیں۔ یہ ساری ذمہ داری ہم نے نہیں، تمہارے والدین نے نبھائی ہے، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ خاندان کی عزت کیا ہوتی ہے اور تمہیں اس کا احساس نہیں۔ میری مانو، تو اب بھی سنبھل جاؤ، اور اپنی سوچ درست کر لو، اسی میں ہی بہو بیٹیوں کی شان ہوتی ہے''۔ زبیدہ خاتون نے بہت نرم لہجے میں اسے بتایا تو ماہا کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے والدین یہ سب کریں گے۔

''اچھا جو بھی ہے ٹھیک ہے، لیکن مجھے تو جانا ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''میں نے ڈرائیور کو منع کر دیا ہے وہ تمہیں لے کر نہیں جائے گا، اب تم واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔'' انہوں نے پیار سے کہا تو ماہا ایک دم سے پھٹ پڑی۔

''میں دیکھتی ہوں، کون مجھے روکتا ہے۔ میرے والدین نے مجھے گاڑی دی ہے اور مجھے ڈرائیو کرنا آتا ہے۔ میں جا رہی ہوں، کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔''

''بیٹی......! اب بھی سنبھل جاؤ، میں تمہیں پیار سے سمجھا رہی ہوں۔'' وہ واقعتاً تحمل سے بولی۔

''پھر کیا ہو جائے گا، یہی ہو گا نا کہ آپ کا بیٹا مجھے چھوڑ دے گا۔'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''ممکن ہے، کیونکہ مجھے اپنی اولاد پر مان ہے، بھروسہ ہے اور اعتماد ہے اور تمہیں نہیں ہے۔ ہر معاملے کو جذباتی انداز میں نہیں دیکھتے، کیونکہ جذباتی فیصلے اکثر پچھتاوے کا باعث بن جاتے ہیں۔ میری بیٹی......! میں سمجھتی ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو، لیکن......''

''لیکن میں غلط ہوں، تو غلط رہنے دیں، کیوں سارے مجھے ہی سمجھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ خود سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ہیں۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''ماہا......! میں تمہیں بچپن سے جانتی ہوں۔ تم میری گود میں کھیلی ہو، اسی خاندان نے تمہاری پرورش کی ہے، کیا تم خود اپنے رویے کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو کہ پہلے تم کیا تھی اور اب کیا ہو۔ تمہیں خود معلوم ہونا چاہئے کہ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت کسے ہے۔'' زبیدہ خاتون نے کہا تو ماہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پہلے میرا دماغ درست نہیں تھا، اب مجھے عقل آ گئی ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ

خاندان کے بڑے اپنے مفاد کے لئے، اپنی جائیداد کو بچانے کے لئے اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اگر اولاد احتجاج کرے تو اسے روایات سنا کر اس کا گلا دبا دیا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں اور سمجھ رہی ہوں بلکہ بھگت بھی رہی ہوں۔ آپ اپنی بیٹی کا رشتہ باہر کر رہی ہیں۔ میں دیکھوں گی جب آپ اس کا حصہ اسے نہیں دیں گی۔''

''ماہا......! تم بات کو بڑھا رہی ہو۔ ہمیں تمہاری جائیداد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں تو تمہیں بیٹی جان کر اپنے بیٹے کی پسند سمجھ کر اپنی جگہ دی ہے، لیکن تم خود ہی قبول نہیں کر رہی ہو، اس میں کسی کا کیا دوش اور رقیہ اگر اپنا حق مانگتی ہے تو تمہارا تو کچھ نہیں مانگے گی اور نہ ہی تم اسے کچھ دے سکتی ہو۔ اس کا مطالبہ اپنے باپ اور بھائی سے ہو گا اور اسے حصہ دینا بھی چاہئے کہ اس کا حق ہے۔''

''خیر......! یہ حصے داریاں کل آ کے کر لوں گی۔ فی الحال میں جا رہی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ماہا، میری بچی، ضدمت کرو اور واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔'' زبیدہ خاتون نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

''آنٹی......! اگر میں آج نہ گئی تو پھر میں کبھی نہیں جا سکوں گی، مجھے آپ کا جواب بھی معلوم ہے کہ آخر میں آپ کے پاس یہی دھمکی ہو گی نا کہ میں اس حویلی میں قدم نہ رکھوں، واپس نہ آؤں۔ اس کا انجام اگر یہی ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گی تو ہوتا رہے۔ میں آج ضرور جاؤں گی۔'' ماہا نے انتہائی ہٹ دھرمی میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹی، اب اگر تم آخری بات بھی سوچ چکی ہو اور پوری ڈھٹائی سے کہہ بھی چکی ہو تو اب میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گی، تم جا سکتی ہو، مگر، اس حویلی کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے، تم جب بھی آؤ۔''

''نہیں آنٹی......! اب مجھے یہاں آنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ حویلی میں میری حیثیت کیا ہے۔'' ماہا نے کہا، اپنا پرس اٹھایا اور ڈرائنگ روم سے نکلتی چلی گئی۔

وہ پورچ میں جا کر کھڑی ہوئی تو وہاں گاڑی نہیں تھی۔ اس نے حویلی کی دائیں جانب وہاں دیکھا جہاں گیراج تھا، وہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اسے یوں پورچ میں کھڑا دیکھ کر ڈرائیور آ گیا۔ پھر گاڑی آنے میں چند منٹ لگے اور نور پور کے لئے روانہ ہو گئی۔ اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اسے یہ قطعاً امید نہیں تھی کہ زبیدہ خاتون اسے یوں جانے سے روکے گی، ایسا

کیوں کیا تھا؟ کیا انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی این جی او کا بہت بڑا فنکشن ہونے والا ہے اور یہ لوگ اسے برداشت نہیں کر سکے۔ جب اسے کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ خود کو نارمل کرنے لگی، پارٹی میں اس کا فریش چہرے کا ساتھ جانا بہت ضروری تھا، اس نے سکون سے ٹیک لگا کر سارے خیال ذہن سے نکال دیئے۔

❀......❀......❀

شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہر بھر میں برقی قمقے جل چکے تھے۔
ایسے میں نجمہ الطاف بہت خوشگوار موڈ میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنا سیل فون ہتھیلی میں دبائے اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی یوں بیٹھی تھی کہ جیسے بڑی مضطرب ہو۔ پورا گھر روشن تھا اور اس کی نگاہیں بار بار اس داخلی دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں، جہاں سے الطاف انور اور فہد نے آنا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر قبل دونوں کو باری باری فون کر کے بلایا تھا۔ الطاف انور تو لان ٹینس کی گیم کرنے کے بعد اپنے دوستوں میں بیٹھا ہوا تھا، جبکہ فہد اپنے دوست ذیشان کے ساتھ بلال کے پاس تھا۔ دونوں نے فوراً آنے کی وجہ فطری طور پر دریافت کی تھی لیکن نجمہ نے انہیں یہاں آکر بتانے پر اصرار کیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہلے الطاف انور آیا اور نجمہ کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''ہاں تم بیگم......! بتاؤ آخر اتنی کیا ایمرجنسی آ گئی ہے کہ مجھے فوراً گھر آنے کو کہا ہے۔''
اس سے پہلے کہ وہ بات کا جواب دیتی باہر فہد کی گاڑی رکنے کی آواز آئی تو اس نے کہا۔
''فہد آجائے تو بتاتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔
کچھ دیر بعد وہ بھی آکر بیٹھا تو اور اس نے بھی یہی سوال کیا۔
''ماما......! کوئی خاص بات؟''
''آج میں بہت خوش ہوں، کیونکہ آج میں اپنے مقصد کے بالکل قریب پہنچ گئی ہوں۔ میری مراد ہے ماہا، ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ماہا کا فون آیا ہے۔ وہ اب ہمیشہ کے لئے حویلی چھوڑ کر نور پور آ گئی ہے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
''لیکن دلی ہنوز دور است......! تم جو چاہ رہی ہو، ابھی وہ کچھ تو نہیں ہوا۔'' الطاف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''باقی بچا بھی کیا ہے۔ معاملہ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ اس وقت خود کو تنہا محسوس کر رہی ہے، بالکل تنہا، یہاں تک کہ اسے اپنے والدین پر بھی اعتماد نہیں رہا؟''
''کیا مطلب......! تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' الطاف نے حیرت سے کہا۔

''آج ماہا کی این جی او والی سہیلیوں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ کوئی برطانیہ سے خاتون آئی تھی، اس کے اعزاز میں بڑی زبردست پارٹی تھی۔ ماہا کے ساتھ ہوا یہ کہ زبان نہ رکھنے والی زبیدہ خاتون نے اسے روکا اور بڑے زبردست طریقے سے باتیں سنا کر روکا اور آئندہ سے پابندی لگا دی کہ تم این جی او وغیرہ بند کر دو۔''
''بڑی بات ہے! یہ کیسے ہو گیا؟'' الطاف نے حیرت سے کہا۔
''اب آگے تو سنیں......! ماہا نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور نور پور چل دی۔ وہاں آکر پتہ چلا کہ احسان بھائی نے ان این جی او والیوں کو منع کر دیا کہ یہاں کوئی پارٹی نہیں ہو گی۔ جدھر چاہیں مرضی بندوبست کر لیں۔ ظاہر ہے اس پر ماہا نے سخت بے عزتی محسوس کی ہے تو احسان بھائی نے سختی کے ساتھ اسے بھی منع کر دیا کہ تم واپس حویلی جاؤ یا پھر یہاں بنگلے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتی ہو۔'' نجمہ نے ساری روداد کہہ دی۔
''تو اس کا مطلب ہے...... ماہا کو سدھارنے کے لئے سارے ایک ہو گئے ہیں۔'' الطاف نے سوچتے ہوئے کہا۔
''ظاہر ہے ایسا ہی ہو گیا ہے۔ اب اسے جتنا دبائیں گے، وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔'' نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان سب کا ایک ہو جانا بھی تو مسئلہ ہے نا۔'' الطاف نے اسے یاد دلایا۔
''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی تو وہ سب ایک ہو کر ہی شادی کر چکے ہیں۔ اس کا کیا ہوا۔ خیر......! اب تو یہ ہمارے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس وقت ماہا کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ اب بھی وہ اپنے کمرے میں پڑی رو رہی ہے، اس نے مجھے ساری تفصیل بتا دی۔ اس نے مجھے اپنا سمجھا ہے تو اپنے دکھ شیئر کر رہی ہے۔ اب زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ وہ طلاق مانگ لے گی۔'' نجمہ نے دو اور دو چار کر کے بتاتے ہوئے کہا تو الطاف نے فہد سے پوچھا۔
''تمہارا کیا خیال ہے فہد......؟''
''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ بات جو ناممکن دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے ممکن کر کے دکھا دی ہے۔ پھل پک چکا ہے، اب اسے توڑنا باقی ہے۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔
''تم نے کبھی بلال کو ٹٹولا؟'' الطاف نے پوچھا۔
''نہیں......! وہ تو اب اللہ لوک بن چکا ہے۔ اس کی تو خیر بات ہی کیا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت جلد یہ نوکری بھی چھوڑ جائے گا۔ اس کے بس کا روگ نہیں رہے گا۔'' فہد نے بتایا۔

''یہ مشکل نہیں ہو جائے گا الطاف......!'' نجمہ نے پوچھا۔

''کیسے؟'' وہ بولا۔

''وہ اگر نوکری چھوڑ کر چلا گیا تو باپ کی جگہ وہی سیاست کرے گا اور وہ جو مستقبل میں فہد کو وہاں کا سیاست دان دیکھ رہے تھے، وہ......؟'' نجمہ تشویش سے بولی۔

''بیگم......! جو کچھ میں نے سوچا تھا اور جن خطوط پر میں نے پلان کی تھا، اب وہ تو رہا نہیں۔ تم نے اور تمہارے بیٹے نے وہ سب کچھ ڈسٹرب کر دیا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے۔ اس کی جگہ تم نے اپنی مرضی کی ہے۔ اب یہ مسئلہ بھی تم نے حل کرنا ہے۔ یہی نہیں اس کے بعد بھی بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے۔'' الطاف نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب......! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' نجمہ نے پوچھا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں وہ تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے جو سوچا تھا اس میں تلخیاں نہیں تھیں۔ محبت کے ساتھ فیملی میں سرائیت کر جانے والی بات تھی۔ اس میں رشتے ناطے اور ان کے تقاضوں کی بنیاد پر سب کچھ ہوتا۔ بلال کی بہن کا اگر میں سسر ہوتا تو وہ کبھی میری بات رد کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب اس پر میرا کوئی زور نہیں ہوگا، وہ چاہے تو میری بات بھی نہ مانے، اسے اختیار ہے۔'' الطاف نے اسے سمجھایا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خاندان میں تلخیاں ڈال دیں۔ اگر میں نے اپنے بیٹے کے لئے کچھ کیا، اس کی خواہش کا احترام کیا تو کیا اس کا کوئی مسئلہ آپ کا مسئلہ نہیں ہوگا۔'' نجمہ نے کہا۔

''اس وقت، جب وہ میری بات مان لیتا، لیکن جو تم کر رہو، اس کی مجھے بہرحال کچھ سمجھ نہیں ہے۔ اب دیکھو! ماہا ہی جب سب سے کٹ جائے گی تو فہد کو مان، عزت اور احترام خاندان میں نہیں مل سکے گا، جو ملنا چاہئے۔ کیا اس مسئلے کا حل ہے تمہارے پاس؟'' الطاف نے اس کے سامنے مستقبل کی تصویر رکھی تو ایک دم سے تذبذب میں پڑ گئی پھر چونکتے ہوئے بولی۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ کروڑوں کی آنے والی جائیداد ہی کافی ہے۔ وقت کے ساتھ سارے ہی مل جاتے ہیں۔'' نجمہ نے کہا۔

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔ اگر تم نے کامیابی حاصل کر لی ہے تو ٹھیک ہے، اس کے پس منظر میں کوئی مسئلہ یا آسانی آنی ہے تو تمہی اسے خوب سمجھ سکتی ہو۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مطلب، تم اس معاملے میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو۔'' نجمہ نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

''اس سے بڑا ساتھ کیا ہوگا کہ میں خاموشی سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کیا کر رہی ہو اور پھر وہ پلان جو میں نے سوچا تھا اس سے دستبردار ہو گیا ہوں۔ اس کے علاوہ جو تم چاہو، میں اگر اسے ٹھیک سمجھا تو بالکل تمہارا ساتھ دوں گا۔'' وہ بولا۔

''اب بھی یہ ''ٹھیک سمجھا'' والی شرط ساتھ میں لگی ہوئی ہے۔'' نجمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''اب یہ کوئی بحث والی بات تو نہیں ہے نا بیگم، میں تمہاری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا چلا جاؤں، میں نے بھی معاشرے میں رہنا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں جو چاہوں گی سو کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر فہد کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''تم اس وقت ماہا کی دلجوئی کرو، وہ بہت زیادہ تنہائی محسوس کر رہی ہوگی۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ ابھی چند دن وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'

''ٹھیک ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔'' فہد یہ کہہ کر اٹھ گیا تو الطاف نے کہا۔

''چلو بیگم کھانا لگاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ بھی اٹھا اور اندر کی جانب چل دیا۔ نجمہ وہاں اکیلی رہ گئی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔

❁......❁......❁

جاتے ہوئے دن کی سنہری دھوپ اپنی گرمی آہستہ آہستہ کھو رہی تھی۔ میں عصر پڑھنے کے بعد لان میں آ بیٹھا۔ معمول تھا کہ میں اس وقت چائے پیتا تھا۔ میں میگزین پڑھنے کے ساتھ چائے بھی پی رہا تھا۔ ایسے میں ذیشان کا فون آ گیا۔ وہ آج رات کھانے پر مجھے اپنے گھر بلا رہا تھا۔ یہ بھی ہمارا معمول تھا اکثر اوقات ہم ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھا لیتے تھے۔ فون سننے کے دوران میں نے میگزین رکھ دیا۔ فون سن چکا تو میرا دھیان ماہا کی طرف چلا گیا۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو ہم بھی ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ جبکہ ہمارے ہاں بجائے قربت کے دوریاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

میں ان دنوں مسلسل یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے لاہور کے بجائے گلاب نگر میں زیادہ وقت گزارنا چاہئے یا پھر کسی طرح میں ماہا کو یہاں لاہور لانے پر راضی کر لوں۔ لاہور میں رہنے کے باعث میری ماہا سے ذہنی دوری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے جب تک میں اس سے بات نہیں کروں گا۔ اسے اپنی بات نہیں سمجھاؤں گا، اس کی الجھنیں دور نہیں کر سکوں گا

تو وہ اپنی سوچ میں تبدیلی کیسے لاسکتی ہے۔ پہلے پہل تو میں نے یہ سمجھا تھا کہ اس کا غصہ وقتی ہے۔ اس نے چند ایشوز کو بنیاد بنا کر اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے اور پھر کرتی چلی جارہی ہے۔ دھیرے دھیرے اس شدت میں کمی آتی چلی جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا یہ ردعمل طویل تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ مجھے اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دے رہی تھی، بلکہ اس نے جن راہوں کا انتخاب کرلیا تھا، ان راہوں پر آگے سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ سو میرے خیال میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ یہ فقط غصے کا اظہار نہیں ہے۔ حویلی سے جو بھی اطلاع مجھے آتی تھی۔ وہ بھی کوئی اچھا تاثر نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ شاید میں نے کوئی بہت بڑی غلطی کرلی ہے اور میری وجہ سے پورا خاندان ڈسٹرب ہورہا ہے۔

یہ ساری سوچیں تو میں سوچتا رہتا تھا لیکن ماہا کی سوچ میں تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے، اس کی مجھے قطعاً سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مجھے اپنی اور اللہ کی ذات پر بھروسہ تو تھا کہ میں کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن ابھی تک مجھے کچھ ایسا سوجھا نہیں تھا، اس لئے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ میں کیا کروں، لاہور ہی میں رہوں یا پھر گلاب نگر چلا جاؤں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ ماہا مجھ سے دور ہو جائے۔ بچپن سے لے کر شادی کے دن تک کی بے شمار یادیں میری ہستی کا سرمایہ بن چکی تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے دستبردار نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ جانے کب سے میرے اندر محبت کی چنگاری عشق کی آگ بن چکی تھی۔ میں اپنے محبوب کو گمراہیوں کے راستے پر کیسے دیکھ سکتا تھا۔ جس زندگی کی اسے خواہش تھی، وہ اب میں اسے دے نہیں سکتا تھا۔ قربت کا تقاضا تو یہی تھا کہ کوئی ایک دوسرے کی ذات میں ڈھل جائے۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آجاتا کہ یار کو منانے کے لئے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ گھنگھرو بھی باندھ کر ناچنا پڑتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال آتا کہ یہ معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب گھنگھرو باندھ کر ناچنے والے کی محبوب کے دل میں قدر ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کا ناچنا کیوں ہے؟ مقامِ یار کی سمجھ بوجھ کیا ہوتی ہے؟ مقام عشق کیا ہوتا ہے؟ پھر یہ خیال آتا کہ محبوب تو نادان ہے، اب جبکہ تم اس سے دل لگا ہی بیٹھے ہو تو پھر اسے اپنے مقام تک خود لے آؤ اگر تم اس کے مقام تک خود نہیں جاسکتے ہو، اب میرے پاس دو ہی راستے تھے، ایک یہ کہ جو ماہا کہتی ہے اسے قبول کرلوں اور اس کے رنگ میں رنگ جاؤں یا پھر ماہا کو اپنے رنگ میں رنگ لوں۔ اس کے علاوہ میرے لئے کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔

میں اگر ماہا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہوں، چاہے بعد میں

اسے پھر سے اپنی راہ پر لے آؤں تو مجھے اس راہ سے ہٹنا پڑے گا جسے میں قبول کرچکا ہوں، یہ وہ راہ تھی جسے اس کائنات کی عظیم واکمل ہستی، ہادی برحقؐ نے انسانوں کو دکھایا تھا۔ اس راہ پر چلنے والا انسان پھر زمین کا باشندہ نہیں رہ جاتا۔ اس کی اٹھان آسمانوں کی جانب ہوتی ہے۔ جس کا منبع ومقصد قرب الٰہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جس انسان کو قرب الٰہی میسر آجائے تو اس کے نزدیک کائنات ہیچ ہوکر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ راستہ انسانوں میں سے ہی ہوکر گزرتا ہے، لیکن اس کے لئے بھی عشق درکار ہوتا ہے۔ عشق نہ ہو تو یہ منزلیں بھی پار نہیں ہوسکتیں۔ میں تو دن بدن یہ کوشش کررہا تھا کہ سنت نبویؐ کو اپناتا چلا جاؤں اور اگر میں ماہا کے کہنے پر ایک بھی سنت کا تارک ہوگیا تو میری یہ بہت بڑی ناکامی ہے۔ میں اس کے راستے پر نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھا، جس نے بھی قرب الٰہی کے لئے عشق کی سیڑھی استعمال کی ہے، اسے زمین سے ناطہ توڑنا ہی پڑا ہے۔ یہ عشق مجھ سے ماہا کی قربانی مانگ رہا تھا، میں اسے ایک طرف ہٹا کر آسودگی کے ساتھ اس کانچ کی سیڑھی پر پاؤں رکھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے زینہ بہ زینہ چڑھنے میں جب زمین سے ناطہ ٹوٹتا ہے تو پھر لہولہان ہو جانا یقینی ہے۔ ماہا سے دور ہو جانے کا تصور اگرچہ بہت دکھ دینے والا تھا۔ میرے کانوں میں یہ سرگوشیاں بھی پڑتی تھیں کہ یہ تمہاری مردانگی کے خلاف ہے، کیا کہے گی دنیا کہ ایک لڑکی نے تمہیں ٹھکرا دیا۔ تمہاری شخصیت مسخ ہوکر رہ جائے گی۔ یہ بہت بڑی ناکامی ہے جو تمہیں دنیا میں ذلیل کر کے رکھ دے گی۔ میں ان سرگرشیوں پر کان بھی دھرتا تھا، لیکن میرے من پر کوئی اثر پیدا نہیں کرسکیں، لہٰذا میں ان پر توجہ ہی دیتا۔ یوں مسلسل ہونے والی سرگوشیاں دم توڑتی چلی جارہی تھیں۔

مجھے اپنے طور پر یہ راستہ زیادہ آسان دکھائی دیتا تھا کہ اسے اپنے رنگ میں رنگ لوں، وہ رنگ جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے، کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو نہ بھی بدلے تو نہ سہی لیکن یہاں نتیجے پر کامیابی یا ناکامی کا انحصار نہیں ہے، بلکہ خلوص نیت سے کی جانے والی کوشش کو دیکھا جاتا ہے۔ میں نے کس قدر خلوص سے اسے وہ راستہ دکھایا ہے، جس پر اللہ اور اس کا رسول برحقؐ خوش ہوتا ہے۔ اب آگے اللہ کی مرضی ہے کہ اس کے من میں ہدایت اترتی ہے یا نہیں۔ میرا فرض ادا ہوگیا۔ اصل میں الجھن بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پورے خلوص کے ساتھ آگ سے بچا رہا ہوتا ہے اور وہ خلوص نیت میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ دوسرے کو بزور بازو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ طریقہ کار غلط ہو جاتا ہے اور یہ فطری سی بات ہے جب بھی کہیں جبر بڑھتا ہے۔ وہاں بغاوت ضرور جنم لیتی ہے۔ چاہئے جبر اپنے تئیں حق پر ہی کیوں نہ ہو۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب خالق کائنات نے یہ فیصلہ دے دیا کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹ جانے والا ہے۔ حق اور باطل کا فرق کیا ہے؟ کیا ہمیں پہلے یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ جب حق کی سمجھ آ جائے گی تو ہی معلوم ہوگا کہ باطل کیا ہے؟ تبھی پتہ چلے گا کہ ہمارا دوست کون ہے اور ہمارا دشمن کون ہے۔ آپ کے پاس اگر حق ہے اور یہ فیصلہ خداوندی ہے کہ باطل نے مٹ جانا ہے تو پھر چاہے جس قدر ظلمت ہو، پورا ماحول پراگندہ اور بدبودار ہو، اس میں اگر نور لایا جاتا ہے تو ظلمت ضرور ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ خوشبو ضرور اپنا آپ منواتی ہے۔ مثال کے طور پر آلاتِ جدید میں ٹیلیویژن ہی کو لیں، اسے اگر شیطانی آلہ سمجھ کر پھینک دیں گے، اسے نظرانداز کر دیں گے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارا اس پر پیغام نہیں آ سکتا، وہاں لاکھ گند ہو، لیکن جب ایک پرنور پیغام جائے گا اور اس پیغام کو موثر انداز میں پیش کیا جائے گا تو کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ وہ دلوں پر اثر نہ کرے۔ کہیں یہ ہمارے یقین میں کمی تو نہیں ہے یا پھر پیغام پیش کرنے میں کہیں کمزور ہیں۔ یہ ہماری کمزوری کوتاہی تو ہو سکتی ہے، پیغام کی نہیں۔ شعرائے عرب کو اپنے کلام پر ناز تھا۔ لیکن کلام الٰہی کا چیلنج اتنی صدیوں بعد اب تک موجود ہے، کوئی اس کے برابر اپنا پیغام نہیں لا سکا۔ قرآن کا معجزہ تو پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت ہے، اسے سمجھنے کی، اس پر عمل کرنے کی، اس پیغام کی روح کو سمجھنے کی جو دلوں پر اثر کرتا ہے، کیونکہ بے شک یہ کلام الٰہی ہے۔

میں اپنی سوچوں میں بہت دور تک نکل آیا تھا۔ میں ماہا کے بارے میں سوچتے ہوئے جس قدر دکھ محسوس کرتا تھا، اس قدر میں پورے خلوص سے دعا مانگا کرتا تھا کہ وہ میری وجہ سے اگر گمراہی کی راہ پر چل دی تو پھر میں کیسے جواب دے پاؤں گا، مجھے کوئی راہ سجھا دے، جس سے میں اس کی زندگی کو بدل سکوں، بے شک یہ اختیار تیرے ہاتھ میں ہے، لیکن مجھے اتنی رسائی دے دے کہ میں تیرا پیغام اس تک ضرور پہنچا سکوں۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ میرا سیل فون بج گیا۔ وہ امی کی طرف سے فون تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فون ریسیو کر لیا۔

''کیسے ہو بیٹے......!'' ان کی ممتا بھری آواز نے میری روح تک سرشار کر دی۔

''میں ٹھیک ہوں امی، آپ سنائیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں اور سب گھر والے بھی ٹھیک ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولیں ''میں اصل میں تمہیں کل سے فون کرنا چاہ رہی تھی، لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فون کروں یا نہ کروں، کہیں تم ڈسٹرب نہ ہو جاؤ، لیکن پھر سوچا کہ بجائے ادھر ادھر سے پتہ چلنے کے میں ہی تمہیں بتا دوں۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا بات امی......! خیریت تو ہے نا۔'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ آگے تم خود اندازہ لگا لینا کہ خیریت ہے یا نہیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ماہا پر نور پور چلے جانے کے بارے میں بتایا۔

''امی یہ معاملہ دن بدن بگڑتا نہیں چلا جا رہا ہے۔ احسان تایا تو بہت پریشان ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''میرا تمہیں فون کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر تمہیں ایسی بات کا کہیں سے پتہ چلتا بھی ہے تو اس پر کسی قسم کے ردعمل کی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ یہاں کا ہے، اسے اب ہم خود حل کر لیں گے۔'' امی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے امی، آپ جیسا چاہیں۔'' میں نے احترام سے کہا تو وہ بولیں۔

''لیکن تم کچھ مت سوچنا، اللہ بہتر کرے گا۔''

''جی اللہ بہتر ہی کرتا ہے۔'' میں نے کہا اور چند الوداعی فقروں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے یونہی ساکت سا بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں کوئی خیال بھی نہیں تھا، جیسے کسی گہرے صدمے کے بعد ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ میں تو اس کے پاس جانا چاہتا تھا، اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے مناؤں گا، اسے بتاؤں گا کہ جس راہ پر میں چل رہا ہوں، وہ کیسا رستہ ہے لیکن! وہ میری بات سنے بغیر سارے ناطے توڑ کر جا چکی ہے۔ میں اس ضدی طبیعت والی لڑکی کا ردعمل سمجھ رہا تھا وہ اپنی ضد میں مزید پختہ ہو جانے والی تھی۔ شاید میرے نصیب میں نہیں تھا کہ میں اسے بتا سکتا۔ میرا دل لہولہان ہو رہا تھا، اس وقت میں ایسے بچے کی مانند تھا جس کا پسندیدہ کھلونا دے کر توڑ دیا جائے۔ ماہا کی یادیں میرے ذہن میں فلم کی مانند چل پڑیں۔ میرے اندر طوفان برپا رہا۔ میں دکھ کی اس انتہا پر پہنچ چکا تھا، جہاں انسان ساکت ہو جاتا ہے۔ امی نے تو فکر نہ کرنے کو کہا تھا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ ناطہ پہلے کی مانند نہیں رہے گا۔ تعلق اگر جڑ بھی جاتا ہے تو اس میں ایک لکیر ضرور رہے گی۔ اذان مغرب ہونے لگی تھی، میں اپنے خیالات سے یوں چونکا جیسے کوئی تہہ آب سے سطح آب پر آ گیا ہو۔ میں نے سکون سے اذان سنی اور پھر اٹھ کر وضو کرنے چل دیا۔

میں ذیشان کے گھر میں تھا اور وہ دوسری بار مجھ سے پوچھ چکا تھا کہ میں اتنا پریشان کیوں ہوں؟ میں اسے کیا جواب دیتا، میں نے حتی المقدور اپنے آپ کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی، لیکن شاید میرے اندر اسے صدمے کا اثر اتنا تھا کہ میں اس سے باہر نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔

عشاء پڑھنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا تو میں وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکا۔ اس لئے میں نے ذیشان سے اجازت چاہی تو وہ حیرت سے بولا۔

’’کمال کرتے ہو یار تم......! صبح آف ہے، کام پر تو جانا نہیں۔ ایک یہی دن تو ہوتا ہے گپ شپ کرنے کو، تو ابھی سے جا رہا ہے۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔‘‘

’’ویسے ہی یار......! لگتا ہے میری طبیعت نہیں ٹھیک، ورنہ شاید زیادہ دیر تک بیٹھتا اور پھر آج فہد بھی تو نہیں ہے۔‘‘ میں نے یونہی کہہ دیا۔

’’فہد کو میں نے فون کیا تھا لیکن اس نے کہا کہ ضروری کام ہے گھر پر وہ آ نہیں سکتا اور رہی تمہاری بات تو میری جان تمہاری طبیعت خراب نہیں، کوئی پریشانی ہے تمہیں۔ میں شیئر کرنے پر اصرار نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر میں اسے حل کرنے میں تھوڑی سی بھی مدد کر سکتا ہوا نا تو ضرور کروں گا، اس لئے مجھ سے کہنا ضرور۔‘‘ وہ بڑے خلوص سے بولا۔

’’اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں ضرور کہوں گا۔‘‘ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

’’میں جانتا ہوں بلال کو تمہاری ازدواجی زندگی ٹھیک نہیں ہے، مگر......‘‘ اس نے کہنا چاہا تو میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

’’تمہیں کیسے پتہ، جبکہ میں نے تم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔‘‘

’’سچ پوچھو تو فہد میرے ساتھ یہ ساری باتیں شیئر کرتا ہے، مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا نا، اس کے خیال میں تم سے بنیادی غلطی یہی ہوئی کہ تم نے ماما کو اعتماد میں لئے بغیر پتایا کا توڑ کیا۔ بس تب سے اس کے دل میں گرہ پڑ گئی ہے اور اس کا دور ہونا اب بہت مشکل ہے۔‘‘ وہ مایوسی سے بولا۔

’’ذیشان......! اگر قسمت میں ایسے ہی لکھا ہے تو یونہی سہی۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ میری نیت میں کوئی شک نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’نیت ایسی شے نہیں ہے کہ جس کا کوئی وجود ہو اور تم اسے کسی دوسرے کو دکھا سکو۔ کون یقین کرتا ہے میں تو یقین کر لوں گا، میں تمہارا دوست ہوں، لیکن......اب فہد بھی تو ہمارا دوست ہے، وہ بھی یقین نہیں کرتا، ممکن ہے اس میں کوئی رشتے داری کا پہلو ہو۔‘‘ ذیشان نے کہا۔

’’لیکن......! ہماری نیتوں کا حال وہ تو جان رہا ہوتا ہے نا جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔ وہ پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے دکھ نہیں ہے، ایک کمزور جذباتی انسان ہونے کے ناطے میرا ایمان شاید ابھی اس سطح پر نہیں ہے کہ میں خود پر قابو رکھ سکوں۔ مگر میں اس حد تک اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتا ہوں کہ جس طرح مجھے اپنے ہونے کا

یقین ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’خیر......! تم بہتر سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میری ذات تمہارے لئے ہر طرح سے حاضر ہے۔‘‘ وہ پھر بڑے خلوص سے بولا۔ تب ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی جیسے بات کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو۔ تبھی نیلم بھابی، ٹرے میں دو مگ رکھے آ گئی۔

’’یہ لیں گرما گرم کافی۔‘‘ اس نے ٹرے ہمارے درمیان پڑی ہوئی میز پر رکھتے ہوئے کہا پھر ہمارے درمیان ٹھہری خاموشی محسوس کر کے بولی۔ ’’ویسے آپ لوگ اتنے خاموش کیوں ہیں؟ خیریت؟‘‘

’’کچھ نہیں، ویسے ہی۔‘‘ ذیشان نے چونکتے ہوئے کہا تو وہ سعادت مندی سے بولیں۔

’’چلیں ٹھیک ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گئی۔

’’کب تک ایسے چلے گا۔‘‘ ذیشان نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

’’جب تک قسمت میں ہے، فی الحال کافی پیئو۔‘‘ میں نے کہا اور مگ اٹھا لیا کافی خاصی مزے دار تھی۔ میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ مقامی نمبر دیکھ کر پہلے میں نے اسے نظر انداز کر دینا چاہا لیکن پھر جب مسلسل بجتا گیا تو میں نے کال ریسیو کر لی۔

’’بلال بات کر رہے ہو۔‘‘ میں پی اون کی آواز سن کر بری طرح چونک گیا۔

’’ہاں......اور تم پی اون......یہاں......‘‘ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

’’جھٹکا لگ گیا ہے نا، میں نے کہا نا کہ جب میں آؤں گی تو تمہیں زبردست جھٹکا دوں گی۔‘‘ وہ انتہائی شوخی سے بولی۔

’’کہاں ہو تم؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’لاہور ائیر پورٹ پر، تم آؤ گے یا میں پہنچ جاؤں تمہارے گھر؟‘‘ اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تو میں نے فوراً کہا۔

’’میں آ رہا ہوں، ابھی تم وہیں میرا انتظار کرو۔‘‘ لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ وہ بولی۔

’’دیکھو......! دھیان سے آنا، میں انتظار کر لوں گی۔‘‘ اس نے بہت سکون سے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

’’پی اون یہاں پر ہے، مطلب ائیر پورٹ پر۔‘‘ میں نے ذیشان کو بتایا۔

’’اوہ......!‘‘ اس کا چہرہ ایک دم سے اتر گیا اور اس نے اپنا مگ میز پر رکھ دیا۔

’’کیا ہوا، تم خوش نہیں ہوئے۔‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’سچ پوچھو تو نہیں، وہ غلط وقت پر آئی ہے، ممکن ہے اس سے مسائل بڑھ جائیں۔

خیر......! آؤ، اسے لے آتے ہیں۔'' ذیشان نے بددلی سے کہا تو میں نے کہا۔

''تم ٹھہرو......! میں لے لیتا ہوں۔'' میں نے مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میری بات سے ناراض ہو گئے ہو، لیکن حقیقت یہی ہے۔'' وہ تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور اٹھ گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اور ذیشان ائیر پورٹ پر پہنچ کر گاڑی پارک میں لگا چکے تھے۔ ہم دونوں تیز قدموں سے اس متوقع جگہ کی جانب بڑھے جہاں پی اون ہو سکتی تھی۔ ہمیں زیادہ ادھر ادھر نہیں گھومنا پڑا، پی اون کچھ فاصلے پر کھڑی مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نیلی جین کے اوپر سنہری کام والا سفید رنگ کا لمبا کرتا پہنا ہوا تھا اور پھر اسی طرح کا سکارف سر پر باندھا ہوا تھا۔ زیادہ تر ملائیشیا کی مسلمان خواتین ویسا لباس پہنتی تھیں۔ میں ایک لمحے کو مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے شاید اسلامی ملک اور میرے ذہن کے مطابق ایسا لباس پہنا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ میری جانب یوں دیکھ رہی تھی کہ مجھ پر گزرنے والی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہ ہو۔ میں جیسے ہی اس کے قریب اس نے بڑے رسان سے کہا۔

''اسلام وعلیکم......!'' لیکن اس کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''وعلیکم اسلام'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور پھر ہنس دیا۔ پھر بولا ''لگتا ہے تم نے یہاں آنے سے پہلے کافی اسلامی آداب سیکھ لئے ہیں۔''

''ہاں......! میں نے سیکھے اور بہت سیکھے اور یہ سب مجھے سیکھنا بھی چاہئے تھا کیونکہ اب تمہارے سامنے پی اون نہیں، عائشہ یان کھڑی ہے۔ میں اسلام قبول کر چکی ہوں، الحمدللہ......'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''پی...... او...... نن...... نہیں، عائشہ یان...... کب؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''بلال......! تم نے مجھے کتنا ستایا تھا اور میں تمہیں اتنا بھی جھٹکا نہیں دے سکتی۔ خیر......! ان سے ملو۔'' یہ کہہ کر اس نے ذرا سے فاصلے پر ایک تھائی لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا، میں نے اس سے ہاتھ ملایا، پھر اس نے ذیشان سے ہاتھ ملایا۔ تب میں نے عائشہ یان کی جانب دیکھا تو وہ بولی، ''یہ میرے شوہر ہیں، علی یان، صرف ایک ہفتہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔'' اس نے کہا تو میرے دل میں اس کے لئے محبت اور احترام کے جذبات اُمنڈ پڑے، میں نے فوراً علی کو اپنے گلے سے

لگایا۔ علیک سلیک کے ساتھ احوال پوچھا۔

''اب میرا خیال ہے باقی باتیں گھر جا کر ہو سکتی ہیں۔'' ذیشان نے کہا تو میں نے دونوں سے ان کا تعارف کرایا اور پھر ہم سامان کے ساتھ ائیر پورٹ سے باہر آ گئے۔ سامان کے نام پر ان کے پاس فقط دو بیگ تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکے تو میں نے ذیشان سے کہا۔

''دیر تو ہو گئی ہے، لیکن کیا امی کو بتا دوں کہ......''

''آرام کرنے دو انہیں، صبح بتا دینا۔'' اس نے کہا تو میں نے گاڑی بڑھا دی۔

''عائشہ......! یہ اچانک تمہارا پروگرام کیسے بن گیا یا پھر......'' میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے ذہن میں تھا کہ شادی کے بعد وہ ہنی مون کے لئے نکلے ہوں گے، لیکن یہ بات میرے دل کو لگ نہیں رہ تھی۔

''میں جانتی ہوں بلال، تمہارے دل میں بہت سارے سوال امنڈ رہے ہیں، مگر میں سارے سوالوں کے جواب ابھی نہیں دے پاؤں گی۔ میں نے ساری باتیں تم سے ہی شیئر کرنی ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے تم صبر کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے کہا تو میں سمجھتے ہوئے بولا۔

''تمہاری انگریزی پہلے سے زیادہ صاف ہو گئی ہے۔'' میرے لہجے میں خوشگواریت تھی، اس لئے وہ ہنس دی۔ پھر سفر کی باتوں کے دوران ہم گھر تک آ پہنچے۔ ذیشان باہر ہی سے اپنے گھر چلا گیا تا کہ صبح نیلم بھابی کے ساتھ آ سکے۔ ملازمین میرے انتظار میں تھے۔ میں نے فوراً ایک کمرہ درست کرنے کو کہا اور عائشہ یان سے پوچھا۔

''فوری طور پر کیا کھانا پسند کرو گی، ممکن ہے تھائی کھانے کے لئے کچن میں کچھ دستیاب بھی ہو یا نہیں۔''

''ہم جہاز میں کھانا کھا چکے ہیں۔'' پھر علی کی جانب دیکھ کر پوچھا، ''کیا خیال ہے؟''

''ہلکی سی بھوک تو ہے، تم خود جاؤ کچن میں جو مناسب سمجھو لے آؤ۔'' اس نے کہا تو عائشہ نے فوراً کچن کا راستہ پوچھا جو میں نے اشارے سے بتا دیا۔ میں علی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا تعلق ملائیشیا سے تھا۔ غیر ملکی ماہر زبان کی حیثیت سے اس نے تھوڑا عرصہ پڑھایا اور پھر تھائی لینڈ آ گیا۔ اس نے اپنی تعلیم کا بیشتر حصہ امریکہ میں مکمل کیا تھا۔ عائشہ یان کچھ بنا کر لے آئی، اس کے پیچھے میرا شیف چائے لے آیا، تب بھی یونہی باتیں چلتی رہیں۔ کھانے پینے کے بعد وہ سونے کے لئے چلے گئے اور میں اپنے بیڈ پر پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی پی اون، اب عائشہ یان ہے؟

ماہا کے سرہانے پڑا ہوا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ رات گئے تک جاگتی رہی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ بہت دیر تک اس کی فہد سے باتیں ہوتی رہیں اور وہ خود یونہی بے سروپا سوچیں سوچ رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ مسلسل بیل ہونے کی آواز پر اس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ فون کرنے والے نے بھی یہ سوچ رکھا تھا کہ بات ضرور کرے گا۔ اس لئے بیل بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اب ماہا بے ہوش تو نہیں تھی کہ اس کی آنکھ ہی نہ کھلتی۔ اس نے بند آنکھوں سے کسمساتے ہوئے فون اٹھا لیا اور خمار آلود لہجے میں بولی۔

”ہیلو..... کون.....“ اس نے سکرین پر نمبر ہی نہیں دیکھے تھے۔

”ماہا بیٹی، میں ہوں تمہاری پھوپھو“ نجمہ نے حیرت ملی آواز میں کہا تو ماہا کے ذہن پر چھائی دھند اترنے لگی۔

”خیریت پھوپھو.....! اتنی صبح صبح.....!“

”اب کہاں صبح رہی ہے، بھئی دس بج رہے ہیں۔ کیا تم ابھی تک جاگی نہیں ہو؟“ وہ پھر حیرت سے بولی۔

”نہیں پھوپھو، ابھی تک بستر میں ہوں، کیسے خیریت تو تھی۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

”تم ذرا ہوش کرو تو بتاؤں۔“ وہ بولی۔

”ایسی بھی کیا بات ہے پھپھو، آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔“ وہ عام سے انداز سے بولی۔

”تو پھر سنو.....! وہ لڑکی جس کے پیچھے بلال تھائی لینڈ گیا تھا، رات سے بلال کے گھر میں آ چکی ہے اور اب وہیں ہے۔“

”کیا.....! آپ کیا کہہ رہی ہیں پھوپھو؟“ اس نے چونکتے ہوئے کہا تو ذہن پر چھائی ساری دھند دور ہو گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یقین نہ آئے تو خود پتہ کر لو اور ویسے بھی میں نے تم سے غلط بات کبھی نہیں کہی۔“ نجمہ نے فوراً ہی یوں کہا جیسے وہ اپنی بات کا یقین دلا رہی ہو۔

”نہیں، نہیں پھوپھو، ایسی بات نہیں، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا، میرا مطلب تھا کہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ وہ بولی۔

”صبح صبح فہد اور ذیشان کی بات ہوئی تھی، اس نے بتایا کہ وہ اسے ائیر پورٹ سے لائے ہیں اور اب فہد بھی وہیں پر ہے اور ذیشان اپنی بیگم کے ساتھ۔“ نجمہ نے اسے تفصیلی انداز

میں بتایا۔

”لیکن یہ اچانک..... کیوں.....“ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سیدھی سی بات ہے میری بیٹی.....! وہ تم سے تو اب متنفر ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے حویلی چھوڑ کر آ چکی ہو۔ اب تو اس کا راستہ صاف ہو گیا۔ میں بھی کہوں کہ زبیدہ خاتون کے منہ میں زبان کس نے ڈال دی۔ یہ ان کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔“ وہ رازدانہ لہجے میں بولی۔

”ہاں پھوپھو، میں خود حیران تھی نا کہ چاچی اماں، اس قدر کیوں تلخ ہو رہی ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس لڑکی کے ساتھ تو رابطے ختم نہیں ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا اب اسے بلوا لیا۔ ظاہر ہے وہ اب حویلی بھی جائے گی“ ماہا نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہی تو.....! اب احسان بھائی اور ذکیہ کے سامنے سچا ہونے کے لئے تمہیں بھی بلایا جائے گا“ اس نے آنے والے دنوں کا نقشہ کھینچا۔

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے پھوپھو.....! وہ بولی۔

”یہی تو سوچنے والی بات ہے بیٹی.....! تم اگر چلی جاتی ہو تو پھر اپنی ہی کہی بات پر شکست کھاؤ گی۔ جس مان پر تم یہ کہہ کر آئی تھی کہ میں دوبارہ حویلی میں قدم نہیں رکھوں گی وہ تو نہیں رہا، مٹی میں مل گیا۔ وہ مان تو نہ رہا۔ ناک نیچی کر کے ہی جانا پڑے گا، کیونکہ انہوں نے خود تو کہنا نہیں، تمہارے والدین ہی سے کہلوائیں گے۔“ نجمہ نے تفصیل بتائی۔

”اور اگر میں نہیں جاتی تو.....؟“ اس نے پوچھا۔

”تو پھر تمہارے ہی والدین تم سے ناراض ہوں گے۔ انہیں یہ تصدیق ہو جائے گی کہ تم ہی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم ہو۔ حویلی والے تو سچے ہی رہیں گے اور سارے ہی الزام تم پر آ جائیں گے۔ جیسے چودھری سرفراز کے خاندان میں انہوں نے تمہیں ہی برا بنایا ہے، خود تو وہ سچے ہیں۔ میرے خیال میں اب تو وہ رقیہ کی منگنی کے لئے بھی آنے والے ہوں گے۔“

”ہاں.....! یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟“

”میری بیٹی.....! میں نے تمہیں دونوں رخ بتا دیئے ہیں، جو میری سمجھ میں آئے ہیں۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کیا کرو گی۔“ نجمہ نے بہت پیار سے اپنا دامن بچا لیا۔

”پھر بھی پھوپھو.....! مجھے کچھ مشورہ تو دیں۔ آپ میری جگہ ہوتی تو کیا کرتیں۔“ وہ الجھن بھرے انداز میں بولی۔

”میں تمہیں یہ بتا سکتی ہوں لیکن بتاؤں گی اس لئے نہیں کہ تم اپنا دماغ استعمال کرو،

میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے مت چلو، اپنے فیصلے کرنا سیکھو، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں کہ تمہیں اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دوں، کیونکہ نتیجہ تمہارے سامنے ہے اور ہمارے درمیان جو طے ہو چکا، وہ تو ہو ہی چکا ہے۔'' نجمہ نے بڑی چابکدستی سے اپنا پہلو بچا لیا۔

''ٹھیک ہے پھوپھو، میں اس پر سوچ لوں گی، ویسے نہ جاؤں تو بہتر ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ حویلی والے اور میرے والدین پہلے ہی مجھ سے ناراض ہیں، اب مزید ناراض کیا ہوں گے۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جو تم چاہو، میں اس پر کوئی رائے نہیں دوں گی۔'' نجمہ نے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد فون کرنے کا کہہ کر کال ختم کر دی۔ جبکہ ماہا گہری سوچ میں ڈوب گئی کہ وہ بلال کو کیا سمجھے؟ کوئی بھی پہلو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا اس نے تھائی لڑکی کو اس لئے بلایا ہے کہ میں جیلس ہو جاؤں گی اور اس طرح بلال کے بارے میں سوچنے لگ جاؤں گی۔ نہیں......! میرے اندر ایسا کوئی جذبہ نہیں ابھرے گا۔ وہ اس سے چاہے شادی بھی کر لے، کیونکہ اب میں اپنے بلال سے الگ کر چکی ہوں۔ اس نے یہ سب سوچا اور پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بستر سے اٹھ گئی۔

❁......❁......❁

میرے دائیں جانب والے صوفے پر علی یان اور فہد بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ بائیں جانب عائشہ یان کے ساتھ نیلم بھابی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ذیشان بالکل میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا، دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا اور ہم ناشتے سے فراغت کے بعد یونہی گپ شپ میں مصروف تھے، تبھی فہد نے کہا۔

''عائشہ......! میرے خیال میں آپ نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے، میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔''

''نہیں......!'' اس نے پوری سنجیدگی سے کہا، کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ابھی اس بات کو ظاہر کرنے کا وقت نہیں ہے۔ جب وقت آیا تو میں خود ہی بتا دوں گی۔''

اس کے یوں کہنے پر فہد کا چہرہ تن گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ عائشہ یان اس طرح جواب دے گی۔ اس لئے پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ تب میں نے عائشہ سے پوچھا۔

''مطلب......! اب تم یہاں نہیں، میرے آبائی گھر جانا چاہتی ہو۔ یہاں ادھر لاہور میں نہیں رہنا چاہتی۔'' میں نے صبح کی اس بات کو جوڑا جو وہ ناشتے کے دوران مجھ سے کہہ چکی تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ لاہور بہت تاریخی شہر ہے اور اگر میں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے ٹیکسلا جانا پسند کرتی، مگر......! میں پہلے وہاں جانا چاہتی ہوں۔ میرے پاس بہت دن ہیں۔ جب تم کہو گے نا کہ جاؤ، تب میں جاؤں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، ہم آج ہی نکل چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یار، آج دوپہر کا کھانا تو کم از کم میرے ہاں کھاؤ، پھر جدھر مرضی جانا۔'' ذیشان جلدی سے بولا۔

''بہت کھانے کھاؤں گی، بلکہ آپ کے کچن میں خود بنا بنا کر کھاؤں گی۔ آپ کی بیگم کو تھائی کھانے بھی سکھاؤں گی، تاکہ بعد میں بھی میری یاد آتی رہے، لیکن فی الحال مجھے وہاں جانے دیا جائے۔ میں بلال کے دادا جی سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ بڑی حسرت سے بولی تو ذیشان نے حتمی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر نکلو انہیں لے کر، تاکہ وقت پر حویلی پہنچ سکو۔''

''چلو عائشہ، تیار ہو جاؤ، چلیں۔'' میں نے کہا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔

شہر سے باہر نکلتے ہوئے دوپہر ہونے کو آ گئی۔ تب پچھلی سیٹ پر بیٹھی عائشہ یان نے کہا

''بلال......! کیا تم نے حویلی میں بتا دیا ہے کہ میں وہاں آ رہی ہوں اور میرے ساتھ علی بھی ہے۔''

''بالکل......! امی تو بہت خوش ہو رہی تھیں۔'' میں نے خوش کن لہجے میں کہا۔

''اور تمہاری بیگم......؟'' اس نے پوچھا تو میں چند لمحے خاموش رہا کہ اسے کیا بتاؤں، حویلی جا کر بھی تو اسے معلوم ہو ہی جانا تھا اس لئے میں نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

''عائشہ......! وہ حویلی میں نہیں ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سب سے روٹھ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے، ہمیشہ کے لئے۔''

''وہ خود ہی گئی ہے یا تم......'' وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نہیں......! میرے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی، اس کے جانے کے بارے میں بھی مجھے امی نے بتایا تھا۔'' میں نے کہا تو اس نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر کہا۔

''او خدایا شکر ہے......! تم اسے کہو کہ حویلی آ جائے۔''

''میرے خیال میں وہ اب نہیں آئے گی۔'' میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''تم کہو تو......! اگر وہ نہیں آئے گی تو میں اس سے ملنے چلی جاؤں گی۔'' اس نے کہا تو علی بولا۔

''بلال......! اصل میں یہ تمہاری بیگم ہی سے ملنے یہاں آئی ہے اور یہ اس لئے......''

اس نے کہنا چاہا لیکن وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

''علی پلیز......! ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا۔''

''او کے......! جیسے تم چاہو۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''اچھا، جہاں آگے کوئی ٹھہرنے کی جگہ تو گاڑی روکنا، نماز بھی پڑھ لیں گے اور فون بھی کرلیں گے۔'' اس نے کہا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

تقریباً مغرب کے وقت ہم نور پور پہنچ گئے تھے۔ گہما گہمی کے علاقے سے نکل کر پرسکون جگہ آئے تو میں نے عائشہ یان کو بتایا۔

''یہاں پر میری بیگم کا گھر ہے اور یہاں سے بیس منٹ کے فاصلے پر گلاب نگر ہے، مطلب حویلی......''

''اگر اس نے ہمارے ساتھ جانا ہوتا تو ہم اسے ابھی لے لیتے، میرے خیال میں وہ اپنے والدین کے ساتھ حویلی پہنچ چکی ہوگی، کنفرم تو کرو۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''ابھی یہاں ایک قریبی مسجد آرہی ہے ہم وہاں نماز بھی پڑھیں گے اور تصدیق بھی کرلیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

میں نے مسجد کے باہر گاڑی روکی اور امی کو فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد میری ان سے بات ہوگئی تو میں نے ان سے پوچھا۔

''امی......! کیا ماہا یہاں آگئی ہے؟''

''ہاں......! آگئی ہے۔ تم کہاں پر ہو۔ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں ہو۔'' وہ ذرا تشویش سے بولیں تو میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ میں تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گی۔ میں نے فون بند کیا اور مسجد میں داخل ہوگیا۔ سامنے ہی دائیں جانب میاں جی چند لوگوں کے درمیان بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خاموش ہوگئے۔ مجھے بڑی سبکی سی محسوس ہوئی کہ میں خود کو اتنا نمایاں کرلیا کہ وہ اپنی بات روک کر میری جانب دیکھنے لگے۔ میں شرمندہ سا ان کی جانب بڑھا۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ میرا حال احوال پوچھا تو میں نے بتایا۔

''میرے ساتھ غیر ملکی مہمان ہیں۔ ان میں ایک نومسلم خاتون ہے، جسے نماز پڑھنا ہے۔''

میرے یوں کہنے پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور خوشی بھرے لہجے میں بولے۔'' الحمدللہ......!'' پھر وہاں پر موجود لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے بولے'' چند باتیں رہتی ہیں لیکن مہمانوں کے باعث معذرت خواہ ہوں۔ اگر ہم نماز کے بعد چند منٹ بیٹھ جائیں

تو کیا مجھے اجازت ہے......''

''یہ سنتے ہی لوگ فوراً اٹھ گئے اور میاں جی میرے ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آگئے۔ دونوں گاڑی سے باہر آ گئے تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ انہوں نے علی کو گلے لگایا، پھر عائشہ یان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آؤ! اندر آؤ......'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب چل دیئے، پھر مسجد کا صحن پار کر کے اپنے حجرے میں چلے گئے اور مجھے کہا'' بھئی......! مجھے ان کی زبان شاید نہ آئے، تم اس بیٹی سے کہو کہ یہاں نماز پڑھ لے اور ہم وہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلیتے ہیں۔''

میں نے یہی بات عائشہ یان سے کہی تو اس نے سر ہلاتے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں یہیں پڑھ لوں گی۔ وضو کے لئے پانی چاہئے ہوگا۔''

''وہ مل جاتا ہے......'' میں نے کہا اور ہم حجرے سے باہر آگئے۔ پھر وضو کے بعد ہم نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلی تو نماز کے بعد میاں جی نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے میرے ذریعے ان سے کہا۔

''بلال بیٹا......! ان سے کہو کہ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ان سے مل کر اور میں امید کروں گا کہ یہ مجھے دوبارہ ضرور ملنے آئیں گے، تاکہ ان سے تھوڑی بات ہوسکے۔'' میں نے کہا تو علی جلدی سے بولا۔

''میں بھی چاہوں گا کہ آپ سے ضرور باتیں ہوں، انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔''

''فی امان اللہ......!'' میاں جی نے کہا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھا ایک شخص آرہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے قریب پہنچ کر رک گیا اور ایک شاپنگ بیگ ان کی جانب بڑھا دیا۔ میاں جی نے اس میں سے ایک روایتی آنچل اور سفید پگڑی نکالی اور مجھے دکھاتے ہوئے بولے۔'' یہ بیٹا ان کے لئے، انہیں بتا دینا کہ روایتی طور پر یہ کیا علامت ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میاں جی۔'' میں نے وہ شاپنگ بیگ پکڑ کر علی کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر ان سے مل کر حویلی کی جانب چل پڑے۔ پھر راستے میں ان دونوں کو بتایا کہ ہمارے علاقے میں آنچل اور پگڑی کے بارے میں کیا تصور ہے۔ یوں خوشگوار باتوں میں ہم حویلی کے پورچ میں جا رکے۔

سوائے ماہا کے حویلی میں مقیم بھی لوگ ڈرائنگ روم میں موجود تھے، یہاں تک کہ ملازمین بھی۔ میں نے سب کا تعارف کرایا تو سبھی نے اپنے مراتب کے لحاظ سے کسی نے سر پر

پیار کیا اور کسی نے گلے لگایا۔علی سب سے مل کر دادا جی نور الٰہی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"بلال......! بہت اچھی حویلی ہے، ایسا تو انڈین کلچر میں ہوتا ہے نا۔"

"ہاں......! لیکن اب پاکستانی کلچر اپنی شناخت بنا رہا ہے، بلکہ بہت ترقی کر رہا ہے۔" میں نے اسے کہا تو دادا جی نے بولے۔

"بلال پتر......! یہ تو بڑا مسئلہ آن پڑا ہے، اس بارے میں پہلے بھی بات کرنا چاہتا تھا، میں ان مہمانوں سے کیسے بات کر سکوں گا، تم لوگ تو شاید کر لو۔" ان کے یوں کہنے پر احسان تایا جلدی سے بولے۔

"میں کس لئے ہوں ابا جی......! میں ترجمہ کر دوں گا نا، یہ کچھ انگریزی میں کہیں گے میں آپ کو بتا دوں گا اور......"

"چلو، یہ ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ اپنی تھائی زبان بولیں گے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں تو ہنس دیا۔

"چلو آپ ان سے کوئی بات کریں۔" میں نے کہا۔

"انہیں کہو......! پہلے جا کر فریش ہو جائیں، پھر کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔" ابا جی نے احسان تایا سے کہا تو انہوں نے علی کی جانب دیکھ کر کہا۔ وہ مسکرا دیا اور جواباً بولا۔

"بالکل......!" یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں......! میں پہلے بلال کی بیگم سے ملوں گی۔" عائشہ یان ایک دم سے بولی۔

احسان انکل سمجھ گیا تو ملازمہ کو ماہا کے بلانے کے لئے کہا، تو علی یان بیٹھ گیا۔ پھر ان میں سفر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ماہا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، وہی لاپرواہانہ انداز، کوئی سنگھار نہیں، بیہودہ لباس، گلے میں آنچل اور اجنبی چہرہ، اس نے آتے ہی میری جانب دیکھا، پھر اس کی نگاہ عائشہ یان پر گئی اور پھر اس نے علی یان کو دیکھا۔

"میری بیگم......!" میں نے سرسراتے ہوئے انداز میں تعارف کرایا تو عائشہ یان کھڑی ہو گئی اور پھر چند قدم چل کر ماہا تک پہنچی۔ ماہا نے سرد مہری سے سلام لینا چاہا لیکن اس نے ماہا کو گلے لگا لیا۔

"کیسی ہو۔" اس نے الگ ہو کر ماہا کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نیا جنبی لہجے میں جواب دیا۔

"آؤ......! ان سے ملو، یہ میرے شوہر ہیں علی یان......" اس نے فخریہ انداز میں تعارف کرایا تو وہ جلدی سے کھڑا ہوا اور سلام کہہ دیا۔ ماہا نے اسی انداز میں جواب دیا اور ایک

جانب ہو کر بیٹھنے لگی تو عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس بیٹھے......!"

اتنے میں ملازمین وہاں پر مشروب لے کر آ گئے، تب عائشہ نے دادا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اس خاندان کے سربراہ ہیں۔ میں آپ کے بعد خاص طور پر ماہا سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ میں چاہوں گی وہ کہانی میں سب کو سناؤں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟"

"ہاں ہاں......احسان بیٹا، اسے کہو میں ضرور سنوں گا، لیکن پتر، یہ کھانا وانا کھا لیں، پھر سکون سے بیٹھیں گے تو سنتے ہیں۔" دادا جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے......! لیکن میں آپ سب کو سنانا چاہوں گی۔" عائشہ یان نے کہا اور پھر ماہا کا ہاتھ پکڑے وہ اٹھ گئی۔ میں بھی ان کے ساتھ اٹھا، دونوں کو ان کا کمرہ دکھایا، پھر میں اور ماہا جب پلٹنے لگے تو اجنبی نگاہوں سے میری جانب دیکھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

❀......❀......❀

میں عائشہ یان، جو چند ماہ پہلے پی اون کے نام سے پکاری جاتی تھی اور میرا پورا نام سپنری لوئیلی رینٹ چائی تھا۔ میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس میں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں تھی، میری ماں کا مذہب بدھ مت تھا، لیکن وہ بہت کم کسی پگوڈا میں جاتی تھی، وہ کبھی کبھی کسی رسم یا میلے میں شریک ہو جاتی، جب اس کے پاس وقت ہوتا تھا، ورنہ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر تھی۔ میرا باپ ذہنی طور پر عیسائیت کے قریب تھا، مگر وہ کبھی کسی چرچ میں نہیں گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہاں سے اگر اس نے کچھ حاصل کر لیا تو تھوڑا بہت میری ماں کو دے دیتا ورنہ زیادہ تر وہ اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیتا۔ وہ خود تو مذہبی نہیں تھا، لیکن دنیا بھر میں اگر اسے کسی سے نفرت تھی تو وہ مسلمانوں سے۔ وہ انہیں دہشت کی علامت سمجھتا تھا۔ یہ یقیناً اس لئے تھا کہ اس کے خون میں تھوڑی بہت امریکی ہونے کی رمق تھی۔ میں بچپن ہی سے سنا کرتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو دنیا کا امن تباہ کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ لیکن خود نہیں جانتا تھا کہ امریکی کیا کر رہے ہیں۔ میں اسی ماحول میں پرورش پاتی چلی گئی۔

تھائی عورتوں کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لئے میری ماں نے مجھے بچپن ہی

سے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ پڑھ لکھ جاؤں، تاکہ اس کی مانند مزدوری نہ کرتی رہوں۔ اس نے میرا خرچ برداشت کیا جب تک وہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ بعد میں میرا بھائی زبردستی سے اپنے اخراجات میری ماں سے چھین لیتا تھا۔ وہ پڑھا نہیں اور میرے باپ کے نقش قدم پر چل پڑا تھا۔ اسے مجھ سے تو کیا اپنے آپ سے بھی غرض نہیں تھی۔ سو میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مزدوری کرتی رہی۔ وہ لڑکیاں جو کچھ نہیں کر سکتی یا زندگی گزارنے کا آسان راستہ تلاش کرتی ہیں، وہ جنسی زندگی کی جانب راغب ہو جاتی ہیں۔ جوانی تو وہ بڑے اچھے انداز میں بسر کر لیتی ہیں لیکن پھر انہیں کوئی نہیں پوچھتا، بقیہ زندگی انتہائی بیماری اور نفرت والی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میرے سامنے بھی یہ راہ تھی، لیکن میں نجانے کیوں اس راہ پر نہیں جا سکی، شاید میں اپنے ماحول میں خوفزدہ تھی، یا میری ماں کی تربیت جس نے اپنی زندگی بہت مشکل سے گزاری تھی یا پھر قسمت تھی، کچھ تھا ایسا کہ میں نے مشکل زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس راستے پر چل نکلی، جہاں مجھے زیادہ دولت کمانے اور آسائش کی زندگی کے لئے بہت سارے راستے دکھائی دیئے اور میں صبر سے ان پر چلتی رہی۔

انہی دنوں مجھے میری ایک ٹیچر نے سمجھایا کہ میں انگریزی زبان پر عبور حاصل کروں تو بہت زیادہ ترقی کر سکتی ہوں۔ ہمارے ہاں سیاحت کا شعبہ بہت مضبوط ہے، اس میں ایسے لوگوں کی بہت مانگ ہوتی ہے۔ زبان پر مہارت میں جہاں دوسرے مشورے ملے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ میں انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کے لوگوں سے رابطہ کروں اور یہ اعتماد حاصل کروں کہ ان سے انگریزی میں بات کس طرح کی جاتی ہے۔ تب مجھے بلال ملا۔ اس کے ساتھ اور بہت سارے لوگ تھے، مگر دھیرے دھیرے وہ ختم ہوتے چلے گئے اور میری بال کے ساتھ بہت اچھی دوستی بن گئی۔

میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میرے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کوئی اچھے جذبات نہیں تھے۔ میں بھی انہیں ویسا ہی سمجھتی تھی، جیسے میرا باپ خیال کرتا تھا۔ اس وقت میں ذہنی طور پر اتنی پختہ نہیں تھی اور میں دنیا بھر کی معلومات بھی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، سو، میں جب بلال سے بات کرتی تو اس سے ایسے سوال کرتی جس میں مسلمانوں کے بارے میں نفرت انگیزی ہوتی، یہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتا، لیکن مجھے مطمئن نہیں کر پاتا تھا اور میں خیال کرتی کہ جو میں سوچ رہی ہوں وہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ میں اپنا ذہن ان معلومات پر خرچ کرتی جو مجھے مل جاتیں، خود سے کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ تحقیق کروں اور پرکھوں کہ آیا میں درست بھی ہوں یا غلط......!

میں ہوٹل میں ملازمت کرتی تھی اور دنیا بھر کے لوگوں سے ملتی تھی۔ انہیں دیکھتی اور پرکھتی اور اپنے طور پر تجزیہ کرتی رہتی، وہ مجھے سب ایک جیسے نظر آتے، جنہیں سوائے عیاشی، شراب نوشی اور عورت سے رغبت کے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ ان کی غلیظ نگاہیں اور دوسروں کا بدن ٹٹولنے کے علاوہ کچھ کرتی ہی نہیں تھیں۔ سو میں اپنے ماحول سے بھی کوئی اچھا تاثر نہیں لے رہی تھی، لیکن تھی تو اسی معاشرے کا حصہ جس کی اپنے انداز میں پرورش ہوئی ہوتی ہے۔ میری بلال کے ساتھ دوستی چلتی رہی اور میں نے محسوس کیا کہ اب اگر میں اس سے مسلمانوں کے خلاف بات کرتی ہوں تو وہ میری بات کو اہمیت نہیں دیتا اسے نظر انداز کر جاتا ہے، جسے میں نے اپنے خیالات کی فتح مندی قرار دیا۔

میں جس انسٹیٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرتی تھی، وہاں ایک مسلمان لڑکی بھی تعلیم حاصل کرتی تھی، وہ وہیں پتایا میں رہتے تھے۔ وہ چند لڑکیوں کا ہاسٹل تھا جس کی نگران ایک ملائیشین خاتون ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو دہشت گرد ہی خیال کیا، لیکن مجھے اس کی باتوں میں یا کسی بھی طرز عمل میں کبھی کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی، مگر میرے سوالوں کا جواب وہ بھی نہیں دے پائی تھی۔ وہ بہت دب کر رہتی تھی۔ اس لئے میری اس سے اتنی زیادہ دلچسپی نہ بڑھی۔ پھر اچانک ایک دن بلال پتایا آ گیا۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے چھپ کر میرے بارے میں جانا کہ میرا کردار کیا ہے۔ وہ میرے سامنے رہا لیکن میری نگاہوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو مجھے اس کا یہ طرز عمل بہت برا لگا تھا، لیکن بعد میں سوچنے پر اتنا برا نہیں، کیونکہ وہ حق بجانب تھا اور اب میں سمجھتی ہوں کہ جس مقصد کے لئے بلال وہاں گیا تھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے۔ وہ اس لئے کہ اگر میں بھی کوئی عام تھائی لڑکی ہوتی، جو رقم کے عوض اپنا آپ کرائے پر دے دیتی ہے تو اس کا میرے ساتھ بات کرنا بنتا ہی نہیں تھا۔ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر خاموشی سے واپس چلا جاتا تو وہ بالکل درست تھا۔

بلال نے میرے نفرت انگیز سوالوں کے جواب دینے کے بجائے، دین اسلام کا وہ بنیادی نکتہ نظر سمجھایا، جس کا مطالبہ وہ انسان سے کرتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ خدا کا وجود ہے، نبی آخر الزمانؐ کیوں مبعوث ہوئے اور دین اسلام انسانیت سے کیا چاہتا ہے۔ میں جو خدا کو نہیں مانتی تھی، یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں کیا ہوں؟ میری ساری سوچیں تو میرے ذہن سے اُڑ گئیں، جیسے خزاں رسیدہ پتے طوفان اُڑا کر لے جاتا ہے۔ میں نے جانا کہ وجود کیا ہے اور روح کیا ہوتی ہے، سماجی زندگی کے بنیادی اصول کیا ہوتے ہیں، انسانیت کسے کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی میں کون اپنی ذہنی غلاظت پھیلا رہا ہے۔ کلچر کے نام پر

غیر اخلاقی اقدام کو فروغ کیوں دیا جا رہا ہے، امن کو تہہ و بالا کر کے سامراجیت کو فروغ کون دے رہا ہے۔ یہ اور ایسے بے شمار سوالوں نے مجھے ایک نئی زندگی سے متعارف کرا دیا۔ میرے سامنے فقط ایک ہی راستہ تھا کہ میں قرآن پاک پڑھوں، اسے سمجھوں اور خود تجزیہ کرنے کی کوشش کروں کہ آیا مسلمانوں کی بنیادی تعلیمات میں وہ سب کچھ ہے جس کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کیا ان کے سماج میں وہ اخلاقیات ہیں جو مسلمانوں کے خلاف غلاظت پھیلا رہے ہیں۔

ان دنوں میں بلال کے کردار سے بہت متاثر ہوئی، میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے بہت محبت محسوس کی۔ ایک بار اس نے میری کوشش کے باوجود مجھے نظر انداز کر دیا۔ مجھے اپنے جسم کے ٹھکرائے جانے پر غصہ بھی بہت آیا۔ لیکن اس کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کوشش کر کے اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی، مگر میں ناکام رہی اور بلال کے کردار کے سامنے شکست کھا گئی۔ اپنے وطن واپس آنے تک اس نے میرے ساتھ بہت اچھا رویہ رکھا، جیسا کہ ایک اچھے دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن میں آخری دم تک اس کے لئے ایک تنقیدی ذہن لئے رہی۔ اس نے مجھے پتایا میں موجود ہمت سنگھ اور جندکور سے ملایا۔ وہ بہرحال بہت مخلص لوگ ہیں۔ بلال تو وطن واپس آ گیا، لیکن میرے لئے ایک نیا راستہ، نئی سوچیں اور نیا طرز زندگی سامنے تھا۔ ہاں......! یہاں میں ایک بات بھول رہی ہوں۔ بلال نے مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے بات کرنے سے قبل اس نے اگرچہ اپنے دین کے بارے میں پڑھا ہے، لیکن اس حد تک نہیں کہ میرے سوالوں کا جواب دے سکے، تب اس نے اپنا مطالعہ وسیع کیا اور اس قابل ہو گیا کہ میرے ہر سوال کا جواب دے سکے اور ایسا اس نے کیا، جس کا ردعمل یہ ہوا کہ میں نے بھی چاہا کہ دین اسلام کے بارے میں جانوں، خود پڑھوں اور تجزیہ کروں، کیا بلال درست بھی کہہ گیا ہے یا یونہی فلسفہ اور منطق جھاڑ کر چلا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اب شاید وہ کبھی مجھ سے نہ مل سکے گا۔ کیونکہ جاتے ہی اس کی شادی ہو جائے گی۔ دو ہفتے تک میں اس تجسس میں مبتلا رہی کہ مجھے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں، پھر میری کون سی ملاقات ہو گی۔ مجھے اس سمیت ساری باتوں کو بھول کر اپنی زندگی میں مگن ہو جانا چاہئے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میرے اندر انتہائی درجے کے تجسس نے آنکھ کھول دی۔ اب وہ سارے منظروں کو خود دیکھنا چاہ رہا تھا، جس کے بارے میں بلال اشارہ کر گیا تھا، پھر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس الجھن سے نجات حاصل کر لوں، میرے سامنے سب کچھ عیاں ہو جائے گا، میں نے ہوٹل کی نوکری تو چھوڑ ہی دی تھی۔ میں اس مسلم لڑکی سے ملی جو میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ وہ مجھے ایک خاتون کے پاس لے گئی، جس نے وہ تمام کتابیں اور لٹریچر فراہم کیا جو

پڑھنا چاہتی تھی، میں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا۔ تب مجھے لگا کہ میں نے تو زندگی میں کچھ بھی نہیں سیکھا، بلاشبہ میرے پاس تو علم ہی نہیں ہے۔ بلال کی ایک ایک بات میرے ذہن میں تھی۔ میں نے اپنے طور پر سوالوں کی ایک فہرست ترتیب دی اور پھر اس کی تلاش میں لگ گئی۔ اس دوران میرے پاس رقم ختم ہو گئی۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اب میں کیسے اپنا خرچ کر پاؤں گی۔ یہاں تک کہ میرے پاس ایک بھات بھی نہ رہا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ میں نے ڈھلتے ہوئے سورج کی جانب دیکھا اور دل سے کہا کہ اگر بلال کا خدا ہے تو پھر آج کے بعد مجھے کم از کم معاشی تنگی نہیں ہونی چاہئے تاکہ میں پوری یکسوئی سے ازلی سچائی تک پہنچ سکوں۔ شاید یہ قبولیت کا وقت تھا، میں جندکور کے پاس جا پہنچی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بلال کے دیئے ہوئے بھات پڑے ہیں۔ اس نے وہ سارے مجھے دے دیئے۔ میں واپس آ گئی، اسی رات مجھے فون ملا کہ میں اگر چاہوں تو پڑھنے کے ساتھ پڑھا بھی سکتی ہوں اور جتنا چاہوں کما لوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے صبح ہی سے وہ انسٹیٹیوٹ جوائن کر لیا اور پھر اس مسلم خاتون کے پاس آ گئی تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی جاب اور تحقیق کر سکوں۔ میں نے دن رات ایک کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں سے پیاسی ہوں، میرے سامنے لاتعداد انکشافات ہونے لگے۔ میں جو سوچ لے کر بھی قرآن پاک کے پاس جاتی، مجھے اس کا جواب مل جاتا، بلاشبہ اس معاملے میں اس مسلم خاتون نے میری بہت مدد کی تھی، اس نے میرا راستہ آسان کر دیا اور پھر ایک دن میں نے اسلام قبول کر لیا، ایسا میں نے اپنے دل سے کیا۔

مجھے معلوم تھا میرے والدین مجھ سے متنفر ہو جائیں گے اور ایسا ہوا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر مجھے تنگ کیا گیا یا پھر مجھ پر جبر کیا گیا تو میں یہ ملک چھوڑ دوں گی، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور میں سکون سے تعلیم حاصل کرتی چلی جا رہی ہوں اور ساتھ میں بہترین جاب کر رہی ہوں۔ میرے پاس بے شمار مواقع ہیں جن سے میں کما سکتی ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں پاکستان کیوں آئی ہوں؟ اگر ہمت سنگھ اور جندکور پاکستان نہ آتے اور وہ واپس جا کر مجھے بلال کے حالات نہ بتاتے تو شاید میں کبھی بھی پاکستان نہ آتی اور شاید میں تب بھی نہ آتی اگر بلال کی ازدواجی زندگی پرسکون اور خوشحال ہوتی۔ جندکور یہاں سے بہت کچھ لے کر گئی تھی۔ روپے، تاثرات، پیار، سب کچھ، اس کا کلچر بھی آپ جیسا ہے اور وہ ان باتوں کو زیادہ سمجھتی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ بلال کی بیگم کے لئے میں جو تحفہ بھیج رہی ہوں، اس میں اس کی تصویر لے آنا، تاکہ میں دیکھ سکوں ماہا کیسی ہے، جس کی بلال نے اس قدر تعریف کی تھی کہ اسے اپنا عشق

مانا تھا اور اپنا سب کچھ اس کے لئے بچا کر رکھا تھا۔ ماہا کو شاید معلوم بھی نہ ہوتا کہ بلال کہاں پر کیا کر رہا ہے، لیکن اس نے اپنی ذات کو گواہ بنا کر اس کی محبت کو اپنے اندر زندہ رکھا۔ وہ شخص جس کے باعث میں ازلی سچائی کو پا چکی ہوں، اس کی محبت کتنی خوبصورت اور اعلیٰ ہوگی، میں یہ دیکھنا چاہتی تھی، لیکن......! جب میں نے بلال کے حالات سنے تو میں نے خود میں بہت دکھ محسوس کیا، کیا اسے یہ سزا ملی ہے کہ اس نے اپنے دین کے بارے میں غلط فہمی دور کرنے کے لئے اتنا لمبا سفر کیا؟ میں نے بہت سوچا اور جتنا سوچتی رہی میرے اندر دکھ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پاکستان جاؤں گی اور کم از کم سب کو حقیقت سے آگاہ ضرور کروں گی۔ آگے اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ اب میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اکیلی کیسے سفر کروں، میں پی اون ہوتی تو فوراً یہاں آ جاتی، لیکن میں تو اب عائشہ یان ہوں۔ بغیر محرم کے سفر کیسے کر سکتی ہوں، میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا، جن کے ہاتھ پر میں نے اسلام قبول کیا تھا۔ انہوں نے یہ مسئلہ حل کر دیا، علی یان انہی کے بڑے بیٹے ہیں اور میں یہاں پر ہوں۔ میں ان سے شادی کر کے خود کو خوش قسمت تصور کر رہی ہوں۔

اس وقت ہمارے سارے ڈرائنگ روم میں تھے اور رات خاصی بھیگ گئی تھی۔ جنوری کے ان دنوں میں سردی اچھی خاصی تھی، آتش دان سلگ رہا تھا، جس میں لکڑیاں جلنے کی آواز سے گہری خاموشی کا اندازہ ہوتا تھا۔ عائشہ یان نے بات ختم کی تو سب کی نگاہیں ماہا کی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے چند لمحے برداشت کیا اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ عائشہ نے جو طویل داستان سنائی تھی، اگر یہ حقیقت ہے تو پھر بلال تو کو میں غلط ہی سمجھتی رہی ہوں۔ میں جو اسے ایک دہشت گرد، انتہا پسند وغیرہ قرار دے کر اسے خود سے الگ کر دیا تھا، کیا میرا یہ قدم درست ہے؟ وہ کتنا اچھا انسان ہے، جس کے باعث ایک گمراہ خاتون نے قبول اسلام کیا، اور میں......! میں نے اسے کیا صلہ دیا۔ اس کی ذات کو اس کی انا کو، اس کی شخصیت کو کچل دیا۔ صرف اس لئے کہ میں اپنی پسند کے مطابق اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بستر پر پڑی یہی سوچے چلی جا رہی تھی۔

''کہیں یہ مجھے اپنے قریب کرنے کے لئے اور اپنی بات منوانے کے لئے کوئی کھیل ہی نہ کھیلا جا رہا ہو، کہیں مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا جا رہا ہے؟'' اچانک ماہا کے ذہن میں آیا تو وہ چونک گئی۔ ''کیا......! بلال اس قدر جھوٹ کر سہارا لے کر میری محبت حاصل کر سکتا ہے؟''

''نہیں......! بلال ایسا نہیں کر سکتا، اسے مجھ سے محبت تو ہے لیکن عائشہ یان اس

قدر جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

''کیوں نہیں بول سکتی، تم نے تو اپنی طرف سے ختم کر دی تھی، یہ اچانک آمد ضرور دال میں کچھ کالا رکھتی ہے، ورنہ وہ پہلے بھی آ سکتی تھی۔ اسے آنے کا شوق تھا تو پہلے آتی...... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اسلام قبول کیا ہو اور بلال کو اس نے نہ بتایا ہو۔''

''ممکن ہے ایسا نہ ہو، تم اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔''

''پھر مجھے تو اپنی انا قربان کرنا پڑے گی؟''

''لیکن اس کے عوض تمہیں کیا ملنے والا ہے، یہ بھی سوچو، ایک محبت کرنے والا شوہر، بالفرض محال، اس نے یہ کھیل بھی کھیلا ہو گا تو کس کے لئے، تمہاری لئے نا؟ ورنہ تو کیا وہ تمہاری پروا کرتا......؟''

''جائیداد کے حصول کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس نے چار پانچ لاکھ لگا بھی دیئے ہوں تو انہیں بلوانے میں تو کیا گھاٹا ہے، میں اس قدر احمق ہوں کہ ان کے اس کھیل سے متاثر ہو جاؤں گی۔''

''اگر وہ تمہاری جائیداد سے دستبردار ہو جائے تو پھر تمہارے پاس کیا جواز رہ جاتا ہے۔''

''جب میں اسے اپنا آپ سونپ دوں گی تو پھر کیا بچے گا۔ وہ میرا برین واش کر کے سب کچھ حاصل کر لے گا۔ یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔''

''وہ اگر......''

وہ اپنی سوچ کی رو میں بہے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد عائشہ یان اس کے کمرے میں آ گئی۔ ماہا کو امید نہیں تھی کہ وہ یوں آ جائے گی، اس لئے جلدی سے اٹھ کر اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن عائشہ یان اس کے پاس بیڈ پر ہی آن کر بیٹھ گئی اور نرم سے لہجے میں بولی۔

''اگر میری باتیں بری لگی ہیں ماہا اور تمہیں اس سے دکھ ہوا ہے تو میں بہت زیادہ معذرت چاہتی ہوں......''۔

''نہیں، مجھے تمہاری بات سے کوئی دکھ نہیں ہوا، لیکن تم نے اپنی تان مجھ پر آ کر توڑی ہے کہ جیسے میں ہی قصوروار ہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا، مگر میں یہ چاہ رہی تھی کہ اگر تمہیں یہ غلط فہمی کہ بلال فقط میری دوستی میں پٹایا گیا تھا تو......'' اس نے کہنا چاہا تو ماہا نے ٹوک دیا۔

''مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ اس کی لائف ہے جس طرح گزارے، میرے

لئے یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ تم اس کی وجہ سے مسلمان ہوگئی ہو۔ مجھے تم پر یہ حیرت ہے کہ تم میری وجہ سے پاکستان آئی ہو اور بلال کے کردار بارے تصدیق کر رہی ہو، جسے میں بچپن سے جانتی ہوں......'' ماہا نے قدرے نخوت سے کہا۔

''او کے......! مجھے یہ اندازہ ہے کہ تم اسے مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہو اور سمجھتی بھی ہو، لیکن اتنے اچھے انسان کی بیوی، جو اس کی محبوبہ بھی ہو، وہ اس سے متنفر ہو جائے، ایسا کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ، کیا ہر انسان کو اپنی پسند کی زندگی جینے کا اختیار ہے کہ نہیں؟'' ماہا نے پوچھا۔

''بالکل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر اگر میں اپنی پسند کی زندگی جینا چاہتی ہوں اور اگر کسی کو میری چاہت ہے تو وہ میری سطح پر آئے۔'' اس نے واضح انداز میں کہا تو عائشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''بالکل یہ تمہارا حق ہے......لیکن مجھے ایک بات بتاؤ ماہا، تمہارا دین کیا ہے؟ تم کون ہو؟''

''میں الحمدللہ مسلمان ہوں، اس میں کسی کو کیا شک ہے؟'' ماہا نے کہا۔

''لیکن مجھے شک ہے اور تم اگر کسی بین الاقوامی جگہ پر جاؤ، تو تمہاری پہچان کیا ہوگی، تمہیں شاید نہ ضرورت ہو لیکن کسی دوسرے کو تو ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ویسا رویہ تمہارے ساتھ اپنائے۔'' وہ بولی۔

''تم کون ہوتی ہو شک کرنے والی، ہو سکتا ہے میں تم سے بہتر مسلمان ہوں۔'' ماہا نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''دلوں کے بھید تو اللہ جانتا ہے، لیکن بندے کی شخصیت سے بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر مسلمان ہے اور وہ اللہ کو کس قدر مانتا ہے۔'' عائشہ نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ یہ ٹھیک ہے دین، بندے اور اللہ کا معاملہ ہے، لیکن ایک مسلمان اور خاص طور پر ایک مسلمان خاتون کا اظہار یہ بتا دیتا ہے کہ وہ اللہ پر کتنا یقین رکھتی ہے اور کس قدر مانتی ہے۔'' بولی

''کیسے کہہ سکتی ہو تم۔'' وہ بولی۔

''میں بتاتی ہوں۔'' عائشہ یان نے خود کو سمیٹا اور کہا ''اللہ پاک نے قرآن مجید میں

فرمایا ہے سورہ نور کی اکتیسویں آیت میں کہ جو مومن عورتیں ہیں وہ اپنی زینت و سنگار کی نمائش نہ کریں، سینوں پر اپنے دوپٹہ، چادر اوڑھیں رکھیں اور سنگھار ظاہر نہ ہونے دیں......سوائے اپنے شوہر پر، باپ، سسر، بیٹوں، خاوند کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنی جیسی عورتوں پر......'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔'' کیا تم نے کبھی یہ آیت پڑھی ہے، اس کا ترجمہ دیکھا ہے......؟''

''ہاں......! میں نے یہ آیت سنی ہے۔''

''تو پھر تمہارا سینہ، چادر سے ڈھکا ہونا چاہئے......'' اس نے کہا تو ماہا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔'' میں کوئی بہت بڑی عالم نہیں ہوں۔ مجھے مسلمان ہوئے بھی اتنا وقت نہیں ہوا مگر میں ایک بات ضرور سمجھتی ہوں۔ جسے ہم مانتے ہیں، جس کی پرستش کرتے ہیں، اسی کا حکم نہ مانیں تو......اور پھر ہم اس کے واضح احکامات سے روگردانی کریں تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ تم یہ بھی سوال کر سکتی ہو کہ اس کی تشریح و تفصیل کیا ہے، پردہ کرنا چاہئے، نہیں کرنا چاہئے، مطلب چہرہ چھپانا چاہئے، نہیں چھپانا چاہئے، اس کی تفصیلات کیا ہیں، کس نے اس پر کیا کہا ہے، اس کو بھی ایک جانب رکھ دیں......فوری طور پر سامنے کیا حکم ہے، پہلے اس کو تو پورا کر لیں، پھر بعد کے معاملات دیکھے جائیں گے......یا پھر کیا ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق ہے، بالکل آزادی ہے اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کی، پھر آپ کی اپنی پسند کے مطابق جو دین یا مذہب ہو اسے اختیار کر لیں یا سرے سے انکار کر دیں۔ آپ کو آزادی ہے......''

''یہ......تم......کیا کہہ رہی ہو......'' ماہا نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماہا......! میرے ملک میں مسلمان محض دو یا چار فیصد ہیں۔ اگر اللہ نے مجھے یہ توفیق دی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بہت بڑی شے ہوں، بلکہ میں نے زندگی کا وہ راز پا لیا جس کی ہر انسان کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو حلال کھانا تلاش کرنا پڑتا ہے اور تم......اتنی آزادی میں......کس آزادی کی بات کر رہی ہو۔ وہ آزادی جو مغرب میں ہے۔ جہاں نہ عزت ہے نہ عفت ہے نہ عصمت ہے......اور نہ پاکیزگی......اور یہی چیزیں کسی بھی عورت کی عظمت ہوتی ہیں......میں تم سے زیادہ جانتی ہوں اس آزادی کو جس میں روح تک جھلس جاتی ہے۔ جن کے پاس کوئی بھی اخلاقی معیار نہیں ہے۔'' عائشہ یان نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی۔'' تم سوچنا کہ تم کیا کر رہی ہو۔'' پھر وہ چند لمحے کھڑی رہی، جب ماہا کی طرف سے کوئی توجہ نہ پائی تو واپس چلی گئی۔

ماہا ایک نئی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرتی چلی جا رہی ہے۔ وہ کس آزادی کی بات کر رہی ہے؟ اور اس سے بھی پہلے اسے یہ سوچنا ہے کہ کیا وہ مسلمان ہے بھی یا نہیں......؟ وہ اللہ کے احکامات پر کس قدر عمل کرتی ہے؟ نبی رحمت، دو جہاں کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر اس نے کتنے قدم بڑھائے ہیں، وہ ٹھیک کہہ رہی ہے اگر اسے یہ سب پسند نہیں ہے تو پھر...... وہ چونک گئی، اس کے آگے وہ سوچ ہی نہ سکی، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ مسلمان چاہے جتنے کمزور ایمان کا مالک ہو، جب اس کی مسلمانی پر زد آتی ہے تو پھر وہ پوری جان سے لرز جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی بھی اپنے دین کے لئے نچھاور کر دیتا ہے، یہاں تو اس کے اور اللہ کے تعلق پر انگلی اٹھ گئی، کون مسلمان چاہئے گا کہ اس کا اللہ سے تعلق ٹوٹ جائے، وہ تو شافع روزِ محشر کی شفاعت کا ہمیشہ طلب گار رہتا ہے، ماہا کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب دو آنسو اس کی گالوں کو بھگو گئے۔

دادا نور الٰہی ساری رات نہیں سو پائے تھے۔ وہ اپنے بستر پر پڑے عائشہ یان کی ساری گفتگو پر غور وفکر کرتے رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ کوئی نو مسلم اس طرح ان کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرے، انہیں بلال پر رشک آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں کس طرح کے شکوک وشبہات کئے گئے لیکن وہ خاموشی سے اور بڑے صبر وتحمل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں ماہا کا رویہ بھی تھا لیکن وہ اسے قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ یہ اس کا بلال کی ذات سے والہانہ محبت کا اظہار تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلال کسی ایسے راستے کا راہی ہو جائے جس کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور راہ میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ دادا کو بہرحال یہ خوشی تھی کہ اس کی نسل میں سے کوئی تو ایسا ہے جو اپنے دین پر پوری طرح کاربند ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو ماہا کے رویے پر سخت ردعمل کر سکتا تھا، لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے تحمل سے کام لیا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب ماہا نے اسے بلال کے کمرے میں لے جا کر دلیلوں کے انبار لگا دیئے تھے اور وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور مؤذن نے اذانِ فجر دے دی۔ وہ اٹھے اور مسجد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اسے معلوم تھا کہ بلال بھی مسجد کا رخ کرے گا۔

وہ نماز پڑھ کر واپس آئے تو ساری رات کے جگ رتے کے باعث کافی تھکان محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت تلاوت کلام پاک ان کا معمول تھا۔ وہ جب کلام مجید کھول رہے تھے، اس وقت نجانے دل سے یہ کس طرح آواز اٹھی کہ آج تک وہ یونہی عربی متن پڑھتا

چلا آ رہا ہے، بلاشبہ رسول عربی کی زبان مبارک میں پڑھنا عین سعادت وثواب ہے لیکن اس کا ترجمہ کیا ہوگا اور پھر ان کی تفصیل کیا ہوگی، ہر آیت کا ایک شانِ نزول بھی ہے۔ ایک جہان ہے جو وا ہو جاتا ہے، مجھے اس کی جانب بھی توجہ کرنی چاہئے۔ میں بلال سے کہوں گا، وہ مجھے ایسا کوئی نسخہ لا دے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ پڑھتے چلے گئے۔ آج انہیں تلاوت میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اک ذرا سے بے چینی بھی تھی کہ میں اس کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش بھی کروں گا۔ اس وقت وہ تلاوت ختم کر کے دعا مانگ رہے تھے، جب انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے کمرے میں آیا ہے۔ انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور مڑ کر دیکھا، ماہا دروازے میں کھڑی تھی۔ دادا اس کی طرف دیکھتے ہی چلے گئے، پورا جسم یوں ڈھکا ہوا تھا جیسے خود کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ سر پر آنچل یوں تھا جس سے گردن بھی چھپی ہوئی تھی اور صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا، وہ اس وقت اتنی معصوم، اتنی مقدس اور اتنی پاکیزہ دکھائی دے رہی تھی کہ دادا کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کی آنکھوں میں جہاں سرخی تھی، وہاں ایک طرح سے احساس خطا بھی جھلک رہا تھا۔ وہ بالکل ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''آؤ بیٹی......! وہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو؟'' دادا نے بہت ہی پیار سے کہا تو وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس قالین پر آ بیٹھی اور پھر اپنا سر ان کے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ وہ چند لمحوں تک یونہی بیٹھی رہی اور دادا اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔ تب وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''دادا جی......! مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ میں بلال کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی، کیونکہ اس نے بھی تو مجھے مطمئن نہیں کیا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے، لیکن......! مجھے شرمندگی اس بات پر ہے کہ میں نے اتنی عمر گزار دی اور بہترین مسلمان نہ بن سکی؟ میں ساری رات یہ سوچتی رہی ہوں، اس کی وجہ کیا ہے، میری تربیت میں کہیں خلا رہ گیا ہے یا پھر میری پرورش اس نہج پر نہیں ہو پائی یا پھر مجھے یہ ماحول ہی نہیں ملا...... یا پھر میری ذات ہی میں کہیں کمی کوتاہی ہے؟'' وہ دھیرے دھیرے یوں کہہ رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو اور دادا اس کا سر دھیرے دھیرے تھپکتے رہے......

''نہیں بیٹی......! یہ انسانی فطرت ہے، جب اس کے پاس کوئی شے بہت زیادہ ہو تب تو وہ اس کی قدر زیادہ محسوس نہیں کرتا اور جو چیز نہ ہو اس کے لئے بڑی تگ و دو کرتا ہے۔ میں مانتا ہوں بیٹی کہ میں نے دوسری بہت ساری چیزوں پر زیادہ توجہ دی، لیکن ایک بہتر سے

بہترین مسلمان بننے کے لئے اپنے اردگرد ماحول نہیں بنایا۔ اب دیکھو نا......! زمین سے جو کونپل نکلتی ہے وہ خود بخود زمین سے باہر نہیں آتی، اس کا بیج کسی نے بویا ہوتا ہے۔ اس کونپل کو خبر نہیں ہوتی کہ باہر ماحول کیسا ہے، وہ تو فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے، اسے تو زمین سے باہر آنا ہی ہے۔ اب اگر اسے جس طرح کا ماحول ملے گا، اس کی نشو ونما بھی تو ویسے ہی ہو گی۔ روشن دھوپ، صاف ہوا اور شفاف پانی جب اسے میسر آئے گا تو وہ فطری طور پر بڑھے گا اور توانا پودے کی صورت اختیار کرے گا، لیکن اگر ایسا نہیں ہوگا تو جو اسے ماحول دے گا، اس کے مطابق بڑھے گا۔'' داد نورالٰہی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اس میں میرا اتنا قصور تو نہیں ہے نا۔'' وہ تجسس بھرے انداز میں بولی۔

''ہاں بیٹی......! اس وقت ایک مسلمان کو جہاں اپنی آخرت بنانی ہے، وہاں اسے دنیا بھی بنانا ہوگی، جنگ بدر میں جب نبی رحمتؐ نے دعا مانگی تھی، وہ بہت قابل غور ہے۔ آج ان تین سو تیرہ جانوں جیسا ایمان اور جذبہ چاہئے...... یہ انہی کا صدقہ ہے کہ آج مسلمان اتنی تعداد میں ہیں لیکن......صرف نام کا مسلمان ہونا نہیں......'' دادا جی نے حسرت سے کہا۔

''ہاں دادا جی......! ہم کیا ہیں......اور ہم نے اپنا راستہ کون سا چنا ہوا ہے، اس پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا......آج جب احساس ہو رہا ہے تو......'' مزید وہ کہہ نہ سکی، اس کی آواز بھرا گئی تو دادا نے اس کے سر پر ہاتھ جما دیا۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''بیٹی......! تمہاری یہ حالت بتا رہی ہے کہ تمہارے اندر جذبہ ایمان بہت زیادہ ہے۔ جس دل میں ذرا سا بھی اپنے ایمان کے بارے میں احساس پیدا ہو جائے تو وہ اللہ کے ہاں بڑی پسندیدہ ذات ہو جاتی ہے۔ ایمان میں پختگی تو اللہ کی توفیق سے ہوتی ہے نا، جیسے انسان اگر اس کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو وہ ستر قدم اس کی جانب آتا ہے۔ اصل چیز تو نیت ہے نا۔'' دادا نے اسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دادا جی......! میں نے جس زندگی کے خواب دیکھے تھے...... وہ تو اتنا اہم نہیں ہے۔ یہ تو انسان کو تنہا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں۔ بہت تلخ ہے یہ سب......'' وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جو گزر چکا بیٹی......! اسے بھول جاؤ۔ اور اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرو، میں تو یہی کہہ سکتا ہوں......'' دادا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ایسے ہی ہوگا، لیکن مجھے آپ کی بہت مدد چاہئے ہوگی...... میں نے جو اپنے رویے سے سب کے دلوں میں......'' اس نے کہنا چاہا لیکن دادا نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

''نہیں......نہیں میری بیٹی......! ان سب کے دلوں میں تمہارے لئے نفرت نہیں ہے۔ وہ سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم دیکھنا سبھی تمہارے ساتھ کتنا پیار کرتے ہیں۔ اور بلال......! وہ تو بچپن ہی سے تمہارے ساتھ بہت نرمی کرتا ہے......بس احساس کی بات ہوتی ہے، انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماہا نے بھی اپنی بھیگی پلکیں صاف کر لیں، پھر بڑے پیار سے بولی۔

''میں آپ کے لئے چائے لیکر آتی ہوں......''

''ضرور لاؤ......! مگر تین پیالیاں لانا، میں بلال کو بھی یہیں بلوا رہا ہوں...... دادا نے کہا تو مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ دادا نورالٰہی کو یوں لگا جیسے زندگی اک نئے انداز سے شروع ہو گئی ہے۔

❁......❁......❁

میں حیران رہ گیا تھا کہ عائشہ یان نے ماہا پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ ایک ہی رات میں بدل کر رہ گئی ہے۔ صبح جب دادا جی کے پاس بیٹھے ہم چائے پی رہے تھے تو وہ اتنی بدلی ہوئی، اتنی نکھری ہوئی لگ رہی تھی کہ پہلے میں نے اس کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا اور اس روپ میں وہ مجھے بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اسی تھوڑے سے وقت میں اس نے ایک بار بھی مجھ سے نگاہ نہیں ملائی لیکن جب وہاں سے جانے لگی تو اس قدر بھرپور نگاہوں سے دیکھا کہ میں جو اتنا لہولہان تھا۔ اس کی مسکان بھری نگاہیں مرہم ثابت ہو گئیں۔ ہمارے درمیان ایک فقرے کا بھی تبادلہ نہیں ہوا، لیکن سارے گلے شکوے ختم ہو کر رہ گئے۔

دوپہر تک میں نے حویلی کی بہار ہی کچھ اور دیکھی۔ یوں جیسے ماہا کے اندر نئی روح آ گئی ہو۔ وہ ملازمین کے ساتھ کچن میں مصروف رہی اور امی ہمارے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھیں رہیں، جہاں عائشہ یان اور علی یان کے ساتھ سب باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں تھا، پھر جیسے ہی اذان ظہر کا وقت ہوا سب اٹھ گئے۔ واپس آئے تو کھانا لگ چکا تھا۔ سب کھانے کی میز تک گئے تو ماہا نے وہی لباس پہنا ہوا تھا، جو عائشہ یان نے تحفے میں بھیجا تھا۔ کھانے کی میز تکلفات بھری نعمتوں سے بھری پڑی تھی۔ پہلی بار مجھے حویلی میں سکون محسوس ہوا۔ احسان تایا اور ذکیہ تائی کے چہرے پر اطمینان بھری دمک تھی۔ ابا جی، امی اور رقیہ کے چہروں پر خوشی جھلک رہی تھی اور دادا سب کو دیکھ کر سرشار ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھا لیا گیا۔

ہم سب پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے۔ تب دادا جی نے سب کی جانب دیکھا اور

پھر بولے''میں آج بہت خوش ہوں اور اس خوشی کے موقع کو یادگار بنانے کے لئے میں نے کچھ سوچا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے سب کی طرف دیکھا اور پھر بولے۔'' میں نے چوہدری سرفراز سے بات کی ہے، وہ کل منگنی کے لئے آرہے ہیں اور اس کے ساتھ میں نے علی یان اور عائشہ یان کے اعزاز میں ایک دعوت کا بھی اہتمام کیا ہے، جس میں پورے علاقے کے لوگ آئیں گے۔اس کے لئے سب ذہنی طور پر تیار رہیں۔'' انہوں نے کہا تو میں نے اس کا ترجمہ کر دیا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ابا جی، لیکن اتنی بڑی دعوت کا بندوبست......'' ابا جی نے کہا تو احسان تایا بولے۔

''یار، مجھے کہا تھا ابا جی نے، میں نے نور پور میں ایک بندے کو کہہ دیا۔کل ظہر کے بعد آپ کو سارا اہتمام ملے گا۔ان کا کام ہی یہی ہے۔''

احسان تایا نے بتایا تو ابا جی نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''احسان، میری یہ بات انہیں بتاؤ، کہ ہمارے لئے اتنی دور سے تحفے لائے ہیں اور ہمیں بھی تو انہیں تحفہ دینا چاہئے نا۔''

''جی بالکل......!'' تایا نے کہا اور پھر علی کو بتایا۔اس پر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بزرگوں کے تحفے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔کیوں نہیں، مجھے قبول ہوگا۔'' علی نے ہنستے ہوئے کہا جو دادا نور الٰہی کو بتا دیا۔

''تو پھر میری طرف سے یہ دونوں اور ماہا کے ساتھ بلال عمرے کی سعادت کے لئے جائیں گے اور اگر مجھے بھی ساتھ لے جانا ہو تو اِن کی مرضی ہوگی......'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

علی اس تحفے پر بہت ممنون ہو رہا تھا۔اس نے کہا''میں نے اور عائشہ نے پروگرام بنایا تھا کہ عمرے کے لئے جائیں، لیکن اس پاکستان ٹور کے باعث یہ ہم نے تھوڑے وقت بعد اور پھر حج ہی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔میرے خیال میں اللہ پاک نے ہماری نیت قبول کر لی۔''

''دادا جی، اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی کہ آپ ہمارے ساتھ جائیں۔خوب جی بھر کر زیارتیں کریں گے۔'' بلال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بس چند دنوں بعد، آج شام میں نے ایک بندے کو بلوایا ہے، وہ پاسپورٹ وغیرہ لے جائے گا۔'' دادا جی نے کہا تو پھر اس حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔

میں عشاء پڑھ کر واپس آیا تو حویلی میں سناٹا تھا۔مجھے محسوس ہوا کہ سب ڈرائنگ روم کے بجائے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے عائشہ یان آ گئی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مجھ پر لگی آنکھیں دمک رہی تھیں۔مجھے

اس کا یہ انداز بہت پراسرار سا لگا۔وہ میرے قریب آئی اور میری کلائی پکڑتے ہوئے بولی۔

''آؤ......ادھر آؤ۔''

''کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''آؤ نا......!'' اس نے اصرار کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل پڑا۔وہ مجھے لیتے ہوئے ماہا کے کمرے کے سامنے آ گئی اور بہت جذباتی انداز میں بولی۔

''تمہاری رات تمہیں واپس لوٹا رہی ہوں...... میری دعا ہے کہ تم دونوں ساری زندگی خوش و خرم رہو۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا، میں نے اندر قدم رکھا تو میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔سامنے پھولوں سے سجی ہوئی سیج کے درمیان ماہا دلہن بنی سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے وہ انگوٹھی اور کنگن دھرے ہوئے تھے۔اس وقت مجھے ماہا سے زیادہ عائشہ یان پر پیار آیا۔

میں نے انگوٹھی اور کنگن پہنائے اور اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔اس وقت ماہا مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگی۔وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔مجھے یہ ماننا پڑا کہ مشرق کا وقار اس کے شرم و حیا ہی میں ہے۔

''مجھے معاف کر دینا بلال، میں نے آپ کو بہت......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''معذرت وہاں کی جاتی ہے جہاں اعتماد نہ ہو اور میں نے تو کبھی تمہیں خود سے الگ نہیں سمجھا، نہ ہی سمجھوں گا۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنی سب سرگرمیاں ختم کر دی ہیں، صرف آپ کی ذات ہی میرا محور ہو گی۔شاید اسی طرح میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں۔'' وہ عزم سے بولی۔

''میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا، تمہاری مراد این جی او سے ہے نا۔''

''جی، وہ اور باقی سب کچھ۔'' اس نے کہا۔

''نہیں......!تم این جی او چلاؤ گی، لیکن اس میں صرف یہ دیکھو گی کہ کہیں میں ایسا کام تو نہیں کر رہی، جس سے میرے اللہ اور رسولؐ نے منع فرمایا ہو۔بس! اتنا ہی کافی ہے۔اس طرح تم نیکیاں بھی کما سکو گی، اللہ کی رضا اور نبی رحمتؐ کی محبت کا راستہ تو خدمت انسانیت سے ہو کر جاتا ہے۔کس نے منع کیا، تم ایسے ادارے بناؤ، جہاں قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی ہو، اسی کام کو سب سے اعلیٰ درجے پر رکھا گیا ہے۔ایک عورت کو تعلیم دینا گویا پورے خاندان کو تعلیم

دینا ہے اور یہاں پر اس کام کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم این جی او کا وہی تصور اپنائیں جو مغرب کا ہے۔ ہمارے دین کی بنیاد میں خدمت و فلاح انسانیت ہے۔ یہی ایک اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہے تم پارلیمنٹ تک بھی جاؤ تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ نور پور سے لے کر گلاب نگر تک کے لوگ تمہاری دینی خدمات سے مستفید ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی۔''

''ہاں......! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، غیروں کو ہمارے نصاب تعلیم کی اتنی فکر کیوں ہے، ظاہر ہے، اسی پر نسل کے خدو خال مرتب ہوتے ہیں۔ خیر......! مجھ سے جو ہو سکا، میں کروں گی، کیونکہ اب آپ کی مدد میرے ساتھ شامل رہے گی......'' اس نے کہا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''کیوں نہیں......! میں تمہارے ساتھ ہوں......'' میں نے کہا ہی تھا کہ ماہا کا سیل فون بج اٹھا، وہ چونک گئی، شاید وہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھا اور پھر فون اٹھا لیا۔ سکرین پر نمبر دیکھتے ہی اس کا چہرہ عجیب سا ہو گیا، جیسے وہ بہت غصے میں ہو، پھر اگلے ہی لمحے خود کو نارمل کرتے ہوئے مجھے کہا۔

''پھوپھو نجمہ کا فون ہے...... میں صبح سے اس کے فون کے انتظار میں تھی، آپ خاموش رہیے گا اور فقط سنئے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سپیکر آن کر دیا اور بولی۔

''پھوپھو......! آپ نے اب فون کیا ہے۔ میں تو کافی دیر سے آپ کے فون کے انتظار میں تھی۔''

''کیا ہوا خیریت تو ہے۔'' وہ تشویش سے بولیں۔

''یہاں بات فیصلے تک آ پہنچی ہے......'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب......! بلال نے تمہیں طلاق دے دی......؟''

''نہیں......! لیکن ایک بہت بڑی بات ہو گئی ہے۔ دادا جی نے اپنے دونوں بیٹوں سے یہ لکھوایا ہے کہ ماہا اور بلال کی شادی اگر ٹوٹتی ہے تو جو بھی شادی توڑنے کا باعث بنے گا، اسے جائیداد میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔''

''کیا کہہ رہی ہو۔'' نجمہ پھوپھو نے چیختے ہوئے کہا۔

''جی یہ دستاویز موجود ہے، مطلب اگر میں چاہوں گی تو پاپا کو جائیداد نہیں ملے گی وہ افضال چاچا کے پاس چلی جائے گی۔'' ماہا نے اپنا لہجہ مایوس کن بناتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت بڑا ظلم ہے...... ابا جی یہ کیا شرطیں لکھواتے رہے ہیں۔'' وہ مری ہوئی

آواز میں بولی۔

''اور سنیں، یہ بھی اس دستاویز میں لکھا ہے کہ میرے نام جو بنگلہ ہے...... میرے قصور وار ہونے پر وہ بلال کو مل جائے گا اور اگر بلال قصور وار ہوتا ہے تو حویلی میرے نام ہو جائے گی۔'' ماہا نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ارے یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔'' نجمہ پھوپھو پھر سے چیخ اٹھی۔

''جب ہماری شادی ہوئی تھی تو یہ طے پایا تھا، پاپا نے بنگلہ میرے نام کیا تھا اور دادا جی نے حویلی بلال کے نام کر دی تھی۔ آج شام یہ دستاویز میرے سامنے کر دی گئیں، اس وقت میرے سامنے پڑی ہیں۔ ان کا خیال یہی ہے کہ میں ساری زندگی حویلی میں پڑی سسکتی رہوں......'' ماہا روہانسے انداز میں بولی۔

''یہ تو سب کچھ ہی غلط ہو گیا۔ میں بھی کہوں کہ وہ سب اتنے مطمئن کیوں ہو رہے ہیں اور وہ زبیدہ......! اسی لئے اپنے منہ میں زبان لگوا آئی ہے۔ مطلب ابا جی نے سارے ہی کام پکے کئے ہوئے ہیں۔'' نجمہ پھوپھو سوچنے والے انداز میں بولی تو ماہا نے پوچھا۔

''تو پھر آپ بتائیں نا پھوپھو، میں کیا کروں، کیا فیصلہ کروں......''

''بیٹی......! تم اپنا فیصلہ خود کرو'' وہ اچانک بولی۔

''آپ ہمیشہ یہی کہتی ہیں، لیکن اس وقت تو میں خود اس پوزیشن ہی میں نہیں ہوں کہ خود فیصلہ کر سکوں۔ ظاہر ہے میں اگر بلال کو نہیں مانتی تو پھر مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ اب آپ ہی نے بتانا ہے کہ اس صورتحال میں کیا آپ مجھے قبول کر لیں گی، فہد قبول کر لے گا۔'' ماہا نے کہا تو میں چونک گیا۔ یعنی بات یہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔

''اب دیکھو بیٹی......! یہ تو فہد کا معاملہ ہوگا نا، میں نہیں چاہتی کہ تم سے یہ سب چھن جائے، اب تجھے بلال ہی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرنا ہوگا۔ وہ بڑے تحمل سے بولیں۔

''میں یونہی حویلی میں پڑی سسکتی رہوں......؟ آپ کے پاس تو بہت کچھ ہے، اگر میرے پاس نہ بھی رہا تو کیا ہوا، میں اب حویلی میں نہیں رہ سکتی۔'' ماہا نے کہا۔

''یہ تمہاری قسمت ہے بیٹی، اب اسے قبول تو کرنا پڑے گا۔ کل کو تمہارے والدین کے پاس کیا رہے گا، کیا اسے بھی فہد ہی پا لے گا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے والدین نے تم پر ظلم کیا ہے، اب بھگتو......'' وہ بولی۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے محبت......'' ماہا نے کہنا چاہا تو وہ بولیں۔

''میں نے بھی دنیا کو منہ دکھانا ہے۔ تمہارے باپ کے پاس رہے گا کیا، صرف

ایک نوکری...... وہ تو اپنی جائیداد کے لئے مقدمہ لڑنے کا بھی اہل نہیں ہوگا۔“

”آپ تو ہمارا خون ہے، ایسے وقت میں ہی تو دوسروں کے کام آتے ہیں۔ میں بہرحال سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس آ رہی ہوں......“ ماہا نے کہا۔

”نہ بیٹی...... ! ایسا مت کرنا، میری جو تھوڑی بہت عزت ابا جی کے سامنے رہ گئی ہے، وہ بھی نہ ختم ہو جائے، تمہاری وجہ سے میں نے رقیہ کا رشتہ بھی چھوڑا۔“ وہ حسرت سے بولیں جس میں غصہ نمایاں تھا۔

”میں نے آپ کو نہیں روکا تھا، آپ نے خود ہی فیصلہ کیا۔ اب جبکہ میں ساری کشتیاں جلا چکی ہوں، اب آپ ایسے نہ کریں...... مجھے قبول کر لیں، ورنہ میں ساری زندگی......“ وہ بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا۔ ماہا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ”اب یہ رقیہ کے پیچھے پڑ جائے گی۔“

”اب کچھ بھی نہیں ہوتا، میں ساری بات سمجھ گیا ہوں......“ میں نے کہا تو وہ دادا جی کے نمبر ملانے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سیل فون پکڑ کر بند کر دیا۔ تب ماہا پہلے تو میری جانب اک ٹک دیکھتی رہی پھر ایک دم سے رو دی۔

”بہت بھٹکی ہوں بلال...... !“ اس نے سسکیوں کے دوران کہا۔

”اللہ کا شکر ادا کرو۔ جس نے نہ صرف تمہیں بچا لیا بلکہ ایک نئی زندگی کی توفیق دی۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”بے شک وہی کارساز ہے......“ اس نے کہا اور اپنا سر میرے کاندھے پر ٹکا دیا۔

❁......❁......❁

سہ پہر ہو رہی تھی۔ حویلی کے مکین لاہور ائیر پورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ دادا جی کے ساتھ علی یان کھڑا تھا جبکہ عائشہ یان اور ماہا زبیدہ خاتون کے ساتھ کھڑی تھیں، جبکہ بلال ان سب کا سامان سمیٹ رہا تھا، جو ملازمین وہاں رکھ گئے تھے۔ تبھی افضال نور نے بلال سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ابا جی کا بہت خیال رکھنا، ممکن ہے آب و ہوا کی تبدیلی سے ان کی صحت پر اثر پڑے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں سنبھال لوں گا۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔

”اور خاص طور پر ان مہمانوں کا۔ ان کی ایک پائی بھی خرچ نہیں ہونی چاہئے۔“ زبیدہ خاتون نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی، آپ بس ہم سب کے لئے دعا کریں۔“

”تم بھی ہمارے لئے دعا کرنا بیٹا۔“ ذکیہ خاتون نے عاجزی سے کہا۔

”ایسے میں ذیشان وہاں آ گیا۔ اس کے پیچھے، اس کی بیگم تھی۔ سب سے ملنے کے بعد اس نے دادا جی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”دادا جی...... ! یہ کتنی غلط بات ہے کہ یہ اکیلے ہی عمرے پر جا رہے ہیں، نہ اس نے پتایا جاتے ہوئے پوری بات بتائی اور نہ اب بتایا۔ اس کی نیت تو یہی ہے نا کہ ہمیں ساتھ لے کر نہ جائے۔“ اس نے جان بوجھ کر انگریزی میں کہا تا کہ وہ بھی سن لیں تو بلال بولا۔

”تمہیں پتہ ہے کہ یہ دادا جی کا تحفہ ہے اور ظاہر ہے سارا خرچ وہ کر رہے ہیں۔ ہاں یہ میرا وعدہ رہا کہ اب جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا، چاہے عمرہ ہو یا حج۔“ بلال نے کہا۔

”مجھے تمہارے وعدے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود جا رہا ہوں...... دادا جی کے خرچے پر۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا تو بلال نے اسے خوشگوار حیرت سے دیکھا تو دادا جی بولے۔

”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ عمرے کے سفر کا سارا بندوبست اسی نے تو کیا ہے۔ اس لئے یہ بھی تحفے میں شامل ہے۔“

”دادا ابو ایسا کہیں یہ تحفہ پیکج میں ہیں......“ ماہا نے کہا تو سبھی مسکرا دیئے۔

”اسے کہتے ہیں قسمت......“ ذکیہ بیگم جذب سے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد فلائٹ کا وقت ہو گیا۔ وہ سب ڈیپارچر لاؤنج کی جانب بڑھ گئے۔ اس وقت ان کے چہروں پر سنجیدگی بھرا تقدس تھا۔

وہ سب اللہ کے مہمان بننے جا رہے تھے۔

❁......❁......❁